معارف القرآن

7

تصنیف

حضرت مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب حفظہ اللہ

ناشر: جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

سورۃ التوبہ، یونس، ھود، یوسف، الرعد، ابراہیم، الحجر

7

تصنیف

استاذ العلماء شیخ الحدیث والتفسیر
حضرۃ مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب مدظلہ
سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور بانی ومہتمم جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

ادارہ آبِ حیات ٹرسٹ لاہور غوث گارڈن 2½ جی ٹی روڈ مناواں لاہور کینٹ
رابطہ نمبر 0300-0321-9458876

☼ سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور ☼ پرنسپل جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور
☼ سابق شیخ الحدیث جامعہ مفتوحہ لاہور ☼ سابق شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ آب حیات لاہور ☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ شان دار لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ تحفہ خواتین لاہور ☼ ماہ نامہ صدائے جمعیت لاہور
☼ امیر جمعیت تحفظ اسلام پاکستان ☼ صدر ادارہ آب حیات ٹرسٹ
☼ متولی جامع مسجد عارفی مناواں لاہور ☼ خطیب ٹاؤن ھال لاہور

ضابطہ

نام کتاب۔۔۔

معارف الفرقان جلد ⑦

سورۃ التوبہ	۱۰	سال کے بارہ مہینوں کی قدر و منزلت	۴۸
سورۃ التوبہ کے اسماء	۱۲	نسی کیا ہے؟	۵۰
معاہدہ مشرکین سے اعلان براءت	۱۳	ہجرت اور شان صدیق اکبر رضی اللہ عنہ	۵۳
مشرکی کو چار ماہ کی مہلت	۱۳	حکم جہاد: عسر و یسر میں یکساں عزم	۵۷
معاہدہ مہلت اور دعوت قرآن	۱۵	منافقین کا عذر مسترد	۵۸
اعلان براءت کے بعد، توبہ کے اصول	۱۸	عتاب نہیں اعزاز و اکرام میں اضافہ	۵۸
دلوں کی شفا اور باطل کی رسوائی	۲۰	مومن صادق اور منافق کی پہچان	۶۲
امتحان ایمان اور مساجد الٰہی کی حقیقی اہلیت	۲۲	عورتوں کے فتنے میں گرفتار منافق	۶۴
مساجد کو آباد کرنے والے	۲۴	احوال منافقین	۶۶
حجاج کو پانی پلانا اور مسجد الحرام کو آباد کرنا	۲۵	مال و اولاد کی آزمائش اور منافق کا کردار	۶۹
اہل ایمان مہاجرین اور مجاہدین اسلام	۲۷	صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور منافقین میں فرق	۷۳
اللہ اور رسول اللہ ﷺ سب سے مقدم	۲۸	مصارف زکوٰۃ	۷۴
غزوہ حنین	۳۰	منافقین کی طرف سے ایذا رسانی	۹۵
مشرک کا حدود حرم میں داخلہ ممنوع	۳۵	منافقین کی بری عادات	۱۰۰
حکم قتال کب اور کیوں؟	۳۷	یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں	۱۰۳
اہل کتاب سے قتال کی وجوہات	۳۸	اہل ایمان کی صفات، ان کیلیے وعدہ جنت	۱۰۴
یہود و نصاریٰ کے عقائد باطلہ	۳۹	جہاد بالسیف اور جہاد باللسان	۱۰۶
قرآن کریم اور دین حق کا غلبہ	۴۳	دوزخ کی آگ	۱۱۴
احبار و رھبان کی اکثریت حرام خور	۴۴	منافقین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم	۱۱۵

غزوہ تبوک میں منافقین اور صحابہ کرام	۱۱۹	سورۃ یونس	۱۵۶
تبوک سے صحابہ کرام فاتح بن کر آئے	۱۲۲	عظمت قرآن اور حکمت رسالت	۱۵۷
منافق دیہاتی اور صحابی دیہاتی میں فرق	۱۲۳	دلائل توحید و قدرت الٰہی، درخشاں پہلو	۱۵۹
سابقون الاولون، مہاجرین کا مقام رفیع	۱۲۶	اہل جہنم اور ارباب جنت	۱۶۱
زکوٰۃ ذریعہ تزکیہ وطہارت	۱۲۹	انسان کی بے صبری سے وحی کی صداقت تک	۱۶۳
تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معافی کا معاملہ	۱۳۰	لوگ ایک ہی امت تھے کا مطلب؟	۱۶۷
مسجد ضرار کی تعمیر	۱۳۲	عناد منکرین، فریب نعمت	۱۶۸
مسجد نبوی، مسجد قبا، مسجد ضرار، صحابہ	۱۳۴	دنیا کی فنائیت اور بے ثباتی	۱۷۱
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عہدِ خدا کے امین	۱۳۶	دارالسلام سے کیا مراد ہے؟	۱۷۲
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صفات	۱۳۷	جنت اور دیدار خداوندی	۱۷۳
نبی کریم اور اہل ایمان مشرکوں کیلیے دعا	۱۳۸	انجام شرک، برہان توحید، قیامت	۱۷۴
مالک و مختار ایک اللہ	۱۴۱	قرآن اللہ کی نازل کردہ کتاب	۱۷۸
مہاجرین وانصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان	۱۴۳	اعجاز قرآن	۱۷۹
کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ساتھیوں کی توبہ	۱۴۴	نفع اور نقصان کا مالک صرف اللہ	۱۸۲
جہادی سفر میں سپہ سالار کا ساتھ	۱۴۵	مہلت دنیا، وعدہ عذاب، عدل مطلق	۱۸۴
جہاد اور طلب علم	۱۴۷	قرآن کریم موعظہ، بیماریوں کیلیے شفا	۱۸۶
آس پاس کے کفار سے قتال کا حکم	۱۵۰	فضل اور رحمت سے کیا مراد ہے؟	۱۸۹
منافقین کی چالاکیاں، مکاریاں	۱۵۰	حلال و حرام کی حقیقت، نگرانی الٰہی	۱۹۰
رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم رؤف ورحیم	۱۵۳	شان اولیاء اللہ رحمہم اللہ اور بشارتیں	۱۹۱
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد	۱۵۴	اولیاء اللہ رحمہم اللہ کے لیے بشارتیں	۱۹۵

قولِ باطل کی تردید، اللہ کی کبریائی	۱۹۶	تاخیر عذاب، مزاج انسان، شان رسالت	۲۳۲
تذکرہ نوح علیہ السلام اور انجام قوم نوح	۱۹۸	مطاعن کفار اور اعجاز قرآنی	۲۳۴
تذکرہ حضرت موسیٰ، جادوگران مصر	۲۰۱	دنیا تو ہاتھ آگئی مگر آخرت برباد	۲۳۸
بنی اسرائیل کیلیے مصر میں نئے مکانات	۲۰۳	شہادتِ حق، انجام باطل	۲۴۲
دعا سے فرعونی اموال پتھر بن گئے	۲۰۵	جنت جانے کیلیے تین اہم صفات	۲۴۵
دعائے موسیٰ علیہ السلام پر ہارون کی آمین	۲۰۶	مومن اور کافر کی مثال	۲۴۷
سرکش فرعون کا عبرت ناک انجام	۲۰۶	دعوت نوح، آغاز رسالت، ندائے توحید	۲۴۸
مصر و شام واردن بنی اسرائیل کا ٹھکانہ	۲۰۸	قوم نوح نے پیروی کیوں نہ کی؟	۲۴۹
یقین رسالت اور منکرین کا انجام	۲۰۹	حضرت نوح علیہ السلام کا انداز بیان	۲۵۰
قوم یونس علیہ السلام پر آیا عذاب کیسے ٹلا؟	۲۱۲	ضد اور تکبر کا جواب	۲۵۱
مشیت الٰہی، اختیار انسان، انجام اقوام	۲۱۴	فیصلہ الٰہی اور سفینہ نجات	۲۵۳
توحید خالص کی دعوت	۲۱۶	طوفان، فراق اور سلام الٰہی	۲۵۷
مالک نفع اور ضرر صرف اللہ ہے	۲۱۷	وحی غیب اور پیغام صبر و تحمل	۲۶۱
دعوت حق کا اعلان، انسان کی ذمہ داری	۲۱۹	دعوت ھود اور انجام قوم عاد	۲۶۳
آسمانی وحی کی اتباع کا حکم	۲۲۰	دعوت صالح علیہ السلام اور انکار ثمود	۲۶۶
سورۃ ھود	۲۲۲	حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ	۲۶۸
عظمت قرآن اور دعوت توحید	۲۲۳	قوم صالح علیہ السلام کو تین دن کی مہلت	۲۶۹
اللہ کو سب کچھ معلوم ہے	۲۲۵	قوم صالح علیہ السلام کا عبرت ناک انجام	۲۶۹
رزق عام اور علم تام (وما من دابہ)	۲۲۷	حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت اسحٰق	۲۷۲
تخلیق کائنات، عرش الٰہی، مقصد امتحان	۲۲۹	شفاعت ابراہیم علیہ السلام اور فیصلہ الٰہی	۲۷۵

فرشتوں کی آمد پر لوط کے خوف کیوجہ	۲۷۷	گیارہ ستارے، سورج اور چاند	۳۲۳
بیٹیوں سے کیا مراد ہے؟	۲۸۰	خواب کا تذکرہ بھائیوں سے نہ کرنا	۳۲۵
حضرت لوط علیہ السلام کو فرشتوں کی نصیحت	۲۸۲	فضیلت یوسف علیہ السلام، بھائیوں کا حسد	۳۲۶
قوم لوط پر عذاب	۲۸۲	یعقوب علیہ السلام کو کیا پریشانی تھی؟	۳۲۸
شعیب علیہ السلام: اصلاح معیشت سے اصلاح عقیدہ تک	۲۸۴	کنویں کی سازش، جھوٹا خون، صبر جمیل	۳۳۰
قوم شعیب علیہ السلام پر تین طرح کا عذاب	۲۸۸	کنویں سے شاہی محل تک، آزمائش	۳۳۴
لعنت کا لگاتار سلسلہ	۲۹۱	بچے کی گواہی، قمیص کی دکھلائی، تہمت	۳۳۹
بت پرستی نے آخرت تباہ کردی	۲۹۵	عزیز مصر کی یوسف علیہ السلام و زلیخا کو نصیحت	۳۴۲
سنت الٰہی مہلت کے بعد مؤاخذہ	۲۹۵	جمال یوسفی اور فتنہ نسوانیت	۳۴۳
انجام انسان: شقاوت سعادت کا منظر	۲۹۶	حضرت یوسف علیہ السلام کے آباؤ اجداد	۳۴۷
نبیوں کو کتاب ملنے کے بعد لوگوں کا اختلاف	۳۰۲	ساقی بری نانبائی تختہ دار پر	۳۵۲
جزا و سزا، استقامت اور اجتناب باطل	۳۰۳	شاہ مصر کا خواب اور یوسف کی تعبیر	۳۵۴
پنجگانہ نماز، نیکیوں سے گناہوں کا مٹ جانا	۳۰۸	یوسف نے قید خانے سے نکلنے سے انکار	۳۵۸
امر بالمعروف و نہی عن المنکر	۳۰۹	یوسف علیہ السلام کی مکمل برأت کا اعلان	۳۵۹
ملک ظلم و ستم سے نہیں چل سکتا	۳۱۰	قول یوسف علیہ السلام و قول زلیخا کا مطلب	۳۵۹
اختلاف مذموم اور اختلاف محمود	۳۱۱	یوسف علیہ السلام جیل سے تخت شاہی تک	۳۶۱
قصص انبیاء، تسلی، ثبات، توکل کا پیغام	۳۱۴	یوسف علیہ السلام کی عزت واقتدار، بھائیوں سے ملاقات	۳۶۴
سورۃ یوسف	۳۱۷	بنیامین علیہ السلام شام سے مصر کیسے پہنچے؟	۳۷۱
قرآن کریم عربی زبان میں	۳۱۹	نظر بد سے بچنے کی تدبیر	۳۷۵
احسن القصص اور نبوت محمدی کی دلیل	۳۲۱	شاہی پیمانے کی گمشدگی و بازیابی	۳۷۷

عدل یوسفی اور برادران یوسف کی آزمائش	۳۸۰	اللہ تعالیٰ کی شان وقدرت	۴۲۵
صبر جمیل کیا ہوتا ہے؟	۳۸۲	اللہ کی طاقت اور عظمت	۴۲۸
گریہ یعقوب علیہ السلام	۳۸۳	توحید ربانی اور تمثیل حق وباطل	۴۲۹
یوسف کے زندہ ہونے کا والد کو احساس	۳۸۵	اوصاف اہل ایمان اور انجام سعادت	۴۳۳
برادران یوسف علیہ السلام کی لجاجت	۳۸۷	عہد شکنی کا انجام، رزق کی حقیقت	۴۳۷
بھائیوں کی اصلاح، رحمت کی امید	۳۸۹	ذکر اللہ سے دلوں کا اطمینان	۴۳۸
برادران یوسف کیلیے یوسف کا پروانہ درگزر	۳۹۰	اہل ایمان کی سعادت دائمی	۴۴۳
یوسف علیہ السلام کی متبرک قمیص	۳۹۱	کافروں کے مطالبات اور قرآن کا جواب	۴۴۴
اشک ندامت، بخشش کی درخواست	۳۹۴	تمسخر رسالت کا انجام	۴۴۷
تخت شاہی پر سجدہ ریزیاں	۳۹۵	جنت کیسی ہوگی؟	۴۴۹
بچھڑے ہوئے اپنوں کی ملاقات	۳۹۸	وحی قرآنی کی تصدیق، استقامت دعوت	۴۵۰
آیات کائنات سے اعراض	۳۹۸	انجام وعدہ عذاب، غلبہ اسلام	۴۵۵
تاخیر نصرت، عصمت انبیاء علیہم السلام	۴۰۵	**سورۃ ابراہیم**	۴۵۸
قصص انبیاء علیہم السلام میں عبرت کا سامان	۴۰۸	نور ہدایت کا منشور، اہل دنیا کی گمراہی	۴۵۹
سورۃ الرعد	۴۱۲	قومی زبان میں نبی کی بعثت	۴۶۰
کتاب اللہ کی حقانیت وصداقت	۴۱۴	یاد ایام اللہ، شکر وناشکری کا انجام	۴۶۲
قدرت کی نیرنگیاں	۴۱۵	کفار کی جسارت	۴۶۴
عذاب کو دعوت	۴۱۸	دعوت توحید، صبر رسالت، وعدہ نصرت	۴۶۵
منکرین کا مطالبہ معجزہ	۴۲۰	انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے خدائی مدد	۴۶۸
شکم مادر میں قدرت کی کاریگریاں	۴۲۲	متکبر کا انجام، پیاس کا عذاب	۴۶۹

کافروں کے نیک اعمال کا صلہ	۴۷۰	آسمان وزمین کی تخلیق، تدبیر الٰہی	۵۰۷
قدرت مطلقہ اور قیامت کا مکالمہ	۴۷۱	جنوں اور انسانوں کی پیدائش	۵۰۸
شیطان اور پیروکاران شیطان کا مکالمہ	۴۷۳	تخلیق آدم، ملائکہ کا سجدہ، ابلیس کا انکار	۵۱۰
ایمان اور عمل کا صلہ، جنت وسلامتی	۴۷۴	راندہ درگاہ ہونے کے بعد شیطانی گستاخی	۵۱۱
کلمہ طیبہ پاکیزہ درخت کی طرح ہے	۴۷۶	اہل تقویٰ کیلیے جنتیں اور بہتے چشمے	۵۱۳
کلمہ خبیثہ گندے درخت کی طرح ہے	۴۷۸	غفور ورحیم کا عذاب الیم	۵۱۴
اہل ایمان کی دنیا اور عقبیٰ میں ثابت قدمی	۴۷۸	حضرت ابراہیم اور ان کے معزز مہمان	۵۱۵
نعمت الٰہی، انسانی ناشکری، انجام ہدایت	۴۷۹	قوم لوط کی تباہی کیلیے آنے والے فرشتے	۵۱۶
سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دردانگیز دعائیں	۴۸۲	اصحاب الایکہ کون تھے؟	۵۲۰
ہولناکی قیامت کی ادنیٰ سی جھلک	۴۸۴	اصحاب الحجر اور حجر سے کیا مردہے؟	۵۲۰
بیداری کی آخری صدا اور غفلت کا انجام	۴۸۵	تخلیق کائنات کا مقصد اور صفح جمیل	۵۲۲
دشمنان اسلام کی سازش	۴۸۶	سبع مثانی سے کیا مراد ہے؟	۵۲۳
زمین وآسمان کی تبدیلی، مجرمین کا انجام	۴۸۸	کفار کو ملنے والا ساز وسامان	۵۲۴
سورۃ الحجر	۴۹۴	اعلان رسالت، انا النذیر المبین	۵۲۵
عظمت قرآن	۴۹۵	دین حق کو ٹکڑیوں میں تقسیم کرنیوالے	۵۲۶
کافروں کی حسرت	۴۹۷	قرآن کریم کو ٹکڑیوں میں تقسیم کرنیوالے	۵۲۷
کافروں کی لمبی امیدیں	۴۹۸	حتمی بازپرس اور ہمہ گیر محاسبہ	۵۲۸
خدائی گرفت وسزا کا وقت طے ہے	۴۹۹	اعلانیہ دعوت وتبلیغ کرنے کا حکم	۵۲۹
قرآن کی حفاظت کا ربانی وعدہ	۴۹۹	دشمنان رسول ﷺ کا عبرت ناک انجام	۵۳۱
انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ تمسخر	۵۰۶	آخر دم تک عبادت کرنے کا حکم	۵۳۴

سورۃ التوبہ (تعارف)

سوال سورۃ التوبہ کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ التوبہ مدنی سورت ہے، مصحف میں نمبر ۹، اور آیات کی تعداد ۱۲۹ ہے، اس کا ایک نام برأۃ بھی ہے، کیونکہ یہ سورت مشرکین سے برأت اور معاہدات کی منسوخی کے اعلان سے شروع ہوتی ہے، اس کی نوعیت جنگی، سیاسی اور اصلاحی ہے۔

شانِ نزول: سورۃ التوبہ کا نزول اس وقت ہوا جب بعض مشرکین نے مسلمانوں سے کیے گئے معاہدوں کو توڑ دیا تھا، اس سلسلے میں اعلانِ برأت حجِ اکبر (۹ ہجری) کے موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ذریعے سنایا گیا، سورت کی پہلی آیات اسی سیاسی و مذہبی اعلانِ برأت کے لیے نازل ہوئیں، جیسا کہ کئی تفاسیر میں مذکور ہے کہ آیات کا تعلق ان مشرکین کی طرف براہِ راست اعلان سے ہے جنہوں نے عہد شکنی کی۔

سورۃ التوبہ کے آغاز میں بسم اللہ نہ آنے کی وجہ: اس بارے میں متعدد روایات منقول ہیں: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی روایت، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا کہ سورۃ التوبہ کے شروع میں بسم اللہ کیوں نہیں لکھی گئی؟ تو عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب آیات نازل ہوتیں تو وہ لکھنے والوں سے فرماتے: ضَعُوا هٰذِهِ الآيَةَ فِي السُّورَةِ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا كَذَا وَ كَذَا" اس آیت کو اُس سورت میں شامل کر دو جس میں فلاں بات کا ذکر آتا ہے۔" اور چونکہ سورۃ الأنفال مدنی دور کی شروع کی سورتوں میں سے تھی اور برأۃ آخر میں سے اور دونوں کے مضامین "عہد" اور "عہد کے خاتمے" کے متعلق تھے، لہٰذا صحابہ رضی اللہ عنہم نے انہیں قریب سمجھ کر اکٹھی رکھ دیں اور درمیان میں بسم اللہ نہ لکھی۔

یہ روایت منقول ہے: لَمْ تَكْتُبُوا بَيْنَهُمَا سَطْرَ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، وَكَانَتِ الْأَنْفَالُ مِنْ أَوَائِلِ مَا نَزَلَ بِالْمَدِينَةِ، وَكَانَتْ بَرَاءَةٌ مِنْ آخِرِ مَا نَزَلَ مِنَ الْقُرْآنِ، فَظَنَنَّا

أَنَّهَا مِنْهَا

شدتِ مضمون اور اعلانِ جنگ: بعض روایات میں آیا ہے کہ چونکہ سورۃ براءۃ کی ابتدا سخت لہجے اور مشرکین کے خلاف اعلان سے ہوتی ہے، اس لیے اس کے آغاز میں رحمت اور امان والی عبارت بسم اللہ الرحمن الرحیم مناسب نہ تھی۔ جیسا بیان ہوا ہے: لَمْ تَنْزِلْ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ عَلَى رَأْسِ سُورَةِ بَرَاءَةَ لِأَنَّ بِسْمَ اللهِ لِلْأَمَانِ وَالرَّحْمَةِ، وَنَزَلَتْ بَرَاءَةُ لِرَفْعِ الْأَمَانِ وَبِالسَّيْفِ، سورتِ براءۃ کے آغاز میں 'بسم اللہ الرحمن الرحیم' اس لیے نازل نہیں ہوئی کہ 'بسم اللہ' امان اور رحمت کے لیے ہے، جبکہ سورتِ براءۃ امان اٹھالینے اور (اعلانِ) تلوار کے ساتھ نازل ہوئی۔

سورۃ الأنفال اور سورۃ براءۃ کا ایک ہی مضمون ہونا، ابنِ کعب اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ایک اور قول کے مطابق دونوں سورتیں ایک دوسرے کے اتنی قریب المعانی ہیں کہ انہیں ایک ہی سلسلے کی سورت سمجھا گیا اور اس وجہ سے درمیان میں بسم اللہ نہ لکھی گئی۔ اس کی صراحت یوں ہے إِنَّهَا ضُمَّتْ إِلَى الْأَنْفَالِ بِالْمُقَارَبَةِ، فَصَارَتَا كَسُورَةٍ وَّاحِدَةٍ، بے شک اسے (سورۂ براءۃ کو) مشابہت اور قربت کی وجہ سے سورۂ انفال کے ساتھ ملا دیا گیا، پس وہ دونوں گویا ایک ہی سورت کی طرح ہو گئیں۔

اہم مضامین: سورۃ التوبہ کے مرکزی نکات درج ذیل ہیں: • مشرکین سے معاہدات کا خاتمہ اور اعلانِ براءت • چار مہینے کی مہلت اور اس کے بعد مشرکین کے خلاف کارروائی کا حکم • غزوۂ تبوک کا پس منظر، منافقین کی سازشیں اور ان کا کردار • ایمان، جہاد اور انفاق کے احکام • مسجد ضرار کا واقعہ اور اس کی تردید • سچے ایمان والوں اور منافقوں کے اخلاق وصفات • اہلِ کتاب کی بعض غلطیوں پر تنبیہ • توبہ، اخلاص اور اللہ کی رحمت کی بشارت جیسا کہ لغوی ماخذ میں آیا ہے کہ توبہ کا مفہوم "گناہ کا اعتراف، ندامت اور نہ لوٹنے کا عزم" ہے (مفردات الفاظ القرآن) اور یہی سورت کا ایک اہم اخلاقی محور ہے۔

سورۃ توبہ کے اسماء

سوال سورۃ التوبہ کے اسماء کتنے ہیں؟

جواب تفاسیر میں سورۃ التوبہ کے بہت سے نام ملتے ہیں، کسی مفسر نے ۱۳ اور کسی نے چودہ ذکر کیے ہیں ، سورۃ توبہ قرآن کی اُن سورتوں میں سے ہے جن کے سب سے زیادہ نام وارد ہوئے ہیں، یہاں کچھ نام پیش کیے جاتے ہیں۔

① براءۃ: براءت اور بے تعلقی کا اعلان، اس نام کی وجہ یہ ہے کہ سورت کی ابتدا ہی بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ کے اعلان سے ہوتی ہے، اس لیے اس سورۃ کا نام سورۃ البراءت رکھا گیا ہے۔

② التوبہ: رجوع اور بازگشت، یہ نام اس لیے کہ سورت میں بار بار توبہ کا ذکر آیا ہے، جیسے فَإِن تُبتُم فَهُوَ خَيرٌ لَّكُم، لَقَد تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وغیرہ۔ اس تکرار کی وجہ سے اس کا نام توبہ رکھا گیا۔

③ الفاضحہ: رسوا کرنے والی، اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سورت منافقین اور ان کے اعمال کو کھول کر بیان کرتی ہے، ابن عباس نے فرمایا: "هِيَ الْفَاضِحَةُ، مَا زَالَتْ تَنْزِلُ: وَمِنْهُمْ وَمِنْهُمْ، یہ سورت فاضحہ (راز کھول دینے والی) ہے، جو مسلسل نازل ہوتی رہی اور منافقین کے بارے میں کہتی رہی، ان میں سے کچھ ایسے ہیں اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں، یوں منافقین کی خوب رسوائی وروسیاہی ہوئی۔

④ سورۃ العذاب: عذاب والی سورت، چونکہ اس میں عذاب کا ذکر کثرت سے ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اسے "سورۃ العذاب" کہا جاتا تھا۔

⑤ اَلْمُقَشْقِشَةُ: نفاق سے پاک کرنے والی (مُبرِّئَةٌ)، عربی میں قَشْقَشَ کے معنی ہیں: بیماری یا آلودگی کو دور کرنا، صاف کر دینا، چھانٹ دینا۔

⑥ المنقرۃ: کھودنے والی، ظاہر کرنے والی، چونکہ یہ سورت منافقین کے باطن کو "نقر" یعنی کھود کر ظاہر کرتی ہے۔

⑦ البحوث: معنی: تلاش کرنے اور کھوج لگانے والی، اس سورت میں منافقین کے احوال کی کھوج لگائی گئی۔ ⑧ الحافرۃ: کھود کر نکالنے والی۔ چونکہ یہ سورت منافقین کے قلوب سے ان کے خبث باطن کو گویا کہ کھود کر نکالنے والی ہے۔ ⑨ المثیرۃ: ظاہر کرنے والی، اٹھانے والی، نفاق کی حالت کو اکھاڑ کر سامنے لانے والی۔ ⑩ المخزیۃ: رسوا کرنے والی۔ چونکہ اس میں منافقین کی رسوائی کا ذکر ہے۔ ⑪ اَلْمُنَكِّلَةُ: سزا دینے والی، انتقام لینے والی، منافقین پر عذاب لانے والی۔ ⑫ المشردۃ: منافقین کو منتشر کرنے والی، بھگانے والی۔ ⑬ اَلْمُدَمْدِمَةُ: منافقین کو ہلاک کرنے والی، منافقین کو تباہ کرنے والی۔ مدامدہ یعنی سخت عذاب دینے والی۔

معاہدہ مشرکین سے اِعلان براءت

سوال آیت میں بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کا کیا مطلب ہے؟

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ {۱} التوبۃ.

جواب ترجمہ: (اے اہل اسلام اب) اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے مشرکوں سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا بیزاری (اور جنگ کی تیاری ہے)

مختلف مقامات پر مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان معاہدے ہوئے تھے، مگر مشرکین اپنی ریشہ دوانیوں کے باعث مسلمانوں کے خلاف کسی نہ کسی طرح کوئی نہ کوئی ساز باز کرتے رہتے تھے، جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے ان کے عزائم ظاہر ہونے لگے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ ان کے ساتھ کیے جانے والے تمام معاہدے منسوخ کر دیے جائیں۔

مشرکین کو چار ماہ کی مہلت

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کیجیے

فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ {۲} التوبۃ

جواب ترجمہ: تو (مشرکو تم) زمین میں چار مہینے چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہ کر سکو گے اور یہ بھی کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔

جن مشرکوں سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ صلح نہیں انہیں چار ماہ کی مدت دی جاتی ہے۔ اس مدت میں وہ خوب سمجھ لیں کہ وہ مسلمانوں سے جنگ کو تیار ہیں یا یہ ملک چھوڑ کر نکل جانا چاہتے ہیں یا اسلام لانا چاہتے ہیں اور اگر وہ اسلام لے آئیں تو وہ بھی انشاء اللہ جنت میں داخل ہوں گے اس دفعہ میں وہ مشرک قبائل بھی شامل ہیں جو صلح کا معاہدہ تو کر لیتے تھے مگر صلح کی شرائط ہی ایسی طے کرتے تھے کہ ان کے لیے فتنہ اور نقض عہد کی گنجائش باقی رہے یعنی ایسے قبائل جن کی طرف سے مسلمانوں کو عہد شکنی یا فتنہ انگیزی کا خطرہ تھا ان کا ایسا عہد بھی اس اعلان کے ذریعہ ختم کر دیا گیا۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

۶ ہجری میں بمقام حدیبیہ جب نبی کریم ﷺ اور قریش کے درمیان معاہدہ صلح ہو چکا تو بنی خزاعہ مسلمانوں کے اور بنی بکر قریش کے حلیف بنے۔ بنی بکر نے معاہدہ کی پروانہ کر کے خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے اسلحہ وغیرہ سے ظالم حملہ آوروں کی مدد کی۔ اس طرح قریش اور ان کے حلیف دونوں معاہدہ حدیبیہ پر قائم نہ رہے جس کے جواب میں ۸ ہجری میں نبی کریم ﷺ نے اچانک حملہ کر کے مکہ معظمہ بڑی آسانی سے فتح کر لیا۔ ان قبائل کے سوا دوسرے قبائل عرب سے مسلمانوں کا میعادی یا غیر میعادی معاہدہ تھا۔ جن میں سے بعض اپنے معاہدہ پر قائم رہے۔ بہت سے قبائل وہ تھے جن سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

اس سورت کی مختلف آیات قبائل کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔ شروع کی آیات میں غالباً ان مشرکین کا ذکر ہے جن سے معاہدہ تھا مگر میعادی نہ تھا۔ ان کو اطلاع کر دی گئی کہ ہم آئندہ معاہدہ رکھنا نہیں چاہتے۔ چار ماہ کی مہلت تم کو دی جاتی ہے کہ اس مدت کے اندر اسلامی برادری میں شامل ہو جاؤ یا وطن چھوڑ کر مرکز ایمان و توحید کو اپنے وجود سے خالی کر دو اور یا جنگی مقابلہ کے لیے تیار ہو جاؤ لیکن یہ خوب سمجھ لینا کہ تم خدا کی مشیت کو روک نہیں سکتے۔ اگر اسلام نہ لائے وہ تم کو دنیا و آخرت

میں رسوا کرنے والا ہے۔ تم اپنی تدبیروں اور حیلہ بازیوں سے اسے عاجز نہ کر سکو گے۔ باقی جن قبائل سے کوئی معاہدہ ہی نہ تھا، ممکن ہے انہیں بھی چار ماہ کی مہلت دی گئی ہو۔ یہ اور اس کے بعد کی آیتوں کا اعلان عام ۹۹ ہجری میں حج کے موقع پر تمام قبائل عرب کے سامنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کیا۔

معاہدہ مہلت اور دعوت قرآن

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۚ﴿۴﴾ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۚ﴿۵﴾ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ التوبہ

جواب ترجمہ: اور حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کے لیے اعلان ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکین سے بری ہے۔ سو اگر تم توبہ کر لو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور اگر تم اعراض کرو تو یہ جان لو کہ بلاشبہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ سوائے ان مشرک لوگوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ ذرا کمی نہ کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد کی۔ سو تم ان کے معاہدہ کو ان کی مدت مقررہ تک پورا کر دو۔ بلاشبہ اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ پھر جب اشہر الحرام گزر جائیں تو تم مشرکین کو قتل کرو جہاں بھی پالو۔ اور ان کو پکڑو اور گھیرو اور ان کی تاک میں گھات کے ہر موقع

پر بیٹھو۔ سو اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دیجیے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے امن کی جگہ پہنچا دیجیے۔ یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو علم نہیں رکھتے۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ: یہ اعلان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے بھی، جو یومِ نحر کے موقع پر تمام لوگوں کے لیے عام کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی ان سے براءت کا اعلان کرتا ہے۔ اے مشرکو! اگر تم اپنے شرک سے توبہ کرلو تو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم توبہ سے منہ موڑو گے تو یقین رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے، نہ اس کی گرفت سے بچ سکتے ہو، اے رسول! آپ ان لوگوں کو، جنہوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا، ایک دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے جو ان کے انتظار میں ہے۔

حج اکبر سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے **يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ** کی تعیین میں مختلف اقوال بیان کیے ہیں، مگر ان تمام روایات اور تفاسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک اس سے مراد یوم النحر ہے، کیونکہ نبی ﷺ نے اسی دن جمرات کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا **هٰذَا يَوْمُ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ**، جیسا کہ ابن عمر سے روایت ہے۔ (الکشاف) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی پوچھنے والے سے کہا: ''یہی تمہارا آج کا دن ہے'' یعنی دنِ نحر (غرائب القرآن) دوسری بڑی دلیل یہ ہے کہ اعلانِ براءت اسی دن کیا گیا تھا اور اسی میں حج کے اکثر بڑے اعمال ادا ہوتے ہیں جیسے طواف، رمی، نحر اور حلق۔ (سراج المنیر)

بعض مفسرین جیسے عمر رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطاء رحمہ اللہ نے اسے **یومِ عرفہ** قرار دیا ہے، کیونکہ عرفہ کو حج کا اہم ترین رکن سمجھا جاتا ہے۔ (مفاتیح الغیب) ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد ایامِ منیٰ کے تمام دن ہیں، جیسا کہ سفیان ثوری اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا کہ 'یوم' سے مراد 'زمانہ' بھی ہوتا ہے، جیسے ''یوم صفین'' اور ''یوم الجمل''۔ (غرائب القرآن)

کچھ روایات میں یہ بات بھی آئی ہے کہ اسے 'حج اکبر' اس لیے کہا گیا کہ اس سال تمام مذاہب کے لوگ، مسلمان، مشرک، یہود اور نصاریٰ، ایک ساتھ حج میں جمع ہوئے تھے، جیسا کہ سمرۃ بن

جندب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔(در منثور) اور اسی بنیاد پر رازی رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے (مفاتیح الغیب) ایک قول یہ بھی ہے کہ حج کو "حج اکبر" اس لیے کہا گیا کہ عمرہ "حج اصغر" کہلاتا ہے (مفاتیح الغیب)

اور بعض روایات میں حجِ قران کو اکبر اور افراد کو اصغر کہا گیا ہے۔(موسوعۃ التفاسیر) تاہم ان تمام اقوال میں سب سے قوی، متفق اور مشہور قول یہی ہے کہ یوم الحج الأکبر = یوم النحر (۱۰ ذوالحجہ)۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا: البتہ وہ مشرکین مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے معاہدہ کیا اور انہوں نے عہد کی پوری پابندی کی، نہ اس میں کوئی کمی کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی۔ ایسے لوگوں کے ساتھ ان کے معاہدے کی مدت پوری ہونے تک وفاداری برتو، بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو اس کے احکام کی پیروی کرتے ہیں اور جن احکام میں عہد کی پاسداری بھی شامل ہے اور وہ خیانت جیسے گناہوں سے بچتے ہیں۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ: پس جب وہ مہلت کے مقدس مہینے گزر جائیں جن میں تم نے اپنے دشمنوں کو امان دی تھی، تو ان مشرکین سے جنگ کرو جہاں کہیں وہ تمہیں ملیں، انہیں گھیر لو، ان کے ٹھکانوں کا محاصرہ کرو اور ان کی گزر گاہوں پر نظر رکھو۔ لیکن اگر وہ شرک سے توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، تو وہ تمہارے دینی بھائی بن جاتے ہیں، پھر ان کے خلاف قتال بند کر دو، یقیناً اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرمانے والا اور ان پر رحم کرنے والا ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ: اور اگر ان مشرکین میں سے کوئی شخص، جو شرعی طور پر سزا کا مستحق تھا، آپ سے پناہ طلب کرے تو اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! اسے پناہ دیجئے تاکہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دیجئے، یہ رعایت اس لیے ہے کہ وہ لوگ اس دین کی حقیقتوں سے ناواقف ہیں؛ ممکن ہے کہ قرآن کی تلاوت سن کر انہیں ہدایت نصیب ہو جائے۔

اعلانِ براءت کے بعد: عہد، دشمنی اور توبہ کے اصول

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ {۷} كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ {۸} اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ {۹} لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ {۱۰} فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ {۱۱} وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ {۱۲} التوبہ

جواب ترجمہ: اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک مشرکین کا عہد کیسے رہے گا مگر جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک عہد لیا، سو جب تک یہ لوگ تم سے سیدھی طرح رہیں تم بھی ان سے سیدھی طرح رہو۔ بلاشبہ اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ ان کا عہد کیسے رہے گا اور حال ان کا یہ ہے کہ اگر وہ تم پر غلبہ پاجائیں تو تمہارے بارے میں نہ کسی قرابت کی پاسداری کریں اور نہ کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا خیال کریں۔ یہ لوگ تمہیں اپنے مونہوں سے راضی کرتے ہیں اور ان کے دل انکار کرتے ہیں۔ اور ان میں اکثر فاسق ہیں۔ انہوں نے اللہ کی آیات کا بدلہ تھوڑی قیمت کو خرید لیا، سو انہوں نے اللہ کے راستہ سے روک دیا۔ بلاشبہ وہ جو کام کرتے ہیں برے کام ہیں۔ وہ کسی مومن کے بارے میں کسی قرابت داری کا اور کسی ذمہ داری کا پاس نہیں رکھتے اور یہ وہ لوگ ہیں جو زیادتی کرنے والے ہیں۔ سو اگر یہ لوگ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو یہ تمہارے دینی بھائی ہوں گے، اور ہم تفصیل کے ساتھ احکام بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں۔ اور اگر وہ لوگ اپنے معاہدہ کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین میں طعن کریں تو تم کفر کے

سرغنوں سے جنگ کرو بلاشبہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کے یہاں قسمیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں، تاکہ وہ باز آجائیں۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ: اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول ﷺ کے ہاں مشرکین کے لیے کوئی عمومی عہد وامان معتبر نہیں، سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجدِ حرام کے پاس صلحِ حدیبیہ کے موقع پر معاہدہ کیا تھا۔ پس جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں اور اسے نہ توڑیں، تم بھی وفاداری کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہو، عہد شکنی تمہارا شیوہ نہ ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں سے محبت فرماتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، یعنی اس کے احکام کی پیروی کرتے اور اس کی نافرمانی سے بچتے ہیں اور عہد کی پاسداری بھی اسی تقویٰ کا روشن مظہر ہے۔

كَيْفَ وَإِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً: کیسے ممکن ہے کہ ان کے لیے کوئی پائدار عہد ہو، حالانکہ وہ تمہارے کھلے دشمن ہیں؟ اگر وہ تم پر غالب آجائیں تو نہ تمہارے بارے میں خدا کا لحاظ کریں گے، نہ قرابت کا اور نہ کسی معاہدے کا، بلکہ تمہیں سخت اذیت میں مبتلا کریں گے۔ وہ اپنی زبانوں سے شیریں کلامی کے ذریعے تمہیں راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ان کے دل ان کی زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے، وہ اپنے قول کے سچے نہیں اور ان میں سے اکثر عہد شکنی کے سبب اللہ کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔

اشْتَرَوْا بِآيَاتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِهِ: انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے، جن میں عہد کی وفاداری بھی شامل تھی، دنیا کے حقیر مفاد کو اختیار کر لیا، انہوں نے چند وقتی خواہشات اور نفسانی لذتوں کی خاطر حق کو چھوڑ دیا۔ یوں وہ خود بھی راہِ حق سے بھٹکے اور دوسروں کو بھی اس سے روکنے لگے، حقیقت یہ ہے کہ ان کا طرزِ عمل نہایت برا ہے۔

لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ: وہ کسی مؤمن کے بارے میں نہ اللہ کا لحاظ کرتے ہیں، نہ رشتہ داری کا اور نہ کسی عہد کا، ان کی دشمنی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں، ظلم اور زیادتی ان کی پہچان بن چکی ہے۔

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ: لیکن اگر وہ اپنے کفر سے توبہ کرلیں، کلمۂ شہادت کا اقرار کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ مسلمان ہو جاتے ہیں، پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، ان کے حقوق وہی ہیں جو تمہارے ہیں اور ان پر ذمہ داریاں بھی وہی ہیں جو تم پر ہیں، ایسے لوگوں کے خلاف قتال جائز نہیں، کیونکہ اسلام ان کی جان، مال اور آبرو کو حرمت عطا کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو ان لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں، کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو ان سے خود بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی نفع پہنچاتے ہیں۔

وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ: اور اگر وہ مشرکین، جن سے تم نے ایک معین مدت تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا تھا، اپنے عہد توڑ دیں اور تمہارے دین پر طعن و تشنیع کریں، تو ان سے قتال کرو، یہ کفر کے پیشوا اور اس کے علمبردار ہیں، جب وہ عہد کی حرمت پامال کر دیں تو ان کے لیے کوئی امان باقی نہیں رہتی، ان کے خلاف قتال اس امید پر کیا جائے کہ شاید وہ اپنے کفر، عہد شکنی اور دین کی توہین سے باز آجائیں۔

شانِ نزول: ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت ابوسفیان بن حرب، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو، عکرمہ بن ابی جہل اور ان تمام رؤسا قریش کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے عہد شکنی کی تھی اور رسول اللہ ﷺ کو مکہ سے نکالنے کی جدوجہد کی تھی۔ (اسباب النزول)

دلوں کی شفا اور باطل کی رسوائی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوٓا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ{۱۳}قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ{۱۴}وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَنْ يَّشَآءُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ{۱۵}التوبہ

جواب ترجمہ: کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا اور رسول کو نکالنے کا پختہ ارادہ کیا۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تم سے پہلے خود چھیڑ چھاڑ کی ابتداء کی، کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ سو اللہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ اس سے جنگ کرو اللہ تمہارے ہاتھوں ان کو سزا دے گا اور ان کو ذلیل کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور مسلمانوں کے سینوں کو شفاء دے گا۔ اور ان کے دلوں کی جلن کو دور فرمادے گا۔ اور اللہ جس کو چاہے توبہ نصیب فرمائے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ : اس میں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو خطاب فرمارہے ہیں کہ تم لوگ جہاد پر دین میں طعنہ زن، دشمن کے پشت پناہ سہولت کار مشرکین سے کیوں نہیں لڑتے؟ اور ان مشرکین سے کیوں کر نہیں لڑتے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ سے نکالا اور بدر کے دن لڑائی کی ابتداء بھی انہوں نے کی بعض نے کہا اس سے مراد بنو خزاعہ سے لڑائی کی ابتداء مراد ہے۔ جو آپ ﷺ کے حلفاء تھے تو کیا تم اپنی جانوں کے خطرہ کے پیش نظر ان سے لڑائی نہیں کرتے اللہ تعالیٰ کا زیادہ حق ہے کہ اس سے ڈرا جائے کہ کہیں ترک جہاد پر وہ عذاب نہ بھیج دے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے ڈرنا چاہیے بجائے ان مشرکین کے جو تمہارے ذرہ بھر نفع نقصان کے مالک نہیں اگر تمہیں اس بات کا اقرار ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ڈر ان مشرکین کے خطرہ سے اولیٰ و اعلیٰ ہے۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ : اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں اے مسلمانو! تم ان مشرکین سے لڑو جنہوں نے تمہارے ساتھ کیے معاہدات کو توڑا اور اپنے ہاں سے اللہ تعالیٰ کے رسول کو نکالا، اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے ہاتھوں قتل کرائیں گے اور قید و غلبہ سے ان کو ذلیل کریں گے اور تمہیں ان پر کامیابی اور غلبے سے نوازیں گے۔ اور مومنو کے دلوں کی تکلیف تمہارے ہاتھوں سے ان کو قتل کرا، تمہارے سامنے ذلیل کرکے اور تمہیں ان پر غلبہ دے کر دور فرمائے گا۔ اس داء سے مراد وہ رنج تھا جو ان کی ایذاؤں سے ان کے دلوں میں پایا جاتا تھا، بعض نے کہا کہ

یشف صدور قوم سے مراد بنو خزاعہ ہیں۔ جن کو قریش نے اپنی معاونت کے ساتھ بنو بکر سے قتل کرایا اور حدیبیہ کا عہد توڑا۔ (تفسیر طبری)

وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ : اور اللہ تعالیٰ اس غیظ و غضب کو، جو اس کے مؤمن بندوں کے دلوں میں دشمنانِ حق کے ظلم و ستم کے باعث بھڑک اٹھا تھا، ان پر غلبہ اور نصرت عطا فرما کر ٹھنڈا کر دیتا ہے، یہ فتح صرف ظاہری کامیابی نہیں ہوتی، بلکہ اہلِ ایمان کے مجروح جذبات کے لیے مرہم بھی بن جاتی ہے اور اللہ جسے چاہے ان ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں میں سے توبہ کی توفیق عطا فرما دے، اگر وہ رجوع کر لیں، جیسا کہ فتحِ مکہ کے موقع پر بعض لوگوں کے ساتھ پیش آیا، اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے کہ توبہ کرنے والوں میں کون سچا ہے اور وہ اپنی تخلیق، تدبیر اور شریعت کے ہر فیصلے میں کامل حکمت والا ہے۔

امتحان ایمان اور مساجد الٰہی کی حقیقی اہلیت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۚ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ {١٦} مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ {١٧} التوبه

جواب ترجمہ: کیا تم کو یہ گمان ہے کہ چھوڑ دیئے جاؤ گے اور حالانکہ اللہ نے ابھی تم میں سے ان لوگوں کو ظاہر کیا ہی نہیں، جنہوں نے جہاد کیا اور جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے علاوہ کسی کو دوست نہیں بنایا اور اللہ ان کاموں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ مشرکین اس کے اہل نہیں ہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں اس حال میں کہ وہ اپنے بارے میں کافر ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال اکارت ہو گئے۔ اور وہ دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ: یہاں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ مومنوں کو آزمائش کے بغیر نہیں چھوڑتا، تاکہ سچے اور جھوٹے سب پر ظاہر ہو جائیں۔ چنانچہ فرمایا: أَم حَسِبتُم أن تُترَكُوا، فَلَا تُؤمَرُوا بِالجِهَادِ، وَلَا تَمتَحِنُوا لِيَظهَرَ الصَّادِقُ مِنَ الكَاذِبِ، یعنی "کیا تم نے یہ گمان کر لیا کہ چھوڑ دیے جاؤ گے، نہ جہاد کا حکم آئے گا، نہ آزمائش ہو گی، تاکہ سچا اور جھوٹا ظاہر ہو جائے؟ (مختصر تفسیر بغوی) اسی بات کو آگے یوں بیان کیا: وَلَمَّا يَعلَمِ اللهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا... وَلَم يَتَّخِذُوا مِن دُونِ اللهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا المُؤمِنِينَ وَلِيجَةً

اشکال: بعض لوگوں کے ذہن میں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ وَلَمَّا يَعلَمِ اللهُ کیا اللہ تعالیٰ مجاہدین کو پہلے نہیں جانتا تھا؟

جواب دراصل یہاں يَعلَمُ سے مراد علمِ وقوعی اور علمِ ظاہری ہے، یعنی وہ علم جو کسی عمل کے حقیقت میں ظاہر ہو جانے کے بعد دنیا والوں پر بھی حجت قائم کرتا ہے، مفسرین نے واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم، کامل اور ایسا ہے کہ اس میں کسی طرح کی زیادتی یا کمی نہیں ہوتی، مگر "اللہ کا جاننا" قرآن میں اکثر "اللہ کا معاملہ ظاہر کرنا"، "لوگوں پر حجت قائم کرنا" یا "عمل کو ظاہر میں پیش کر دینا" ہوتا ہے۔

یہاں "يَعلَم" کا معنی یہ ہے کہ اللہ وہ عمل ظاہراً ظاہر کر دے جس پر جزا و سزا قائم ہوتی ہے، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اللہ کو پہلے علم نہیں تھا، اللہ تعالیٰ کے لیے "لمّا یعلم" کا مطلب "اللہ کا علمِ ازلی کا پیدا ہونا" نہیں، بلکہ عمل کا ظہور میں آجانا اور سچوں کا جھوٹوں سے ممتاز ہو جانا ہے۔ مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ ایمان کا دعویٰ صرف زبان سے نہیں، بلکہ جہاد، ثابت قدمی اور اللہ و رسول کے ساتھ خلوص کے ذریعے اس کا ثبوت ظاہر ہوتا ہے۔

وَاللهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ: اللہ تمہارے سب اعمال سے پوری طرح باخبر ہے، اس جملے نے صراحت کے ساتھ یہ بتا دیا کہ اللہ کے علم میں کوئی کمی نہیں، بلکہ آیت میں علم سے مراد ظہورِ عمل ہے، نہ کہ علمِ حقیقی کا حصول۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللّٰهِ شَاهِدِينَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ: مشرکین کو یہ حق نہیں کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، جبکہ وہ خود اپنے کفر کے گواہ ہیں۔ یعنی جب ان کے باطن اور ظاہر میں کفر ہے تو مسجدیں آباد کرنا انہی کا حق ہو گا جو ایمان و عمل کے سچے ہیں۔

مساجد کو آباد کرنے والے

سوال اللہ کے گھر کون لوگ آباد کرتے ہیں؟ اس آیت کی روشنی میں وضاحت فرمایئے۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ {۱۸} التوبة

جواب ترجمہ: اللہ کی مسجدوں کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان لاتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ یہی لوگ امید ہے کہ ہدایت یافتہ لوگوں میں (داخل) ہوں گے۔

یہ آیت اس اصولِ ربانی کو بیان کرتی ہے کہ مساجد کی حقیقی اور معتبر عمارت یعنی ان کی تعمیر، خدمت اور عبادت سے آباد رکھنا صرف اُن ہی لوگوں کا فریضہ ہے جو ایمان و عمل کی سچی صفات رکھتے ہوں۔

طبری کے مطابق، آیت کا مقصود یہ ہے کہ مسجدیں دراصل " وہی شخص آباد کرتا ہے جو اللہ کی وحدانیت کا سچا مصدق ہو، یومِ آخرت پر یقین رکھتا ہو، نماز قائم کرتا ہو، زکوٰۃ ادا کرتا ہو اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتا ہو۔ (جامع البیان فی تفسیر القرآن) اس میں ایمان، عبادت اور خلوصِ نیت کو مسجد کی حقیقی خدمت کے معیار کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

زمخشری نے یَعمُرُ کی تشریح میں مسجد کی عمارت کو محض تعمیر تک محدود نہیں رکھا بلکہ فرمایا کہ اس میں مرمت، صفائی، روشنیاں کرنا، تعظیم کرنا اور عبادت و ذکر کے لیے اس کا معمول بنانا شامل ہے، بلکہ "درسِ علم" کو مسجد کی سب سے بڑی عمارت قرار دیتے ہیں (الکشاف)

"الموسوعۃ القرآنیہ" نے بھی اسی بات کو تقویت دیتے ہوئے کہا کہ مسجد کی عمارت وہ ہے" جو اس کی حفاظت، دیکھ بھال اور صحیح استعمال پر مشتمل ہو، سہیلی رحمہ اللہ کے مطابق یہاں اللہ نے مشرکین کے زعم کو رد کیا ہے، جو سمجھتے تھے کہ ان کا مسجدِ حرام سے ظاہری تعلق انہیں کوئی فضیلت دیتا ہے، فرمایا عمارت وہی معتبر ہے جو حق کے ساتھ ہ "یعنی ایمان اور عبادت کے ساتھ۔ (الروض الانف)

حدیثِ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّجُلَ يَعْتَادُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوا لَهُ بِالْإِيمَانِ جب تم کسی شخص کے مسجد میں آنے جانے کو دیکھو تو اس کے ایمان کی گواہی دو۔ اور اس آیت کو دلیل بنایا (التفسیر النبوی ﷺ)

فَعَسَى أُولَئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ: اور مفسرین کے مطابق اللہ کی طرف سے "عسی" یقین اور وعدۂ قطعی ہے کہ ایسے لوگ واقعی ہدایت یافتہ ہیں۔ (مختصر تفسیر بغوی)

پس آیت ہمیں بتاتی ہے کہ مسجد کی خدمت اور اس کا حق ادا کرنا محض تعمیر یا شکل و صورت نہیں، بلکہ ایمانِ راست، خالص عبادت، تقویٰ اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرنے کی بنیاد پر قائم ہے۔ بندہ راقم الحروف کا اس عنوان پر الگ رسالہ "فضائل مسجد" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

حجاج کو پانی پلانا اور مسجد الحرام کو آباد کرنا

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ {۱۹} التوبہ

جواب ترجمہ: کیا تم نے حج کرنے والوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو اس شخص کے برابر بنا دیا جو اللہ پر ایمان لائے اور آخرت کے دن پر، اور جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اللہ کے نزدیک یہ لوگ برابر نہیں ہیں۔ اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

شانِ نزول: حضرت نعمان بن بشیر انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں منبر رسول ﷺ کے پاس

تھا کہ ایک شخص نے کہا کہ حاجیوں کو پانی پلانے کے بعد مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی اور عمل کروں یا نہ کروں ایک دوسرے شخص نے کہا کہ مسجد حرام کی تعمیر کے بعد مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ کوئی عمل کروں یا نہ کروں اور تیسرے آدمی نے کہا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ان چیزوں سے افضل ہے جن کا تم نے ذکر کیا ہے اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ڈانٹا اور ان سے کہا کہ منبر رسول کے پاس اپنی آوازیں بلند نہ کرو خاص کر جب آج جمعہ بھی ہے لیکن میں نماز ادا کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور آپ ﷺ سے تمہارے مابین اختلافی باتوں کے بارے میں فتوی پوچھا آپ ﷺ نے فتوی دیا اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ (اسباب النزول)

اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: اللہ تعالیٰ سوالیہ انداز میں فرماتے ہیں کہ کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجدِ حرام کی خدمت کو ایمان اور جہاد کے برابر قرار دے دیا؟ اس سے واضح ہوا کہ مشرکین کی سقایہ و عمارۃ قابلِ فخر نہیں، کیونکہ وہ ایمان سے خالی ہیں۔ اصل فضیلت وہ ہے جو ایمان، اخلاص اور جہاد کے ساتھ ہو۔

امام طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کی تردید ہے جو سقایہ وسدانہ پر فخر کرتے تھے اور اللہ نے بتا دیا کہ اصل فضیلت ایمان و جہاد ہے (جامع البیان) امام رازی رحمہ اللہ کے مطابق مشرکین اور بعض اہلِ عرب کا خیال تھا کہ یہ خدمات انہیں اللہ کے نزدیک افضل بناتی ہیں، تو اللہ نے اعلان کیا کہ یہ اعمال ایمان کے بغیر بے فائدہ ہیں (مفاتیح الغیب)

الفاظ کا لغوی و نحوی تجزیہ: سِقَایَةَ الحاجّ سے مراد حاجیوں کو پانی پلانا ہے، جسے قریش کی مخصوص ذمّہ داری سمجھا جاتا تھا۔ **عِمَارَةَ المَسجِدِ الحَرَامِ** سے مراد اس کی دیکھ بھال، حفاظت اور انتظام ہے۔

مشرکین کے اعمال کیوں ناقص قرار دیے گئے؟ مفسرین کے مطابق چونکہ یہ اعمال شرک کے ساتھ ہو رہے تھے، اس لیے ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ قاسمی لکھتے ہیں کہ اللہ نے واضح کیا کہ ان کی سقایہ و عمارۃ شرک کے ساتھ بے سود ہیں، اور وہ "ظالم" ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر شرک کا ظلم کیا۔ (محاسن التاویل)

لَا يَسْتَوُوْنَ عِنْدَ اللّٰهِ: یعنی ایمان و جہاد کرنے والے اللہ کے ہاں بلند درجات رکھتے ہیں، جبکہ محض خاندانی خدمت یا رسمیں کوئی مقام نہیں رکھتیں۔ سیواسی لکھتے ہیں: لَا يَسْتَوُوْنَ فِي الثَّوابِ عِنْدَ اللّٰهِ، إِذْ لَا ثَوابَ مَعَ الكفر۔ (عیون التفاسیر)

آیت اعلان کرتی ہے کہ: ایمان، عمل، جہاد یہ سب سے اعلیٰ درجہ ہے اور مشرکین کی خدمت بے وزن ہے۔ اللہ کے نزدیک فضیلت کا معیار "ایمان" ہے، نہ نسب، قوم، خاندان یا روایتی خدمت۔ چنانچہ جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، جہاد کیا، وہی اللہ کے نزدیک بلند اور کامیاب ہیں۔

اہل ایمان مہاجرین اور مجاہدین اسلام کو بشارت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ {۲۰} يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ {۲۱} خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ {۲۲} التوبه

جواب ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا یہ لوگ اللہ کے نزدیک درجے کے اعتبار سے بڑے ہیں، اور یہ لوگ کامیاب ہیں۔ ان کا رب اپنی طرف سے انہیں رحمت کی اور رضامندی اور ایسے باغوں کی بشارت دیتا ہے جن میں ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہیں۔ یہ لوگ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مفتخرین کے مابین فیصلہ ہے جو باہمی سقایہ، سدانہ اور ایمان باللہ میں مقابلہ کر رہے تھے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے توحید کو مشرکین کے مقابلہ میں سچا جانا اور اپنے قومی گھروں کو چھوڑا اور اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر مشرکین سے جہاد کیا، جو جان و مال کے ساتھ تھا وہ اس کے یوں بلند مرتبہ والے ہیں ان لوگوں کے مقابلہ میں جو حجاج کے ساقی اور مسجد حرام کے عمار ہیں اس لیے کہ یہ آخر الذکر مشرک

ہیں اور اہل الذکر مومن، مہاجر، مجاہد ہیں وہ جنت پانے والے اور آگ سے نجات حاصل کرنے والے ہیں۔ (جامع البیان)

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ : اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ان مومن، مہاجر، مجاہد لوگوں کو اس پر خوش ہونا چاہیے کہ ان کے رب نے ان عذاب کی بجائے ان پر رحم فرمادیا اور ان کی طاعت اور جس چیز کا ان کو مکلف بنایا اس پر خوش ہو گیا اور اسے قبول کر لیا ان کو ایسے باغات میں رکھا جائے جہاں ثبات دوام والی نعمتیں ہوں گی جن کو زوال و ہلاکت نہیں۔ (جامع البیان)

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ : اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں وہ ان باغات میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے اس کی کوئی نہایت وحد نہیں۔ بلاشبہ ان باوصف مومنین کے لیے ان کی طاعت کرنے اور اعمال مکلفہ کے بجالانے پر بہت بڑا اجر ملے گا وہ وہی نعمتیں ہیں جن کے دینے کا آخرت میں اس سے وعدہ فرمارکھا ہے۔

اللہ اور رسول اللہ ﷺ سب سے مقدم

سوال یہ آیات کریمات کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئیں؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاۗءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاۗءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ {۲۳} قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ {۲۴} التوبۃ.

جواب ترجمہ: اے اہل ایمان! اگر تمہارے (ماں) باپ اور (بہن، بھائی) ایمان کے مقابلے کفر کو پسند کریں تو ان سے دوستی نہ رکھو اور جو ان سے دوستی رکھیں گے وہ ظالم ہیں۔ کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے بند

ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جن کو پسند کرتے ہو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ عزیز ہوں تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (یعنی عذاب) بھیجے۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

شان نزول: کلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ کو مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا گیا تو ایک آدمی نے اپنے والد، بھائی اور اپنی بیوی کو یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہمیں ہجرت کا حکم دیا گیا ہے تو ان میں سے بعض ہجرت کی طرف جلدی کرتے ہیں اور اسے بہت پسند کرتے اور بعض کی بیوی، اہل وعیال اور بچے اس کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں اور کہتے کہ ہم تجھے اللہ کی قسم دیتے ہیں کہ اس طرح لاچار نہ چھوڑنا کہ ہم ہلاک ہو جائیں تو اس شخص کا دل نرم پڑ جاتا اور ہجرت کو چھوڑ دیتا ان لوگوں کو عتاب کے طور پر یہ آیت نازل ہوئی۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاۗءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ (زادالمسیر) یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے مکہ سے محض اپنی آل واولاد کی خاطر اور محض تجارت کی خاطر ہجرت نہیں کی۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو خبردار کر رہے ہیں جو اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو سچا جانتے اور مانتے ہیں شریعت کے احکامات پر عمل کرتے ہیں، کہ تم لوگ اپنے قریبی رشتہ داروں کو، اپنے والدین کو، اپنے بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں کو اس طرح دوست نہ بناؤ کہ وہ حالت کفر پر ہوں، دین دشمن ہوں اور تم مسلمانوں کے راز ان تک پہنچاتے پھرو، اپنے معاملات میں ان سے مشورے لیتے پھرو، جو انہیں اپنا دوست بنائے گا ان کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھائے گا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب کرے گا، اپنی جان پر بہت بڑا ظلم کرے گا، اس لیے نبی پاک ﷺ کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ اہل ایمان کو اس ساری صورت حال سے مطلع کر دیں کہ اگر تم اپنے والدین، اپنی اولاد، اپنے بھائیوں، اپنی بیویوں، اپنے باقی رشتہ داروں، اپنے ذخیرہ کیے ہوئے مالوں اور تجارت کو ترجیح دو گے اور یہ خیال کرو گے کہ یہ سب ختم ہو جائیں گے، جن شاندار گھروں میں تم رہائش پذیر ہو اگر تم انہیں اللہ، رسول اللہ اور اللہ کی راہ میں جہاد پر ترجیح دو گے تو پھر عبرت ناک عذاب کا انتظار کرو۔

غزوۂ حنین

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے، غزوہ حنین کا تذکرہ کیجیے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ {۲۵} ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ {۲۶} ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۲۷} التوبہ

جواب ترجمہ: یہ واقعی بات ہے کہ اللہ نے بہت سے مواقع میں تمہاری مدد فرمائی۔ اور حنین کے دن بھی، جب تمہیں اپنی کثرت پہ گھمنڈ ہو گیا۔ پھر اس کثرت نے تمہیں کچھ بھی فائدہ نہ دیا۔ اور زمین اپنی فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی۔ پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنین پر اطمینان قلبی نازل فرمایا اور ایسے لشکر اتار دیئے جنہیں تم نہیں دیکھ رہے تھے، اور اللہ نے کافروں کو عذاب دیا اور یہ سزا ہے کافروں کی۔ پھر اس کے بعد اللہ جس کی چاہے توبہ قبول فرمائے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ : اے اہلِ ایمان! اللہ تعالیٰ نے تمہیں متعدد مواقع پر مشرکین کے مقابلے میں نصرت عطا فرمائی، حالانکہ تم تعداد میں کم اور ساز و سامان میں کمزور تھے، اس وقت تمہارا سہارا اللہ پر توکل اور اسبابِ مشروعہ کا اختیار کرنا تھا، نہ کہ اپنی کثرتِ تعداد پر ناز کرنا، پس تمہاری کامیابی کا سبب تمہاری کثرت نہ تھی، بلکہ اعتماد علی اللہ تھا۔

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا: لیکن حنین کے دن جب تم اپنی کثرت پر فخر کرنے لگے اور تم میں سے بعض نے کہا کہ آج ہم قلت کے باعث مغلوب نہ ہوں گے، تو یہی خود اعتمادی تمہارے لیے آزمائش بن گئی، تمہاری وہ کثرت جس پر تمہیں گھمنڈ تھا، تمہارے کسی

کام نہ آئی، دشمن غالب آگیا، زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر میدان سے منتشر ہوگئے۔

ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ: پھر جب تم پر گھبراہٹ اور پسپائی کی کیفیت طاری ہوگئی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر سکینت نازل فرمائی اور اسی اطمینان کو اہلِ ایمان کے دلوں میں بھی اتارا، چنانچہ وہ سنبھل گئے، ثابت قدم ہوئے اور دوبارہ میدانِ قتال میں ڈٹ گئے، اللہ تعالیٰ نے ایسے فرشتے بھی نازل فرمائے جنہیں تم دیکھ نہ سکے اور کافروں کو قتل، اسیری، مال کی ضبطی اور اولاد کی گرفتاری کے ذریعے عذاب میں مبتلا کیا، یہی وہ سزا ہے جو ان منکرین کو دی گئی جنہوں نے اپنے رسول کی تکذیب کی اور اس کے لائے ہوئے پیغام سے منہ موڑا۔

ثُمَّ يَتُوبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلَى مَنْ يَّشَاءُ: اس کے باوجود رحمتِ الٰہی کا دروازہ بند نہیں ہوا، جو لوگ اس آزمائش اور سزا کے بعد اپنے کفر اور گمراہی سے توبہ کر کے لوٹ آئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی، بے شک اللہ اپنے بندوں میں سے توبہ کرنے والوں کے لیے بڑا بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے، وہ کفر اور معصیت کے بعد بھی رجوع کرنے والوں کو اپنی رحمت سے محروم نہیں کرتا۔

ان آیات میں ایک گہرا سبق مضمر ہے: نصرت کا مدار ظاہری قوت پر نہیں بلکہ توکل اور اطاعت پر ہے، اور شکست کے بعد بھی اگر رجوعِ الی اللہ ہو تو رحمت کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔

جنگ حنین: حنین، مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے، جو مکہ مکرمہ سے دس میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر واقع ہے، رمضان ۸ ہجری میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور قریش مکہ نے رسول کریم ﷺ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، تو عرب کا ایک بہت بڑا مشہور بہادر جنگجو اور مالدار قبیلہ ہوازن جس کی ایک شاخ طائف کے رہنے والے بنو ثقیف بھی تھے، ان میں ہلچل مچ گئی، انہوں نے جمع ہو کر یہ کہنا شروع کیا کہ مکہ فتح ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو کافی قوت حاصل ہوگئی ہے، اس سے فارغ ہونے کے بعد لازمی ہے کہ ان کا رخ ہماری طرف ہوگا، اس لئے دانشمندی کی بات یہ ہے کہ ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہم خود ان پر حملہ کر دیں، اس کام کے لئے قبیلہ ہوازن نے اپنی سب

شاخوں کو جو مکہ سے طائف تک پھیلی ہوئی تھیں جمع کرلیا، اس قبیلہ کے سب بڑے چھوٹے بجز معدودے چند افراد کے جن کی تعداسو(۱۰۰) سے بھی کم تھی، سب ہی جمع ہوگئے۔

اس تحریک کے لیڈر مالک بن عوف تھے جو بعد میں مسلمان ہوگئے اور اسلام کے بڑے علمبر دار ثابت ہوئے، ان کی رائے سے اتفاق کر کے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، اس قبیلہ کی چھوٹی چھوٹی دو شاخیں بنو کعب اور بنو کلاب اس رائے سے متفق نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کو کچھ بصیرت دے دی تھی، انہوں نے کہا کہ اگر مشرق سے مغرب تک ساری دنیا بھی محمد ﷺ کے خلاف جمع ہو جائے گی تو وہ ان سب پر بھی غالب آئیں گے، ہم خدائی طاقت کے ساتھ جنگ نہیں کرسکتے، باقی سب کے سب نے معاہدے کئے اور مالک بن عوف نے ان سب کو پوری قوت سے جنگ پر قائم رہنے کی ایک تدبیر یہ کی کہ ہر شخص کے تمام اہل وعیال بھی ساتھ چلیں اور اپنا اپنا پورا مال بھی ساتھ لے کر نکلیں، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ میدان سے بھاگنے لگیں تو بیوی بچوں اور مال کی محبت ان کے پاؤں کی زنجیر بن جائے، میدان سے گریز کا ان کے لئے کوئی موقع نہ رہے۔

ان کی تعداد کے بارے میں اہل تاریخ کے مختلف اقوال ہیں۔ حافظ حدیث علامہ ابن حجر وغیرہ نے راجح اس کو قرار دیا ہے کہ چوبیس یا اٹھائیس ہزار کا مجمع تھا اور بعض حضرات نے چار ہزار کی تعداد بیان کی ہے، یہ ممکن ہے کہ سب اہل وعیال عورتوں بچوں سمیت تعداد چوبیس یا اٹھائیس ہزار ہو اور لڑنے والے جوان ان میں چار ہزار ہوں۔

بہر حال رسول کریم ﷺ کو مکہ مکرمہ میں ان کے خطرناک عزائم کی اطلاع ملی تو آپ نے ان کے مقابلہ پر جانے کا عزم فرمالیا، مکہ مکرمہ پر حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ لوگوں کو اسلامی تعلیمات سکھانے کے لئے چھوڑا اور قریش مکہ سے اسلحہ اور سامان جنگ عاریت کے طور پر مانگا، صفوان بن امیہ جو قریش کا سردار تھا بول اٹھا کہ کیا آپ یہ سامان جنگ ہم سے غصب کر کے لینا چاہتے ہیں، رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ عاریت کے طور پر

لیتے ہیں، جس کی واپسی ہمارے ذمہ ہو گی، یہ سن کر اس نے سو زرہیں مستعار دیں اور نوفل بن حارث نے تین ہزار نیزے اسی طرح پیش کر دیئے۔

امام زہری رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چودہ ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم کا لشکر لے کر اس جہاد کی طرف متوجہ ہوئے جن میں بارہ ہزار انصار مدینہ تھے، جو فتح مکہ کے لئے آپ کے ساتھ آئے تھے اور دو ہزار وہ مسلمان تھے جو مکہ اور اطراف مکہ کے لوگوں میں سے بوقت فتح مسلمان ہو گئے تھے جن کو طلقاء کہا جاتا ہے، شوال کی چھٹی تاریخ ہفتہ کے دن آپ اس غزوہ کے لئے نکلے اور فرمایا کہ کل انشاء اللہ ہمارا قیام خیف بنی کنانہ کے اس مقام پر ہو گا جہاں جمع ہو کر قریش مکہ نے مسلمانوں کے خلاف مقاطعہ کے لئے عہد نامہ لکھا تھا۔

یہ چودہ ہزار مجاہدین کا لشکر تو جہاد کے لئے نکلا ان کے ساتھ مکہ کے بیشمار لوگ مرد و عورت تماشائی بن کر نکلے، جن کے دلوں میں عموماً یہ تھا کہ اگر اس موقع پر مسلمانوں کو شکست ہو تو ہمیں بھی اپنا انتقام لینے کا موقع ملے گا اور یہ کامیاب ہوں تو بھی ہمارا کوئی نقصان نہیں۔ (معارف القرآن)

مقام حنین پر پہنچ کر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا تو حضرت سہیل بن حنظلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ خبر لے کر حاضر ہوئے کہ گھوڑا سوار آدمی ابھی دشمن کی طرف سے آیا ہے وہ بتلا رہا ہے کہ قبیلہ ہوازن پورا کا پورا مع اپنے سب سامان کے مقابلہ پر آگیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر تبسم فرمایا اور کہا کہ پروا نہ کر یہ سارا سامان مسلمانوں کے لئے مال غنیمت بن کر ہاتھ آئے گا۔

اس جگہ ٹھہر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن حداد کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ دشمن کے حالات کا پتہ چلائیں، وہ ان کی قوم میں جا کر دو دن رہے، سب حالات دیکھتے سنتے رہے، ان کے لیڈر اور کمانڈر مالک بن عوف کو دیکھا کہ وہ اپنے لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ محمد کو اب تک کسی بہادر تجربہ کار قوم سے سابقہ نہیں پڑا، مکہ کے بھولے بھالے قریشیوں کا مقابلہ کر کے انہیں اپنی طاقت کا زعم ہو گیا، اب ان کو پتہ لگے گا، تم سب لوگ صبح ہوتے ہی اس طرح صف بندی کرو کہ ہر ایک کے پیچھے اس کے

بیوی بچے اور مال ہو اور اپنی تلواروں کی میانوں کو توڑ ڈالو اور سب مل کر یکبارگی ہلہ بولو، یہ لوگ جنگ کے بڑے تجربہ کار تھے، اپنی فوج کے چند دستوں کو مختلف گھاٹیوں میں چھپا دیا تھا۔

اس طرح کفار کے لشکر کی یہ تیاریاں تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کا یہ پہلا جہاد تھا، جس میں چودہ ہزار سپاہی مقابلہ کے لئے نکلے تھے اور سامان جنگ بھی ہمیشہ سے زیادہ تھا اور یہ لوگ بدر و احد کے میدانوں میں یہ دیکھ چکے تھے کہ صرف تین سو تیرہ بے سامان لوگوں نے ایک ہزار کے لشکر جرار پر فتح پائی، تو آج اپنی کثرت اور تیاری پر نظر کر کے حاکم اور بزار کی روایت کے مطابق ان میں سے بعض کی زبان سے ایسے کلمات نکل گئے کہ آج تو یہ ممکن نہیں کہ ہم کسی سے مغلوب ہو جائیں آج تو مقابلہ کی دیر ہے کہ دشمن فوراً بھاگے گا۔

مالک الملک و الملکوت کو یہی چیز ناپسند تھی کہ اپنی طاقت پر کوئی بھروسہ کیا جائے، چنانچہ مسلمانوں کو اس کا سبق اس طرح ملا کہ جب قبیلہ ہوازن نے قرارداد کے مطابق یکبارگی ہلہ بولا اور گھاٹیوں میں چھپے ہوئے دستوں نے چار طرف سے گھیر اڈال دیا، گرد و غبار نے دن کو رات بنا دیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنے لگے، صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر سوار پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ رہے تھے اور بہت تھوڑے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کی تعداد تین سو اور بعض نے ایک سو یا اس سے بھی کم بتلائی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمے رہے، وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ آپ آگے نہ بڑھیں۔

یہ حالت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ بلند آواز سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پکارو کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے شجرہ کے نیچے جہاد کی بیعت کی تھی اور سورہ بقرہ والے حضرات کہاں ہیں اور وہ انصار رضی اللہ عنہم کہاں ہیں جنہوں نے جان کی بازی لگانے کا عہد کیا تھا، سب کو چاہیے کہ واپس آئیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ہیں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی آواز بجلی کی طرح دوڑ گئی اور یکایک سب بھاگنے والوں کو پشیمانی ہوئی اور بڑی دلیری کے ساتھ لوٹ کر دشمن کا پورا مقابلہ کیا، اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی مدد بھیج

دی، ان کا کمانڈر مالک بن عوف اپنے اہل وعیال اور سب مال کو چھوڑ کر بھاگا اور طائف کے قلعہ میں جا چھپا اور پھر باقی پوری قوم بھاگ کھڑی ہوئی، ان کے ستر سردار مارے گئے، بعض مسلمانوں کے ہاتھ سے کچھ بچے زخمی ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ نے سختی سے منع فرمایا، ان کا سب مال مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، چھ ہزار جنگی قیدی چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں چار ہزار اوقیہ چاندی ہاتھ آئی۔ (معارف القرآن)

اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ کی ان آیات میں اسی منظر کی طرف اشارہ فرمایا ہے، بلکہ حنین کا نام تک ذکر فرمادیا ہے۔

مشرک کا حدود حرم میں داخلہ ممنوع

سوال اس آیت مبارکہ میں بَعْدَ عَامِهِمْ سے کیا مراد ہے؟

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ {٢٨} التوبة.

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! مشرک تو پلید ہیں سو اس برس کے بعد مسجد حرام کے نزدیک نہ آنے پائیں اور اگر تم تنگدستی سے ڈرتے ہو تو آئندہ اگر اللہ چاہے تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا بیشک اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

جب رب تعالیٰ نے مشرکین کی قوت کو توڑ کر مکہ مکرمہ پر مسلمانوں کی فتح کے جھنڈے لہروائے تو اس کے بعد عرب لوگ بہت زیادہ تعداد میں مسلمان ہوئے، دائرۂ اسلام وسیع ہوا، جب مسلمانوں کو اس قدر مضبوطی حاصل ہوئی تو سنہ ۹ ہجری میں کھل کر یہ اعلان کیا گیا کہ آئندہ کوئی مشرک یا کافر مسجد الحرام میں داخل نہ ہو، مسجد الحرام تو بہت ہی عظمت والی مسجد ہے ان پر پابندی عائد کر دی گئی کہ یہ ناپاک لوگ حرم شریف کی حدود میں بھی داخل نہیں ہوسکتے، اس لیے کہ ان کے دل شرک وکفر کی

گندگی سے اس قدر گندے اور ناپاک ہو چکے ہیں کہ اس مقدس مرکز توحید اور تجلیات ربانی کے نزول کے مقام پر قدم رکھنے کے لائق بھی یہ نہیں ہیں۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے مشرکوں، یہودیوں اور نصرانیوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دینے کا حکم جاری فرمادیا تھا، کسی مصلحت کے تحت فوری طور پر تو ان لوگوں کا یہاں سے انخلاء نہیں ہو سکا، مگر مراد پیغمبر حضرت عمر کے دور خلافت میں آپ ﷺ کی وصیت کے مطابق انہیں جزیرۃ العرب سے باہر نکال دیا گیا تھا۔

شرعی حکم اب بھی مشرکوں اور یہود و نصاریٰ کے خلاف مسلمانوں کو اسی بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ ان کو اس پاک سرزمین پر قدم نہ جمانے دیں، بزور قوت وطاقت اگر یہ لوگ اس سرزمین پر اپنے پنجے گاڑ دیں تو مسلمان کسی صورت انہیں برداشت نہ کریں کہ یہ لوگ یہاں ڈیرے لگائیں، احناف کے نزدیک کوئی بھی کافر مسافرانہ طور پر، عارضی طور پر حکومت کی اجازت سے وہاں جا سکتا ہے، بشرطیکہ حکومت اس قدر اجازت دینے کو مصلحت کے خلاف نہ سمجھے، ہاں ازروئے حدیث شریف کسی کافر کو حج وعمرہ کی غرض سے حدود حرم میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اَلَا لَا یَحُجَّنَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ، خبردار! اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا۔

امام لغت علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ نجس میں وہ نجاست بھی داخل ہے جو آنکھ ناک یا ہاتھ وغیرہ سے محسوس ہو اور وہ بھی جو علم و عقل کے ذریعہ معلوم ہو، اس لئے لفظ نجس اس غلاظت اور گندگی کو بھی شامل ہے جو ظاہری طور پر سب محسوس کرتے ہیں اور اس معنوی نجاست کو بھی جس کی بنا پر شرعاً وضو یا غسل واجب ہوتا ہے، جیسے جنابت یا حیض و نفاس کے ختم ہونے کے بعد کی حالت، اور وہ باطنی نجاست بھی جس کا تعلق انسان کے قلب سے ہے جیسے عقائد فاسدہ اور اخلاق رذیلہ۔

بَعْدَ عَامِهِمْ: اس سال کے بعد مشرکین کا داخلہ حدود حرم میں ممنوع ہے، اس سال سے مراد کونسا

سال ہے بعض حضرات نے فرمایا کہ ۱۰ ہجری مراد ہے، مگر جمہور مفسرین کے نزدیک ۹ ہجری راجح ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اعلان برأت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ذریعہ موسم حج میں اسی ۹ ھ میں کرایا ہے، اس لئے ۹ ھ سے ۱۰ ھ تک مہلت کا سال ہے، ۱۰ ہجری کے بعد یہ قانون نافذ ہوا۔

حکم قتال کب اور کیوں؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ {۲۹} التوبه

جواب ترجمہ: ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ نے اور ان کے رسول نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے اور دین حق کو قبول نہیں کرتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں کتاب دی گئی، ان سے یہاں تک جنگ کرو کہ وہ ماتحت ہو کر ذلت کی حالت میں اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔

جب مشرکین کا قصہ پاک ہو گیا اور ملکی سطح ذرا ہموار ہوئی تو حکم ہوا کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی قوت و شوکت کو توڑو، مشرکین کے وجود سے تو بالکل عرب کو پاک کر دینا مقصود تھا لیکن یہود و نصاریٰ کے متعلق اس وقت صرف اسی قدر مطمح نظر تھا کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں زور نہ پکڑیں اور اس کی اشاعت و ترقی کے راستہ میں حائل نہ ہوں، اس لیے اجازت دی گئی کہ اگر یہ لوگ ماتحت رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں تو کچھ مضائقہ نہیں، قبول کر لو، پھر حکومت اسلامیہ ان کے جان و مال کی محافظ ہو گی، ورنہ ان کا اعلان بھی وہی ہے جو مشرکین کا تھا (یعنی مجاہدانہ قتال) کیونکہ یہ بھی اللہ اور یوم آخرت پر جیسا چاہیے ایمان نہیں رکھتے نہ خدا اور رسول کے احکام کی کچھ پروا کرتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ کی تو کجا، اپنے تسلیم کردہ نبی حضرت مسیح علیہ السلام کی سچی پیروی نہیں کرتے، محض اہوا، و آراء کا اتباع کرتے ہیں، جو سچا دین پہلے آیا یعنی حضرت مسیح وغیرہ کے زمانہ میں اور جواب نبی آخر الزماں ﷺ لے کر آئے، کسی کے قائل نہیں، بلکہ جیسا کہ عنقریب آتا ہے، اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ خدا کا روشن کیا ہوا چراغ اپنی پھونکوں سے گل کر دیں، ایسے بد باطن نالائقوں کو اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو ملک میں فتنہ و فساد اور کفر و تمرد کے شعلے برابر بھڑکتے رہیں گے۔ (عثمانی) کئی مفسرین کے مطابق یہ حکم غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوا۔

اہل کتاب سے قتال کی وجوہات: اہل کتاب کا اللہ اور آخرت پر ایمان نہ لانا، باوجود یکہ وہ بظاہر اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے تھے، حقیقت میں ان کا عقیدہ درست نہیں تھا۔ ان کا عقیدہ تحریف شدہ تھا، اس لیے قرآن نے اسے ایمان قرار نہ دیا۔ یہ لوگ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے حرام کردہ کو حرام نہیں کہتے تھے، یعنی دینِ الٰہی کے حدود و اوامر کو صحیح طور پر نہیں مانتے۔ یہ لوگ دین حق کے تابع نہیں تھے، دین حق وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل فرمایا، یعنی وہ شریعتِ الٰہی کے حکم کے سامنے جھکنے کو تیار نہ تھے۔ اللہ کی اطاعت اور اس کی شریعت کی فرماں برداری ان میں نہیں تھی، یہاں جو ان کے ساتھ قتال کا حکم دیا گیا ہے اس کا مقصد تنگی یا غیر ضروری جنگ نہیں ہے، جب وہ اسلام قبول کر لیں یا جزیہ دینا منظور کر لیں تو پھر لڑائی نہیں ہو گی، جزیہ دے کر وہ مسلمانوں کے ساتھ امن معاہدے کے تحت رہیں گے۔

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ: یہ جزیہ کیا ہے؟ مراغی کہتے ہیں افراد پر لگایا جانے والا ٹیک ہے، زمین پر نہیں ہے، **عن ید:** "ید" کے معنی طاقت اور قدرت کے ہیں، یعنی جزیہ اپنی طاقت واستطاعت سے دیا جائے۔

وَهُمْ صَاغِرُوْنَ: یعنی وہ اسلامی ریاست کے قانون اور نظم کے تابع ہوں، یہ "تحقیر" نہیں بلکہ قانونی تابع داری کا بیان ہے، ہمارے استاذ نے تفسیر کے درس کے دوران فرمایا تھا کہ وہ اس طرح جزیہ دیں کہ ہاتھ کی ہتھیلی پر وہ جزیہ رکھیں گے اور مسلمان اوپر سے ہاتھ لا کر ان کی ہتھیلی سے جزیہ وصول کرے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ حکم کن پر لاگو ہوتا ہے؟ یہ ان پر لاگو ہوگا جو دین حق کو دین حق نہیں مانتے، جو اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں مانیں گے، یعنی جنہوں نے دشمنی، عناد یا ظلم کی راہ اختیار کی، اسی لیے رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین ہمیشہ حکم دیتے کہ: لَا يُقَاتَلُ إِلَّا مَن يُّقَاتِلُهُم... وَيُتْرَكُوا مَن لَّا يَتَعَرَّضُ لَهُم یعنی جو نہ لڑے، اس سے لڑائی نہ کی جائے۔

یہود و نصاریٰ کے عقائد باطلہ

سوال ان آیات کی روشنی میں یہود و نصاریٰ کے عقائد باطلہ پر روشنی ڈالیے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ {۳۰} اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ {۳۱} يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ {۳۲} التوبہ

جواب ترجمہ: اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی باتیں ہیں جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہیں۔ یہ ان لوگوں کی طرح باتیں کرتے ہیں جنہوں نے ان سے پہلے کفر اختیار کیا۔ اللہ انہیں غارت کرے۔ کدھر الٹے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں کو اور درویشوں کو رب بنالیا اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ اور حالانکہ ان کو یہی حکم ہوا تھا کہ صرف ایک معبود کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اس چیز سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں سے بجھا دیں۔ حالانکہ اللہ کو اس کے علاوہ کوئی بات منظور نہیں کہ وہ اپنے نور کو پورا کرے۔ اگرچہ کافروں کو ناگوار ہو۔

تفسیر ابن کثیر میں یہودیوں کی طرف سے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دینے کا پس منظر بیان کیا گیا ہے کہ یہود عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بتاتے ہیں، اللہ اس سے پاک اور برتر و بلند ہے کہ اس کی اولاد

ہو، ان لوگوں کو حضرت عزیر علیہ السلام کی نسبت جو یہ وہم ہوا اس کا قصہ یہ ہے کہ جب عمالقہ بنی اسرائیل پر غالب آ گئے ان کے علماء کو قتل کر دیا ان کے رئیسوں کو قید کر لیا، عزیر علیہ السلام باقی رہ گئے، بنی اسرائیل کا علم اٹھ جانے اور علماء کے قتل ہو جانے سے اور بنی اسرائیل کی تباہی کی وجہ سے حضرت عزیر سخت رنجیدہ ہوئے اب جو رونا شروع کیا تو آنکھوں سے آنسو نہ تھمتے تھے، روتے روتے پلکیں بھی جھڑ گئیں ایک دن اسی طرح روتے ہوئے ایک میدان سے گذر ہوا دیکھا کہ ایک عورت ایک قبر کے پاس بیٹھی رو رہی ہے اور کہہ رہی ہے ہائے اب میرے کھانے کا کیا ہو گا، میرے کپڑوں کا کیا ہو گا؟ آپ اس کے پاس ٹھہر گئے اور اس سے فرمایا اس شخص سے پہلے تجھے کون کھلاتا تھا اور کون پہناتا تھا؟ اس نے کہا اللہ تعالیٰ۔

آپ نے فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ تو اب بھی زندہ باقی ہے اس پر تو کبھی موت نہیں آئے گی۔ عورت نے کہا اے عزیر! پھر تو یہ تو بتا کہ بنی اسرائیل سے پہلے علماء کو کون علم سکھاتا تھا؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ۔ عورت نے کہا: پھر آپ کس لیے اس قدر رو رہے ہیں؟

اس عورت کی یہ گفتگو سن کر حضرت عزیر علیہ السلام کو بات سمجھ میں آ گئی کہ اس عورت کی گفتگو میں میرے لیے کوئی نصیحت اور تنبیہ کی گئی ہے۔

پھر آپ سے فرمایا گیا کہ فلاں نہر پر جا کر غسل کرو وہیں دو رکعت نماز ادا کرو وہاں تمہیں ایک شخص ملیں گے وہ جو کچھ کھلائیں وہ کھا لینا، چنانچہ آپ وہیں تشریف لے گئے نہا کر نماز ادا کی دیکھا کہ ایک بوڑھے شخص ہیں جو انہیں کہہ رہے ہیں منہ کھولو آپ نے منہ کھول دیا انہوں نے تین مرتبہ انگارے جتنی بڑی چیز عزیر علیہ السلام کے منہ میں ڈالی، اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ایسا کرم فرمایا، عزیر علیہ السلام کا سینہ اللہ نے کھول دیا، جب آپ یہاں سے واپس لوٹے تو تورات شریف کے سب سے بڑے عالم بن چکے تھے۔

بنی اسرائیل میں گئے ان سے فرمایا کہ میں تمہارے پاس تورات لایا ہوں انہوں نے کہا، عزیر آپ تو بہت ہی سچے انسان تھے، چنانچہ آپ نے اپنی انگلی کے ساتھ قلم کو باندھ لیا اور اسی انگلی سے اسی

وقت پوری توراۃ لکھ ڈالی، ادھر لوگ لڑائی سے لوٹے ان میں ان کے علماء بھی واپس آئے تو انہیں عزیر علیہ السلام کی اس بات کا علم ہوا، یہ گئے اور پہاڑوں اور غاروں میں تورات شریف کے جو نسخے چھپا آئے تھے وہ نکال لائے اور ان نسخوں سے حضرت عزیر علیہ السلام کے لکھے ہوئے نسخے کو ملا کر دیکھا تو بالکل صحیح پایا اس پر بعض جاہلوں کے دل میں شیطان نے یہ وسوسہ ڈال دیا کہ آپ اللہ کے بیٹے ہیں۔ (ابن کثیر)

یہودیوں میں فنحاص بن عازوراء نام کا ایک شخص تھا جس نے حضرت عزیر علیہ السلام کے لیے بیٹا ہونے کی بات سب سے پہلے کی تھی، تفسیر کبیر میں یہودیوں کے دو تین اور اشخاص کے نام بھی لکھے ہوئے ہیں، اس لیے قرآن نے یہاں کسی ایک فرد کی بجائے پوری جماعت کا ذکر کر دیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے عجیب و غریب معجزات کی وجہ سے نصاریٰ نے ابن اللہ کہا، ایک تو حضرت عیسیٰ بغیر والد کے دنیا میں تشریف لائے، پھر وہ مردوں کو اللہ کے اذن سے زندہ کر دیتے تھے، کوڑھ کی بیماری والے کو ٹھیک کر دیتے تھے، مادر زاد اندھوں کو بینا کر دیتے تھے، اس بناء پر نصاریٰ انہیں کہتے تھے کہ یہ تو اللہ کے بیٹے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں یہودیوں کے اس دعوائے بے دلیل کو رد کیا، نصاریٰ کے دعوائے بے دلیل کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے مونہوں سے نکلنے والی یہ باتیں وہ ہیں جو پہلے کافر کہا کرتے تھے، ان کی طرح یہ بھی اس طرح کی باتیں اپنے مونہوں سے نکالتے ہیں، اللہ ان کا بیڑہ غرق کرے یہاں کہاں الٹے پھرے جاتے ہیں، حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام جیسے جلیل القدر لوگوں کو ابن اللہ کہنا یہ یہود و نصاریٰ کے فاسد عقائد میں سے تھا۔

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا: "حبر" کا معنی بڑے عالم و فقیہ کے ہیں، اس کی جمع "احبار" ہے، یعنی علماء اور فقہاء، "راھب" کے معنی زاہد اور خشیت اختیار کرنے والے کے ہیں، اس کی جمع ہے "رھبان" یہود و نصاریٰ نے اپنے علماء اور رھبان کو دین بتانے والا نہیں بلکہ دین بنانے والا سمجھا ہوا تھا، یہاں علماء اور رھبان کو رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے علماء اور رھبان کو یہ اختیارات

دے رکھے تھے جو شریعت عطا کرنے والے رب کے تھے، جس چیز کو چاہیں حلال قرار دیں اور جس چیز کو چاہیں حرام قرار دیں، عامۃ الناس شرعی مسائل و معاملات سے ناآشنا ہوتے ہیں، اس لیے انہیں علماء ہی کے دروازہ علم پر دستک دینا پڑتی ہے، وہ لوگوں کو شرعی مسائل سے آگاہ کرتے ہیں، اس بات کی شریعت میں گنجائش موجود ہے، بلکہ قرآن کریم میں تو یہ حکم دیا گیا کہ اہل علم سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے، اہل علم اللہ کے بتائے ہوئے دین کی تشریح و تفسیر کر سکتے ہیں، اپنی طرف سے دین بنا نہیں سکتے، اللہ کے حلال کردہ کو حرام اور حرام کردہ کو حلال نہیں قرار دے سکتے، مگر یہود و نصاریٰ نے اپنے علماء ورھبان کو یہ اختیارات دے رکھے تھے کہ وہ حلال کردہ کو حرام اور حرام کردہ کو حلال کر سکتے تھے، اس لیے یہاں ان کی قباحتوں کے بیان میں اس قباحت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ : نصاریٰ نے حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام کو بھی خدائی اختیارات کا مالک سمجھ رکھا تھا، اس بارے میں یہاں فرمایا گیا ہے، قرآن کریم میں مختلف مقامات پر نصاریٰ کے کفریہ و شرکیہ عقیدہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو الٰہ (معبود) مانتے تھے، وہ اللہ کو تیسرا نمبر دیتے تھے، اللہ تین میں سے تیسرا خدا ہے مانتے تھے، وہ حضرت مریم اور ان کے لخت جگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی الٰہ مانتے تھے، یہاں خدائی اختیارات کی طرف اشارہ ہے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ : یہاں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ان لوگوں کو تو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک ہی ذات کو الٰہ و معبود مانیں، جس کے سوا کوئی معبود و لائق بندگی نہیں ہے، جسے اللہ کہا جاتا ہے، جو ساری کائنات کا خالق، مالک، رازق، مختار اور متصرف الامور ہے۔

سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ : اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کیا دنیا بھر کے مشرکین کے شرکیہ عقائد و خیالات کی جڑ کاٹ دی ہے، اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔ یعنی وہ جو عبادت و طاعت میں دوسروں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں، اللہ ان کی اس مشرکانہ و شرکیہ حرکت سے پاک ہیں۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ : یہ کافر اور ان جیسے دوسرے اہلِ باطل، جو مختلف ملتوں اور گمراہ مسالک سے تعلق رکھتے ہیں، اپنی گھڑی ہوئی باتوں اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے ذریعے

یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کی روشنی کو بجھا دیں، اس کا چراغ گل کر دیں اور اس کے واضح دلائل و روشن براہین کو باطل ٹھہرا دیں، وہ دلائل جو اللہ کی توحید اور رسول ﷺ کے لائے ہوئے پیغام کی حقانیت پر شاہد ہیں، ان کی کوشش یہ ہے کہ حق کی آواز دب جائے اور دینِ اسلام اپنی تاثیر کھو بیٹھے، لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو اس کے سوا کچھ منظور نہیں کہ وہ اپنے دین کو کامل فرمائے، اسے غالب کرے اور دوسرے تمام ادیان پر بلند کر دے، خواہ کافروں کو دین کا مکمل ہونا، اس کا ظاہر و غالب ہونا اور اس کا سربلند رہنا ناگوار ہی کیوں نہ گزرے، اللہ اپنے دین کو پورا کر کے رہے گا، اسے نمایاں اور سربلند کر کے رہے گا، جب اللہ کسی امر کا ارادہ فرمالے تو پھر کسی اور کی تدبیر یا خواہش اس کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتی، اس کی مشیت کے آگے سب ارادے ماند پڑ جاتے ہیں۔

قرآن کریم اور دین حق کا غلبہ

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ {۳۳} التوبہ

جواب ترجمہ: اللہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین کو ناگوار ہو۔

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ : اللہ تعالیٰ نے یہاں رسول کی اضافت و نسبت اپنی طرف کرتے ہوئے رسول کی عظمت کو چار چاند لگا دیے ہیں، ھدیٰ سے مراد قرآن کریم اور دین حق سے مراد اسلام ہے۔

اس میں حضور ﷺ اور اہل ایمان کے لیے بشارت ہے کہ اللہ ان کی مدد کرے گا اور ان کے دین کو تمام دوسرے ادیان پر غالب کر دے گا، یعنی حجت و دلائل کی قوت اور غلبے کے ذریعے یہ دوسری تمام امتوں پر اس امت کو غلبہ عطا کر کے اللہ تعالیٰ دین اسلام کا پرچم بلند کر دے گا، آیت میں جس امر

کی خبر دی تھی واقعاتی دنیا میں بھی ایسا ہی پیش آیا، یہ امت دین اسلام کی مخالفت اور دشمن قوتوں اور قوموں پر غالب آگئی اور ان پر اسے بالادستی حاصل ہوگئی۔ (احکام القرآن للجصاص)

اس میں حضور ﷺ کی نبوت کی صداقت پر دلالت موجود ہے، نیز یہ دلالت بھی ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ کے پاس سے حضور ﷺ پر نازل ہوا ہے اس لیے کہ اس قسم کی پیشین گوئیاں اندازے لگانے والوں نیز ظن و تخمین کی بنیاد پر آئندہ کی باتیں بتانے والوں اور جھوٹی خبریں دینے والوں کو میسر نہیں آسکتیں جبکہ قرآن میں کثرت سے غیب کی خبریں بتائی گئی ہیں اور غیب کی خبر اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں ہوسکتی اس لیے قرآن مجید، اللہ کا کلام ہے اور اس میں بیان ہونے والی باتیں اللہ کی طرف سے دی ہوئی خبریں ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنا کلام صرف اپنے رسولوں پر نازل کرتا ہے۔ (احکام)

احبار ورھبان کی اکثریت حرام خور اور راہِ خدا میں رکاوٹ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ {۳۴} يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ {۳۵} التوبه

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! بلاشبہ بہت سے علماء اور راہب ایسے ہیں جو لوگوں کے مال باطل طریقہ پر کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے۔ جس روز ان کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر ان کی پیشانیوں اور کروٹوں اور پشتوں کو داغ دیا جائے گا۔ یہ وہ ہے جس کو تم نے اپنی جانوں کے لیے جمع کیا تھا سو اب اسے تم چکھ لو جسے تم جمع کرتے تھے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ:
اس آیتِ کریمہ میں اہلِ کتاب کے اُن مذہبی پیشواؤں کا حال بیان کیا گیا ہے جو علم و زہد کے منصب پر فائز تھے، مگر باطن میں دنیا پرست نکلے، فرمایا گیا کہ ان میں سے بہت سے لوگ لوگوں کا مال ناحق طریقوں سے کھاتے ہیں۔ لفظ كَثِيرًا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سب ایسے نہ تھے، مگر اکثریت اسی روش پر قائم تھی، ان کی بددیانتی کی صورت یہ تھی کہ وہ اپنی کتابوں میں تحریف کرتے، احکامِ الٰہی کو بدل دیتے، اور پھر ان گھڑے ہوئے فتووں کے عوض اپنی عوام سے مال وصول کرتے، گویا دین کو ذریعۂ معاش بنالیا گیا تھا۔

اہلِ ایمان کو اس طرزِ عمل سے آگاہ کیا گیا، تاکہ وہ سمجھ لیں کہ امتوں کی گمراہی ہمیشہ باہر سے نہیں آتی، کبھی وہ اپنے مذہبی طبقات کے ہاتھوں بھی جنم لیتی ہے، اگر علم و روحانیت کے منصب پر بیٹھنے والے اخلاص سے خالی ہو جائیں تو دین تجارت بن جاتا ہے اور عوام فریب کا شکار ہو جاتے ہیں، اس لیے ہر دور میں ضروری ہے کہ اہلِ ایمان دین کے نام پر دنیا کمانے والوں سے ہوشیار رہیں اور شخصیت پرستی کے بجائے معیارِ حق کو سامنے رکھیں۔

فقہائے امت نے بھی تصریح کی ہے کہ جو چیز کسی شخص کو اس کے متقی اور صالح ہونے کے گمان میں دی جائے، حالانکہ وہ باطن میں اس کا اہل نہ ہو، تو اس کے لیے اس مال کا لینا جائز نہیں، کیونکہ اگر دینے والے کو حقیقت معلوم ہو جاتی تو وہ ہرگز نہ دیتا، یہ اصول بتاتا ہے کہ دین کے نام پر باطل کمائی کس قدر سنگین جرم ہے۔

وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ: آیت میں ان پیشواؤں کی دوسری صفت یہ بیان ہوئی کہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، انہوں نے رسولِ اکرم ﷺ کی علامات کو پہچان لیا تھا، مگر اپنی سرداری اور مفاد کے خوف سے حق کو چھپالیا، اپنے پیروکاروں کو یہ باور کرایا کہ یہ وہ نبی نہیں جن کا انتظار تھا، حالانکہ دل جانتے تھے کہ یہی سچ ہے، یہ روش تاریخ کا قصہ نہیں، بلکہ ایک دائمی رویّہ ہے، جب بھی حق غالب ہونے لگتا ہے، باطل کے ذمہ دار طبقے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دیتے، وہ خود بھی قبولِ حق سے گریز

کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں، طرح طرح کے شبہات، لالچ اور ترغیبات کے ذریعے نوجوان ذہنوں کو متأثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن جس دل میں ایمان راسخ ہو جائے، اسے دنیا کی کوئی چمک مستقل طور پر نہیں بہکا سکتی۔

اسلام کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ دشمنانِ حق نے ہر دور میں اسے روکنے کی کوشش کی، اگر نتائج کو انسانی تدبیر سے ناپا جائے تو یہ دعوت مکہ کے ایک گھر سے آگے نہ بڑھتی، مگر اللہ کی نصرت نے اسے بستی بستی اور ملک ملک پہنچا دیا، آج بھی دنیا کے مختلف خطوں میں لوگ اسلام کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حق کی روشنی کو بجھانے کی ہر کوشش آخر کار ناکام رہتی ہے۔

باطل کے داعی جانتے ہیں کہ اللہ کی مشیت غالب ہے، مگر مفاد کی زنجیریں انہیں حقیقت قبول کرنے سے روکے رکھتی ہیں، وہ اپنے عوام کو اسلام سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر دلوں کی گواہی کو کب تک دبایا جا سکتا ہے؟ حق اپنی تاثیر رکھتا ہے اور جب دل مطمئن نہ ہوں تو ظاہری وابستگی دیرپا نہیں رہتی۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ: یہاں آیت کا رخ ایک اور سنگین برائی کی طرف ہوتا ہے، سونا اور چاندی جمع کرنا اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا، یہاں اس طبقے کا ذکر مستقل انداز میں کیا گیا ہے، تاکہ واضح ہو جائے کہ مال اندوزی بذاتِ خود ایک بڑا فتنہ ہے، خواہ وہ اہلِ کتاب میں ہو یا اس امت کے افراد میں۔

فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ: جو لوگ دولت کو خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اس میں سے اللہ کے مقرر کردہ حقوق ادا نہیں کرتے، ان کے لیے دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی۔ لفظ **بَشِّرْهُم** بطورِ طنز استعمال ہوا ہے، گویا جس چیز کو وہ خوش بختی سمجھ رہے ہیں، وہی ان کے لیے عذاب کا سبب بننے والی ہے، اگر مال کا جمع کرنا انہیں باعثِ مسرت معلوم ہوتا ہے تو سن لیں کہ اس کا انجام مسرت نہیں بلکہ حسرت اور عذاب ہے۔

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ: یہ آیتِ کریمہ ان لوگوں کے لیے سخت وعید پر مشتمل ہے جو سونا چاندی اور دولت جمع تو کرتے ہیں، مگر اس میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق ادا نہیں کرتے، قرآن کریم نہایت مؤثر انداز میں قیامت کا وہ منظر سامنے لاتا ہے جب دنیا کی محبوب ترین متاع انسان کے لیے عذاب کا ذریعہ بن جائے گی۔

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا: جب انہی خزائن کو آگ میں تپایا جائے گا، یہاں عَلَيْهَا کا اشارہ اسی سونے، چاندی اور جمع شدہ مال کی طرف ہے جسے دنیا میں سینوں سے لگا کر رکھا گیا تھا، مگر اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا گیا، قیامت کے دن وہی مال جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا، یہاں تک کہ وہ دہکتے ہوئے انگاروں کی مانند سرخ ہو جائے، جس دولت کو انسان نے ٹھنڈکِ دل سمجھا تھا، وہی شعلۂ سوزاں بن کر اس کے سامنے آئے گی۔

فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ: پیشانیاں، پہلو اور پشتیں داغی جائیں گی، پھر انہی تپائے ہوئے سکوں اور خزائن سے ان کے جسموں کو داغا جائے گا، پیشانیاں، پہلو اور پشتیں خاص طور پر ذکر کی گئیں، مفسرین نے اس تخصیص کی حکمت بیان کی ہے کہ جب محتاج اور سائل ان کے پاس آتا تھا تو وہ تکبر سے پیشانی سکیڑ لیتے، پہلو پھیر لیتے اور پشت دکھا کر بے رخی اختیار کر لیتے تھے، آج انہی اعضاء پر عذاب وارد ہو گا، گویا عمل کا بدلہ عین اسی نوعیت کا ہو گا۔

بعض اہلِ تفسیر نے یہ بھی فرمایا کہ ان مقامات پر اندرونی اعضاء واقع ہیں، اس لیے عذاب کی شدت زیادہ ہو گی، حرارت باہر سے اندر تک سرایت کرے گی اور انسان اپنے کیے کا پورا مزہ چکھے گا، روایات میں آیا ہے کہ جسم کو پھیلا دیا جائے گا تاکہ ہر دینار اور ہر درہم الگ الگ اپنا نشان چھوڑے، کوئی سکہ دوسرے پر نہ رکھا جائے، بلکہ ہر جمع کی ہوئی چیز کا حساب الگ ہو۔

هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ: یہی ہے وہ جسے تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، اس موقع پر کہا جائے گا، یہ وہی مال ہے جسے تم نے اپنے لیے سنبھال کر رکھا تھا، تم سمجھتے تھے کہ یہ تمہاری قوت، تمہاری عزت اور

تمہاری نجات کا ذریعہ ہے، مگر آج یہی تمہارے عذاب کا سبب بن گیا، دنیا میں اسے لذت اور آسائش کا وسیلہ سمجھا گیا، مگر آخرت میں یہی ذخیرہ وبالِ جان بن کر سامنے کھڑا ہے۔

فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ: اب اپنے جمع کیے ہوئے مال کا مزہ چکھو، یہ جملہ زجر و توبیخ کا اعلان ہے، تم نے اللہ کے حق روکے، فقراء کا حصہ ادا نہ کیا اور مال کو مقصدِ حیات بنا لیا، اب اسی کا انجام چکھو۔ قرآن کا یہ اسلوب دراصل ایک الٰہی تنبیہ ہے: جس چیز کو تم نے کامیابی سمجھا تھا، وہی تمہاری ناکامی ثابت ہوئی۔

جامع پیغام: یہ آیت یہ نہیں کہتی کہ مال رکھنا بذاتِ خود جرم ہے، اسلام نے حلال کمائی اور جائز ملکیت کو تسلیم کیا ہے، جرم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب، مال میں اللہ کا حق ادا نہ کیا جائے، زکوٰۃ اور واجبات روکے جائیں، بخل اور دنیا پرستی دل پر غالب آجائے۔ پھر یہی جمع شدہ دولت قیامت کے دن آگ بن کر لوٹتی ہے۔ یہ آیت اہلِ ایمان کو متنبہ کرتی ہے کہ مال کو مقصد نہ بناؤ، اسے وسیلہ بناؤ، اگر مال اللہ کی راہ میں خرچ ہو تو نعمت ہے اور اگر محض ذخیرہ ہو تو قیامت کا شعلہ ہے۔

سال کے بارہ مہینوں کی قدر و منزلت

سوال آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ {٣٦} التوبة.

جواب ترجمہ: بے شک اللہ کے ہاں مہینوں کی گنتی بارہ مہینے ہیں اللہ کی کتاب میں جس دن سے اللہ نے زمین اور آسمان پیدا کیے ان میں سے چار عزت والے ہیں یہی سیدھا دین ہے سو ان میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو اور تم سب مشرکوں سے لڑو جیسے وہ سب تم سے لڑتے ہیں اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں، حرمت والے مہینے وہ ہوتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے لڑائی کرنے پر پابندی لگائی ہے، یہ چار مہینے ہیں ذیقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب، حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں، تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں اس پر متفق ہیں کہ ان چار مہینوں میں ہر عبادت کا ثواب زیادہ ہوتا ہے اور ان میں کوئی گناہ کرے تو اس کا وبال اور عذاب بھی زیادہ ہے، سابق شریعتوں میں ان مہینوں کے اندر قتل و قتال بھی ممنوع تھا۔

مکہ مکرمہ کے عرب چونکہ اسمٰعیل علیہ السلام کے واسطہ سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہیں، اس لئے یہ سب لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے قائل اور ان کی شریعت کو ماننے کا دعوٰی کرتے تھے اور چونکہ ملت ابراہیم میں بھی ان چار مہینوں (یعنی اشہر حرم) میں قتل و قتال اور شکار ممنوع تھا، عرب جاہلیت پر اس حکم کی تعمیل اس لئے سخت دشوار تھی کہ دور جاہلیت میں قتل و قتال ہی ان کا پیشہ بن کر رہ گیا تھا، اس لئے اس میں آسانی پیدا کرنے کے لئے انہوں نے اپنی نفسانی اغراض کے لئے طرح طرح کے حیلے نکالے کبھی اشہر حرم کے کسی مہینہ میں جنگ کی ضرورت پیش آئی یا لڑتے لڑتے شہر حرام آجاتا تو کہہ دیتے کہ اب کے سال یہ مہینہ حرام نہیں ہوا اگلا مہینہ حرام ہوگا، مثلاً محرم آگیا تو کہتے کہ اس سال محرم کا مہینہ حرام نہیں بلکہ صفر کا مہینہ حرام ہوگا، اور مزید ضرورت پڑتی تو کہتے کہ ربیع الاول حرام ہوگا، یا یہ کہتے کہ اس سال صفر کا مہینہ پہلے آگیا، محرم بعد میں آئے گا اس طرح محرم کو صفر بنادیا، غرض سال بھر میں چار مہینے تو پورے کرلیتے تھے لیکن اللہ کی متعین کردہ ترتیب اور تعیین کا لحاظ نہ کرتے تھے۔

جس مہینہ کو چاہیں ذی الحجہ کہہ دیں اور جس کو چاہیں رمضان کہہ دیں جس کو چاہیں مقدم کردیں جس کو چاہیں موخر کردیں اور کبھی زیادہ ضرورت پڑتی مثلاً لڑتے لڑتے دس مہینے گذر گئے اور سال کے صرف دو ہی مہینے باقی رہ گئے تو ایسے موقع پر سال کے مہینوں کی تعداد بڑھادیتے اور کہتے کہ اب کے برس سال چودہ مہینوں کا ہوگا، اسی طرح باقی ماندہ چار مہینوں کو اشہر حرم بنالیتے تھے۔

غرض دین ابراہیمی کا اتنا تو احترام کرتے تھے کہ سال میں چار مہینوں کا احترام کرتے اور ان میں قتل و قتال سے باز رہتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے جو ترتیب مہینوں کی متعین فرمائی اور اسی ترتیب سے چار مہینوں کو اشہر حرم قرار دیا، اس میں طرح طرح کی تاویلیں کرکے اپنی اغراض نفسانی کو پورا کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں اس کا امتیاز ہی دشوار ہو گیا تھا کہ کونسا مہینہ رمضان یا شوال کا ہے اور کونسا ذی القعدہ ذی الحجہ یا رجب کا ہے۔ ہجرت کے آٹھویں سال جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور نویں سال میں آنحضرت ﷺ نے صدیق اکبر کو موسم حج میں تمام کفار و مشرکین سے براءت کا اعلان کرنے کے لئے بھیجا تو یہ مہینہ حقیقی حساب سے اگرچہ ذی الحجہ کا مہینہ تھا، مگر جاہلیت کے اسی پرانے دستور کے مطابق یہ مہینہ ذی القعدہ کا قرار پایا تھا اور اس سال ان کے نزدیک حج کا مہینہ بجائے ذی الحجہ کے ذی القعدہ مقرر تھا، پھر ۱۰ھ میں جب رسول کریم ﷺ نے اپنے منیٰ کے خطبہ میں ارشاد فرمایا: أَلَا إِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ، یعنی زمانہ پھر پھرا کر پھر اپنی اسی ہیئت پر آگیا جس پر اس کو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت رکھا تھا، یعنی جو مہینہ اصلی ذی الحجہ کا تھا جاہلیت والوں کے نزدیک بھی اس سال وہی مہینہ ذی الحجہ کا مہینہ قرار پایا۔

یہ تھی وہ رسم جاہلیت جو مہینوں کی تعداد اور ترتیب اور تعیین میں کمی بیشی اور رد و بدل کرکے کی جاتی تھی، جس کے نتیجہ میں ان تمام احکام شرعیہ میں خلل آتا تھا جو کسی خاص مہینہ یا اس کی کسی خاص تاریخ سے متعلق ہیں، یا جو سال کے شروع یا ختم سے متعلق ہیں، مثلاً عشرہ ذی الحجہ میں احکام حج اور عشرہ محرم کے روزے اور ختم سال پر زکوٰۃ وغیرہ کے احکام۔

نسی کیا ہے؟

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِنَّمَا النَّسِيٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا

لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ{۳۷}يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ{۳۸}اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ{۳۹}التوبه

جواب ترجمہ: مہینوں کی حرمت کو آگے بڑھادینا کفر میں ترقی کرنا ہے جس سے کافر لوگ گمراہ کیے جاتے ہیں کہ وہ اس مہینے کو کسی سال حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال حرام قرار دے دیتے ہیں تاکہ ان مہینوں کی گنتی پوری کر لیں جنہیں اللہ نے حرام قرار دے دیا ہے۔ پھر اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینے کو حلال کر لیتے ہیں، ان کے برے اعمال ان کے لیے مزین کر دیئے گئے اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔ اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہو تو زمین پر بوجھل بن جاتے ہو، کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیاوالی زندگی پر راضی ہو گئے۔ سو دنیاوالی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑی سی ہے۔ اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا۔ اور تمہارے علاوہ دوسری قوم کو تمہارے بدلہ پیدا فرمادے گا اور تم اس کو کچھ بھی ضرر نہیں پہنچاسکتے ہو، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ: النسیٔ کیا تھا؟ عرب زمانۂ جاہلیت میں اشہر حرم (ذوالقعدہ، ذوالحجۃ، محرم، رجب) کا احترام بظاہر رکھتے تھے لیکن اپنی جنگی ضرورت کے مطابق ان مہینوں میں تبدیلی کر دیتے تھے، ضرورت پڑتی تو محرم کو حلال اور کوئی دوسرا مہینہ حرام قرار دے دیتے۔ علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں وہ کبھی نسیٔ کو جائز کر لیتے اور کبھی حرام، تاکہ اللہ کی مقرر کردہ تعداد پوری دکھائی دے سکے۔ **زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ**، یہ ان کے کفر پر مزید اضافہ اس لیے تھا کہ وہ اللہ کے مقرر کردہ مہینوں کی حرمت کو بدل کر دینِ الٰہی میں اپنی مرضی داخل کرتے تھے، اللہ نے ان کے اس باطل

طریقے کو ”کفر میں زیادتی“ کہا، کیونکہ وہ شریعتِ الٰہی کی مقدس حدود میں تبدیلی کرتے اور اسے دین سمجھ کر کرتے تھے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ: یہ آیت غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی جب مسلمانوں میں سے کچھ لوگ سخت گرمی، طویل سفر اور قلتِ وسائل کی وجہ سے جہاد کے لیے نکلنے سے ہچکچا رہے تھے۔

اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ: نحویین لکھتے ہیں کہ اصل لفظ تَثَاقَلْتُم تھا جس میں ادغام ہوا، یعنی تم زمین (دنیا) کی آسائش کی طرف جھک گئے۔ علامہ زمخشری نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جہاد سے ٹل گئے اور دنیا کی طرف مائل ہوئے۔

أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ: اللہ مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر پوچھتا ہے کہ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کا انتخاب کر لیا ہے؟ نحاس فرماتے ہیں کہ دنیا کی ہر نعمت آخرت کی نعمت کے مقابلے میں بہت ہی کم اور فانی ہے۔

إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا: اللہ فرماتا ہے کہ اگر تم جہاد کے لیے نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا۔ نحاس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا جو اس کے دین کی مدد کرے، اسی معنی کو الصالحی نے نقل کیا کہ یہ تنبیہ منافقین اور سستی کرنے والوں کے لیے تھی (سبل الھدیٰ)

وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا: تمہاری سستی اللہ یا اس کے دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ: اللہ اپنے دین کی نصرت کے لیے ہر وقت قادر ہے، تم پر منحصر نہیں۔

مجموعی مفہوم: ان آیات میں دو اہم نکات بیان ہوئے ① جاہلی طریقۂ نسیٔ دین میں بدعت و تحریف تھی، جسے اللہ نے کفر میں زیادتی قرار دیا۔ ② غزوۂ تبوک کے موقع پر مسلمانوں کی سستی پر اللہ نے نہایت سخت عتاب فرمایا اور بتایا کہ دنیا کی راحت کے مقابلے میں آخرت کی نعمت کم نہیں، جو لوگ نفیرِ عام میں شامل نہ ہوں، ان پر دردناک عذاب کی وعید اور ان کے بدلے ایک نئی قوم کے آنے کی تنبیہ ہے۔

ہجرت اور شان صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ {۴۰} التوبة.

جواب ترجمہ: اگر تم رسول کی مدد نہ کروگے تو اس کی اللہ نے مدد کی ہے جس وقت اسے کافروں نے نکالا تھا کہ وہ دو میں سے دوسرا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا تو غم نہ کھا بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے پھر اللہ نے اپنی طرف سے اس پر تسکین اتاری اور اس کی مدد کو وہ فوجیں بھیجیں جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کی بات کو پست کر دیا اور بات تو اللہ ہی کی بلند ہے اور اللہ زبردست (اور) حکمت والا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں متعدد مقامات ایسے ہیں جنہیں مفسرین نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت و منقبت کے طور پر پیش کیا ہے، ذیل میں صرف انہی جملوں کا ذکر ہو رہا ہے جن سے فضیلتِ صدیق رضی اللہ عنہ واضح ہوتی ہے۔

ثَانِيَ اثْنَيْنِ: یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ایک ہی شخص کا ہونا اور اس کا ابو بکر رضی اللہ عنہ ہونا، صدیقیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ شیخ جمال الدین قاسمی فرماتے ہیں فَخَرَجَ وَمَعَهُ أَبُو بَكر الصِّدِّيق رَضِيَ اللهُ عَنهُ ثَانِيَ اثنَينِ حَالٌ مِّن ضَمِيرِهِ ﷺ أَي أَحَدُ اِثنَينِ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ابو بکر تھے، اور یہی ان کی خصوصی فضیلت ہے۔ (محاسن التاویل)

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لَمَّا هَمَّ الْمُشْرِكُونَ بِقَتْلِهِ أَوْ حَبْسِهِ أَوْ نَفْيِهِ، فَخَرَجَ مِنْهُمْ هَارِبًا صُحْبَةَ صدّيقه وَصَاحِبِهِ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَبِي قُحَافَةَ. فَلَجَأَ إِلَى غَارِ ثَوْرٍ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ

لِيَرْجِعَ الطَّلَبُ الَّذِينَ خَرَجُوا فِي آثَارِهِمْ، ثُمَّ يَسِيرَا نَحْوَ الْمَدِينَةِ، فَجَعَلَ أَبُو بَكْرٍ، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، يَجْزَعُ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِمْ أَحَدٌ، فَيَخْلُصَ إِلَى الرَّسُولِ، عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْهُمْ أَذًى، فَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَكِّنه ويَثبّته وَيَقُولُ: "يَا أَبَابَكْرٍ، مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا، جب مشرکین نے آپ ﷺ کو قتل کرنے، یا قید کرنے، یا جلا وطن کرنے کا ارادہ کیا تو آپ ان کے درمیان سے ہجرت فرماتے ہوئے اپنے صدیق اور رفیق، ابو بکر بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے، پھر آپ دونوں نے غارِ ثور میں تین دن پناہ لی، تاکہ وہ لوگ جو آپ کی تلاش میں نکلے تھے واپس لوٹ جائیں، اس کے بعد مدینہ کی طرف سفر شروع کریں۔

اس دوران حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو یہ اندیشہ لاحق رہتا کہ کہیں کوئی شخص ان پر مطلع نہ ہو جائے اور رسول اللہ ﷺ تک ان کی طرف سے کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے، چنانچہ نبی کریم ﷺ انہیں تسلی دیتے، ان کا حوصلہ بڑھاتے اور فرماتے": اے ابو بکر! تمہارا ان دو کے بارے میں کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہے؟"

سیواسی نے لکھا:اَلرَّسُولُ أَحَدُ اثنَينِ، وَهُمَا النَّبِيُّ وَأَبُو بَكر وَلَم يَكُن مَعَهُمَا غَيرُهُمَا (عیون التفاسیر) یہ نص واضح کرتی ہے کہ اس مقامِ عظیم میں کوئی اور شریک نہ تھا۔ شیعہ مفسر علامہ طبرسی لکھتے ہیں ثانی اثنین سے مراد نبی کریم ﷺ اور ابو بکر ہیں۔ (مجمع البیان) یہی شیعہ مفسر لکھتے ہیں کہ اکیلے اللہ نے نبی کریم ﷺ کی مدد کی، کسی نے آپ ﷺ کی مدد نہیں کی سوائے ابو بکر صدیق کے۔ (مجمع البیان ج ۵ ص ۴۵)

إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ: غارِ ثور میں رفاقت اور خلوت میں ساتھ رہنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ہے۔ فتح الرحمن میں ہے:اَلغَارُ... مَكَثَا فِيهِ ثَلَاثًا (فتح الرحمٰن فی تفسیر القرآن) یعنی تین دن تک رسول اللہ ﷺ کے خلوت کے ساتھی صرف ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ جمال الدین قاسمی فرماتے ہیں إِذ هُمَا فِي الغَارِ بَدَلٌ مِّن إِذ أَخرَجَه، (محاسن التاویل) یہ بدلی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس پورے

واقعے میں ساتھ صرف ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔

إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ: لفظ صاحبہ قرآن میں براہِ راست ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے آیا ہے، جو ان کے شرفِ صحبت کی قطعی دلیل ہے۔ جمال الدین قاسمی فرماتے ہیں **إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ أَي لِأَبِي بَكر** (محاسن التاویل) قرآن نے انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحب کہہ کر پکارا۔ سیواسی نے بھی یہی نقل کیا: **إِذ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ أَي لِأَبِي بَكر** (عیون التفاسیر) شیعہ مفسر علامہ طبرسی نے **صَاحِبِهِ** (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی) سے مراد ابو بکر صدیق لیے ہیں۔ (مجمع البیان)

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللهَ مَعَنَا: یہ جملہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مقام کی عظیم ترین شہادت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تسلی دی اور معیتِ الٰہی میں ابو بکر کو شامل فرمایا۔

نوال العید نے اس کو اس طرح بیان کیا ہے: **اَلصِّدِّيقُ يَجزَعُ فَيَقُولُ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ: يَا أَبَا بَكر مَا ظَنُّكَ بِاثنَينِ اللهُ ثَالِثُهُمَا** (موسوعۃ شرح اسماء الحسنیٰ) یہ حدیث آیت کے اسی مفہوم کی شرح ہے کہ اللہ ہماری معیت میں ہے۔ ابن عطیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں "اللہ نے اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کی جب وہ **فِي مَوضِعِ القِلَّةِ وَالِانفِرَادِ** تھے۔ (المحرالوجیز) اور یہاں شریکِ خلوت صرف ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔

فَأَنْزَلَ اللهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ: اگرچہ سکینت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، مگر اس کے اثرات سے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اطمینان ملا، اسی لیے مفسرین نے اس پورے مقام کو صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے طور پر ذکر کیا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کے بیان میں واضح ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ "**يَجزَعُ... فَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ يُسَكِّنُهُ** (تفسیر ابن کثیر) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تسلی اور اللہ کی نصرت صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے عظیم مقام کی دلیل بنی۔ شیعہ مفسر طبرسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سکینہ کی ضمیر کو لوٹانا تو تسلیم کیا ہے لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سکینہ والی ضمیر کا لوٹنا تسلیم نہیں کیا، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو پہلے سے ہی اس سکینہ میں تھے، اس وقت سکینہ تو صدیق کے لیے ضروری تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سخت پریشان ہو رہے تھے کہ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی موذی تکلیف نہ پہنچادے۔

فضائلِ صدیق رضی اللہ عنہ: غار میں رسول اللہ ﷺ کے واحد ساتھی ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے، "ثَانِیَ اِثْنَیْنِ"۔ قرآن نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو صَاحِبِہٖ کہہ کر رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہونے کا قطعی ثبوت دے دیا۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا میں معیتِ الٰہی میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کا شامل ہونا سب سے اعلیٰ فضیلت ہے۔ مکہ سے ہجرت کے مشکل ترین مرحلے میں رسول اللہ ﷺ کی رفاقت صرف صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوئی۔ مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس آیت میں مذکور "صاحب" ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی نہیں۔

سورۂ توبہ کی آیت ۴۰ کے ذیل میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت متعدد احادیث اور سیرت کی روایات سے نمایاں ہوتی ہے، ہجرت کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ کو اجازتِ ہجرت ملی تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا :اَلصُّحبَۃُ یَا رَسُولَ اللّٰہِ؟ آپ ﷺ نے فرمایا:اَلصُّحبَۃُ "یعنی تم میرے رفیق ہو، اس بشارت پر وہ خوشی سے رو پڑے، غارِ ثور میں یہی خصوصی رفاقت قرآن کے الفاظ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ اور اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ سے ثبت ہوئی، اسی موقع پر نبی ﷺ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا

یَا أَبَا بَکر مَا ظَنُّکَ بِاثْنَیْنِ اَللّٰہُ ثَالِثُھُمَا یہ وہ معیتِ خاصہ ہے جسے آیت کے الفاظ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا نے محفوظ کر دیا، مزید بر آں، غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا اور کبوتروں کا بسیرا جیسے غیر معمولی اسبابِ حفاظت بھی اسی مشترکہ رفاقت کی نشانی سمجھے گئے ہیں۔

ہجرت کے سفر میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کی عملی جان نثاری بھی غیر معمولی تھی، وہ کبھی آگے چلتے کبھی پیچھے، تاکہ کسی سمت سے خطرہ ہو تو پہلے خود سامنے آئیں، غار میں داخل ہو کر سوراخ بند کیے، بستر تیار کیا، دودھ کا انتظام کیا، اور مسلسل پہرہ دیا۔ ان کے صاحبزادے عبد اللہ رضی اللہ عنہ خبریں پہنچاتے، اسماء رضی اللہ عنہا کھانا لاتیں اور عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ نشان مٹاتے، یہ سب انتظام ابو بکر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تھا، اس طرح آیتِ غار نہ صرف ان کی رفاقت بلکہ ایثار، خدمت اور فدائیت کی روشن دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہے اور یہ شرفِ صحبت کسی اور صحابی کو اس انداز میں حاصل نہیں ہوا۔

حکم جہاد: عسر و یسر میں یکساں عزم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ{۴۱} التوبہ

جواب ترجمہ: نکل کھڑے ہو ہلکے ہونے کی حالت میں اور بھاری ہونے کی حالت میں، اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ: اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو خطاب فرما کر ارشاد کرتا ہے کہ اس کی راہ میں جہاد کے لیے نکل کھڑے ہو، چاہے حالات تنگی کے ہوں یا فراخی کے، چاہے وسائل کم ہوں یا وافر، چاہے تم جوان اور توانا ہو یا عمر رسیدہ اور کمزور، دین کا تقاضا یہ نہیں کہ آدمی سہولت کا انتظار کرے، بلکہ یہ ہے کہ وہ حکمِ الٰہی پر لبیک کہے۔

یہ دعوت محض زبانی ہمدردی کی نہیں، بلکہ عملی اقدام کی ہے، اپنے مال کے ساتھ بھی نکلو اور اپنی جانوں کے ساتھ بھی، کیونکہ دین کی سربلندی اور حق کی حفاظت صرف تمناؤں سے نہیں ہوتی، بلکہ قربانی سے ہوتی ہے، جو شخص اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اپنی جان تک پیش کرنے کو تیار رہتا ہے، وہی درحقیقت ایمان کی صداقت کا ثبوت دیتا ہے۔

ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ: پھر فرمایا کہ یہ خروج اور یہ جدوجہد تمہارے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں زیادہ نفع بخش ہے، بہ نسبت اس کے کہ تم بیٹھے رہو اور اپنے مال و جان کی سلامتی سے دل لگائے رکھو، بظاہر آرام اور تحفظ میں فائدہ محسوس ہوتا ہے، مگر حقیقت میں یہی بے عملی خسارے کا پیش خیمہ بنتی ہے، اس کے برعکس، راہِ خدا کی مشقت وقتی ہوتی ہے، لیکن اس کا اجر دائمی اور اس کا اثر وسیع تر ہوتا ہے۔

إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ: اگر تم علم رکھتے ہو، اگر تم حقیقت کو سمجھتے ہو، تو اس بھلائی کی طرف سبقت کرو اور اس سعادت کو ہاتھ سے جانے نہ دو۔ یہی کامیابی کا راستہ ہے اور یہی عزتِ دنیا و آخرت کی ضمانت۔

منافقین کا عذر مسترد

سوال اس آیت مبارکہ کا شان نزول کیا ہے؟

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ{۴۲} التوبة.

جواب ترجمہ: اگر مال نزدیک ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تیرے ساتھ ہوتے لیکن انہیں مسافت لمبی نظر آئی اور اب اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم سے ہو سکتا تو ہم تمہارے ساتھ ضرور چلتے اپنی جانوں کو ہلاک کرتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں

جو لوگ غزوہ تبوک میں جانے سے رہ گئے تھے اور اس کے بعد حضور ﷺ کے پاس آکر اپنے جھوٹے اور بناوٹی عذر پیش کرنے لگے تھے۔ انہیں اس آیت میں ڈانٹا جارہا ہے کہ دراصل انہیں کوئی معذوری نہ تھی اگر کوئی غنیمت اور قریب کا سفر ہوتا تو یہ ساتھ ہو لیتے لیکن شام تک کے لمبے سفر نے ان کے گھٹنے توڑ دیئے اور مشقت کے خیال نے ان کے ایمان کمزور کر دیئے۔

اب یہ آکر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اللہ کے رسول ﷺ کو دھوکہ دے رہے ہیں کہ اگر کوئی عذر نہ ہوتا تو بھلا ہم شرف ہم رکابی چھوڑنے والے تھے؟ ہم تو جان و دل سے آپ کے قدموں میں حاضر ہو جاتے اللہ فرماتا ہے ان کے جھوٹ کا مجھے علم ہے انہوں نے تو اپنے آپ کو غارت کر دیا۔

منافقین کی وہ جماعت جس نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش ہو کر غزوۂ تبوک میں نہ جانے کا عذر پیش کیا تھا ان کے بارے میں نازل ہوئی۔

عتاب نہیں اعزاز واکرام میں اضافہ

سوال اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں معافی کو مقدم کیوں کیا؟ آپ ﷺ نے کن لوگوں کو

اجازت دی تھی؟ اور کس بات کی اجازت دی تھی؟

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ {۴۳} التوبة.

جواب ترجمہ: اللہ آپ کو سلامت (اور باعزت و عافیت) رکھے، آپ نے انہیں رخصت (ہی) کیوں دی (کہ وہ شریکِ جنگ نہ ہوں) یہاں تک کہ وہ لوگ (بھی) آپ کے لئے ظاہر ہو جاتے جو سچ بول رہے تھے اور آپ جھوٹ بولنے والوں کو (بھی) معلوم فرما لیتے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے معافی کو پہلے اس لیے ذکر کیا تا کہ آپ ﷺ کے دل کو تسلی دیں،، یہ اجازت اس جماعت کو دی گئی تھی جو غزوۂ تبوک میں نہیں جانا چاہ رہی تھی، اس بات کی اجازت انہیں دی گئی تھی کہ چلو تمہارا عذر ہے تو نہ جاؤ۔

علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے اس مقام کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اس موقع پر کسی قسم کا کوئی گناہ صادر نہیں ہوا، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے فرمایا کہ اللہ نے آپ ﷺ کو معاف کر دیا ہے، اس میں آپ ﷺ کی عظمت اور بزرگی کو مزید چار چاند لگانے تھے، اس لیے اللہ جل شانہ نے یہ فرمایا ہے۔

ابو الفرج جمال الدین جوزی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر زاد المسیر میں لکھتے ہیں کہ لٰكِنَّ اللّٰهَ وَقَّرَهُ وَرَفَعَ مِنْ شَأْنِهِ حِينَ اُفْتَتَحَ الْكَلَامَ بِقَوْلِهِ تَعَالَىٰ: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ، كَمَا يَقُولُ الرَّجُلُ لِمُخَاطَبِهِ إِذَا كَانَ كَرِيمًا عَلَيْهِ: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ، مَا صَنَعْتَ فِي حَاجَتِي؟ وَرَضِيَ اللّٰهُ عَنْكَ، هَلَّا زُرْتَنِي؟ اللہ تعالیٰ نے اس جملے سے آپ ﷺ کی عزت و توقیر بڑھائی ہے، کہ اللہ نے کلام کا آغاز ہی عفا اللہ عنک سے فرمایا، جیسے آدمی اپنے کسی مہربان اور مشفق کو مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اللہ آپ کو عافیت و سلامتی عطا فرمائے، آپ نے میرے کام کا کیا کیا؟ اللہ آپ سے راضی ہو جائے آپ مجھے ملنے کے لیے کیوں نہیں آئے؟ (زاد المسیر ج ۲ / ۲۶۴)

حضرت ابو سعید فاریابی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے سلیم القلب! اللہ نے آپ کو معاف کر دیا ہے، آپ نے انہیں کیوں اجازت دی؟ یوں کہا جاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے یوں سوال کر لیں کہ تم نے ایسا ایسا کیوں کیا؟ تو یہ اس شخص کے لیے موت سے زیادہ شدید اور بھاری ہوتا ہے، اللہ کے جلال و ہیبت کی وجہ سے، اللہ تعالیٰ اگر عفا اللہ عنک سے پہلے اپنے نبی ﷺ سے یوں پوچھ لیتے کہ آپ نے انہیں اجازت کیوں دی؟ تو اس سے آپ ﷺ پر خوف طاری ہو جاتا، اللہ کی ہیبت و جلال سے دل شق ہو جاتا، اس لیے اللہ نے اپنی رحمت اور مہربانی سے عفا اللہ عنک کا لفظ پہلے ذکر فرمایا، تاکہ آپ ﷺ کو اضطراب و پریشانی کی بجائے دلی سکون حاصل ہو جائے۔ (بحر العلوم سمرقندی ۲/ ۶۲)

تفسیر قرطبی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو دو کاموں کا اختیار دیا، ان میں ایک کام کرنا اولیٰ اور بہتر تھا جب کہ دوسرا غیر اولیٰ تھا، آپ ﷺ اگر ان منافقین کو اجازت نہ دیتے تھے تو یہ اولیٰ اور بہتر تھا، اجازت دینا غیر اولیٰ تھا، اس لیے اللہ نے تنبیہ فرمائی کہ آپ ﷺ نے غیر اولیٰ کام کیوں کیا، مگر پھر بھی ہم درگزر کیے دیتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی ۴/ ۳۱۷)

عَفَا اللّٰهُ عَنكَ کا مطلب ہے أَصلَحَكَ اللّٰهُ وَ أَعَزَّكَ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو درست کر دے، اللہ تعالیٰ آپ کی عزت میں اضافہ کرے۔ (الہدایہ الی بلوغ النہایہ)

حضرت عمرو بن میمون اودی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لے کر انہیں چھوڑنے اور غزوہ تبوک میں ان منافقین کو جہاد سے پیچھے رہ جانے کی اجازت آپ ﷺ نے دی، مگر اللہ سے اجازت نہیں لی، جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عتاب فرمایا، کہ اللہ نے آپ ﷺ کو معاف کر دیا، درگزر کر دیا، مگر آپ ﷺ نے انہیں اجازت کیونکر دی ہے، انہوں نے تو ویسے بھی نہیں جانا تھا، اب انہیں مضبوط بہانا ہاتھ آ گیا ہے۔ (تفسیر سمعانی) عَفَا اللّٰهُ عَنكَ کو لِمَ اَذِنتَ لَهُم سے مقدم کرنے سے مقصود آپ ﷺ کے اعزاز و اکرام کو زیادہ کرنا تھا۔ (تفسیر التسہیل لعلوم التنزیل)

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں، پس اجازت دینا کوئی گناہ نہ تھا، البتہ نہ دینا مصالح حاضرہ کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہوتا۔ اس اعلیٰ و اکمل صورت کے ترک کی وجہ سے خطاب کو عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ سے شروع فرمایا۔ عفو کا لفظ ضروری نہیں کہ گناہ ہی کے مقابلہ میں ہو۔ بعض محققین نے عفا اللہ عنك اس جملہ کو صدر کلام میں محض دعا و تعظیم کے طور پر لیا ہے جیسا کہ عرب کے محاورات میں شائع تھا (تفسیر عثمانی)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں، مقصد در حقیقت عتاب نہیں بلکہ یہ بات ہے کہ آئندہ ان لوگوں کی چالوں سے باخبر رہیں اور صورۃ جو ایک قسم کا عتاب بھی ہے تو کس لطف عنایت کے ساتھ کہ عتاب کی بات جو لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ سے شروع ہوئی ہے، یعنی آپ نے ان لوگوں کو کیوں اجازت دے دی اس کے ذکر کرنے سے پہلے ہی عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ذکر فرما دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف فرما دیا۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب و مقام اور آپ کے تعلق مع اللہ پر نظر رکھنے والے حضرات نے فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو غایت تعلق حضرت حق جل شانہ کے ساتھ تھا اس کے پیش نظر آپ کا قلب مبارک اس کا تحمل ہی نہ کر سکتا تھا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے کسی معاملہ میں آپ سے جواب طلب کیا جائے، اگر شروع میں لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ کے الفاظ ذکر فرما دیئے جاتے جن میں صورۃ جواب طلبی کا عنوان ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک اس کا تحمل نہ کر سکتا، اس لئے اس سے پہلے عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ فرما کر ایک طرف تو اس پر مطلع کر دیا کہ کوئی ایسا کام ہو گیا ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہ تھا، دوسری طرف اس کی معافی کی اطلاع پہلے دے دیتا کہ اگلا کلام قلب مبارک پر زیادہ شاق نہ ہو۔ (معارف القرآن)

کنز الایمان میں ہے، عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ التوبہ:۴۳) سے ابتدائے کلام و افتتاحِ خطاب مخاطب کی تعظیم و توقیر میں مبالغہ کے لئے ہے اور زبان عرب میں یہ عُرف شائع ہے کہ مخاطب کی تعظیم کے موقع پر ایسے کلمے استعمال

کئے جاتے ہیں۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے شفا میں فرمایا جس کسی نے اس سوال کو عتاب قرار دیا اس نے غلطی کی کیونکہ غزوہ تبوک میں حاضر نہ ہونے اور گھر رہ جانے کی اجازت مانگنے والوں کو اجازت دینا نہ دینا دونوں حضرت کے اختیار میں تھے اور آپ اس میں مختار تھے چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا (فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ (النور:٦٢) آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دیجئے تو لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (التوبہ:٤٣) فرمانا عتاب کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ اظہار ہے کہ اگر آپ انہیں اجازت نہ دیتے تو بھی وہ جہاد میں جانے والے نہ تھے اور عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ التوبہ:٤٣) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے، گناہ سے تو تمہیں واسطہ ہی نہیں۔ اس میں سید عالم ﷺ کی کمال تکریم و توقیر اور تسکین و تسلی ہے کہ قلب مبارک پر (لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (التوبہ:٤٣) فرمانے سے کوئی بار نہ ہو۔

مؤمن صادق اور منافق کی پہچان

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ{٤٤}اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ{٤٥}وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ{٤٦}لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاْاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ{٤٧}لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ{٤٨}التوبہ

جواب ترجمہ: آپ سے وہ لوگ اجازت نہیں مانگتے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں

کہ وہ اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کریں۔ اور اللہ متقیوں کو جانتا ہے۔ آپ سے وہی لوگ اجازت مانگتے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں سو وہ اپنے شک میں حیران ہیں۔ اور اگر وہ لوگ نکلنے کا ارادہ کرتے تو اس کے لیے ضرور تیاری کرتے لیکن اللہ نے ان کے جانے کو پسند فرمایا سو ان کو روک دیا اور کہا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اگر وہ تم میں شامل ہو کر نکل جاتے تو زیادہ فساد کرنے کے سوا کچھ کام نہ کرتے اور تمہارے درمیان فتنہ پردازی کی فکر میں تیزی کے ساتھ دوڑے پھرتے، اور تمہارے اندر وہ لوگ ہیں جو ان کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں اور اللہ ظالموں کو جانتا ہے۔ وہ پہلے سے فتنہ پردازی کی فکر میں لگے رہے ہیں اور آپ کے لیے کارروائیوں کا الٹ پھیر کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ حق آگیا اور اللہ کا حکم غالب ہوا حالانکہ ان کو ناگوار ہو رہا تھا۔

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ: اہلِ ایمان کی شان یہ نہیں کہ وہ اللہ اور یومِ آخرت پر سچا ایمان رکھتے ہوئے بھی رسولِ اکرم ﷺ سے جہاد میں پیچھے رہنے کی اجازت طلب کریں، جو دل ایمان کی حرارت سے روشن ہو، وہ حکمِ جہاد سن کر عذر نہیں ڈھونڈتا بلکہ لبیک کہتا ہے، جب بھی انہیں پکارا جائے، وہ اپنے مال اور اپنی جان کے ساتھ نکل کھڑے ہوتے ہیں، یہی اہلِ تقویٰ کی پہچان ہے اور اللہ اپنے بندوں میں سے پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے، وہ جانتا ہے کہ کون سچا ہے اور کون محض بہانہ تراش۔

إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ: درحقیقت اجازت مانگنے والے وہ لوگ تھے جن کے دل ایمان سے خالی اور شک و تردّد سے بھرے ہوئے تھے، وہ نہ اللہ پر یقین رکھتے تھے اور نہ آخرت پر، دین کے بارے میں شبہات نے ان کے باطن کو مضطرب کر رکھا تھا، اسی لیے وہ حیرانی اور تذبذب کی کیفیت میں بھٹکتے رہے، نہ حق کی راہ اختیار کر سکے اور نہ باطل سے کنارہ کش ہو سکے۔

وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً: اگر وہ اپنے دعوے میں سچے ہوتے اور واقعی جہاد کا ارادہ رکھتے، تو اس کے لیے تیاری کرتے، سامان مہیا کرتے اور عزمِ سفر باندھتے، مگر حقیقت یہ تھی کہ اللہ کو

ان کا نکلنا پسند نہ تھا، کیونکہ ان کے دل اخلاص سے خالی تھے، چنانچہ ان پر نکلنا گراں کر دیا گیا اور وہ گھروں میں بیٹھ رہنے کو ترجیح دینے لگے، بظاہر یہ ان کی کمزوری تھی، مگر در حقیقت یہ اللہ کی مشیت تھی کہ وہ لشکرِ حق کا حصہ نہ بنیں۔

لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا: اور حقیقتاً ان کا نہ نکلنا ہی بہتر تھا، اگر وہ ساتھ چل پڑتے تو تمہارے لیے نفع کے بجائے نقصان کا باعث بنتے، وہ تمہارے درمیان کمزوری پھیلاتے، حوصلے توڑتے، شکوک و شبہات کو ہوا دیتے اور صفوں میں بدگمانی کی آگ بھڑکاتے، وہ تمہارے اندر تیزی سے گھس کر فساد کی چنگاریاں سلگاتے اور تم میں کچھ سادہ دل ایسے بھی ہوتے جو ان کی باتوں کو سن کر قبول کر لیتے اور پھر انہیں آگے پھیلا دیتے، یوں اختلاف کی دراڑیں پیدا ہوتیں، اللہ ان ظالم منافقوں سے خوب واقف ہے جو اہلِ ایمان کے درمیان وسوسے اور سازشیں پھیلاتے ہیں۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ: یہ پہلا موقع نہ تھا کہ انہوں نے فساد کی کوشش کی ہو، غزوۂ تبوک سے پہلے بھی وہ اہلِ ایمان کی صفوں کو منتشر کرنے، ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے اور رسول اللہ ﷺ کے عزم کو متزلزل کرنے کی تدبیریں کرتے رہے، انہوں نے طرح طرح کی چالیں چلیں، حیلے گھڑے اور سازشوں کے جال بچھائے، مگر بالآخر اللہ کا فیصلہ غالب آیا، اس کی نصرت نازل ہوئی، اس نے اپنے دین کو سربلند کیا اور دشمنوں کو مغلوب کر دیا، اگرچہ یہ بات ان منافقوں کو سخت ناگوار تھی، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ باطل غالب آئے اور حق مغلوب ہو، مگر اللہ کا نور بجھایا نہیں جا سکتا اور اس کا دین مغلوب نہیں کیا جا سکتا۔

عورتوں کے فتنے میں گرفتار منافق

سوال یہ آیت کریمہ کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی؟ تفسیر کیجیے

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ {۴۹} التوبة

جواب ترجمہ: اور ان میں کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے تو اجازت ہی دیجئے اور آفت میں نہ ڈالئے۔ دیکھو یہ آفت میں پڑ گئے ہیں اور دوزخ سب کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

شان نزول: یہ آیت جد بن قیس منافق کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس کا شان نزول یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک کے لیے تیاری کی تو آپ ﷺ نے اس سے کہا کہ اے ابو وہب کیا تم رومیوں پر حملہ کر کے ان کے بچوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے میں دل چسپی رکھتے ہو بنی الاصفر سے مراد یہاں رومی قوم ہے تو اس نے جواب دیا کہ یارسول اللہ! میری قوم جانتی ہے کہ میں عورتوں کا رسیا شخص ہوں مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر میں نے رومیوں کی لڑکیوں کو دیکھ لیا تو میں ان کے بغیر صبر نہیں کر سکتا، اس لیے مجھے آزمائش میں نہ ڈالیے مجھے اپنے پیچھے بیٹھے رہنے کی اجازت دیجیے، میں آپ کی مالی امداد کروں گا، نبی اکرم ﷺ نے اس شخص سے صرف نظر کر لیا اور فرمایا کہ میں نے تمہیں اجازت دے دی اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے بنو سلمہ قبیلے والوں سے کہا جو اسی قبیلے سے تھے اے بنی سلمہ! تمہارا سردار کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارا سردار جد بن قیس ہے البتہ وہ بخیل اور بزدل ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بخل سے بڑھ کر کون سی بیماری ہے؟ بلکہ تمہارا سردار سفید نگت والا، گھنگریالے بالوں والا نوجوان بشر بن البراء بن معرور ہے اس کی شان میں حسان بن ثابت نے کہا ہے۔

وَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ وَالْحَقُّ لَا حِقٌّ ... بِمَنْ قَالَ مِنَّا: مَنْ تَعُدُّونَ سَيِّدَا
فَقُلْنَا لَهُ: جَدُّ بْنُ قَيْسٍ عَلَى الَّذِي ... نُبَخِّلُهُ فِينَا وَإِنْ كَانَ أَنْكَدَا
فَقَالَ: وَأَيُّ الدَّاءِ أَدْوَى مِنَ الَّذِي ... رَمَيْتُمْ بِهِ جَدًّا وَعَالَى بِهَا يَدَا
وَسَوَّدَ بِشْرَ بْنَ الْبَرَاءِ بِجُودِهِ ... وَحُقَّ لِبِشْرٍ ذِي النَّدَا أَنْ يُسَوَّدَا
إِذَا مَا أَتَاهُ الْوَفْدُ أَنْهَبَ مَالَهُ ... وَقَالَ: خُذُوهُ إِنَّهُ عَائِدٌ غَدَا

① رسول اللہ نے ہم سے پوچھا کہ تمہارا سردار کون ہے یا تم اپنا سردار کسے شمار کرتے ہو۔

② ہم جد بن قیس کو اپنا سردار سمجھتے تھے ہم اسے گراں قدر سمجھتے تھے اگر چہ ہم اسے اپنے میں بخیل اور ناکارہ ہی سمجھتے ہیں۔

③ آپ نے فرمایا کہ تم نے اس پر بخل کا جو الزام لگایا ہے بھلا اس سے بڑی بیماری اور کون سی ہے۔

④ آپ نے بشر بن البراء کو اس کی سخاوت کے باعث ان کا سردار بنادیا اور یہ بشر کا حق تھا کہ اسے سردار بنایا جائے۔

⑤ جب اس کے پاس وفد آتے ہیں تو بے دریغ مال خرچ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم یہ مال لے لو یہ کل یعنی قیامت کو واپس ملنے والا ہے۔

احوال منافقین

سوال ان آیات کی روشنی میں منافقین کے مختلف احوال بیان کیجیے۔

اِنۡ تُصِبۡكَ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ وَاِنۡ تُصِبۡكَ مُصِيۡبَةٌ يَّقُوۡلُوۡا قَدۡ اَخَذۡنَاۤ اَمۡرَنَا مِنۡ قَبۡلُ وَيَتَوَلَّوۡا وَّهُمۡ فَرِحُوۡنَ{۵۰}قُلۡ لَّنۡ يُّصِيۡبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوۡلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ{۵۱}قُلۡ هَلۡ تَرَبَّصُوۡنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحۡدَى الۡحُسۡنَيَيۡنِ ؕ وَنَحۡنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمۡ اَنۡ يُّصِيۡبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنۡ عِنۡدِهٖۤ اَوۡ بِاَيۡدِيۡنَا ۚ فَتَرَبَّصُوۡۤا اِنَّا مَعَكُمۡ مُّتَرَبِّصُوۡنَ {۵۲}قُلۡ اَنۡفِقُوۡا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا لَّنۡ يُّتَقَبَّلَ مِنۡكُمۡ ؕ اِنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ {۵۳} وَمَا مَنَعَهُمۡ اَنۡ تُقۡبَلَ مِنۡهُمۡ نَفَقٰتُهُمۡ اِلَّاۤ اَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوۡلِهٖ وَلَا يَاۡتُوۡنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمۡ كُسَالٰى وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا وَهُمۡ كٰرِهُوۡنَ{۵۴}التوبه

جواب ترجمہ: اگر آپ کو اچھی حالت پیش آجائے تو انہیں بری لگتی ہے، اور اگر آپ کو کوئی مصیبت پہنچ جائے تو یوں کہتے ہیں کہ ہم نے تو پہلے ہی اپنا کام سنبھال لیا تھا اور پشت پھیر کر خوش ہوتے ہوئے چل دیتے ہیں۔ آپ فرمادیجیے کہ اس کے علاوہ ہمیں تکلیف نہ پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے وہ ہمارا کارساز ہے اور ایمان والے اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔ آپ فرمادیجیے کہ تم ہمارے

بارے میں یہی انتظار کرتے ہو کہ ہمیں دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی مل جائے اور ہم تمہارے بارے میں یہ انتظار کرتے ہیں کہ اللہ تم پر اپنے پاس سے کوئی عذاب بھیج دے یا ہمارے ہاتھوں سے عذاب دے دے، سو تم انتظار کرو۔ بلاشبہ ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار میں ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے ہر گز تم سے قبول نہ کیا جائے گا، بلاشبہ تم نافرمان لوگ ہو۔ اور ان کے صدقات قبول کیے جانے سے کوئی چیز اس کے سوا مانع نہیں ہے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا، اور یہ لوگ نماز نہیں پڑھتے مگر سستی کے ساتھ اور خرچ نہیں کرتے مگر ناگواری کے ساتھ۔

منافقین کی اندرونی خباثت کا یہاں بیان ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کی فتح و نصرت سے، ان کی بھلائی اور ترقی سے ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور اگر کسی موقع پر مسلمان آزمائش اور امتحان سے دوچار ہو جاتے ہیں، کسی موقع پر انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کسی جگہ انہیں چوٹ آتی ہے، زخم لگتے ہیں، دکھ اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو بڑے شور و غل مچاتے ہیں گا گا کر اپنی چالاکی کے افسانے گاتے ہیں کہ میاں اسی وجہ سے ہم تو ان سے بچے رہے مارے خوشی کے بغلیں بجانے لگتے ہیں۔

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ: آپ کو پہنچنے والی مسرت و شادمانی انہیں بری لگتی ہے۔

شان نزول: اس آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے حضرت عبد اللہ بن جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کہ مدینہ میں رہ جانے والے منافقین نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بری بری خبریں پھیلانا شروع کر دیں کہ محمد اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو سفر میں بہت مشقت پیش آئی اور وہ ہلاک ہو گئے جب انہیں اپنی خبر کا جھوٹا ہونا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا عافیت سے ہونا معلوم ہوا تو یہ انہیں بہت برا لگا اس موقع پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (سیوطی، ۱۴۰، نیشاپوری ۲۰۹، طبری ۱۰/۱۰۵)

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا: اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! ان منافقوں سے صاف فرما دیجیے کہ ہمیں ہر گز کوئی مصیبت یا کامیابی نہیں پہنچ سکتی مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی

ہے، جو کچھ پیش آتا ہے، وہ اسی کی تقدیر اور اسی کے فیصلے کے تحت ہوتا ہے، نہ دشمن کی تدبیر کچھ کر سکتی ہے اور نہ حالات کی سختی، جب تک ربِّ کائنات کا حکم نہ ہو۔

هُوَ مَوْلَانَا: وہی ہمارا مالک ہے، وہی ہمارا کارساز اور پناہ گاہ ہے، اسی کی طرف ہم رجوع کرتے ہیں، اسی پر بھروسا رکھتے ہیں اور اسی کے سپرد اپنے تمام معاملات کرتے ہیں، مومن کا سرمایہ یقین یہی ہے کہ وہ اسباب کے ہجوم میں بھی مسببِ الاسباب کو نہ بھولے اور خطرات کے درمیان بھی اپنے دل کو اضطراب سے پاک رکھے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ: ہم نے اپنے امور اسی کے حوالے کر دیے ہیں، وہی ہمارے لیے کافی ہے اور وہی بہترین وکیل ہے، جس کا وکیل اللہ ہو، اسے کسی اور سہارے کی حاجت نہیں رہتی، یہی توکل مومن کی ڈھال بھی ہے اور اس کی قوت بھی۔

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ: مسلمانوں کے جہاد میں دو ہی انجام ہوتے ہیں اور دونوں ہر طرح اچھے ہیں اگر شہادت ملی تو جنت اپنی ہے اور اگر فتح ملی تو غنیمت و اجر ہے، پس اے منافقو تم جو ہماری بابت انتظار کر رہے ہو وہ انہی دو اچھائیوں میں سے ایک کا ہے اور ہم جس بات کا انتظار تمہارے بارے میں کر رہے ہیں وہ دو برائیوں میں سے ایک کا ہے یعنی یا تو یہ کہ اللہ کا عذاب براہ راست تم پر آجائے یا ہمارے ہاتھوں سے تم پر اللہ کی مار پڑے کہ قتل و قید ہو جاؤ۔ اچھا اب تم اپنی جگہ اور ہم اپنی جگہ منتظر رہیں دیکھیں پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ **إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ** سے مراد فتح اور شہادت ہے۔

قُلْ أَنفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَّن يُتَقَبَّلَ مِنكُمْ: اے میرے حبیب ﷺ! ان سے فرما دیجیے کہ تم اپنے مال خرچ کرو، خواہ خوشی سے یا ناگواری کے ساتھ، تمہاری یہ پیشکش ہرگز قبول نہ کی جائے گی، اس لیے کہ تمہارے دل ایمان سے خالی اور تمہارا طرزِ عمل اطاعتِ الٰہی سے منحرف ہے، جب بنیاد ہی کفر اور نافرمانی پر ہو تو ظاہری سخاوت اور مالی خرچ کس طرح بارگاہِ الٰہی میں وزن پا سکتا ہے؟ اللہ

کے ہاں قبولیت کا معیار مقدار نہیں، بلکہ ایمان اور اخلاص ہے۔

وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ: پھر فرمایا کہ ان کے انفاق کے ردّ ہونے کی اصل وجہ تین باتیں ہیں: ① اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کا فقدان، ② نماز میں سستی اور بے دلی، گویا عبادت بوجھ ہو اور ③ خرچ کرنا بھی دل کی آمادگی سے نہیں بلکہ مجبوری اور کراہت کے ساتھ، وہ نہ نماز میں ثواب کی امید رکھتے ہیں اور نہ انفاق میں اجر کے طلبگار ہیں، جب نیت میں اخلاص نہ ہو اور دل میں یقین کی روشنی نہ ہو، تو عمل محض ایک ظاہری حرکت رہ جاتا ہے، روح سے خالی، اثر سے محروم۔

یوں یہ آیات واضح کر دیتی ہیں کہ قبولیتِ عمل کا راز ایمانِ صادق اور اخلاصِ نیت میں پوشیدہ ہے، جس کے دل میں یقین نہ ہو، اس کا خرچ بھی بوجھ ہے اور اس کی عبادت بھی بے جان۔

مال واولاد کی آزمائش اور منافق کا کردار

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ{۵۵}وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ{۵۶}لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ{۵۷}وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ{۵۸}وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ{۵۹}التوبہ

جواب ترجمہ: سو آپ کو ان کے مال اور ان کی اولاد تعجب میں نہ ڈالیں، اللہ یہی چاہتا ہے کہ انہیں دنیاوالی زندگی میں ان چیزوں کے ذریعہ عذاب دے اور یہ کہ ان کی جانیں اس حال میں نکل جائیں کہ کفر کی حالت میں ہوں۔ وہ لوگ قسم کھاتے ہیں کہ بلاشبہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں، لیکن وہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے ہیں۔ اگر انہیں کوئی پناہ کی جگہ یا کوئی غار مل جائے یا گھس بیٹھنے

کے لیے کوئی جگہ حاصل ہو جائے تو پیٹھ پھیر کر جلدی سے اسی کی طرف دوڑے چلے جائیں۔ اور ان میں بعض وہ لوگ ہیں جو صدقات کے بارے میں آپ پر طعن کرتے ہیں، سو اگر اس میں سے ان کو دے دیا جائے تو راضی ہو جاتے ہیں اور اگر ان کو اس میں سے نہ دیا جائے تو اسی وقت وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ اس پر راضی ہوں جو اللہ نے اور اس کے رسول نے انہیں دیا اور وہ یوں کہیں کہ اللہ ہمیں کافی ہے۔ عنقریب اللہ ہمیں اپنے فضل سے عطا فرمائے گا اور اس کا رسول بیشک ہم اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ : اے میرے حبیب ﷺ! آپ کو ان منافقوں کے مال و اولاد ہر گز حیرت میں نہ ڈالیں، نہ آپ ان کی ظاہری فراوانی کو قابلِ رشک سمجھیں، بظاہر یہ نعمتیں ہیں، مگر حقیقت میں ان کے لیے وبال بننے والی ہیں، وہ ان اموال کے حصول میں مشقت اٹھائیں گے، انہی میں آزمائے جائیں گے اور انہی کے ذریعے دلوں کی سختی میں مبتلا رہیں گے، یہاں تک کہ ان کی جانیں حالتِ کفر میں نکل جائیں گی، پھر یہی دنیاوی فراوانی آخرت کے دائمی عذاب کا پیش خیمہ بنے گی اور وہ جہنم کے نچلے طبقے میں جا ٹھہریں گے۔ **تُعْجِبْكَ**: یعنی ان کی دولت اور اولاد کو پسند نہ کرو، یہ سب ان کے لیے وبال اور استدراج ہے۔ اعجاب: وہ تعجب جس میں خوشی اور پسندیدگی شامل ہو۔

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ : یہ منافق اہلِ ایمان کے سامنے قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ وہ بھی تم ہی میں سے ہیں، حالانکہ ان کے باطن میں تمہاری صف سے کوئی تعلق نہیں، ان کا اسلام خوف کی چادر میں لپٹا ہوا ہے، وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان پر بھی وہی انجام نہ آ جائے جو مشرکین پر آیا، قتل، اسیری یا رسوائی، اسی اندیشے کے تحت وہ ظاہراً اسلام کا اظہار کرتے ہیں، مگر دل ایمان کی روشنی سے خالی ہے۔

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا : ان کی کیفیت یہ ہے کہ اگر انہیں کوئی مضبوط قلعہ مل جائے، یا پہاڑوں کی غاریں جہاں وہ چھپ سکیں، یا زمین میں کوئی سرنگ جہاں پناہ لے سکیں، تو وہ فوراً

ادھر بھاگ جائیں، ان کے دل میدانِ حق میں جم کر کھڑے ہونے کے عادی نہیں، وہ ہر خطرے سے فرار چاہتے ہیں، چاہے اس کے لیے کتنی ہی تیزی سے کیوں نہ لپکنا پڑے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ: ان ہی میں کچھ ایسے بھی ہیں جو آپ ﷺ پر صدقات کی تقسیم میں اعتراض کرتے ہیں، اگر ان کے حصے میں وہ مقدار آجائے جو ان کی خواہش کے مطابق ہو تو راضی رہتے ہیں، اور اگر نہ ملے تو ناراضی اور شکوہ زبان پر لے آتے ہیں، گویا ان کا معیارِ رضا حق اور عدل نہیں بلکہ اپنی خواہش ہے۔

شانِ نزول: ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مال غنیمت کا حصہ تقسیم کر رہے تھے کہ ابن ذی الخویصرہ تمیمی آیا اس کا اصل نام حرقوص بن زہیر تھا اس نے کہا یا رسول اللہ ہمارے ساتھ انصاف کیجیے آپ ﷺ نے فرمایا افسوس ہے تیرے لیے اگر میں انصاف نہ کروں گا تو اور کون کرے گا اس پر یہ آیت نازل ہوئی **وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ**

چونکہ انہوں نے رسولِ اکرم ﷺ کی تقسیم پر زبان درازی کی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود صدقات کے مصارف اور مستحقین کو واضح فرمادیا، تاکہ رسول کی ذات ہر قسم کے اعتراض سے پاک اور منزّہ ثابت ہو جائے اور یہ حقیقت آشکار ہو جائے کہ تقسیم کسی شخصی خواہش کے تابع نہیں بلکہ حکمِ الٰہی کے مطابق ہے۔

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے رنگے ہوئے چمڑے میں کچھ سونا، جس سے مٹی علیحدہ نہیں کی گئی تھی۔ یمن سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ ﷺ نے اسے چار آدمیوں عیینہ بن بدر، اقرع بن حابس، زید الخیل اور علقمہ یا عامر بن طفیل کے درمیان تقسیم کر دیا۔

آپ ﷺ کے اصحاب میں سے کسی نے کہا: اس مال کے تو ہم ان لوگوں سے زیادہ حقدار تھے۔ آپ ﷺ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے فرمایا: کیا تم لوگوں کو مجھ پر اطمینان نہیں حالانکہ میں آسمان والے کا امین ہوں۔ میرے پاس صبح و شام آسمان کی خبریں آتی ہیں۔

ایک آدمی جس کی آنکھیں دھنسی ہوئی، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی، پیشانی باہر نکلی ہوئی، داڑھی گھنی اور سر منڈا ہوا تھا۔ اپنا تہمد پنڈلیوں سے اٹھاتے ہوئے کھڑا ہو کر کہنے لگا، اللہ کے رسول! اللہ سے ڈریئے۔ آپ نے فرمایا، تیرے لیے بربادی ہو۔ کیا میں روئے زمین پر اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے کا مستحق نہیں ہوں؟

وہ آدمی چلا گیا تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں اس کی گردن نہ اڑا دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہیں شاید وہ نماز پڑھتا ہو۔ خالد کہنے لگے، کتنے ہی نمازی ہیں جو زبان سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، **إِنِّي لَمْ أُومَرْ أَنْ أَنْقُبَ عَنْ قُلُوبِ النَّاسِ وَلاَ أَشُقَّ بُطُونَهُمْ**، مجھے لوگوں کے دلوں میں نقب لگانے اور ان کے پیٹوں کو چاک کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔

ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب وہ پیٹھ موڑے جارہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا: **إِنَّهُ يَخْرُجُ مِنْ ضِئْضِئِ هَذَا قَوْمٌ يَتْلُونَ كِتَابَ اللهِ رَطْبًا، لاَ يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ، يَمْرُقُونَ مِنَ الدِّينِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ**، اس کی نسل سے وہ لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن کو مزے لے لے کر پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔

ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ اگر میں اس قوم کے زمانہ میں موجود رہا تو قوم ثمود کی طرح انہیں قتل کروں گا۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب بعث علی بن ابی طالب۔ برکتاب استتابۃ المرتدین، مسلم کتاب الزکوٰۃ۔ باب اعطاء المؤلفۃ القلوب وذکر الخوارج)

جنگ حنین کے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت ذوالخویصرہ ہر قوص نامی اس گستاخ شخص کی بات سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی نسل سے ایک قوم نکلے گی جن کی نمازوں کے مقابلے میں تمہاری نمازیں تمہیں حقیر معلوم ہونگی اور ان کے روزوں کے مقابلے میں تم میں سے ایک کو اپنے روزے

حقیر معلوم ہوں گے لیکن وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے تمہیں جہاں بھی مل جائیں ان کے قتل میں کمی نہ کرو آسمان تلے ان مقتولوں سے بدتر مقتول اور کوئی نہیں۔

روایت میں ہے کہ ایک نو مسلم صحرائی حضور ﷺ کو سونا چاندی بانٹتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا کہ گر اللہ نے تجھے عدل کا حکم دیا ہے تو تو عدل نہیں کرتا، آپ ﷺ نے فرمایا تو تباہ ہو اگر میں بھی عادل نہیں تو زمین پر اور کون عادل ہو گا؟ پھر آپ ﷺ نے فرمایا اس سے اور اس جیسوں سے بچو میری امت میں ان جیسے لوگ ہوں گے قرآن پڑھیں گے لیکن حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ جب نکلیں انہیں قتل کر ڈالو۔ پھر نکلیں تو مار ڈالو پھر جب ظاہر ہوں پھر گردنیں مارو۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں اللہ کی قسم نہ میں تمہیں دوں نہ تم سے روکوں میں تو ایک خازن ہوں۔ (تفسیر ابن کثیر)

یہاں مفسرین کرام نے فرمایا کہ یَلۡمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ کا مطلب یہ ہے کہ یہ اقربا پروری کرتے ہیں، اپنوں کو نوازتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ صدقات تقسیم کر رہے ہیں، صدقات کی تقسیم میں وہ لوگ آپ ﷺ کے خلاف زبان طعن دراز کرتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور منافقین میں فرق: اس زمانے میں جو پکے سچے کھرے اور سُچے مسلمان تھے انہیں صحابہ کہا جاتا ہے، جو مذبذب تھے انہیں منافق کہا جاتا ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو نبی کریم ﷺ کی دل وجان سے عزت کرتے تھے، بلکہ آپ ﷺ کے ایک ادنیٰ اشارہ پر جان فدا کر دینے کے لیے تیار رہتے تھے، جب کہ منافقین اور مخالفین کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے جس میں آپ ﷺ کی برائی یا مخالفت نہ کریں۔

وَلَوۡ اَنَّهُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ: حالانکہ اگر وہ اس پر راضی ہو جاتے جو اللہ نے ان کے لیے مقرر کیا اور جو اس کے رسول ﷺ نے عطا فرمایا اور یوں کہتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے، وہ اپنے فضل سے ہمیں عطا کرے گا اور اس کا رسول بھی اسی کے دیے میں سے دے گا اور ہم صرف اللہ ہی سے امید رکھتے ہیں، تو یہ طرزِ فکر ان کے لیے کہیں بہتر ہوتا، مگر انہوں نے قناعت اور توکل کے بجائے

اعتراض اور بدگمانی کو اختیار کیا۔ بات یہ ہے کہ مومن آدمی اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اور اسی سے امیدیں باندھے رکھتا ہے تھوڑا مال جو اللہ کی طرف سے مل جائے اس پر بھی راضی رہتا ہے۔ اور منافق تھوڑے پر راضی نہیں ہوتا۔ برکتوں سے واقف نہیں ہوتا اللہ سے لو نہیں لگاتا، ہر وقت مال ہی کی طلب اور حرص میں لگا رہتا ہے۔ (انوار البیان)

مصارف زکوٰۃ

سوال زکوٰۃ کے مصارف کیا کیا ہیں؟ اس آیت کی روشنی میں وضاحت فرمائیے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ {٦٠} التوبة.

جواب ترجمہ: بے شک زکوٰۃ فقیروں، مسکینوں اور زکوٰۃ اکٹھی کرنے والوں کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرضداروں (کے قرض ادا کرنے) میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہئے یہ حقوق) اللہ کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں اور اللہ جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں آیت کا شان نزول معلوم کرنے کے بعد آیت کی مکمل تفسیر اور تشریح سننے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ جل شانہ نے تمام مخلوقات انسان وحیوان وغیرہ کو رزق دینے کا وعدہ فرمایا ہے، وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا اور ساتھ ہی اپنی حکمت بالغہ سے ایسا نہیں کیا کہ سب کو رزق میں برابر کر دیتے، غنی و فقیر کا فرق نہ رہتا، اس میں انسان کی اخلاقی تربیت اور نظام عالم سے متعلق سینکڑوں حکمتیں ہیں، غریب فقیر کا حصہ لگا دیا، ارشاد فرمایا وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ، جس میں بتلا دیا کہ مالداروں کے مال میں اللہ تعالیٰ نے ایک معین مقدار کا حصہ فقراء کے لئے رکھ دیا ہے، جو ان فقراء کا حق ہے۔

اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ مال داروں کے مال میں سے جو صدقہ نکالنے کا حکم دیا گیا ہے یہ کوئی ان کا احسان نہیں، بلکہ فقراء کا ایک حق ہے، جس کی ادائیگی ان کے ذمہ ضروری ہے، دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ حق اللہ تعالیٰ کے نزدیک متعین ہے، یہ نہیں کہ جس کا جی چاہے جب چاہے اس میں کمی بیشی کر دے، اللہ تعالیٰ نے اس معین حق کی مقدار بھی بتلانے کا کام رسول کریم ﷺ کے سپرد فرمایا اور اسی لئے آپ نے اس کا اس قدر اہتمام فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صرف زبانی بتلا دینے پر کفایت نہیں فرمائی، بلکہ اس معاملہ کے متعلق مفصل فرمان لکھوا کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو سپرد فرمائے، جس سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ زکوٰۃ کے نصاب اور ہر نصاب میں سے مقدار زکوٰۃ ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے واسطہ سے متعین کر کے بتلا دیئے ہیں، اس میں کسی زمانہ اور کسی ملک میں کسی کو کمی بیشی یا تغیر و تبدل کا کوئی حق نہیں۔

صدقہ، زکوٰۃ کی فرضیت صحیح یہ ہے کہ اوائل اسلام ہی میں مکہ مکرمہ کے اندر نازل ہو چکی تھی، جیسا کہ امام تفسیر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ مزمل کی آیت فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ سے استدلال فرمایا ہے کیونکہ یہ سورۃ بالکل ابتداء وحی کے زمانہ کی سورتوں میں سے ہے، اس میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم بھی ہے۔

البتہ روایات حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء اسلام میں زکوٰۃ کے لئے کوئی خاص نصاب یا خاص مقدار مقرر نہ تھی، بلکہ جو کچھ ایک مسلمان کی اپنی ضرورتوں سے بچ رہے وہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کیا جاتا تھا، نصابوں کا تعین اور مقدار زکوٰۃ کا بیان بعد ہجرت مدینہ طیبہ میں ہوا ہے اور پھر زکوٰۃ و صدقات کی وصول یابی کا نظام محکمانہ انداز کا تو فتح مکہ کے بعد عمل میں آیا ہے۔

اس آیت میں باجماع صحابہ و تابعین اسی صدقہ واجبہ کے مصارف کا بیان ہے جو نماز کی طرح مسلمانوں پر فرض ہے، کیونکہ جو مصارف اس آیت میں متعین کیے گئے ہیں وہ صدقات فرض کے

مصارف ہیں، نفلی صدقات میں روایات کی تصریحات کی بنا پر بہت وسعت ہے وہ ان آٹھ مصارف میں منحصر نہیں ہیں۔

اگرچہ اوپر کی آیات میں صدقات کا لفظ عام صدقات کے لئے استعمال ہوا ہے، جس میں واجب اور نفلی دونوں داخل ہیں، مگر اس آیت میں باجماع امت صدقات فرض ہی کے مصارف کا بیان مراد ہے، اور تفسیر قرطبی میں ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں لفظ صدقہ مطلقاً بولا گیا ہے اور کوئی قرینہ نفلی صدقہ کا نہیں ہے تو وہاں صدقہ فرض ہی مراد ہوتا ہے۔

اس آیت کو لفظ اِنَّمَا سے شروع کیا گیا ہے، یہ لفظ حصر و انحصار کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس شروع ہی کے کلمہ نے بتلا دیا کہ صدقات کے جو مصارف آگے بیان ہو رہے ہیں تمام صدقات واجبہ صرف انہیں میں خرچ ہونے چاہئیں ان کے علاوہ کسی دوسرے مصرف خیر میں صدقات واجبہ صرف نہیں ہو سکتے، جیسے جہاد کی تیاری یا بناء مسجد و مدارس یا دوسرے رفاہ عام کے ادارے، یہ سب چیزیں بھی اگرچہ ضروری ہیں اور ان میں خرچ کرنے کا بہت بڑا ثواب ہے، مگر صدقات فرض جن کی مقداریں متعین کر دی گئی ہیں، ان کو ان میں نہیں لگایا جا سکتا۔

آیت کا دوسرا لفظ صَدَقَات، صدقہ کی جمع ہے، صدقہ لغت میں اس مال کے جزء کو کہا جاتا ہے جو اللہ کے لئے خرچ کیا جائے۔ (قاموس)

امام راغب نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ صَدَقَةٌ کو صدقہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا دینے والا گویا یہ دعوی کرتا ہے کہ میں اپنے قول و فعل میں صادق ہوں، اس کے خرچ کرنے کی کوئی غرض دنیوی نہیں، بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لئے خرچ کر رہا ہوں، اسی لئے جس صدقہ میں کوئی نام و نمود یا دنیوی غرض شامل ہو جائے قرآن کریم نے اس کو کالعدم قرار دیا ہے۔

لفظ صدقہ اپنے اصلی معنی کی رو سے عام ہے، نفلی صدقہ کو بھی کہا جاتا ہے، فرض زکوٰۃ کو بھی، نفل کے لئے اس کا استعمال عام ہے ہی، فرض کے لئے بھی قرآن کریم میں بہت جگہ یہ لفظ استعمال ہوا

ہے، جیسے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً، اور آیت زیر بحث اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ بلکہ قرطبی کی تحقیق تو یہ ہے کہ قرآن میں جب مطلق لفظ صدقہ بولا جاتا ہے تو اس سے صدقہ فرض ہی مراد ہوتا ہے اور روایات حدیث میں لفظ صدقہ ہر نیک کام کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جیسے حدیث میں ہے کہ کسی مسلمان سے خوش ہو کر ملنا بھی صدقہ ہے، کسی بوجھ اٹھانے والے کا بوجھ اٹھوا دینا بھی صدقہ ہے، کنویں سے پانی کا ڈول اپنے لئے نکالا اس میں سے کسی دوسرے کو دیدینا بھی صدقہ ہے، اس حدیث میں لفظ صدقہ مجازی طور پر عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

تیسر الفظ اس کے بعد لِلْفُقَرَاءِ سے شروع ہوا ہے، اس کے شروع میں حرف لام ہے جو تخصیص کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس لئے معنی جملہ کے یہ ہوں گے کہ تمام صدقات صرف انہی لوگوں کو حق ہے جن کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ (معارف القرآن للمفتی رحمہ اللہ)

زکوٰۃ کے آٹھ مصارف: قرآن کریم میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کیے گئے ہیں، جو سورۃ التوبہ کی پیش نظر آیت میں یکجا بیان ہوئے ہیں، مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں "ان میں پہلا مصرف فقراء ہیں، دوسرا مساکین، فقیر اور مسکین کے اصلی معنیٰ میں اگرچہ اختلاف ہے، ایک کے معنیٰ ہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو، دوسرے کے معنیٰ ہیں جس کے پاس نصاب سے کم ہو، لیکن حکم زکوٰۃ میں دونوں یکساں ہیں اختلاف نہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کے پاس اس کی ضروریات اصلیہ سے زائد بقدر نصاب مال نہ ہو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اور اس کے لئے زکوٰۃ لینا بھی جائز ہے، ضروریات میں رہنے کا امکان استعمالی برتن اور کپڑے اور فرنیچر وغیرہ سب داخل ہیں، نصاب یعنی سونا ساڑھے سات تولہ یا چاندی ساڑھے باون تولہ یا اس کی قیمت جس کے پاس ہو اور وہ قرضدار بھی نہ ہو نہ اس کو زکوٰۃ لینا جائز ہے نہ دینا۔

اسی طرح وہ شخص جس کے پاس کچھ چاندی یا کچھ پیسے نقد ہیں اور تھوڑا سا سونا ہے تو سب کی قیمت لگا کر اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو وہ بھی صاحب نصاب ہے، اس کو زکوٰۃ

دینا اور لینا جائز نہیں اور جو شخص صاحب نصاب نہیں مگر تندرست، قوی اور کمانے کے قابل ہے اور ایک دن کا گذارہ اس کے پاس موجود ہے اس کو اگرچہ زکوٰۃ دینا جائز ہے مگر یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں سے سوال کرتا پھرے، اس میں بہت سے لوگ غفلت برتتے ہیں، سوال کرنا ایسے لوگوں کے لئے حرام ہے، ایسا شخص جو کچھ سوال کرکے حاصل کرتا ہے اس کو رسول کریم ﷺ نے جہنم کا انگارہ فرمایا ہے (ابوداؤد بروایت علی، قرطبی)

حاصل یہ ہے کہ فقیر اور مسکین میں زکوٰۃ کے باب میں کوئی فرق نہیں، البتہ وصیت کے حکم میں فرق پڑتا ہے کہ مساکین کے لئے وصیت کی ہے تو کیسے لوگوں کو دیا جائے اور فقراء کے لئے ہے تو کیسے لوگوں کو دیا جائے، جس کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں، فقیر اور مسکین کے دونوں مصرفوں میں یہ بات قدر مشترک ہے کہ جس کو مال زکوٰۃ دیا جائے وہ مسلمان ہو اور حاجات اصلیہ سے زائد بقدر نصاب مال کا مالک نہ ہو۔

اگرچہ عام صدقات غیر مسلموں کو بھی دیئے جاسکتے ہیں، رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے: تَصَدَّقُوا عَلَى اَهلِ الاَدیَانِ كُلِّهَا یعنی ہر مذہب والے پر صدقہ کرو، لیکن صدقہ زکوٰۃ کے بارے میں رسول کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجنے کے وقت یہ ہدایت فرمائی تھی کہ مال زکوٰۃ صرف مسلمانوں کے اغنیاء سے لیا جائے، اور انہی کے فقراء پر صرف کیا جائے، اس لئے مال زکوٰۃ کو صرف مسلم فقراء و مساکین ہی پر صرف کیا جاسکتا ہے زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات یہاں تک کہ صدقۃ الفطر بھی غیر مسلم فقیر کو دینا جائز ہے۔ (ہدایہ)

اور دوسری شرط مالک نصاب نہ ہونے کی خود فقیر و مسکین کے معنی سے واضح ہو جاتی ہے، کیونکہ یا تو اس کے پاس کچھ نہ ہوگا، یا کم از کم مال نصاب کی مقدار سے کم ہوگا، اس لئے ان دونوں مصرفوں کے بعد اور چھ مصارف کا بیان آیا ہے، ان میں پہلا مصرف عاملین صدقہ ہیں۔

عاملین: تیسرا مصرف الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا، یہاں عاملین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات زکوٰۃ و عشر وغیرہ لوگوں سے وصول کرکے بیت المال میں جمع کرنے کی خدمت

پر مامور ہوتے ہیں، یہ لوگ چونکہ اپنے تمام اوقات اس خدمت میں خرچ کرتے ہیں، اس لئے ان کی ضروریات کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہے، قرآن کریم کی اس آیت نے مصارف زکوٰۃ میں ان کا حصہ رکھ کر یہ متعین کر دیا کہ ان کا حق الخدمت اسی مد زکوٰۃ سے دیا جائے گا۔

اس میں اصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے مسلمانوں سے زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے کا فریضہ براہ راست رسول کریم ﷺ کے سپرد فرمایا ہے، جس کا ذکر اسی سورت میں آگے آنے والی اس آیت میں ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً یعنی وصول کریں آپ مسلمانوں کے اموال میں سے صدقہ۔

یہاں یہ بتلانا منظور ہے کہ اس آیت کی رو سے مسلمانوں کے امیر پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ زکوٰۃ صدقات وصول کرے اور یہ ظاہر ہے کہ امیر خود اس کام کو پورے ملک میں بغیر اعوان اور مددگاروں کے نہیں کر سکتا، انہی اعوان اور مددگاروں کا ذکر مذکور الصدر آیت میں وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔

انہی آیات کی تعمیل میں رسول کریم ﷺ نے بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صدقات وصول کرنے کے لئے عامل بنا کر مختلف خطوں میں بھیجا ہے اور آیت مذکورہ کی ہدایت کے موافق زکوٰۃ ہی کی حاصل شدہ رقم میں سے ان کو حق الخدمت دیا ہے، ان میں وہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں جو اغنیاء تھے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ کسی غنی یعنی مال دار کے لئے حلال نہیں، بجز پانچ شخصوں کے، ایک وہ شخص جو جہاد کے لئے نکلا ہے اور وہاں اس کے پاس بقدر ضرورت مال نہیں، اگرچہ وہ شخص کہ اگرچہ اس کے پاس مال ہے مگر وہ موجودہ مال سے زیادہ کا مقروض ہے، چوتھے وہ شخص جو صدقہ کا مال کسی غریب مسکین سے پیسے دے کر خرید لے، پانچویں وہ شخص جس کو کسی غریب فقیر نے صدقہ کا حاصل شدہ مال بطور ہدیہ تحفہ پیش کر دیا ہو۔

رہا یہ مسئلہ کہ عاملین صدقہ کو اس میں سے کتنی رقم دی جائے سو اس کا حکم یہ ہے کہ ان کی محنت و عمل کی حیثیت کے مطابق دی جائے گی (احکام القرآن جصاص، قرطبی) البتہ یہ ضروری ہو گا کہ

عاملین کی تنخواہیں نصف زکوٰۃ سے بڑھنے نہ پائیں، اگر زکوٰۃ کی وصول یابی اتنی کم ہو کہ عاملین کی تنخواہیں دے کر نصف بھی باقی نہیں رہتی تو پھر تنخواہوں میں کمی کی جائے گی، نصف سے زائد صرف نہیں کیا جائے گا۔ (تفسیر مظہری ظہیریہ)

بیان مذکور سے معلوم ہوا کہ عاملین صدقہ کو جو رقم مد زکوٰۃ سے دی جاتی ہے وہ بحیثیت صدقہ نہیں بلکہ ان کی خدمت کا معاوضہ ہے، اسی لئے باوجود غنی اور مال دار ہونے کے بھی وہ اس رقم کے مستحق ہیں اور زکوٰۃ سے ان کو دینا جائز ہے اور مصارف زکوٰۃ کی آٹھ مدات میں سے صرف ایک یہی مد ایسی ہے جس میں رقم زکوٰۃ بطور معاوضہ خدمت دی جاتی ہے، ورنہ زکوٰۃ نام ہی اس عطیہ کا ہے جو غریبوں کو بغیر کسی معاوضہ خدمت کے دیا جائے اور اگر کسی غریب فقیر کو کوئی خدمت لے کر مال زکوٰۃ دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔ (معارف القرآن)

دو سوالات: اسی لئے یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اول یہ کہ مال زکوٰۃ کو معاوضہ خدمت میں کیسے دیا گیا؟ دوسرے یہ کہ مال دار کے لئے اصلی حیثیت کو سمجھ لیا جائے، وہ یہ ہے کہ یہ حضرات فقراء کے وکیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ سب جانتے ہیں کہ وکیل کا قبضہ اصل موکل کے قبضہ کے حکم میں ہوتا ہے، اگر کوئی شخص اپنا قرض وصول کرنے کے لئے کسی کو وکیل مختار بنا دے اور قرضدار یہ قرض وکیل کو سپرد کر دے تو وکیل کا قبضہ ہوتے ہی قرضدار بری ہو جاتا ہے، تو جب رقم زکوٰۃ عاملین صدقہ نے فقراء وکیل ہونے کی حیثیت سے وصول کر لی تو ان کی زکوٰۃ ادا ہو گئی، اب یہ پوری رقم ان فقراء کی ملک ہے جن کی طرف سے بطور وکیل انہوں نے وصول کی ہے اب جو رقم بطور حق الخدمت کے ان کو دی جاتی ہے وہ مال داروں کی طرف سے نہیں بلکہ فقراء کی طرف سے ہوئی اور فقراء کو اس میں ہر طرح کا تصرف کرنے کا اختیار ہے، ان کو یہ بھی حق ہے کہ جب اپنا کام ان لوگوں سے لیتے ہیں تو اپنی رقم میں سے ان کو معاوضہ خدمت دیدیں۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ فقراء نے تو ان کو وکیل مختار بنایا نہیں، یہ ان کے وکیل کیسے بن گئے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ جس کو امیر کہا جاتا ہے وہ قدرتی طور پر منجانب اللہ

پورے ملک کے فقراء غرباء کا وکیل ہوتا ہے، کیونکہ ان سب کی ضروریات کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے، امیر مملکت جس جس کو صدقات وصول یابی پر عامل بنادے وہ سب ان کے نائب کی حیثیت سے فقراء کے وکیل ہو جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ عاملین صدقہ کو جو کچھ دیا گیا وہ در حقیقت زکوٰۃ نہیں دی گئی، بلکہ زکوٰۃ جن فقراء کا حق ہے ان کی طرف سے معاوضہ خدمت دیا گیا، جیسے کوئی غریب فقیر کسی کو اپنے مقدمہ کا وکیل بناوے اور اس کا حق الخدمت زکوٰۃ کے حاصل شدہ مال سے ادا کر دے تو یہاں نہ تو دینے والا بطور زکوٰۃ کے دے رہا ہے اور نہ لینے والا زکوٰۃ کی حیثیت سے لے رہا ہے۔

تفصیل مذکور سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آجکل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر صدقات زکوٰۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کے لئے وصول کرتے ہیں، ان کا وہ حکم نہیں جو عاملین صدقہ کا اس آیت میں مذکور ہے کہ زکوٰۃ کی رقم میں سے ان کی تنخواہ دی جاسکے، بلکہ ان کو مدارس اور انجمن کی طرف سے جداگانہ تنخواہ دینا ضروری ہے زکوٰۃ کی رقم سے ان کی تنخواہ نہیں دی جاسکتی، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں بلکہ اصحاب زکوٰۃ مال داروں کے وکیل ہیں، ان کی طرف سے مال زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے، اسی لئے ان کے قبضہ ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں۔

فقراء کا وکیل نہ ہونا اس لئے ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر کسی فقیر نے ان کو اپنا وکیل بنایا نہیں اور امیر المومنین کی ولایت عامہ کی بناء پر جو خود بخود وکالت فقراء حاصل ہوتی ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں، اس لئے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو اصحاب زکوٰۃ کا وکیل قرار دیا جائے اور جب تک یہ اس مال کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال والے کے پاس رکھی ہو۔

ایک غفلت: اس معاملہ میں عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے، بہت سے ادارے زکوٰۃ کا فنڈ وصول کر کے اس کو سالہا سال رکھے رہتے ہیں اور اصحاب زکوٰۃ سمجھتے ہیں کہ ہماری زکوٰۃ ادا ہو گئی، حالانکہ ان

کی زکوٰۃ اس وقت ادا ہو گی جب ان کی رقم مصارف زکوٰۃ میں صرف ہو جائے۔ اسی طرح بہت سے لوگ ناواقفیت سے ان لوگوں کو عاملین صدقہ کے حکم میں داخل سمجھ کر زکوٰۃ ہی کی رقم سے ان کی تنخواہ دیتے ہیں، یہ نہ دینے والوں کے لئے جائز ہے نہ لینے والوں کے لئے۔ (معارف القرآن)

مؤلفۃ القلوب: چوتھا مصرف مصارف زکوٰۃ میں سے مؤلّفۃ القلوب ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی دل جوئی کے لئے ان کو صدقات دیئے جاتے تھے، عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان میں تین چار قسم کے لوگ شامل تھے، کچھ مسلمان کچھ غیر مسلم، پھر مسلمانوں میں بعض تو وہ لوگ تھے جو غریب حاجت مند بھی تھے اور نو مسلم بھی، ان کی دل جوئی اس لئے کی جاتی تھی کہ اسلام پر پختہ ہو جائیں اور بعض وہ تھے جو مال دار بھی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے، مگر ابھی تک ایمان کا رنگ ان کے دلوں میں رچا نہیں تھا اور بعض وہ لوگ تھے جو خود تو پکے مسلمان تھے مگر ان کی قوم کو ان کے ذریعہ شر سے بچنے کے لئے ان کی دل جوئی کی جاتی تھی اور بعض وہ تھے جن کے بارے میں یہ تجربہ تھا کہ نہ تبلیغ و تعلیم سے اثر پذیر ہوتے ہیں، نہ جنگ و تشدد سے بلکہ احسان و حسن سلوک سے متاثر ہوتے ہیں، رحمۃ للعالمین ﷺ تو یہ چاہتے تھے کہ خلق خدا کو کفر کی ظلمت سے نکال کر نور ایمان میں لے آئیں، اس کے لئے ہر وہ جائز تدبیر کرتے تھے جس سے یہ لوگ متاثر ہو سکیں، یہ سب قسمیں عام طور پر مؤلفۃ القلوب میں داخل سمجھی جاتی ہیں، جن کو صدقات کا چوتھا مصرف اس آیت میں قرار دیا ہے۔

مؤلفۃ القلوب منسوخ: مؤلفۃ القلوب یہ وہ لوگ ہیں جن کی دل جوئی کے لئے ان صدقات سے حصہ دیا جاتا تھا، عام خیال کے مطابق ان میں مسلم و غیر مسلم دونوں طرح کے لوگ تھے، غیر مسلموں کی دل جوئی اسلام کی ترغیب کے لئے اور نو مسلموں کی دل جوئی اسلام پر پختہ کرنے کے لئے کی جاتی تھی، عام طور پر مشہور یہ ہے کہ ان کو رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں ایک خاص علت اور مصلحت کے لئے جس کا ذکر ابھی آچکا ہے صدقات دیئے جاتے تھے، آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جبکہ اسلام کو مادی قوت بھی حاصل ہو گئی اور کفار کے شر سے بچنے یا نو مسلموں کو اسلام پر پختہ کرنے کے

لئے اس طرح کی تدبیروں کی ضرورت نہ رہی تو وہ علت اور مصلحت ختم ہو گئی، اس لئے ان کا حصہ بھی ختم ہو گیا جس کو بعض فقہاء نے منسوخ ہو جانے سے تعبیر فرمایا، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حسن بصری، ابو حنیفہ، مالک بن انس رحمہم اللہ کی طرف یہی قول منسوب ہے۔

اور بہت سے حضرات نے فرمایا کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ منسوخ نہیں، بلکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس کو ساقط کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت نہ رہنے کی وجہ سے ان کا حصہ ساقط کر دیا گیا، آئندہ کسی زمانہ میں پھر ایسی ضرورت پیش آجائے تو پھر دیا جاسکتا ہے، امام زہری، قاضی عبد الوہاب ابن عربی، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے، لیکن تحقیق اور صحیح بات یہ ہے کہ غیر مسلموں کو صدقات وغیرہ سے کسی وقت کسی زمانہ میں حصہ نہیں دیا گیا اور نہ وہ مؤلفۃ القلوب میں داخل ہیں، جن کا ذکر مصارف صدقات میں آیا ہے۔ (معارف القرآن)

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ان سب لوگوں کے نام تفصیل کے ساتھ شمار کئے ہیں جن کی دل جوئی کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مد صدقات سے حصہ دیا ہے اور یہ سب شمار کرنے کے بعد فرمایا وَبِالْجُمْلَةِ فَكُلُّهُمْ مُؤْمِنٌ وَلَمْ يَكُنْ فِيهِمْ كَافِرٌ، یعنی خلاصہ یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب سب کے سب مسلمان ہی تھے، ان میں کوئی کافر شامل نہیں تھا۔

اسی طرح تفسیر مظہری میں ہے: لَمْ يَثْبُتْ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطٰى اَحَدًا مِّنَ الْكُفَّارِ لِلْاِيْلَافِ شَيْئًا مِّنَ الزَّكٰوةِ، یعنی یہ بات کسی روایت سے ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کافر کو مال زکوٰۃ میں سے اس کی دلجوئی کیلئے حصہ دیا ہو، اس کی تائید تفسیر کشاف کی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مصارف صدقات کا بیان یہاں ان کفار منافقین کے جواب میں آیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تقسیم صدقات کے بارے میں اعتراض کیا کرتے تھے کہ ہم کو صدقات نہیں دیتے، اس آیت میں مصارف صدقات کی تفصیل بیان فرمانے سے مقصد ہے کہ ان کو بتلا دیا جائے کہ کافر کا کوئی حق مال صدقات میں نہیں ہے، اگر مؤلفۃ القلوب میں کافر بھی داخل ہوں تو اس جواب کی ضرورت نہ تھی۔

تفسیر مظہری میں اس مغالطہ کو بھی اچھی طرح واضح کر دیا ہے جو بعض روایات حدیث کے سبب لوگوں کو پیش آیا ہے، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض غیر مسلموں کو کچھ عطیات دیئے ہیں، چنانچہ صحیح مسلم اور ترمذی کی روایت میں جو یہ مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صفوان بن امیہ کو کافر ہونے کے زمانے میں کچھ عطیات دیئے، اس کے متعلق امام نووی رحمہ اللہ کے حوالہ سے تحریر فرمایا کہ یہ عطیات زکوٰۃ کے مال سے نہ تھے، بلکہ غزوہ حنین کے مال غنیمت کا جو خمس بیت المال میں داخل ہوا اس میں سے دیئے گئے اور یہ ظاہر ہے کہ بیت المال کی اس مد سے مسلم وغیرہ دونوں پر خرچ کرنا باتفاق فقہاء رحمہم اللہ جائز ہے، پھر فرمایا کہ امام بیہقی، ابن سید الناس، امام ابن کثیر وغیرہم سب نے یہی قرار دیا ہے کہ یہ عطاء مال زکوٰۃ سے نہیں بلکہ خمس غنیمت سے تھی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خود رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں اموال صدقات اگرچہ بیت المال میں جمع کئے جاتے تھے مگر ان کا حساب بالکل جدا تھا اور بیت المال کی دوسری مدات جیسے خمس غنیمت یا خمس معادن وغیرہ ان کا حساب جدا اور ہر ایک کے مصارف جدا تھے، جیسا کہ حضرات فقہاء رحمہم اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اسلامی حکومت کے بیت المال میں چار مد علیحدہ رہنی چاہئیں اور اصل حکم یہ ہے کہ صرف حساب علیحدہ رکھنا نہیں بلکہ ہر ایک مد کا بیت المال الگ ہونا چاہئے تاکہ ہر ایک کو اس کے مصرف میں خرچ کرنے کی پوری احتیاط قائم رہے، البتہ اگر کسی وقت کسی خاص مد میں کمی ہو تو دوسری مد سے بطور قرض لے کر اس پر خرچ کیا جا سکتا ہے یہ مدات بیت المال یہ ہیں:

اول خمس غنائم: یعنی جو مال کفار سے بذریعہ جنگ حاصل ہو اس کے چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر کے باقی پانچواں حصہ: بیت المال کا حق ہے۔

خمس معادن: یعنی مختلف قسم کی کانوں سے نکلنے والی اشیاء میں سے پانچواں حصہ بیت المال کا حق ہے۔

خمس رکاز: یعنی جو قدیم خزانہ کسی زمین سے برآمد ہو اس کا بھی پانچواں حصہ بیت المال کا حق ہے، یہ تینوں قسم کے خمس بیت المال کی ایک ہی مد میں داخل ہیں۔

دوسری مد صدقات ہیں، جس میں مسلمانوں کی زکوٰۃ، صدقہ الفطر اور ان کی زمینوں کا عشر داخل ہے تیسری مد خراج اور مال فئی ہے، جس میں غیر مسلموں کی زمینوں سے حاصل شدہ خراج اور ان کا جزیہ اور ان سے حاصل شدہ تجارتی ٹیکس اور وہ تمام اموال داخل ہیں جو غیر مسلموں سے ان کی رضامندی کے ساتھ مصالحانہ طور پر حاصل ہوں۔

چوتھی مد ضوائع کی ہے، جس میں لاوارث مال، لاوارث شخص کی میراث وغیرہ داخل ہیں، ان چار مدات کے مصارف اگرچہ الگ الگ ہیں، لیکن فقراء و مساکین کا حق ان چاروں مدات میں رکھا گیا ہے، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلامی حکومت میں قوم کے اس ضعیف عنصر کو قوی کرنے کا کس قدر اہتمام کیا گیا ہے، جو درحقیقت اسلامی حکومت کا طغرٰی امتیاز ہے ورنہ دنیا کے عام نظاموں میں ایک مخصوص طبقہ ہی بڑھتا رہتا ہے، غریب کو بڑھنے کا موقع نہیں ملتا، جس کے ردعمل نے اشتراکیت اور کمیونزم کو جنم دیا، مگر وہ بالکل ایک غیر فطری اصول اور بارش سے بھاگ کر پرنالہ کے نیچے کھڑے ہوجانے کے مرادف اور انسانی اخلاق کے لئے سم قاتل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں چار بیت المال چار مدات کے لئے الگ الگ مقرر ہیں اور فقراء و مساکین کا حق چاروں میں رکھا گیا ہے، ان میں سے پہلی تین مدوں کے مصارف خود قرآن کریم نے تفصیل کے ساتھ متعین فرما کر واضح طور پر بیان کردیئے ہیں، پہلی مد یعنی خمس غنائم کے مصارف کا بیان سورہ انفال دسویں پارہ کے شروع میں مذکور ہے اور دوسری مد یعنی صدقات کے مصارف کا بیان سورہ توبہ کی مذکور الصدر ساٹھویں آیات میں آیا ہے، جس کی تفصیل اس وقت زیر بحث ہے، اور تیسری مد جس کو اصطلاح میں مال فئی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کا بیان سورہ حشر میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے، اسلامی حکومت کی اکثر مدات فوجی اخراجات اور عمال حکومت کی تنخواہیں وغیرہ اسی مد سے خرچ کی جاتی ہیں، چوتھی مد یعنی لاوارث مال رسول کریم ﷺ کی ہدایات اور خلفائے راشدین کے تعامل سے اپاہج محتاجوں اور لاوارث بچوں کے لئے مخصوص ہے۔ (شامی، کتاب الزکوٰۃ)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرات فقہاء نے بیت المال کی چاروں مدات بالکل الگ الگ رکھنے اور اپنے اپنے معینہ مصارف میں خرچ کرنے کی جو ہدایات دی ہیں، یہ سب قرآنی ارشادات اور رسول کریم ﷺ پھر خلفائے راشدین کے تعامل سے واضح طور پر ثابت ہیں۔

محققین، محدثین وفقہاء کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ کسی کافر کو کسی وقت بھی نہیں دیا گیا، نہ رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں اور نہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں اور جن غیر مسلموں کو دینا ثابت ہے وہ مد صدقات وزکوٰۃ سے نہیں بلکہ خمس غنیمت میں سے دیا گیا ہے، جس میں سے ہر حاجت مند مسلم وغیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے، تو مؤلفۃ القلوب صرف مسلم رہ گئے اور ان میں جو فقراء ہیں ان کا حصہ بدستور باقی ہونے پر پوری امت کا اتفاق ہے۔

اختلاف صرف اس صورت میں رہ گیا کہ یہ لوگ غنی صاحب نصاب ہوں تو امام شافعی امام احمد کے نزدیک چونکہ تمام مصارف زکوٰۃ میں فقر و حاجت مندی شرط نہیں، اس لئے وہ مؤلفۃ القلوب میں ایسے لوگوں کو بھی داخل کرتے ہیں جو غنی اور صاحب نصاب ہیں، امام اعظم ابو حنیفہ اور مام مالک کے نزدیک عاملین صدقہ کے علاوہ باقی تمام مصارف میں فقر و حاجت مندی شرط ہے، اس لئے مؤلفۃ القلوب کا حصہ بھی ان کو اسی شرط کے ساتھ دیا جائے گا کہ وہ فقیر و حاجتمند ہوں جیسے غارمین اور رقاب، ابن سبیل وغیرہ سب میں اسی شرط کے ساتھ ان کو زکوٰۃ دی جاتی ہے کہ وہ اس جگہ حاجتمند ہوں، گو وہ اپنے مقام میں مال دار ہوں۔

نتیجہ تحقیق: اس تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے نزدیک منسوخ نہیں فرق صرف اتنا ہے کہ بعض حضرات نے فقراء و مساکین کے علاوہ کسی دوسرے مصرف میں فقر و حاجت مندی کے ساتھ مشروط نہیں کیا اور بعض نے یہ شرط کی ہے، جن حضرات نے یہ شرط رکھی ہے وہ مؤلفۃ القلوب میں بھی صرف انہی لوگوں کو دیتے ہیں جو حاجتمند اور غریب ہوں، بہر حال یہ حصہ قائم اور باقی ہے (تفسیر مظہری)

حرف لام اور حرف فی: یہاں تک صدقات کے آٹھ مصارف میں سے چار کا بیان آیا ہے، ان چاروں کا حق حرف لام کے تحت بیان ہوا، لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ، آگے جن چار مصارف کا ذکر ہے ان میں عنوان بدل کر لام کی جگہ حرف فی استعمال فرمایا: وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ، زمخشری نے کشاف میں اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ یہ آخری چار مصرف بہ نسبت پہلے چار کے زیادہ مستحق ہیں، کیونکہ حرف فِی ظرفیت کے لئے بولا جاتا ہے، جس کی وجہ سے معنی یہ پیدا ہوتے ہیں کہ صدقات کو ان لوگوں کے اندر رکھ دینا چاہئے اور ان کے زیادہ مستحق ہونے کی وجہ ان کا زیادہ ضرورت مند ہونا ہے، کیونکہ جو شخص کسی کا مملوک غلام ہے وہ بہ نسبت عام فقراء کے زیادہ تکلیف میں ہے، اسی طرح جو کسی کا قرضدار ہے اور قرضخواہوں کا اس پر تقاضا ہے وہ عام غرباء فقراء سے زیادہ تنگی میں ہے کہ اپنے اخراجات کے فکر سے بھی زیادہ قرضداروں کے قرض کی فکر اس کے ذمہ ہے۔

وَفِي الرِّقَابِ: ان باقی ماندہ چار مصارف میں سب سے پہلے وَفِي الرِّقَابِ کا ذکر فرمایا ہے، رقاب رقبہ کی جمع ہے، اصل میں گردن کو رقبہ کہتے ہیں، عرف میں اس شخص کو رقبہ کہہ دیا جاتا ہے جس کی گردن کسی دوسرے کی غلامی میں مقید ہو۔

اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ رقاب سے مراد اس آیت میں کیا ہے؟ جمہور فقہاء و محدثین اس پر ہیں کہ اس سے مراد وہ غلام ہیں جن کے آقاؤں نے کوئی مقدار مال کی متعین کر کے کہہ دیا ہے کہ اتنا مال کما کر ہمیں دے دو تو تم آزاد ہو جس کو قرآن و سنت کی اصطلاح میں مکاتب کہا جاتا ہے ایسے شخص کو آقا اس کی اجازت دیدیتا ہے کہ وہ تجارت یا مزدوری کے ذریعہ مال کمائے اور آقا کو لا کر دے، آیت مذکورہ میں رقاب سے مراد یہ ہے کہ اس شخص کو رقم زکوٰۃ میں سے حصہ دے کر اس کی گلو خلاصی میں امداد کی جائے۔

یہ قسم غلاموں کی باتفاق مفسرین و فقہاء لفظ وَفِي الرِّقَابِ کی مراد ہے کہ رقم زکوٰۃ ان کو دے کر ان کی گلو خلاصی میں امداد کی جائے، ان کے علاوہ دوسرے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا یا ان کے

آقاؤں کو رقم زکوٰۃ دے کر یہ معاہدہ کرلینا کہ وہ ان کو آزاد کردیں گے، اس میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے، جمہور ائمہ ابو حنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل وغیرہ رحمہم اللہ اس کو جائز نہیں سمجھتے اور حضرت امام مالک بھی ایک روایت میں جمہور کے ساتھ متفق ہیں کہ وَفِي الرِّقَابِ کو صرف مکاتب غلاموں کے ساتھ مخصوص فرماتے ہیں اور ایک روایت میں امام مالک رحمہ اللہ سے یہ بھی منقول ہے وَفِي الرِّقَابِ میں عام غلاموں کو داخل کرکے اس کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ رقم زکوٰۃ سے غلام خرید کر آزاد کئے جائیں (احکام القرآن ابن عربی مالکی)

جمہور ائمہ وفقہاء جو اس کو جائز نہیں رکھتے، ان کے پیش نظر ایک فقہی اشکال ہے کہ اگر رقم زکوٰۃ سے غلام کو خرید کر آزاد کیا گیا تو اس پر صدقہ کی تعریف ہی صادق نہیں آتی، کیونکہ صدقہ وہ مال ہے جو کسی مستحق کو بلا معاوضہ دیا جائے، رقم زکوٰۃ اگر آقا کو دی جائے تو ظاہر ہے کہ نہ وہ مستحق زکوٰۃ ہے اور نہ اس کو یہ رقم بلا معاوضہ دی جارہی ہے اور غلام جو مستحق زکوٰۃ ہے اس کو یہ رقم دی نہیں گئی، یہ الگ بات ہے کہ اس رقم کے دینے کا فائدہ غلام کو پہنچ گیا کہ اس نے خرید کر آزاد کردیا، مگر آزاد کرنا صدقہ کی تعریف میں داخل نہیں ہوتا اور حقیقی معنی کو بلاوجہ چھوڑ کر صدقہ کے مجازی معنی عام مراد لینے کا بلاضرورت کوئی جواز نہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آیت مذکورہ میں مصارف صدقات کے بیان کئے جارہے ہیں، اس لئے وَفِي الرِّقَابِ کا مصداق کوئی ایسی چیز نہیں بن سکتی جس پر صدقہ کی تعریف ہی صادق نہ آئے اور اگر یہ رقم زکوٰۃ خود غلام کو دی جائے تو غلام کی کوئی ملک نہیں ہوتی وہ خود بخود آقا کا مال بن جائے گا، پھر آزاد کرنا نہ کرنا بھی اس کے اختیار میں رہے گا۔

اس فقہی اشکال کی وجہ سے جمہور ائمہ اور فقہاء نے فرمایا کہ وَفِي الرِّقَابِ سے مراد صرف غلام مکاتب ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ صدقہ کی ادائیگی کے لئے یہ شرط ہے کہ کسی مستحق کو مالک بنا کر اس کے قبضہ میں دے دیا جائے جب تک مستحق کا مالکانہ قبضہ اس پر نہیں ہوگا زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی

الغارمین: چھٹا مصرف الْغٰرِمِيْنَ، غارم کی جمع ہے، جس کے معنی مدیون یعنی قرضدار کے ہیں یہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ پانچواں اور چھٹا مصرف جو حرف فِي کے ساتھ بیان کیا گیا ہے استحقاق میں پہلے

چاروں مصارف سے زیادہ ہیں، اس لئے غلام کی گلو خلاصی کے لئے یا قرضدار کو ادائے قرض کے لئے دینا عام فقراء و مساکین کو دینے سے زیادہ افضل ہے، شرط یہ ہے کہ اس قرضدار کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے وہ قرض ادا کر سکے، کیونکہ غارم لغت میں ایسے ہی قرضدار کو کہا جاتا ہے اور بعض ائمہ فقہاء نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ یہ قرض اس نے کسی ناجائز کام کے لئے نہ لیا ہو اور اگر کسی گناہ کے لئے قرض لیا جیسے شراب وغیرہ یا شادی غمی کی ناجائز رسمیں وغیرہ تو ایسے قرضدار کو مد زکوٰۃ سے نہ دیا جائے گا، تاکہ اس کی معصیت اور اسراف بے جا کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔

فی سبیل اللہ: ساتواں مصرف فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ہے، یہاں پھر حرف فِی کا اعادہ کیا گیا، تفسیر کشاف میں ہے کہ اس اعادہ سے اس طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ یہ مصرف پہلے سب مصارف سے افضل اور بہتر ہے، وجہ یہ ہے کہ اس میں دو فائدے ہیں ایک تو غریب مفلس کی امداد دوسرے ایک دینی خدمت میں اعانت، کیونکہ فی سبیل اللہ سے مراد وہ غازی اور مجاہد ہے، جس کے پاس اسلحہ اور جنگ کا ضروری سامان خریدنے کے لئے مال نہ ہو، یا وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہو مگر اس کے پاس اب مال نہیں رہا جس سے وہ حج فرض ادا کرے، یہ دونوں کام خالص دینی خدمت اور عبادت ہیں، اس لئے مال زکوٰۃ کو ان پر خرچ کرنے میں ایک مفلس کی امداد بھی ہے اور ایک عبادت کی ادائیگی میں تعاون بھی، اسی طرح حضرات فقہاء نے طالب علموں کو بھی اس میں شامل کیا ہے کہ وہ بھی ایک عبادت کی ادائیگی کے لئے لیتے ہیں (روح بحوالہ ظہیریہ)

دینی کتابوں کی اشاعت میں زکوٰۃ: صاحب بدائع نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہے اور اس کی ادائیگی میں مال کی ضرورت ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے، بشرطیکہ اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کام کو پورا کر سکے، جیسے دین کی تعلیم اور تبلیغ اور ان کے لئے نشر واشاعت کہ اگر کوئی مستحق زکوٰۃ یہ کام کرنا چاہے تو اس کی امداد مال زکوٰۃ سے کر دی جائے مگر مال دار صاحب نصاب کو نہیں دیا جا سکتا۔ (البدائع والصنائع)

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان تمام صورتوں میں جو فی سبیل اللہ کی تفسیریں مذکور ہیں فقر و حاجتمندی کی شرط ملحوظ ہے، غنی صاحب نصاب کا اس مد میں بھی حصہ نہیں، بجز اس کے کہ اس کا موجودہ مال اس ضرورت کو پورا نہ کر سکتا ہو، جو جہاد یا حج کے لئے درپیش ہے، تو اگرچہ بقدر نصاب مال موجود ہونے کی وجہ سے اس کو غنی کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں اس کو غنی کہا گیا ہے، مگر وہ بھی اس اعتبار سے فقیر و حاجتمند ہی ہو گیا، کہ جس قدر مال جہاد یا حج کے لئے درکار ہے وہ اس کے پاس موجود نہیں۔

فتح القدیر میں شیخ ابن ہمام رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت صدقات میں جتنے مصرف ذکر کئے گئے ہیں ہر ایک کے الفاظ خود اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ فقر و حاجتمندی کی بناء پر مستحق ہیں، لفظ فقیر، مسکین میں تو یہ ظاہر ہی ہے، رقاب، غارمین، فی سبیل اللہ، ابن السبیل کے الفاظ بھی اس طرف مشیر ہیں کہ ان کی حاجت روائی کی بناء پر ان کو دیا جاتا ہے، البتہ عاملین کو بطور معاوضہ خدمت دیا جاتا ہے، اسی لئے اس میں غنی و فقیر برابر ہیں۔

انتہائی غلط طریقہ کار: لفظ فی سبیل اللہ کے لفظی معنی بہت عام ہیں، جو جو کام اللہ کی رضاجوئی کے لئے کئے جائیں وہ سب اس عام مفہوم کے اعتبار سے فی سبیل اللہ میں داخل ہیں، جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر و بیان اور ائمہ تفسیر کے ارشادات سے قطع نظر محض لفظی ترجمہ کے ذریعہ قرآن سمجھنا چاہتے ہیں یہاں ان کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ لفظ فی سبیل اللہ دیکھ کر زکوٰۃ کے مصارف میں ان تمام کاموں کو داخل کر دیا جو کسی حیثیت سے نیکی یا عبادت میں، مساجد، مدارس، شفاخانوں، مسافر خانوں وغیرہ کی تعمیر، کنویں اور پل اور سڑکیں بنانا اور ان رفاہی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں اور تمام دفتری ضروریات ان سب کو انہوں نے فی سبیل اللہ میں داخل کر کے مصرف زکوٰۃ قرار دیدیا، جو سراسر غلط ہے اور اجماع امت کے خلاف ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے قرآن کو براہ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا اور سمجھا ہے ان کی اور ائمہ تابعین رحمہم اللہ کی جتنی تفسیریں اس لفظ کے متعلق منقول ہیں ان

میں اس لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لئے مخصوص قرار دیا گیا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنے ایک اونٹ کو فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو فرمایا کہ اس اونٹ کو حجاج کے سفر میں استعمال کرو (مبسوط سرخسی، ص ۱۰ ج ۳)۔

امام ابن جریر، ابن کثیر، قرآن کی تفسیر روایات حدیث ہی سے کرنے کے پابند ہیں، ان سب نے لفظ فی سبیل اللہ کو ایسے مجاہدین اور حجاج کے لئے مخصوص کیا ہے جن کے پاس جہاد یا حج کا سامان نہ ہو اور جن حضرات فقہاء رحمہم اللہ نے طالب علموں یا دوسرے نیک کام کرنے والوں کو اس میں شامل کیا ہے تو اس شرط کے ساتھ کیا ہے کہ وہ فقیر و حاجتمند ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ فقیر و حاجتمند تو خود ہی مصرف زکوٰۃ میں سب سے پہلا مصرف ہیں، ان کو فی سبیل اللہ کے مفہوم میں شامل نہ کیا جاتا جب بھی وہ مستحق زکوٰۃ تھے، لیکن ائمہ اربعہ اور فقہاء امت رحمہم اللہ میں سے یہ کسی نے نہیں کہا کہ رفاہ عام کے اداروں اور مساجد و مدارس کی تعمیر اور ان کی جملہ ضروریات مصرف زکوٰۃ میں داخل ہیں، بلکہ اس کے خلاف اس کی تصریحات فرمائی ہیں کہ مال زکوٰۃ ان چیزوں میں صرف کرنا جائز نہیں، فقہاء حنفیہ میں سے شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ نے مبسوط اور شرح سیر میں اور فقہاء شافعیہ میں ابو عبید نے کتاب الاموال میں اور فقہاء مالکیہ میں سے دردیر رحمہم اللہ نے شرح مختصر خلیل میں اور فقہاء حنابلہ میں سے موفق نے مغنی میں اس کو پوری تفصیل سے لکھا ہے۔

ائمہ تفسیر اور فقہاء امت کی مذکورہ تصریحات کے علاوہ اگر ایک بات پر غور کر لیا جائے تو اس مسئلہ کے سمجھنے کے لئے بالکل کافی ہے وہ یہ کہ اگر زکوٰۃ کے مسئلہ میں اتنا عموم ہوتا کہ تمام طاعات و عبادات اور ہر قسم کی نیکی پر خرچ کرنا اس میں داخل ہو تو پھر قرآن میں ان آٹھ مصرفوں کا بیان (معاذ اللہ) بالکل فضول ہو جاتا ہے اور رسول کریم ﷺ کا ارشاد جو پہلے اسی سلسلہ میں بیان ہو چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مصارف صدقات متعین کرنے کا کام نبی کو بھی سپرد نہیں کیا بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصرف متعین فرما دیئے۔

تو اگر فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تمام طاعات اور نیکیاں داخل ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں زکوٰۃ کا مال خرچ کیا جاسکتا ہے تو معاذ اللہ یہ ارشاد نبوی بالکل غلط ٹھہرتا ہے، معلوم ہوا کہ فی سبیل اللہ کے لغوی ترجمہ سے جو ناواقف کو عموم سمجھ میں آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے، بلکہ مراد وہ ہے جو رسول کریم ﷺ کے بیان اور صحابہ و تابعین کی تصریحات سے ثابت ہے۔

آٹھواں مصرف ابْنِ السَّبِيْلِ ہے، سبیل کے معنی راستہ اور ابن کا لفظ اصل میں تو بیٹے کے لئے بولا جاتا ہے، لیکن عربی محاورات میں ابن اور اب اور اخ وغیرہ کے الفاظ ان چیزوں کے لئے بھی بولے جاتے ہیں جن کا گہرا تعلق کسی سے ہو، اسی محاورہ کے مطابق ابْنِ السَّبِيْلِ راہ گیر و مسافر کو کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کا گہرا تعلق راستہ قطع کرنے اور منزل مقصود پر پہنچنے سے ہے اور مصارف زکوٰۃ میں اس سے مراد وہ مسافر ہے جس کے پاس سفر میں بقدر ضرورت مال نہ ہو، اگرچہ اس کے وطن میں اس کے پاس کتنا ہی مال ہو، ایسے مسافر کو مال زکوٰۃ دیا جاسکتا ہے، جس سے وہ اپنے سفر کی ضروریات پوری کرلے، اور وطن واپس جاسکے۔ (ماخوذ از معارف القرآن)

مسئلہ تملیک: جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ زکوٰۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے یہ شرط ہے کہ ان مصارف میں سے کسی مستحق کو مال زکوٰۃ پر مالکانہ قبضہ دے دیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دیئے اگر کوئی مال انہی لوگوں کے فائدے کے لئے خرچ کر دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء امت رحمہم اللہ اس پر متفق ہیں کہ رقم زکوٰۃ کو مساجد یا مدارس یا شفا خانے یتیم خانے کی تعمیر میں یا ان کی دوسری ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں، اگرچہ ان تمام چیزوں سے فائدہ ان فقراء اور دوسرے حضرات کو پہنچتا ہے جو مصرف زکوٰۃ ہیں، مگر ان کا مالکانہ قبضہ ان چیزوں پر نہ ہونے کے سبب زکوٰۃ اس سے ادا نہیں ہوتی۔

البتہ یتیم خانوں میں اگر یتیموں کا کھانا کپڑا اور وغیرہ مالکانہ حیثیت سے دیا جاتا ہے تو صرف اس خرچ کی حد تک رقم زکوٰۃ صرف ہو سکتی ہے، اسی طرح شفاخانوں میں جو دوا حاجت مند غرباء کو مالکانہ حیثیت سے دے دیجائے اس کی قیمت رقم زکوٰۃ میں محسوب ہو سکتی ہے۔

اسی طرح فقہاء امت کی تصریحات ہیں کہ لاوارث میت کا کفن رقم زکوٰۃ سے نہیں لگایا جاسکتا، کیونکہ میت میں مالک ہونے کی صلاحیت نہیں، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ رقم زکوٰۃ کسی غریب مستحق کو دے دیجائے اور وہ اپنی خوشی سے اس رقم کو لاوارث میت کے کفن پر خرچ کر دے، اسی طرح اگر اس میت کے ذمہ قرض ہے تو اس قرض کو رقم زکوٰۃ سے براہ راست ادا نہیں کیا جاسکتا ہے، وہ اس رقم کے مالک ہو کر اپنی رضامندی کے ساتھ اس رقم سے میت کا قرض ادا کر سکتے ہیں، اسی طرح رفاہ عام کے سب کام جیسے کنواں یا پل یا سڑک وغیرہ کی تعمیر، اگرچہ ان کا فائدہ مستحقین زکوٰۃ کو بھی پہونچتا ہے، مگر ان کا مالکانہ قبضہ نہ ہونے کے سبب اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں ہوتی۔

ان مسائل میں چاروں ائمہ مجتہدین ابو حنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ اور جمہور فقہاء امت متفق ہیں، شمس الائمہ سرخسی نے اس مسئلہ کو امام محمد کی کتابوں کی شرح مبسوط اور شرح سیر میں پوری تحقیق اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، اور فقہاء شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ رحمہم اللہ کی عام کتابوں میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔

فقیہ شافعی امام ابو عبید نے کتاب الاموال میں فرمایا کہ میت کی طرف سے اس کے قرض کی ادائیگی یا اس کے دفن کے اخراجات میں اور مساجد کی تعمیر میں، نہر کھودنے وغیرہ میں مال زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں، کیونکہ سفیان ثوری اور تمام ائمہ رحمہم اللہ اس پر متفق ہیں کہ اس میں خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، کیونکہ یہ ان آٹھ مصارف میں سے نہیں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔

اسی طرح فقیہ حنبلی موفق نے مغنی میں لکھا ہے کہ بجز ان مصارف کے جن کا بیان قرآن کریم میں مذکور ہے اور کسی نیک کام میں مال زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں جیسے مساجد یا پلوں اور پانی کی سبیلوں کی تعمیر، یا سڑکوں کی درستی یا مردوں کو کفن دینا یا مہمانوں کو کھانا کھلانا وغیرہ جو بلاشبہ موجب ثواب ہیں، مگر مصارف صدقات میں داخل نہیں۔

ملک العلماء نے بدائع میں ادائیگی زکوٰۃ کے لئے شرط تملیک کی یہ دلیل دی ہے کہ قرآن میں

عموماً زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کا لفظ ایتاء کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ، وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ،اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ،وَاٰتُوْا حَقَّہٗ یَوْمَ حَصَادِہٖ،

اور لفظ ایتاء لغت میں عطاء کرنے کے معنی میں آتا ہے، امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں فرمایا وَالْاِیتَاءُ الْاِعْطَاءُ وَخُصَّ وَضْعُ الصَّدَقَۃِ فِی الْقُرْآنِ بِالْاِیتَاءِ ، یعنی ایتاء کے معنی عطاء فرمانے کے ہیں اور قرآن میں صدقہ واجبہ ادا کرنے کو ایتاء کے لفظ کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی کو کوئی چیز عطاء کرنے کا مفہوم حقیقی یہی ہے کہ اس کو اس چیز کا مالک بنا دیا جائے۔

اور علاوہ زکوٰۃ و صدقات کے بھی لفظ ایتاء قرآن کریم میں مالک بنا دینے ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، مثلاً وَاٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِہِنَّ یعنی دے دو عورتوں کو ان کے مہر، ظاہر ہے مہر کی ادائیگی جب ہی تسلیم ہوتی ہے جب رقم مہر پر عورت کو مالکانہ قبضہ دیدے۔ دوسرے یہ کہ قرآن کریم میں زکوٰۃ صدقہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ، اور صدقہ کے معنی حقیقی یہی ہیں کہ کسی فقیر حاجتمند کو اس کا مالک بنا دیا جائے۔

کسی کو کھانا کھلا دینا یا رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کر دینا حقیقی معنی کے اعتبار سے صدقہ نہیں کہلاتا، شیخ ابن ہمام رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں فرمایا کہ حقیقت صدقہ کی بھی یہی ہے کہ کسی فقیر کو اس مال کا مالک بنا دیا جائے اسی طرح امام جصاص رحمہ اللہ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ لفظ صدقہ تملیک کا نام ہے (جصاص، ص ۱۵۲ ج ۲)

بندہ نے اپنی اس کتاب میں حساس مقامات پر حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کی تحریر کردہ عبارت او مضمون کو ہمیشہ ترجیح دی ہے، چونکہ ان حساس مقامات پر نئی تحقیق کے جوش میں بڑے بڑے لکھاریوں نے خطاء کا ارتکاب کیا ہے، اس لیے میں نے نئی تحقیق کی بجائے اپنے اکابر کی تحقیق کو ہی ترجیح اور اولیت دی ہے، یہاں بھی زکوٰۃ کے مسئلہ میں حضرت مفتی صاحب کی تحقیق پر اکتفا کرتے ہوئے اسے من و عن نقل کیا ہے۔

چند ایام پہلے میری نظر سے کویت سے شائع ہونے والا کثیر الاشاعت مجلہ المجتمع گزرا جس میں عالم عرب کے مشہور و معروف عالم دین علامہ یوسف القرضاوی کا ایک فتویٰ شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے مغربی ممالک میں موجود اسلامک سنٹرز کے قیام وانصرام کے حوالے سے فتویٰ دیا ہے کہ وہ چونکہ فی سبیل اللہ کی فہرست میں آتے ہیں اس لیے ان پر زکوٰۃ استعمال ہو سکتی ہے، جس پر کافی دیر تک میں دل ہی دل میں خوشی محسوس کرتا رہا کہ چلو عالم اسلام میں کسی عالم نے فی سبیل اللہ کی قید کی وضاحت کی ہے، مگر مجھے شرح صدر حضرت مفتی شفیع صاحب کی اس تفصیلی تحریر سے ہی ہوا ہے، اس لیے میں نے مصارف زکوٰۃ کے ذیل میں انہی کی مکمل عبارت نقل کر دی ہے۔

منافقین کی طرف سے ایذا رسانی

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کیجیے

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ {٦١} يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ {٦٢} اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ {٦٣} يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِءُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ {٦٤} وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ {٦٥} لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً ۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ {٦٦} التوبة.

جواب ترجمہ: اور ان میں بعض وہ لوگ ہیں جو نبی کو تکلیف دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بس وہ تو کان ہیں آپ فرما دیجیے کہ وہ تمہارے لیے خیر کا کان ہیں۔ وہ ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور یقین کرتے ہیں

مومنین کی بات کا، اور وہ ان لوگوں کے لیے رحمت ہیں جو تم میں سے مومن ہیں، اور جو لوگ اللہ کے رسول کو تکلیف دیتے ہیں۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہ لوگ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کرلیں اور اللہ اور اس کا رسول اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ انہیں راضی کریں اگر یہ لوگ مومن ہیں۔ کیا ان لوگوں نے اس بات کو نہیں جانا کہ جو شخص اللہ کی اور ان کے رسول کی مخالفت کرے اس کے لیے دوزخ کا عذاب ہے وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ یہ بڑی رسوائی ہے۔

منافقین اس بات سے ڈرتے ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان باتوں کو بتادے جو ان کے دلوں میں ہیں۔ آپ فرمادیجیے کہ تم مذاق بنالو۔ بلاشبہ اللہ اس چیز کو ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم ڈرتے ہو۔ اور اگر آپ ان سے سوال کریں گے تو وہ کہہ دیں گے کہ ہم تو بس یونہی باتوں میں مشغول تھے اور دل لگی کر رہے تھے۔ آپ فرمادیجیے کہ کیا تم اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ہنسی کرتے تھے۔ عذر بیان نہ کرو۔ تم اپنے ایمان کے بعد کافر ہوگئے، اگر ہم تم میں سے ایک جماعت کو معاف کر دیں گے تو دوسری جماعت کو ہم عذاب دیں گے اس وجہ سے کہ وہ مجرم تھے۔

وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ: منافقین میں سے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو نبی کریم ﷺ کو اپنی زبانوں سے تکلیف اور ایذا دیتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ یہ تو ہر وہ بات سن لیتے ہیں جو ان کے سامنے کہی جاتی ہے اور اس کو سچا بھی سمجھ لیتے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو فرمایا کہ انہیں آپ بتادیں کہ محمد ﷺ ایسا کان ہیں جو ہر بھلائی کی بات کو سن لیتا ہے، وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان کی باتوں کی تصدیق کرتا ہے جو اسے بتاتے ہیں، وہ اپنے پیروکاروں کے لیے اور ہدایت پانے والوں کے لیے رحمت اور شفقت رکھنے والے ہیں، مگر جو لوگ نبی کریم ﷺ کو ایذا اور تکلیف دیتے ہیں خواہ یہ تکلیف اور ایذا کسی بھی شکل میں ہو تو ان ایذا دینے والوں کے لیے سخت تکلیف دہ عذاب اللہ کی طرف سے تیار ہے۔

شانِ نزول: یہ آیت منافقین کی ایک جماعت کے متعلق نازل ہوئی یہ لوگ نبی کو ایذا دیتے اور نامناسب گفتگو کرتے ان میں سے کسی نے کہا ایسا نہ کرو ہمیں ڈر ہے کہ کہیں تمہاری باتیں انہیں معلوم نہ ہو جائیں کہ پھر وہ ہم پر ٹوٹ پڑیں تو جلاس بن سوید نے کہا ہم تو جو چاہتے ہیں کہتے ہیں پھر ان کے پاس جاتے ہیں تو ہم (ان کے سامنے) جو بھی کہیں وہ ہماری تصدیق کرتے ہیں بس محمد تو سننے والے کان ہیں تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (اسباب النزول، نیشاپوری، قرطبی ۸ / ۱۹۲، ابن کثیر ۲ / ۳۶۶)

محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ یہ آیت منافقین میں سے ایک شخص نبتل بن حارث کے متعلق نازل ہوئی یہ برص زدہ تھا سرخ آنکھوں والا، سرخی مائل سیاہ گالوں والا بد شکل آدمی تھا یہی وہ شخص ہے جس کے متعلق نبی نے فرمایا کہ جو شخص شیطان کو دیکھنا چاہتا ہے وہ نبتل بن حارث کو دیکھ لے یہ نبی کی باتیں منافقین کی طرف چغلی کیا کرتا تھا اس سے کسی نے کہا ایسا نہ کر تو اس نے کہا محمد تو کان ہیں جو بھی ان سے کوئی بات کرے یہ اس کی تصدیق کر دیتے ہیں ہم جو چاہتے ہیں کہتے ہیں پھر ان کے پاس جا کر ان کے سامنے قسم اٹھا لیتے ہیں تو یہ ہماری تصدیق کر دیتے ہیں اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (طبری)

سدی کہتے ہیں کہ منافقین میں سے کچھ لوگ جمع ہوئے ان میں جلاس بن سوید بن صامت اور ودیعہ بن ثابت بھی تھے انہوں نے نبی کی غیبت کرنے کا ارادہ کیا ان کے پاس اس وقت ایک انصاری لڑکا عامر بن قیس بھی موجود تھا لیکن انہوں نے اسے حقیر جانا اور اپنی گفتگو کر دی اور کہا کہ اگر محمد جو کہتے ہیں سچ ہے تو پھر تو ہم گدھے سے بھی بدتر ہیں وہ لڑکا نبی کے پاس آیا اور آپ کو اس کی خبر دی آپ نے انہیں بلایا اور ان سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے قسم اٹھالی کہ کہ عامر جھوٹا ہے اور عامر نے اس بات پر قسم کھالی کہ یہ جھوٹے ہیں اور کہا اے اللہ! ہمارے متفرق ہونے سے پہلے جھوٹے کے جھوٹ اور سچے کے سچ کو ظاہر فرما۔ اس موقع پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (در منثور ۳ / ۳۵۳)

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ: یہ منافق تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، اے اہلِ ایمان! کہ انہوں نے رسولِ اکرم ﷺ کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہی جو آپ کو اذیت دے،

ان کی یہ قسمیں سچائی کے اظہار کے لیے نہیں، بلکہ تمہیں راضی کرنے اور اپنے بارے میں بد گمانی کو دور کرنے کی ایک ظاہری کوشش ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ چند الفاظ اور قسموں کے ذریعے دلوں کو مطمئن کیا جاسکتا ہے، حالانکہ ان کے باطن میں کچھ اور ہی چھپا ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ: حالانکہ اگر ان کے دلوں میں واقعی ایمان ہوتا تو وہ سب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو راضی کرنے کی فکر کرتے، نہ کہ لوگوں کی خوشنودی کے طالب بنتے، ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے قول و عمل کو اس معیار پر پرکھے کہ آیا اس سے اللہ اور اس کے رسول راضی ہوتے ہیں یا نہیں، جو شخص سچا مؤمن ہو، وہ مخلوق کی رضا کو خالق کی رضا پر مقدم نہیں کرتا۔

یوں یہ آیت واضح کر دیتی ہے کہ منافق کی پہچان یہ ہے کہ وہ ظاہری صفائی پیش کرتا ہے، قسمیں کھاتا ہے، مگر اس کی اصل ترجیح لوگوں کی خوشنودی ہوتی ہے؛ جبکہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ اور اس کے رسول کی رضا کو اپنا مقصدِ حیات بنائے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے مقابلہ کرتا ہے تو اس کے لئے جہنم کی آگ (تیار) ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا؟ یہ بڑی رسوائی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کیا ان منافقوں کو یہ شعور نہیں کہ اپنے اس طرزِ عمل کے ذریعے وہ درحقیقت اللہ اور اس کے رسول کے مخالف بن رہے ہیں؟ کیا انہیں اندازہ نہیں کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی مول لیتا ہے، اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کی راہ اختیار کرے گا، وہ قیامت کے دن جہنم کی آگ میں داخل کیا جائے گا، جہاں اسے ہمیشہ رہنا ہوگا، وہاں نہ کوئی رہائی ہوگی، نہ مہلت، نہ واپسی کا کوئی راستہ، یہی ہے وہ کھلا ہوا خسارہ، یہی ہے وہ عظیم رسوائی اور دائمی ذلت، جس میں انسان اپنی سرکشی اور عناد کے سبب خود کو مبتلا کر لیتا ہے، دنیا کی عارضی چالاکیاں اور ظاہری پردہ پوشیاں وہاں کچھ کام نہ آئیں گی، وہاں صرف سچا ایمان اور خالص اطاعت ہی نجات کا ذریعہ بنے گی۔

يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ: یہ منافق اس اندیشے میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں اللہ اپنے رسول پر ایسی سورت نازل نہ فرما دے جو ان کے دلوں میں چھپے ہوئے کفر اور نفاق کو اہلِ ایمان پر ظاہر کر دے، ان کے چہروں پر اگرچہ اطمینان کا پردہ ہوتا ہے، مگر باطن میں خوف کی ایک چنگاری سلگتی رہتی ہے کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے۔

قُلِ اسْتَهْزِئُوا إِنَّ اللَّهَ مُخْرِجٌ مَا تَحْذَرُونَ: اے میرے حبیب ﷺ! آپ ان سے فرما دیجیے: تم اپنی ٹھٹھہ بازی اور دین پر طعن و تمسخر کا سلسلہ جاری رکھو، اللہ وہ سب کچھ ظاہر کر کے رہے گا جس کے کھل جانے سے تم خائف ہو، چاہے کسی نئی سورت کے ذریعے، یا اپنے رسول کو آگاہ کر کے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ: اور اگر آپ ان سے باز پرس کریں کہ تم نے ایمان والوں کا مذاق کیوں اڑایا اور دین کے بارے میں وہ باتیں کیوں کہیں؟ تو وہ فوراً یہ عذر پیش کریں گے کہ ہم تو محض باتوں ہی باتوں میں دل لگی کر رہے تھے، ہمارا مقصد سنجیدہ نہ تھا، آپ فرما دیجیے: کیا تم اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے تھے؟

لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ: اب جھوٹے بہانے نہ تراشو، تم نے اپنے اس استہزا کے ذریعے اس کفر کو ظاہر کر دیا ہے جسے پہلے دلوں میں چھپائے ہوئے تھے، البتہ اگر تم میں سے کوئی گروہ سچے دل سے نفاق چھوڑ کر توبہ کرے اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کر لے، تو ممکن ہے اسے معاف کر دیا جائے، لیکن جو لوگ اپنی روش پر اصرار کریں گے اور توبہ کی راہ اختیار نہ کریں گے، وہ عذاب کے مستحق ہوں گے۔

یوں یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ دین کے معاملے میں تمسخر کوئی ہلکی بات نہیں، یہ ایمان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتا ہے۔ اللہ کے نزدیک نیتوں کے پردے دیر تک قائم نہیں رہتے، وہ انہیں چاک کر کے حقیقت کو نمایاں کر دیتا ہے۔

منافقین کی بری عادات

سوال منافق مردوں اور منافق عورتوں کے کچھ احوال یہاں بیان کیے گئے ہیں، ان کی وضاحت قرآنی آیات کی روشنی میں کیجیے۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ {٦٧}وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ {٦٨}كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ {٦٩} التوبة.

جواب ترجمہ: منافق مرد اور منافق عورتیں آپس میں سب ایک ہی طرح کے ہیں۔ بری باتوں کا حکم کرتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے، سو اللہ انہیں بھول گیا، بیشک منافقین نافرمان ہی ہیں۔ اللہ نے منافق مردوں سے اور منافق عورتوں سے اور تمام کافروں سے دوزخ کی آگ کا وعدہ فرمایا ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ان کے لیے دوزخ کافی ہے اور اللہ نے ان کو ملعون قرار دیدیا اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ تمہاری حالت انہیں لوگوں کی طرح سے ہے جو تم سے پہلے تھے، وہ لوگ قوت میں تم سے زیادہ سخت اور مال و اولاد میں تم سے زیادہ تھے۔ سو انہوں نے اپنے حصہ سے فائدہ حاصل کیا جو تم سے پہلے تھے۔ اور تم بھی ایسے ہی گھستے چلے گئے جیسا کہ وہ لوگ گھسے تھے۔ ان کے اعمال دنیا و آخرت میں اکارت ہو گئے، اور وہ لوگ نقصان میں پڑنے والے ہیں۔

الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ: منافق مرد ہوں یا عورتیں، سب اپنے نفاق کی حقیقت میں یکساں ہیں، ان کے دل ایک ہی روش پر جمع ہیں اور ان کا طرزِ عمل اہلِ ایمان کے بالکل برعکس ہے، جہاں مومن نیکی کا علم بلند کرتا ہے، وہاں یہ برائی کو فروغ دیتے ہیں، جہاں اہلِ ایمان معروف کا حکم دیتے ہیں، یہ منکر کو رواج دیتے ہیں اور جہاں نیکی کی حفاظت مطلوب ہو، یہ اس کے خلاف صف آراد کھائی دیتے ہیں۔

يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ: اللہ تعالیٰ ان منافقین کی بری خصلتوں اور عادات سے آگاہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ بھلائی سے روکتے اور برائی کی ترغیب دیتے ہیں، اور اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل کرتے ہیں، ان کے دلوں میں نہ اخلاص کی حرارت ہے، نہ ایثار کی روشنی۔

نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ: انہوں نے اللہ کی اطاعت کو پسِ پشت ڈال دیا، اس کے احکام سے روگردانی اختیار کی، چنانچہ اللہ نے بھی انہیں اپنی توفیق سے محروم کر دیا، جب بندہ اپنے رب کو بھلا دے تو انجام یہی ہوتا ہے کہ وہ ہدایت کی دستگیری سے محروم ہو جاتا ہے۔

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ: بلاشبہ یہی منافق وہ لوگ ہیں جو اطاعتِ الٰہی کی شاہراہ چھوڑ کر معصیت کی راہوں پر نکل کھڑے ہوتے ہیں اور حق کے راستے سے ہٹ کر گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں، ان کی زندگی ظاہر میں اگرچہ مسلمانوں جیسی دکھائی دے، مگر باطن میں وہ حق سے دور اور انحراف کی تاریکیوں میں گرفتار ہوتے ہیں۔

وَعَدَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا هِيَ حَسْبُهُمْ: اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں اور ان کافروں کے لیے، جو اپنی سرکشی سے باز نہ آئے اور توبہ کی راہ اختیار نہ کی، یہ وعدہ فرمادیا ہے کہ وہ جہنم کی آگ میں داخل کیے جائیں گے اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے، یہ آگ ہی ان کے لیے بطورِ سزا کافی ہے، ایسی سزا جو ان کے کفر، نفاق اور ہٹ دھرمی کے عین مطابق ہے۔

وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ ان منافقین کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انہیں اللہ کی رحمت سے دور کر دیا جائے گا، وہ رحمت جس کی ایک جھلک دنیا و آخرت کی ہر بھلائی کا سرچشمہ ہے، جب بندہ اپنے اختیار سے رحمت کے دروازے بند کر لے تو انجام یہی ہوتا ہے کہ اس پر محرومی کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ: اللہ تعالیٰ ان منافقین کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کے لیے دائمی عذاب ہے، ایسا عذاب جو تھمنے والا نہیں، جس میں نہ کمی آئے گی اور نہ انہیں اس سے نجات نصیب ہو گی، یہی ہے نفاق اور کفر کی آخری منزل، ابدی حسرت، دائمی محرومی اور رحمتِ الٰہی سے قطعی بے نصیبی۔

كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَأَكْثَرَ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا: اللہ تعالیٰ ان منافقین کو مخاطب فرما رہے ہیں کہ اے گروہِ منافقین! تم اپنے کفر اور استہزا کی روش میں ان گزشتہ امتوں ہی کی مانند ہو جو تم سے پہلے حق کو جھٹلا چکی ہیں، وہ تم سے کہیں بڑھ کر قوت و شوکت رکھتی تھیں، مال و اولاد میں بھی تم سے زیادہ تھیں، مگر انجام کے اعتبار سے ان کی برتری انہیں کچھ فائدہ نہ دے سکی۔

فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا: اللہ تعالیٰ ان منافقین کو امم سابقہ کے احوال سے مطلع فرما رہے ہیں کہ انہوں نے بھی دنیا کے اس حصے سے لطف اٹھایا جو ان کے لیے مقدر تھا، اس کی لذتوں اور خواہشات میں ڈوبے رہے اور تم نے بھی اپنے مقررہ حصے سے اسی طرح فائدہ اٹھایا جس طرح وہ اٹھا چکے تھے، انہوں نے بھی حق کا انکار کیا، رسولوں پر طعن کیا، اور تم بھی تکذیب و تمسخر کی اسی راہ پر گامزن ہو، تمہاری زبانوں پر بھی وہی اعتراضات ہیں، تمہارے دلوں میں بھی وہی انکار اور تمہاری مجلسوں میں بھی وہی استہزا کی بازگشت۔

أُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ: یہی وہ لوگ ہیں جن کی بداعمالیاں، ان کے کفر کے باعث، اللہ کے نزدیک بے وزن ہو گئیں، ان کے اعمال، جو بظاہر کچھ نیکی کا رنگ رکھتے ہوں، حقیقت میں قبولیت سے محروم رہے، کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل بارگاہِ الٰہی میں معتبر نہیں ہوتا۔

وَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ: اور یہی دراصل وہ خسارہ ہے جو سب سے بڑا خسارہ ہے، انسان اپنی ہی جان کو ہلاکت کے گھاٹ اتار دے، انہوں نے اپنے آپ کو ایسے انجام کے سپرد کر دیا جو تباہی اور محرومی کے سوا کچھ نہیں، یہی لوگ حقیقی خسارے میں مبتلا ہیں، جنہوں نے دنیا کی عارضی لذت کے بدلے اپنی ابدی فلاح کھو دی۔

یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کریں اور یہ بتائیں کہ قوم عاد، قوم ثمود، اصحاب مدین اور مؤتفکات کی طرف بھیجے جانے والے انبیاء کرام علیہم السلام کے نام کیا تھے؟

اَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ۭ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ {۷۰} التوبة.

جواب ترجمہ: کیا ان کے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے تھے یعنی قوم نوح، اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور مدین والے لوگ اور الٹی ہوئی بستیاں۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی دلیلیں لے کر آئے سو اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔

قوم عاد کی طرف حضرت ھود علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا، قوم ثمود کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا، اصحاب مدین کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا، مؤتفکات یعنی جن بستیوں کو الٹ پلٹ دیا گیا تھا ان کی طرف حضرت لوط علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔

ان بد کردار منافقوں کو وعظ سنایا جارہا ہے کہ اپنے سے پہلے کے اپنے جیسوں کے حالات پر عبرت کی نظر ڈالو، دیکھو کہ نبیوں کی تکذیب کیا پھل لائی؟ قوم نوح کا غرق ہونا اور سوا مسلمانوں کے کسی کا نہ بچنا یاد کرو، عادیوں کا ہود علیہ السلام کے نہ ماننے کی وجہ سے ہوا کے جھونکوں سے تباہ ہونا یاد کرو، ثمودیوں کا حضرت صالح علیہ السلام کے جھٹلانے اور اللہ کی نشانی اونٹنی کے کاٹ ڈالنے سے ایک جگر دوز کڑاکے کی آواز

سے تباہ و برباد ہونا یاد کرو۔

ابراہیم علیہ السلام کا دشمنوں کے ہاتھوں سے بچ جانا اور ان کے دشمنوں کا غارت ہونا، نمرود بن کنعان بن کوش جیسے بادشاہ کا مع اپنے لاؤ لشکر کے تباہ ہونا نہ بھولو، وہ سب لعنت کے مارے بے نشان کر دیئے گئے، قوم شعیب انہی بد کرداریوں اور کفر کے بدلے زلزلے اور سائبان والے دن کے عذاب سے تہ و بالا کر دی گئی، جو مدین کی رہنے والی تھی، قوم لوط جن کی بستیاں الٹی پڑی ہیں مدین اور سدوم وغیرہ اللہ نے انہیں بھی اپنے نبی لوط علیہ السلام کو نہ ماننے اور اپنی بد فعلی نہ چھوڑنے کے باعث ایک ایک کو پیوند زمین کر دیا۔

ان کے پاس ہمارے رسول ہماری کتاب اور کھلے معجزے اور صاف دلیلیں لے کر پہنچے لیکن انہوں نے ایک نہ مانی، بالآخر اپنے ظلم سے آپ برباد ہوئے، اللہ تعالیٰ نے تو حق واضح کر دیا کتاب اتار دی رسول بھیج دیئے حجت ختم کر دی لیکن یہ رسولوں کے مقابلے پر آمادہ ہوئے کتاب اللہ کی تعمیل سے بھاگے حق کی مخالفت کی تو ان پر اللہ کی لعنت اتری جس نے انہیں سیاہ خاک کر دیا۔

اہل ایمان کی صفات، ان کے لیے وعدہ جنت

سوال مومن مردوں اور مومن عورتوں کی صفات قرآنی ارشاد کی روشنی میں بیان کیجیے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ {۷۱} وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ {۷۲} التوبة.

جواب ترجمہ: اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے اور بری باتوں سے منع کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے اور اللہ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا۔ بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے۔

اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ فرمایا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور ایسے عمدہ مکانوں کا وعدہ فرمایا جو ہمیشگی والے باغوں میں ہوں گے اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے یہ بڑی کامیابی ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ: اہلِ ایمان، مرد ہوں یا عورتیں، ایک دوسرے کے مددگار اور پشت پناہ ہیں، ایمان کی مشترکہ بنیاد نے انہیں ایک مضبوط رشتہ میں باندھ دیا ہے۔

يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: وہ ایک دوسرے کی خیر خواہی کرتے ہیں، نیکی کو فروغ دیتے ہیں اور بھلائی کی راہوں کو ہموار کرتے ہیں، جو کچھ اللہ کو محبوب ہے، توحید، نماز، اطاعت اور ہر طرح کی بندگی، اس کا حکم دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ کو ناپسند ہے، کفر، ظلم، سود اور دیگر معاصی، اس سے روکتے ہیں۔

وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ: وہ نماز کو پورے اہتمام اور خشوع کے ساتھ قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو شعار بناتے ہیں۔

أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ: نماز قائم کرنے والے، زکوٰۃ ادا کرنے والے، اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنے والے یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے ان پاکیزہ اوصاف کے باعث رحمتِ الٰہی کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ بے شک اللہ غالب ہے، کوئی اس کے فیصلے کو ٹال نہیں سکتا اور وہ حکمت والا ہے، اس کی تخلیق، تدبیر اور شریعت سب حکمت سے معمور ہیں۔

وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا: اور ان مؤمن مردوں اور عورتوں سے اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ قیامت کے دن انہیں ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ وہاں موت آئے گی، نہ نعمتوں کا سلسلہ منقطع ہو گا، انہیں پاکیزہ اور دلنشین مکانات عطا کیے جائیں گے، دائمی قیام کے باغات میں۔

وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ ذَالِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ: اور ان سب سے بڑھ کر اللہ کی رضا ملے گی، وہ رضا جو ہر نعمت سے برتر اور ہر عطا سے عظیم تر ہے، یہی وہ کامیابی ہے جو حقیقی کامیابی ہے، ایسی فتح جو کسی اور فتح کے ہم پلہ نہیں، دنیا کی ہر کامیابی اس کے مقابلے میں ہیچ ہے، کیونکہ یہاں نعمت کے ساتھ رضائے الٰہی کا تاج بھی نصیب ہو گا۔

کفار سے جہاد بالسیف، منافقین سے جہاد باللسان

سوال ان آیات کا منظر پس منظر بیان کیجیے

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ {۷۳} يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ {۷۴} وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ {۷۵} فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ {۷۶} فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ {۷۷} اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ {۷۸} اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ {۷۹} اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ {۸۰} التوبة.

جواب ترجمہ: اے پیغمبر ﷺ! کافروں اور منافقوں سے لڑو اور ان پر سختی کرو۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔ یہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے (تو کچھ) نہیں کہا حالانکہ

انہوں نے کفر کا کلمہ کہا ہے اور یہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے ہیں اور ایسی بات کا قصد کر چکے ہیں جس پر قدرت نہیں پا سکے اور انہوں نے (مسلمانوں میں) عیب ہی کو نسا دیکھا ہے سوا اس کے کہ اللہ نے اپنے فضل سے اور اس کے پیغمبر ﷺ نے (اپنی مہربانی سے) ان کو دولتمند کر دیا ہے؟ تو اگر یہ لوگ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہو گا اور اگر منہ پھیر لیں تو خدا ان کو دنیا اور آخرت میں دُکھ دینے والا عذاب دے گا۔ اور زمین میں ان کا کوئی دوست اور مددگار نہ ہو گا۔ اور ان میں بعض ایسے ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہم کو اپنی مہربانی سے (مال) عطا فرمائے گا تو ہم ضرور خیرات کیا کریں گے اور نیکوکاروں میں ہو جائیں گے۔ لیکن جب خدا نے ان کو اپنے فضل سے (مال) دیا تو اس میں بخل کرنے لگے۔ اور (اپنے عہد سے) روگردانی کر کے پھر بیٹھے۔ تو اللہ نے اس کا انجام یہ کیا کہ اس روز تک کے لئے جس میں وہ خدا کے روبرو حاضر ہوں گے ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا اس لئے کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ اللہ ان کے بھیدوں اور مشوروں تک سے واقف ہے اور یہ کہ وہ غیب کی باتیں جاننے والا ہے؟

جو (ذی استطاعت) مسلمان دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور (بیچارے غریب) صرف اتنا ہی کما سکتے ہیں جتنی مزدوری کرتے ہیں (اور اس تھوڑی سی کمائی میں سے بھی خرچ کرتے) ہیں ان پر جو (منافق) طعن کرتے اور ہنستے ہیں اللہ ان پر ہنستا ہے۔ اور ان کے لئے تکلیف دینے والا عذاب (تیار) ہے۔ تم ان کے لئے بخشش مانگو یا نہ مانگو (بات ایک ہی ہے) اگر (ان کے لئے) ستر دفعہ بھی بخشش مانگو گے تو بھی اللہ ان کو نہیں بخشے گا۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے کفر کیا اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ: نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں آزمائشوں کی جانگسل وادیاں عبور کیں، مصائب ومشکلات برداشت کیں، مکی زندگی میں آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جوابی کارروائی کی اجازت نہ تھی، مدینہ منورہ میں کافروں کے ساتھ

ساتھ ایک اور طبقہ منافقین کا بھی سامنے تھا، ان دونوں طبقوں کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا گیا، کفار کے خلاف تلوار و شمشیر سے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا، جس پر میدان بدر، میدان احد، جنگ خندق جیسے معرکے برپا ہوئے، جب کہ دوسرے طبقے یعنی منافقین کے خلاف زبان اور دلیل کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دیا گیا، ان پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا، یہ لوگ اسی لائق تھے، دنیا میں ان کے ساتھ یہ معاملہ رکھنے کا حکم دیا گیا جب کہ آخرت کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ جہنم جائیں گے، ان کا ٹھکانہ وہی ہے، دوسرے مقام پر منافقین کے لیے تو یہاں تک فرمادیا گیا کہ یہ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ: شان نزول: یہ آیت جلاس بن سوید کے بارے میں اتری، اس نے کہا تھا کہ اگر محمد سچے ہیں تو ہم گدھوں سے بھی بدتر ہوتے! اس کے بھانجے نے کہا اللہ کی قسم! اے دشمن خدا! میں تیری بات رسول اللہ ﷺ کو بتلاؤں گا اور اگر میں نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ کھٹکھٹانے والا عذاب مجھ پر اتر پڑے گا اور تیرے گناہ پر میں پکڑا جاؤں گا، رسول اللہ ﷺ نے جلاس کو بلایا اور اس سے پوچھا اے جلاس! کیا تو نے یہ یہ کہا ہے؟ اس نے قسم اٹھائی، کہ میں نے نہیں کہا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ (تفسیر طبری) حضور ﷺ تک یہ اطلاع عمیر بن سعید نے پہنچائی تھی، جو اس کا پروردہ تھا، علامہ طبری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد جلاس نے توبہ کرلی تھی، پھر توبہ پر قائم رہا تھا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا عنقریب تمہارے پاس ایک شخص آئے گا جو شیطان کی آنکھوں سے دیکھتا ہوگا، جب وہ آجائے تو اس سے بات نہ کرنا، زیادہ دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ ایک نیلی آنکھوں والا شخص آنکلا، آپ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا تو اور تیرے ساتھی مجھے کیوں گالیاں دیتے ہو؟ وہ آدمی گیا اور اپنے ساتھیوں کو بلالایا، انہوں نے اللہ کی قسم اٹھائی کہ انہوں نے ایسا کیا ہے اور نہ ہی کچھ کہا ہے، آپ ﷺ نے انہیں درگزر فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔ پھر آیت کے آخر تک ان کی صفات

بیان کر دیں۔

ایک شان نزول میں عبد اللہ بن ابی رئیس المنافقین کا نام بھی آتا ہے، جس نے نبی کریم ﷺ کی شان اقدس میں گستاخانہ جملہ کہا تھا، جب نبی کریم ﷺ نے اس سے پوچھا تو وہ قسم کھا کر مکر گیا کہ میں نے ایسی بات نہیں کہی ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور واضح کیا کہ انہوں نے کلمہ کفر زبانوں سے نکالا تھا۔

وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا: اس کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں، ایک یہ کہ اس سے منافقین کا وہ شخص مراد ہے جس نے کفر یہ بات کہی تو مخبر کے ذریعہ افشاء کا خطرہ پاکر اس سے مخبر بھانجے کو قتل کرنا چاہا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس منافق نے اس مومن کو قتل کرنا چاہا جس مومن نے اسے کہا تو گدھے سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ اسود نامی ایک قریشی تھا جس نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنا چاہا۔ (طبری)

اس بارے میں ایک تفسیر یہ ہے، غزوہ تبوک سے واپسی میں آنحضرت ﷺ لشکر سے علیحدہ ہو کر ایک پہاڑی راستہ کو تشریف لے جا رہے تھے، تقریباً بارہ منافقین نے چہرے چھپا کر رات کی تاریکی میں چاہا کہ آپ ﷺ پر ہاتھ چلائیں اور معاذ اللہ پہاڑی سے گرا دیں، حضور ﷺ کے ساتھ حذیفہ اور عمار تھے، عمار رضی اللہ عنہ کو انہوں نے گھیر لیا تھا، مگر حذیفہ رضی اللہ عنہ نے مار مار کر ان کی اونٹنیوں کے منہ پھیر دیے، چونکہ چہرے چھپائے ہوئے تھے، حذیفہ وغیرہ نے ان کو نہیں پہچانا، بعد ازاں آنحضرت ﷺ نے حذیفہ و عمار رضی اللہ عنہما کو نام بنام ان کے پتے بتا دیے، مگر منع فرما دیا کہ کسی پر ظاہر نہ کریں، اسی واقعہ کی طرف **وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا** میں اشارہ ہے کہ جو ناپاک قصد انہوں نے کیا خدا کے فضل سے پورا نہ ہوا۔ (تفسیر عثمانی علامہ شبیر احمد عثمانی)

وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ: عکرمہ سے منقول ہے کہ بنو عدی بن کعب کے غلام نے ایک انصاری کو قتل کر دیا رسول اللہ ﷺ نے بارہ ہزار دیت کا فیصلہ کیا اور اسی سلسلہ میں آیت اتری **وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ** عمرو کہتے ہیں یہ بارہ

ہزار کی رقم برائے دیت میں نے صرف عکرمہ سے سنی ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت بارہ ہزار مقرر کی آیت وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ یہ دیت لینے کے سلسلہ میں ہے۔(طبری)

فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَهُمْ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر یہ لوگ کلمہ کفر سے تائب ہوں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے کہ وہ منافقت اختیار کریں۔

وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ: اور اگر وہ توبہ سے رخ موڑ کر کفر پر اصرار کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں دردناک عذاب دنیا میں قتل اور جلد حاصل ہونے والی رسوائی کی صورت میں دے اور آخرت میں آگ سے سزا دے گا، آخرت میں تو ہر منافق اور ہر کافر کو جہنم کا عذاب ہے ہی منافقوں کو دنیا میں جس عذاب الیم کی وعید سنائی گئی اس سے کیا مراد ہے ؟ اس کے بارے میں مفسرین نے فرمایا ہے کہ بار بار رسوائی ہونا اور اہل ایمان کے دلوں میں ان کی وقعت نہ ہونا، سب کی نظروں سے گر جانا اور موت کے وقت عذاب میں مبتلا ہونا مراد ہے، چونکہ دنیا میں ان کو قتل نہیں کیا گیا اور ایمان کے ظاہری دعویٰ کی وجہ سے ان کے ساتھ مروت کا معاملہ کیا جاتا رہا اس لیے مفسرین نے عذاب دنیوی کی مذکورہ بالا تفسیر کی ہے۔(انوار البیان)

وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ: یعنی پوری دنیا میں کوئی ان کا حمایتی اور مددگار نہ ہوگا جو انہیں عذاب سے بچالے۔

وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللهَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهِ: بعض منافق ایسے بھی تھے جنہوں نے اللہ سے عہد باندھا تھا کہ اگر وہ اپنے فضل سے ہمیں نواز دے تو ہم ضرور محتاجوں پر خرچ کریں گے اور نیکوکاروں میں شامل ہو جائیں گے، زبان پر اخلاص کا دعویٰ تھا اور وعدوں میں دینداری کی جھلک، گویا وہ مال کو اطاعت اور صدقہ کا ذریعہ بنانے کا عزم کر چکے ہوں۔

شان نزول: ثعلبہ بن حاطب انصاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! اللہ سے دعا فرمایئے کہ مجھے مال عطا کرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تجھ پر افسوس ہے اے ثعلبہ! تھوڑا مال

جس کا تو شکر ادا کرے اس کثیر مال سے زیادہ بہتر ہے جسے تو برداشت نہ کر سکے آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ تو اللہ کے نبی کی طرح ہو جائے اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر میں چاہوں کہ میرے ساتھ سونے اور چاندی کا پہاڑ بہہ نکلیں تو ایسا ہو سکتا ہے اس پر ثعلبہ نے کہا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر نبی مبعوث کیا اگر آپ ﷺ اللہ سے دعا کریں کہ مجھے مال عطا کرے تو میں ضرور ہر حقدار کا حق ادا کروں گا۔

رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی، اَللّٰھُمَّ ارْزُقْ ثَعْلَبَۃَ مَالًا، یعنی اے اللہ! ثعلبہ کو مال دے اس نے ایک بکری لی، اس کی بکریوں میں کیڑے مکوڑوں کی طرح افزائش ہوئی، یہاں تک کہ ان کے لیے مدینہ کی سرزمین تنگ ہو گئی چنانچہ وہ مدینہ کی ایک وادی میں چلا گیا اب صورت حال یہ ہوئی کہ وہ صرف ظہر اور عصر کی نمازیں باجماعت پڑھتا اور اس کی دوسری نمازیں چھوٹ گئیں اس کی بکریوں میں مزید اضافہ ہوا یہاں تک کہ اس کی جمعہ کی نماز کے سوا اس کی ساری نمازیں چھوٹ گئیں، بکریوں نے کیڑے مکوڑوں کی طرح بڑھنا شروع کیا۔

یہاں تک کہ اس کی جمعہ کی نماز بھی ترک ہو گئی، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا اور فرمایا کہ ثعلبہ نے کیا کیا؟ کسی نے کہا کہ اس نے ایک بکری لی تھی اور اس کے لیے مدینہ کی سرزمین تنگ ہو گئی اور اس نے آپ ﷺ کو ثعلبہ کے حالات کی اطلاع دی آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا یاویح ثعلبہ، اے ثعلبہ افسوس ہے کہ الفاظ کہے اللہ نے اس پر یہ آیت نازل کی۔ (اسباب النزول)

زکوٰۃ لینے کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے دو آدمی زکوٰۃ وصولنے کے لیے روانہ کیے، ثعلبہ کے پاس پہنچے تو اس نے حضور ﷺ کی تحریر دیکھ کر کہا تھا کہ یہ تو جزیہ کی بہن ہے، اس نے زکوٰۃ نہیں دی تھی، پھر جب اسے حضور ﷺ کی ناراضگی کا علم ہوا تو زکوٰۃ لے کر پہنچا، حضور ﷺ نے وصول نہیں کی، پھر واپس چلا گیا تو نبی کریم ﷺ کا وصال ہو گیا، پھر یہ زکوٰۃ لے کر صدیق اکبر کے پاس آیا، انہیں حالات کا علم ہوا تو انہوں نے بھی اس سے زکوٰۃ نہیں لی، پھر عمر کے زمانہ میں آیا، انہیں پتہ چلا تو انہوں نے بھی اس سے زکوٰۃ نہیں لی، پھر حضرت عثمان کے زمانہ میں زکوٰۃ لے کر آیا تو انہیں حالات معلوم

ہوئے تو انہوں نے بھی اس سے زکوٰۃ نہیں لی، حضرت عثمان کے دور خلافت میں یہ شخص فوت ہو گیا تھا، اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ (اسباب النزول)

فَلَمَّا آتَاهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخِلُوا بِهِ: مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے انہیں مال عطا کر دیا تو انہوں نے اپنے عہد کو پس پشت ڈال دیا، نہ وہ وعدہ پورا ہوا، نہ صدقہ جاری ہوا، بلکہ بخل نے ان کے ہاتھ روک دیے اور وہ ایمان سے منہ موڑ کر پھر گئے، یوں ان کے قول و فعل کا تضاد کھل کر سامنے آ گیا۔

فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ: پس ان کے اس عہد شکنی اور جھوٹ کا انجام یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے دلوں میں قیامت تک کے لیے نفاق جما دیا، جو دل وعدۂ الٰہی کی حرمت نہ پہچانے، وہ اخلاص کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے، ان کی بد عہدی نے ان کے باطن پر مہر لگا دی اور نفاق ان کا مقدر بن گیا۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ: کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اللہ ان کی خفیہ سازشوں اور پوشیدہ سرگوشیوں سے خوب واقف ہے؟ وہ ان کی ہر چال، ہر مکر اور ہر فریب کو جانتا ہے، وہ غیبوں کا جاننے والا ہے، اس سے کوئی بات اوجھل نہیں رہتی اور وہ ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا۔

الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ: یہی وہ لوگ ہیں جو اہلِ ایمان میں سے ان لوگوں پر طعن کرتے ہیں جو خوش دلی سے صدقات دیتے ہیں، خواہ ان کا عطیہ زیادہ ہو یا محض تھوڑا سا، جو کچھ ان کی استطاعت میں ہو، جو مؤمن اپنی محنت کی معمولی کمائی میں سے کچھ پیش کر دیتا ہے، اس پر یہ طنز کرتے ہیں کہ اس قلیل صدقے سے کیا حاصل ہو گا؟ ان کی اس تمسخر آمیز روش کا جواب اللہ خود دے گا، وہ ان کا مذاق اڑائے گا جیسا کہ انہوں نے مؤمنوں کا اڑایا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

شانِ نزول: نبی کریم ﷺ نے جب زکوٰۃ کی ادائیگی کی ترغیب دی تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ چار ہزار درہم لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ! میرا مال آٹھ ہزار درہم ہے

میں اپنے پاس اس کا نصف لایا ہوں اسے راہِ خدا میں رکھ لیجیے میں نے اپنے گھر والوں کے لیے آدھا مال رکھ لیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تمہارے دیے میں برکت دے اور جو کچھ تم نے گھر والوں کے لیے چھوڑ رکھا ہے اس میں بھی برکت دے، تو اللہ نے عبد الرحمن رضی اللہ عنہ کے مال میں اس قدر برکت دی کہ انہوں نے اپنی وفات پر دو بیویاں پیچھے چھوڑیں ان دو بیویوں کا حصہ جو ان کے مال کا آٹھواں حصہ ہوتا تھا ایک لاکھ ساٹھ ہزار درہم تھے اس روز یعنی رسول اللہ ﷺ کے اعلان کے روز عاصم بن عدی بن عجلان نے ایک سو وسق کھجور صدقہ کیے ابو عقیل الانصاری ایک صاع تمر لے کر آئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں نے رات پانی کھینچنے کی مزدوری میں گزار دی مجھے اس کام کی مزدوری دو صاع کھجور ملے میں نے اس میں سے ایک صاع اپنے گھر والوں کے لیے رکھ دیے اور دوسرا آپ ﷺ کی خدمت میں پیش ہے، رسول اللہ ﷺ نے ان ایک صاع کھجوروں کو تمام صدقات پر پھیلا دینے کا حکم دیا، منافقوں نے ان لوگوں کا مذاق اڑایا اور ان پر طعن کیا کہ انہوں نے کہا عبد الرحمن رضی اللہ عنہ اور عاصم نے محض دکھاوے کے لیے زیادہ مال دیا اور ابو عقیل نے ایک صاع کھجور سے اللہ بے نیاز تھا اسے اس کی ضرورت نہ تھی لیکن اس نے اپنے نفس کا ذکر ضروری سمجھا اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ (اسباب النزول)

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ: میرے حبیب ﷺ! آپ چاہیں تو ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں یا نہ کریں، اگر آپ ستر بار بھی ان کے لیے استغفار کریں تو بھی انہیں بخشش نصیب نہ ہو گی، اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ کفر کیا ہے اور اللہ ایسے لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جو جان بوجھ کر اس کی شریعت سے روگردانی کرتے ہیں اور حق سے انحراف کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔

شانِ نزول: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب عبد اللہ بن اُبیّ (منافقین کے سردار) کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! اپنی قمیص مجھے عطا فرما دیجئے تاکہ میں اپنے والد کو اس میں کفن دوں اور آپ ﷺ ان کی نمازِ جنازہ پڑھائیں

اور ان کے لیے استغفار بھی فرمائیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی قمیص عطا فرمادی، پھر (اس کے بیٹے نے) عرض کیا کہ جب آپ نمازِ جنازہ پڑھانے کا ارادہ کریں تو مجھے اطلاع فرمادیں، آپ ﷺ نے اجازت دے دی، جب رسول اللہ ﷺ اس کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو پکڑ لیا اور عرض کیا: یارسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو منافقین کی نمازِ جنازہ پڑھانے سے منع نہیں فرمایا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ میں ان کے لیے استغفار کروں یا نہ کروں، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ ادا فرمائی، اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی، اس کے بعد آپ ﷺ نے منافقین کی نمازِ جنازہ پڑھانا ترک فرمادیا۔ (بخاری)

دوزخ کی آگ

سوال ان آیات کا ترجمہ کیجیے اور بتائیے کہ اس آیت میں جن لوگوں کو کہا گیا کہ وہ پیچھے رہ جانے والے ہیں، اس سے مراد کون لوگ ہیں؟

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ {۸۱} التوبہ

جواب ترجمہ: جو لوگ (غزوہ تبوک میں) پیچھے رہ گئے وہ پیغمبر خدا ﷺ (کی مرضی) کے خلاف بیٹھ رہنے سے خوش ہوئے اور اس بات کو ناپسند کیا کہ (خدا کی راہ میں) اپنے مال اور جان سے جہاد کریں اور (اوروں سے بھی) کہنے لگے کہ گرمی میں مت نکلنا (ان سے) کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔ کاش یہ (اس بات کو) سمجھتے۔

اللہ تعالیٰ ان آیات میں ان منافقین کی مذمت کر رہے ہیں، جو غزوہ تبوک میں حضور ﷺ کے ساتھ نہیں گئے تھے اور گھروں میں ہی بیٹھنے پر اکڑ رہے تھے۔ جنہیں راہ اللہ میں مال و جان سے جہاد کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا جنہوں نے ایک دوسرے کے کان بھرے تھے کہ اس گرمی میں کہاں نکلو

گے؟ ایک طرف پھر پکے ہوئے پھل ہیں سائے بڑھے ہوئے ہیں دوسری جانب لوکے تھپیڑے چل رہے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے کہ جہنم کی آگ جس کی طرف تم اپنی اس بد کرداری سے جا رہے ہو وہ اس گرمی سے زیادہ بڑھی ہوئی حرارت اپنے اندر رکھتی ہے۔

یہ آگ تو اس آگ کا ستر واں حصہ ہے جیسے کہ بخاری و مسلم میں ہے کہ إِنَّ نَارَكُمْ هٰذِهِ جُزْءٌ مِنْ سَبْعِينَ جُزْءًا مِنْ نَارِ جَهَنَّمَ، وَضُرِبَتْ بِالْبَحْرِ مَرَّتَيْنِ، وَلَوْلَا ذٰلِكَ مَا جَعَلَ (اللّٰهُ) فِيهَا مَنْفَعَةً لِأَحَدٍ (مسند احمد) تمہاری یہ آگ آتش دوزخ کے ستر اجزاء میں سے ایک جز ہے پھر بھی یہ سمندر کے پانی میں دو دفعہ بجھائی ہوئی ہے ورنہ تم اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکتے۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں أُوقِدَ عَلَى النَّارِ أَلْفَ سَنَةٍ حَتَّى احمرَّت، ثُمَّ أُوقِدَ عَلَيْهَا أَلْفَ سَنَةٍ حَتَّى ابيضَّت، ثُمَّ أُوقِدَ عَلَيْهَا أَلْفَ سَنَةٍ حَتَّى اسْوَدَّتْ، فَهِيَ سَوْدَاءُ كَاللَّيْلِ الْمُظْلِمِ (ترمذی، ابن ماجہ) ایک ہزار سال تک آتش دوزخ دھونکی گئی تو سرخ ہو گئی پھر ایک ہزار سال تک جلائی گئی تو سفید ہو گئی پھر ایک ہزار سال تک دھونکی گئی تو سیاہ ہو گئی پس وہ اندھیری رات جیسی سخت سیاہ ہے۔

منافقین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ {۸۲} فَإِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ إِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا ۚ إِنَّكُمْ رَضِيتُمْ بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ الْخَالِفِينَ {۸۳} وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ أَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۚ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ وَمَاتُوا وَهُمْ فٰسِقُونَ {۸۴} وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُونَ {۸۵} وَإِذَآ أُنْزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ اٰمِنُوا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ

اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ {۸۶} رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ {۸۷} لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ {۸۸} اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ {۸۹} التوبه

جواب ترجمہ: سو یہ لوگ تھوڑا سا ہنس لیں اور زیادہ روئیں ان اعمال کے بدلہ جو وہ کیا کرتے تھے۔ سو اگر اللہ آپ کو ان کی کسی جماعت کی طرف واپس لے جائے پھر وہ آپ سے نکلنے کی اجازت مانگیں تو آپ فرما دیجیے کہ تم ہرگز کبھی میرے ساتھ نہ نکلو گے۔ اور ہرگز میرے ساتھ کسی دشمن سے جنگ نہ کرو گے۔ بیشک تم پہلی مرتبہ بیٹھنے پر راضی ہو گئے۔ سو تم پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔

اور ان میں سے جو کوئی شخص مر جائے تو آپ اس پر کبھی نماز نہ پڑھیں، اور اس کی قبر پر کھڑے نہ ہوں، بیشک ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ اس حال میں مر گئے کہ نافرمان تھے۔ اور آپ کو ان کے اموال اور اولاد تعجب میں نہ ڈالیں اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان کو ان چیزوں کے ذریعہ دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں اس حالت میں نکل جائیں کہ وہ کافر ہوں۔ اور جب کوئی سورۃ نازل کی جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو ان میں سے مقدور والے لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجیے ہم بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ ہو جائیں۔

یہ لوگ اس بات پر راضی ہو گئے کہ گھروں میں پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی سو وہ نہیں سمجھتے۔ لیکن رسول اور وہ لوگ جو آپ کے ساتھ ایمان لائے انہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے خوبیاں ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار فرمائے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری

ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ منافق لوگ اپنی فانی دنیاوی زندگی میں چاہیں تو تھوڑا سا ہنس لیں، خوشیاں منالیں اور اپنے بظاہر محفوظ رہ جانے پر مسرور ہولیں، مگر انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ آخرت کی ابدی زندگی میں انہیں طویل گریہ وزاری کا سامنا ہوگا۔

جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ: یہ انجام اس کفر، نافرمانی اور گناہوں کا بدلہ ہے جو وہ دنیا میں کماتے رہے، دنیا کی عارضی مسرت دراصل دائمی حسرت کا پیش خیمہ ہے۔

فَإِنْ رَجَعَكَ اللهُ إِلَى طَائِفَةٍ مِنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ: اے نبی کریم ﷺ! اگر اللہ تعالیٰ آپ کو دوبارہ ان منافقین کے کسی گروہ کی طرف لوٹائے اور وہ آئندہ کسی جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کریں تو آپ صاف الفاظ میں فرمادیجئے کہ اب تم کبھی میرے ساتھ جہاد کے لیے نہیں نکل سکو گے، یہ ان کے لیے سزا بھی ہے اور امت کو ان کے شر سے محفوظ رکھنے کا انتظام بھی، جب انہوں نے غزوۂ تبوک میں بیٹھے رہنے کو پسند کیا اور میدانِ عمل سے کنارہ کشی اختیار کی، تو اب وہ انہی لوگوں کے ساتھ رہیں جو عذر کی بنا پر پیچھے رہ گئے تھے، جیسے بیمار، عورتیں اور بچے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ: مزید حکم دیا گیا کہ ان منافقین میں سے جو کوئی مر جائے، اس کی نمازِ جنازہ ہر گز نہ پڑھی جائے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو کر مغفرت کی دعا کی جائے، اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور نافرمانی کی حالت ہی میں دنیا سے رخصت ہوئے، جو شخص ایمان سے خالی ہو اور کفر کی حالت میں مرے، وہ دعا اور نمازِ جنازہ کا مستحق نہیں رہتا۔

شانِ نزول: عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے اُس کے بیٹے نے دعوت دی تو نبی ﷺ نے دعوت قبول فرمائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو اس کی شر انگیزیاں گنوائیں اور عرض کیا کہ اس کی نماز جنازہ نہ پڑھائیں، نبی کریم ﷺ نے اس کے باوجود منافق کی نماز جنازہ

پڑھادی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر آپ ﷺ کو منع کر دیا کہ آپ ﷺ منافقین کی نماز جنازہ بھی نہ پڑھائیں اوران کی قبر پر بھی نہ کھڑے ہوں۔

نکتہ : نبی کریم ﷺ کو منافقین کی نمازِ جنازہ پڑھانے اور ان کی قبروں پر کھڑے ہونے سے اس لیے روکا گیا کہ یہ اعمال دراصل تعظیم، قبولیت اور مغفرت کی علامت ہیں، جبکہ منافقین حقیقت میں باطنی کفر پر قائم تھے، جب تک ان کا نفاق ظاہر نہ ہوا، ظاہری اسلام کی بنا پر ان سے مسلمانوں جیسا معاملہ کیا جاتا رہا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کی حقیقت واضح فرمادی تو ان پر ایسی کوئی تکریم باقی نہ رکھی گئی جو انہیں اہلِ ایمان کے زمرے میں دکھائے، مزید یہ کہ اگر رسول اللہ ﷺ ان کا جنازہ پڑھاتے رہتے تو لوگوں کو اشتباہ ہو سکتا تھا کہ وہ سچے مومن ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز سلب کر کے ایمان اور نفاق کے درمیان واضح حد قائم فرمادی۔

وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا: اے میرے حبیب ﷺ! ان منافقین کے مال و دولت اور اولاد کی کثرت آپ کو متاثر نہ کرے، یہ ظاہری خوش حالی دراصل ان کے لیے عذاب کا ذریعہ ہے، وہ اسی مال کی فکر اور اسی دنیا کی مشقتوں میں مبتلا رہیں گے، مصیبتیں اٹھائیں گے اور بالآخر اسی حال میں ان کی روحیں قبض کر لی جائیں گی کہ وہ کفر پر قائم ہوں گے، بظاہر نعمت، درحقیقت وبال بن جائے گی۔

وَإِذَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ آمِنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ: جب بھی اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ پر کوئی ایسی سورت نازل فرماتا جس میں ایمان کی تجدید اور اللہ کی راہ میں جہاد کا حکم ہوتا، تو انہی میں سے صاحبِ حیثیت اور خوش حال لوگ آکر اجازت طلب کرتے کہ ہمیں چھوڑ دیجئے، ہم معذوروں کے ساتھ بیٹھ رہیں، انہوں نے عزت کے بجائے ذلت کو پسند کیا، غیرت کے بجائے سستی کو اختیار کیا اور عمل کے بجائے بہانے تراشی کو اپنا شعار بنایا۔

وَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ: ان کے اس رویّے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی، اب وہ نہ حق کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ اپنی بھلائی کو پہچان سکتے ہیں، نفاق اور کفر نے ان کی

بصیرت کو سلب کر لیا ہے۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ: اس کے برعکس، رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ ایمان لانے والے لوگ پیچھے نہیں رہے، انہوں نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔

وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: ان کے لیے دنیا میں بھی بھلائی ہے، نصرت، کامیابی اور غنیمت کی صورت میں اور آخرت میں بھی بے شمار نعمتیں ہیں، یہی لوگ اپنی مراد کو پانے والے اور خوف سے نجات حاصل کرنے والے ہیں۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے محلات کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، نہ انہیں فنا ہو گی اور نہ زوال، یہی وہ عظیم کامیابی ہے جس کی کوئی مثال نہیں، جس کے برابر کوئی اور فلاح نہیں۔

غزوہ تبوک میں منافقین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کردار

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ {۹۰}لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۹۱}وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ {۹۲}اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ {۹۳}التوبه

جواب ترجمہ: اور دیہاتیوں میں سے کچھ لوگ بہانہ کرنے والے آئے تاکہ ان کو اجازت دے دی

جائے، اور جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا تھا وہ بیٹھے رہ گئے، جو لوگ ان میں سے کفر ہی پر رہیں گے انہیں دردناک عذاب پہنچے گا۔ ضعیفوں اور مریضوں اور ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں جو خرچ کرنے کے لیے نہیں پاتے جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے خلوص دل سے حاضر ہوں، محسنین پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ غفور ہے رحیم ہے۔ اور ان لوگوں پر بھی کوئی گناہ نہیں جو آپ کے پاس اس لیے حاضر ہوئے کہ آپ ان کو سواری دے دیں۔ آپ نے کہہ دیا کہ میں ایسی کوئی چیز نہیں پاتا جس پر تمہیں سوار کر دوں، وہ اس حال میں واپس ہو گئے کہ اس رنج میں ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے کہ وہ خرچ کرنے کے لیے نہیں پاتے۔ الزام تو انہی لوگوں پر ہے جو مالدار ہوتے ہوئے آپ سے اجازت چاہتے ہیں، وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی سو وہ نہیں جانتے۔

وَجَاءَ الْمُعَذِّرُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ: جنگ تبوک کے حوالے سے منافقین کے مختلف گروہوں کی طرف اشارہ فرما کر ان کے اعمال پر تنقید جاری ہے، انہی گروہوں میں سے ایک گروہ دیہاتیوں کا بھی ہے یعنی وہ عرب جو اطراف مدینہ میں رہتے تھے، یا بادیہ نشین تھے، ان میں سے دو قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، جب جہاد کا اعلان ہوا تو مدینہ اور اس کے گرد و نواح کے کچھ دیہاتی رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ عذر پیش کر کے اجازت چاہتے تھے کہ اس مہم میں شریک نہ ہوں، ان میں بعض سچے معذور بھی تھے، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو محض بہانہ سازی سے کام لے رہے تھے اور ایک گروہ ایسا تھا جس نے عذر پیش کرنے کی بھی زحمت نہ کی، کیونکہ وہ نہ دل سے نبی ﷺ کی صداقت پر ایمان رکھتے تھے اور نہ اللہ کے وعدوں پر یقین، ان کے اس باطنی کفر کے سبب ان کے لیے دردناک عذاب مقدر ہوا۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَى وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنْفِقُونَ حَرَجٌ: البتہ شریعتِ الٰہی کا عدل یہ ہے کہ کمزوروں، بیماروں، معذوروں، نابیناؤں، عورتوں، بچوں اور ان فقراء پر

کوئی گناہ نہیں جو سفر جہاد کے لیے وسائل ہی نہ رکھتے ہوں، اگر وہ دل سے مخلص ہوں، اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں اور اپنے دائرۂ عمل میں اطاعت گزار رہیں تو ان پر ملامت کی کوئی راہ نہیں، اللہ ایسے محسنین کے لیے غفور بھی ہے اور رحیم بھی۔

وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ: اسی طرح وہ لوگ بھی معذور قرار پائے جو شوقِ جہاد میں حاضر ہوئے اور سواری یا سامان کی درخواست کی، مگر جب انہیں بتایا گیا کہ مہیا کرنے کے لیے کچھ موجود نہیں تو وہ رنج والم سے واپس لوٹ گئے، اس حال میں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ کاش ان کے پاس خرچ کرنے کو کچھ ہوتا، یہ آنسو ان کی سچائی کی گواہی تھے۔

شانِ نزول: یہ آیت ان رونے اور گریہ وزاری کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کی تعداد سات تھی ان کے نام یہ ہیں، معقل بن یسار رضی اللہ عنہ، صخر بن خنیس رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن کعب انصاری رضی اللہ عنہ سالم بن عمیر رضی اللہ عنہ، ثعلبہ بن غنمہ رضی اللہ عنہ اور عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ، یہ صحابی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! خدا عزوجل نے ہمیں آپ ﷺ کے ساتھ نکلنے کا حکم دیا ہے ہمیں پیوند شدہ کپڑوں اور جوتوں کے ساتھ اپنے ساتھ لے چلیے ہم آپ کے ساتھ ہو کر جہاد کریں گے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس آپ کو ساتھ لے چلنے کے لیے سواری وغیرہ کا انتظام نہیں ہے وہ حضرات روتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''البدایہ والنہایہ'' میں ان ناموں سے کچھ نام مختلف ذکر کیے ہیں، جب کہ اسباب النزول میں یہی نام لکھے ہوئے ہیں۔

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ: اس کے برعکس گرفت اور مؤاخذہ ان لوگوں پر ہے جو استطاعت رکھنے کے باوجود اجازت لے کر پیچھے رہنا چاہتے تھے، انہوں نے خود اپنے لیے ذلت پسند کی کہ گھروں میں بیٹھ رہیں اور کمزوروں کے ساتھ شمار ہوں، ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، اس لیے نصیحت ان پر اثر نہیں کرتی، وہ نہ اپنے نفع کو پہچانتے ہیں کہ اسے اختیار کریں، نہ اپنے نقصان کو سمجھتے ہیں کہ اس سے بچیں، یہی وہ فرق ہے جو اخلاص اور نفاق کے درمیان کھنچی ہوئی لکیر کو نمایاں کر دیتا ہے۔

تبوک سے صحابہ رضی اللہ عنہم فاتح بن کر آئے، منافقین نے بہانے بنائے

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ{۹۴}سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ{۹۵}يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ{۹۶}التوبه

جواب ترجمہ: وہ لوگ آپ کے پاس عذر پیش کریں گے جب آپ ان کی طرف واپس ہوں گے، آپ فرما دیجیے عذر پیش نہ کرو ہم ہرگز تمہاری بات کو سچ نہ مانیں گے۔ اللہ نے تمہاری خبریں ہمیں بتادی ہیں، اور عنقریب اللہ تمہارے عمل کو دیکھ لے گا اور اس کا رسول بھی۔ پھر تم اس ذات کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو چھپی ہوئی اور ظاہری باتوں کا جاننے والا ہے۔ سو وہ تمہیں ان کاموں سے باخبر فرمادے گا جو تم کیا کرتے تھے، وہ عنقریب تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے درگزر کرو۔ سو آپ ان سے اعراض کریں بیشک وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ان کو ان کاموں کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے۔ وہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم راضی ہو جاؤ سو اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں ہوتا۔

يَعْتَذِرُوْنَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ قُلْ لَا تَعْتَذِرُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكُمْ: جب مجاہدین تبوک سے فتح و نصرت کے ساتھ واپس آئیں گے تو پیچھے رہ جانے والے منافقین جھوٹے اور کمزور عذر پیش کریں گے، وہ اپنی کوتاہی کو الفاظ کے پردے میں چھپانے کی کوشش کریں گے، مگر اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ اور اہلِ ایمان کو ہدایت فرماتا ہے کہ ان کے بہانوں کو قبول نہ کریں، صاف کہہ دیا جائے کہ

ہم تمہاری باتوں پر یقین نہیں کرتے، اللہ نے تمہارے دلوں کے حال سے ہمیں آگاہ کر دیا ہے، اب تمہارے اعمال کو اللہ اور اس کا رسول دیکھیں گے کہ آیا تم سچی توبہ کرتے ہو یا اپنے نفاق پر قائم رہتے ہو، آخر کار تم اسی ذات کے حضور لوٹائے جاؤ گے جو ظاہر و باطن سب جانتی ہے اور وہ تمہیں تمہارے اعمال کا پورا بدلہ دے گی، پس دانش مندی اسی میں ہے کہ انسان فریب کی راہ چھوڑ کر توبہ و اصلاح کا راستہ اختیار کرے۔

سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا عَنْهُمْ: یہ منافقین اپنے جھوٹ کو مضبوط کرنے کے لیے قسمیں بھی کھائیں گے، تاکہ اہلِ ایمان انہیں ملامت نہ کریں اور ان سے درگزر کرلیں، مگر حکم یہ ہے کہ ان سے بے رغبتی برتی جائے، اس انداز سے کہ ناراضی کا اظہار بھی ہو اور ان کی باطنی خباثت سے دُوری بھی، ان کے دل ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، یہی ان کے نفاق اور گناہوں کا انجام ہے۔

يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ: وہ بار بار قسمیں کھا کر تمہاری رضا حاصل کرنا چاہیں گے، تاکہ تم انہیں معاف سمجھ لو اور ان کے عذر قبول کر لو، لیکن خبر دار! تمہاری رضا اس وقت کوئی معنی نہیں رکھتی جب اللہ ان سے راضی نہیں، جو لوگ کفر و نفاق کے ذریعے اطاعتِ الٰہی سے باہر ہو جائیں، اللہ ان سے راضی نہیں ہوتا، پس اے اہلِ ایمان! اس بات سے بچو کہ تم اس شخص سے راضی ہو جاؤ جس سے تمہارا رب راضی نہیں، یہی ایمان کی غیرت اور بندگی کی سچی علامت ہے۔

منافق دیہاتی اور صحابی رضی اللہ عنہ دیہاتی میں فرق

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ {۹۷} وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ {۹۸} وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ۭ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۹۹} التوبة.

جواب ترجمہ: دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور اس قابل ہیں کہ جو احکام (شریعت) اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں ان سے واقف (ہی) نہ ہوں اور اللہ جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔ اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں اور تمہارے حق میں مصیبتوں کے منتظر ہیں۔ انہی پر بری مصیبت (واقع) ہو اور اللہ سُننے والا (اور) جاننے والا ہے۔ اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو اللہ کی قربت اور پیغمبر کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں دیکھو وہ بے شُبہہ ان کے لئے (موجب) قربت ہے۔ اللہ ان کو عنقریب اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اعراب دیہات میں رہنے والوں کو کہا جاتا ہے، جو اپنے کفر اور نفاق کے لحاظ سے سخت سمجھے جاتے ہیں، ان میں کفر و نفاق کی شدت اس لیے ہوتی ہے کہ ان کے دل سخت ہوتے ہیں، علماء اور علم سے دور رہتے ہیں، علماء و مشائخ کی مجالس وعظ و نصیحت سے دور رہتے ہیں، اس لیے یہ لوگ دینی حدود کو نہیں جانتے، اللہ نے جو شرعی احکامات نازل کیے ان سے یہ لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ دیہاتیوں اور صحرا نشین بدوؤں میں کفار و منافق بھی ہیں اور مومن مسلمان بھی ہیں، لیکن کافروں اور منافقوں کا کفر و نفاق نہایت سخت ہے۔ ان میں اس بات کی مطلقاً اہلیت نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ان حدوں کا علم حاصل کریں جو اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہیں۔

چنانچہ ایک اعرابی حضرت زید بن صوحان رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اس وقت یہ اس مجلس میں لوگوں کو کچھ بیان فرما رہے تھے، نہاوند والے دن انکا ہاتھ کٹ گیا تھا، اعرابی بول اٹھا کہ آپ کی باتوں سے تو آپ کی محبت میرے دل میں پیدا ہوتی ہے، لیکن آپ کا یہ کٹا ہوا ہاتھ مجھے اور ہی شبہ میں ڈالتا ہے۔

آپ نے فرمایا اس سے تمہیں کیا شک ہوا یہ تو بایاں ہاتھ ہے؟ تو اعرابی نے کہا واللہ مجھے نہیں معلوم کہ دایاں ہاتھ کاٹتے ہیں یا بایاں؟ انہوں نے فرمایا اللہ عزوجل نے سچ فرمایا کہ اعراب بڑے ہی سخت کفر و نفاق والے اور اللہ کی حدوں کے بالکل ہی نہ جاننے والے ہیں۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ سَكَنَ الْبَادِيَةَ جَفَا، وَمَنِ اتَّبَعَ الصَّيْدَ غَفَلَ، وَمَنْ أَتَى السُّلْطَانَ افْتُتِنَ، جو بادیہ نشین ہوا اس نے جفا کی اور جو شکار کے پیچھے پڑ گیا اس نے غفلت کی اور جو بادشاہ کے پاس پہنچا وہ فتنے میں پڑا۔ (مسند احمد)

چونکہ صحرا نشینوں میں عموماً سختی اور بد خلقی ہوتی ہے، اللہ عزوجل نے ان میں سے کسی کو اپنی رسالت کے ساتھ ممتاز نہیں فرمایا بلکہ رسول ہمیشہ شہری لوگ ہوتے رہے۔ جیسے فرمان اللہ ہے۔ {وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى} (یُوسُف:۱۰۹) ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے سب انسان مرد تھے جن کی طرف ہم وحی نازل فرماتے تھے وہ سب متمدن بستیوں کے لوگ تھے۔

ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ کو کچھ ہدیہ پیش کیا، آپ ﷺ نے اس کے ہدیہ سے کئی گناہ زیادہ انعام دیا جب جا کر بمشکل تمام راضی ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اب سے میں نے قصد کیا ہے کہ سوائے قریشی، ثقفی، انصاری یا دوسی کے کسی کا تحفہ قبول نہ کروں گا۔ یہ اس لئے کہ یہ چاروں شہروں کے رہنے والے تھے۔ مکہ، طائف، مدینہ اور یمن کے لوگ تھے، پس یہ فطرتاً ان بادیہ نشینوں کی نسبت نرم اخلاق اور دور اندیش لوگ تھے، ان میں اعراب جیسی سختی اور کھردرا پن نہ تھا۔

اللہ ان کے تمام حالات کو بہتر جانتا ہے، وہ اپنے بندوں کے معاملات میں بہتر تدبیر اور حکمت سے کام لیتا ہے، ان دیہاتیوں میں ایک وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کو چٹی اور تاوان سمجھتے ہیں، مال خرچ کرنے میں نقصان خیال کرتے ہیں، یہ منافق لوگ تھے۔

بعض دیہاتیوں میں سے ایسے ہوتے ہیں جو اللہ کی ذات پر ایمان رکھتے ہیں، یہاں صحابہ کرام جو دیہات میں رہتے تھے ان کی ایمانی صفات کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا

اقرار کرتے ہیں، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان رکھتے ہیں، ثواب اور عذاب پر ایمان رکھتے ہیں، یہ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ کی راہ میں، جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرتے ہوئے ثواب کی امید رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رضا کے متلاشی ہوتے ہیں، معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہری ہوں یا دیہاتی یہ سب پاکباز انسان تھے، منافق شہری ہوں یا دیہاتی سب اللہ کی غضب وغصے کے مستحق تھے۔

سابقون الاولون، مہاجرین اور انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام رفیع

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ {۱۰۰} وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَي النِّفَاقِ ۡ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ {۱۰۱} وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۱۰۲} التوبہ

جواب ترجمہ: اور مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ پہلے ایمان لائے، اور جنہوں نے نیکی کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سب سے راضی ہو گیا ہے، اور وہ اس سے راضی ہیں، اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی زبردست کامیابی ہے۔ اور تمہارے ارد گرد جو دیہاتی ہیں، ان میں بھی منافق لوگ موجود ہیں، اور مدینہ کے باشندوں میں بھی۔ یہ لوگ منافقت میں (اتنے) ماہر ہو گئے ہیں (کہ) آپ انہیں نہیں جانتے، انہیں ہم جانتے ہیں۔ ان کو ہم دو مرتبہ سزا دیں گے۔ پھر ان کو ایک زبردست عذاب کی طرف دھکیل دیا جائے گا۔ اور کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ انہوں نے ملے جلے عمل کیے ہیں، کچھ نیک کام، اور کچھ برے۔ امید ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول کر لے گا۔

یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔

شانِ نزول: حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ، سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ، ابن سیرین رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اس کا نزول ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہوا تھا، جنہیں قبلتین یعنی بیت المقدس اور بیت اللہ دونوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، شعبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جو حضرات بیعت رضوان میں شامل تھے وہ مراد ہیں، دوسرے مفسرین کا قول ہے کہ ہجرت سے قبل مسلمان ہو جانے والے لوگ مراد ہیں۔ (احکام القرآن للجصاص)

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ: سب سے پہلے ذکر اُن خوش نصیبوں کا ہے جنہوں نے سبقت کی راہ اختیار کی، وہ مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے اللہ کی رضا کی خاطر اپنے گھر بار، وطن اور مال و اسباب چھوڑ دیے۔ اعلان نبوت کے بعد پہلے پہل مسلمان ہونے والوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا وہ تھیں جنہوں نے عورتوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا، بڑی عمر کے لوگوں میں جس نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، بچوں میں جس نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا وہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ تھے، غلاموں میں جس نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا وہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تھے۔

وَالْأَنْصَارِ: اور وہ انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و اعانت کو اپنے لیے اعزاز سمجھا۔ مکہ کی زندگی میں حضرت ابو بکر مسلمان ہوئے، حضرت عمر مسلمان ہوئے، حضرت عثمان مسلمان ہوئے، حضرت علی مسلمان ہوئے، رافضیوں کی تفسیر منہج الصادقین میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ (منہج الصادقین ج ۵ ص ۸۷)

میں عرض کرتا ہوں کہ صدیق اکبر اسلام لانے میں بھی سب سے اول ہیں، ہجرت کرنے والوں میں بھی سب سے اول ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے والے بھی سب سے اول ہیں، غار کے ساتھی بننے والے بھی سب سے اول ہیں، مزار کے رفیق بننے والے بھی سب سے اول ہیں۔

یہاں حرف من استعمال ہوا ہے جس سے بازی گر اور دھوکہ باز دھوکہ دہی سے کام لے سکتے ہیں کہ اس سے مراد بعض مہاجرین اور بعض انصار ہیں، جب کہ یہاں من کو تبعیضیہ ماننا درست نہیں ہے بلکہ یہ من تبیینیہ (بیان کے لیے) ہے۔

وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ: پھر وہ لوگ بھی ان ہی کے ساتھ شامل ہیں جو مہاجر ہیں اور نہ ہی انصار مگر بعد میں اخلاص کے ساتھ ان کے نقشِ قدم پر چلے، عقیدہ میں بھی، قول میں بھی اور عمل میں بھی۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ: اللہ ان سب سے راضی ہو گیا، اس لیے کہ انہوں نے اپنے ایمان کو صدق و وفا سے نبھایا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، اس لیے کہ اس نے انہیں اپنی رضا اور بے پایاں اجر سے نوازا۔ مجھے یہاں یہ بات عرض کرنے دیجیے کہ اللہ تعالیٰ جس سے ایک بار راضی ہو جاتا ہے اس سے کبھی ناراض نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ صحابہ کرام سے یوں ہی راضی نہیں ہوا، وہ عالم الغیب ذات ہے اسے پتہ تھا کہ اب یہ لوگ میرے محبوب کی رحمت والی چھتری کے نیچے آ گئے ہیں اب یہ کبھی مجھے ناراض کرنے والا کام نہیں کریں گے، صحابہ کرام کے ساتھ رضا فی الحال اور فی المآل کے لحاظ سے ہے۔

علامہ طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں آیتِ کریمہ میں **رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ** دراصل اُن نفوسِ قدسیہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رفعتِ مقام اور علوِّ منزلت کا اعلان ہے، اس میں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کی صداقت، اخلاص کی پاکیزگی اور عمل کی درستی سے راضی ہو گیا، اس نے ان کی طاعت کو شرفِ قبول بخشا، ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی لغزشوں سے درگزر کیا اور وہ بھی اپنے رب سے راضی ہو گئے، اس لیے کہ اس نے انہیں عظیم نعمتوں سے نوازا، ہدایت کی روشنی عطا کی، اجر و ثواب کی بشارت دی اور اپنی رضا کا تاج ان کے سروں پر رکھا، یوں یہ باہمی رضا دراصل بندگی کے کمال اور ربوبیت کی عنایت کا حسین امتزاج ہے۔

وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا: ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے گئے ہیں جن کے محلات کے نیچے نہریں رواں ہیں، جہاں وہ ہمیشہ کے لیے قیام کریں گے۔ کعب قرظی

فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کرام کی بخشش فرمادی ہے اور سب کے لیے جنت واجب کر دی ہے، چاہے ان میں نیکو کار ہیں یا خطا کار ہیں۔ (مفاتیح الغیب للرازی)

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ: یہی وہ کامیابی ہے جسے حقیقی فلاح کہا جاسکتا ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ: اس کے برعکس، مدینہ کے گرد و نواح کے دیہاتیوں میں بھی منافق موجود تھے اور خود اہلِ مدینہ میں بھی ایسے لوگ تھے جو نفاق پر جمے رہے، اے میرے حبیب ﷺ! آپ ان سب کو نہیں جانتے، مگر اللہ ان کے باطن سے خوب واقف ہے، ان کے لیے دوہرا عذاب مقدر ہے، ایک دنیا میں، جب ان کا نفاق آشکار ہو گا اور وہ رسوائی یا سزا کا سامنا کریں گے اور دوسرا برزخ اور آخرت میں، جہاں انہیں سخت ترین عذاب کی طرف لوٹا دیا جائے گا، یہ انجام اُس دل کی سزا ہے جو حق کو جان کر بھی قبول نہ کرے۔

وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا: لیکن اسی معاشرے میں ایک تیسرا طبقہ بھی تھا، وہ لوگ جو کسی عذر کے بغیر پیچھے رہ گئے، مگر انہوں نے جھوٹ کا سہارا نہ لیا، انہوں نے اپنی لغزش کا اعتراف کیا اور اپنی سابقہ نیکیوں کو ایک کوتاہی کے ساتھ ملا ہوا پایا، ان کے دل میں ندامت تھی اور نگاہ میں امید کہ شاید اللہ ان کی توبہ قبول فرمالے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی شانِ مغفرت یہی ہے کہ جو بندہ سچائی کے ساتھ پلٹ آئے، اس کے لیے درِ رحمت کھلا ہوتا ہے، بے شک وہ توبہ کرنے والوں کے لیے غفور بھی ہے اور رحیم بھی۔

زکوٰۃ ذریعۂ تزکیہ وطہارت

سوال اس آیت کریمہ کے بارے میں کچھ وضاحت فرمائیں

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ {۱۰۳} التوبة.

جواب ترجمہ: ان کے مال میں سے زکوٰۃ قبول کرلو کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی) پاک اور

(باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے ہو اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو کہ تمہاری دعا ان کے لیے موجب تسکین ہے اور خدا سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

آیت میں جو صدَقہ وارِد ہوا ہے اس کے معنی میں مفسِّرین کے کئی قول ہیں، ایک تو یہ کہ وہ صدَقہ غیر واجبہ تھا جو بطورِ کفّارہ کے ان صاحبوں نے دیا تھا جن کا ذکر اوپر کی آیت میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس صدَقہ سے مراد وہ زکوٰۃ ہے جو ان کے ذمہ واجب تھی، وہ تائب ہوئے اور انہوں نے زکوٰۃ ادا کرنی چاہی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لینے کا حکم دیا۔ امام ابو بکر رازی جصاص نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ صدَقہ سے زکوٰۃ مراد ہے۔ (خازن و احکام القرآن)

مدارک میں ہے کہ سنّت یہ ہے کہ صدَقہ لینے والا صدَقہ دینے والے کے لئے دعا کرے اور بخاری و مسلم میں حضرت عبد اللہ بن ابی اَوفی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ جب کوئی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدَقہ لاتا آپ اس کے حق میں دعا کرتے، میرے باپ نے صدَقہ حاضر کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی اَبِی اَوفٰی

غزوہ تبوک میں جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ گئے تھے ان لوگوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اپنے گناہ سے توبہ کی، اپنے اس قصور پر شرمندہ ہوئے، تو جن مالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان سے کوتاہی ہوئی وہی مال وہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لا کر ڈھیر کر رہے ہیں کہ یہ قبول کر لیجیے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے، جس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرما کر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دی کہ ان کا کچھ نہ کچھ مال قبول فرما لیجیے اور ان کے لیے دعا کیجیے۔

تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معافی کا معاملہ

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کیجیے

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ {۱۰۴} وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى

عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ {۱۰۵} وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ {۱۰۶} التوبه

جواب ترجمہ: کیا ان لوگوں نے نہیں جانا کہ بلاشبہ اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور صدقات قبول فرماتا ہے اور بلاشبہ اللہ خوب زیادہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اور آپ فرما دیجیے کہ عمل کرتے رہو سو عنقریب اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ لے گا اور اس کا رسول بھی اور اہل ایمان بھی، اور عنقریب تم اس ذات پاک کی طرف لوٹائے جاؤ گے جسے چھپی ہوئی چیزوں کا اور کھلی ہوئی چیزوں کا علم ہے پھر وہ تمہیں جتا دے گا جو عمل تم کیا کرتے تھے۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا معاملہ اللہ کا حکم آنے سے موخر کیا ہوا ہے۔ وہ انھیں عذاب دے یا ان کی توبہ قبول فرمائے اور اللہ علیم ہے حکیم ہے۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ: کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرمانے والا ہے؟ وہی ہے جو پلٹ آنے والوں کو آغوشِ رحمت میں جگہ دیتا ہے اور صدقات کو حالانکہ وہ ان سے بے نیاز ہے، شرفِ قبول عطا کرتا ہے اور دینے والے کو اس کے اخلاص پر اجرِ عظیم سے نوازتا ہے، بے شک وہی ہے جو بار بار توبہ قبول کرتا ہے اور اپنے بندوں پر مہربان ہے، اس اعلان میں مایوس دلوں کے لیے امید ہے اور لغزش خوردہ قدموں کے لیے واپسی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ: اور اے نبی ﷺ! ان پیچھے رہ جانے والوں اور اپنے گناہ پر نادم ہونے والوں سے فرما دیجیے کہ جو کمی رہ گئی ہے اسے سچے عمل سے پورا کریں، اپنے اعمال کو خالص اللہ کے لیے کر دیں اور وہی راستہ اختیار کریں جو اس کی رضا کا باعث ہو، عنقریب اللہ، اس کا رسول اور اہلِ ایمان تمہارے اعمال کو دیکھ لیں گے، پھر ایک دن تم سب اسی رب کی بارگاہ میں لوٹائے جاؤ گے جو ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے، وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے اور تمہیں اس کا پورا بدلہ دے گا، پس عمل ہی اصل گواہی ہے اور اخلاص ہی اصل سرمایہ۔

وَآخَرُونَ مُرْجَوْنَ لِأَمْرِ اللّٰهِ: اور ان پیچھے رہ جانے والوں میں کچھ اور لوگ بھی تھے جن کا معاملہ فی الحال اللہ کے فیصلے پر موقوف رکھا گیا، نہ انہیں فوراً معاف کیا گیا اور نہ فوراً سزا دی گئی، بلکہ ان کا انجام اللہ کی مشیت پر چھوڑ دیا گیا، اگر وہ توبہ نہ کریں تو عذاب کے مستحق ہوں اور اگر سچے دل سے پلٹ آئیں تو رحمت کے حقدار ٹھہریں، اللہ خوب جانتا ہے کہ کون سزا کا مستحق ہے اور کون معافی اور درگزر کا اور وہ اپنے حکم اور تدبیر میں سراسر حکمت والا ہے، یہی وہ لوگ تھے جن کے نام تاریخ نے مرارۃ بن ربیع، کعب بن مالک اور ہلال بن امیہ کے طور پر محفوظ رکھے ہیں، جن کا واقعہ توبہ و استقامت کی ایک روشن مثال بن گیا۔

مسجد ضرار کی تعمیر

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کریں، نیز بتائیں کہ جس مسجد ضرار کا اس آیت میں تذکرہ ہے، یہ کن لوگوں نے بنائی تھی؟ اس میں ان کی کیا حجت تھی؟ اللہ نے ان لوگوں کو کیسے ذلیل ورسوا کیا تھا؟

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّتَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ {۱۰۷} التوبة.

جواب ترجمہ: اور جنہوں نے نقصان پہنچانے اور کفر کرنے اور مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کے لیے مسجد بنائی ہے اور واسطے گھات لگانے ان لوگوں کے جو اللہ اور اس کے رسول سے پہلے لڑ چکے ہیں اور البتہ قسمیں کھائیں گے ہمارا مقصد تو صرف بھلائی تھی اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بیشک وہ جھوٹے ہیں۔

مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ بنو عمرو بن عوف نے مسجد قبا تیار کی اور رسول اللہ کو پیغام بھیجا کہ آپ ان کے ہاں اس مسجد میں تشریف لائیں چنانچہ آپ تشریف لائے اور اس مسجد میں نماز پڑھائی تو بنو عمرو بن عوف میں سے ان کے بھائیوں منافقین کو ان سے حسد ہوا اور انہوں نے کہا ہم بھی ایک مسجد بناتے ہیں اور رسول اللہ کی طرف پیغام بھیجتے ہیں تاکہ آپ تشریف لا کر اس میں بھی نماز ادا

فرمائیں جیسا کہ ہمارے بھائیوں کی مسجد میں نماز ادا فرمائی ہے اور اس مسجد میں ابو عامر راہب بھی جب شام سے آئے گا نماز پڑھے گا۔

ابو عامر زمانہ جاہلیت میں راہب تھا اور نصرانی ہو گیا تھا اور جب نبی مدینہ تشریف لائے تو اس نے دین حنیف قبول کرنے سے انکار کر دیا اور آپ سے عداوت رکھتا تھا اور نبی نے اس کا نام ابو عامر فاسق رکھا تھا۔ یہ شام کی طرف چلا گیا اور منافقین کو یہ پیغام بھیجا کہ تم قوت اور اسلحہ جتنا ہو سکے تیار رکھو اور میرے لیے ایک مسجد تعمیر کرو میں قیصر روم کی طرف جا رہا ہوں روم کا لشکر لے کر آؤں گا اور محمد اور اس کے ساتھیوں کو (معاذ اللہ) نکال باہر کروں گا۔

چنانچہ ان منافقین نے اس کے لیے مسجد قبا کے پہلو میں ایک مسجد تعمیر کی اس مسجد کی تعمیر کرنے والے بارہ افراد تھے حزام بن خالد جس کے گھر کو مسجد کی طرف نکالا گیا، ثعلبہ بن حاطب معتب بن قشیر، ابو حبیبہ بن ارعد، عباد بن حنیف، حارثہ، جاریہ، اس کے دو بیٹے مجمع اور زید، نبتل بن حارث، لحاد بن عثمان اور ودیعہ بن ثابت۔

جب یہ لوگ تعمیر سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ ہم نے بیمار، حاجت مند کے لیے برساتی اور سردرات کے لیے مسجد تعمیر کی ہے ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری خاطر اس میں نماز ادا کریں تو آپ نے اپنی قمیص طلب کی تاکہ آپ وہ پہن کر ان کے ساتھ تشریف لے جائیں لیکن آپ پر اس بارے میں قرآن پاک نازل ہوا اور اللہ نے مسجد ضرار کی آپ کو خبر دے دی اور جو انہوں نے ارادہ کیا تھا اس کے بارے میں بھی بتلا دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے مالک بن دخشم، معن بن عدی، عامر بن یشکر اور وحشی (قاتل حمزہ) رضی اللہ عنہم کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ اس مسجد کی طرف جس کے بنانے والے ظالم ہیں جاؤ اور اسے منہدم کر دو اور جلا دو چنانچہ یہ حضرات نکلے اور مالک اپنے ساتھ کھجور کی ایک شاخ لے کر نکلے جسے انہوں نے آگ سے روشن کر لیا پھر یہ لوگ مسجد میں داخل ہوئے جبکہ اس کے بنانے والے اس مسجد میں موجود تھے

اور مسجد کو جلا کر منہدم کر دیا اور اس کے بنانے والے اس سے بھاگ کر نکل گئے نبی ﷺ نے اس جگہ کوڑادان بنانے کا حکم دیا کہ اس میں مردار، بدبودار، اشیاء، کوڑا کرٹ وغیرہ پھینکا جائے اور ابو عامر شام میں اکیلا جلاوطنی کی حالت میں مرا۔ (نیشاپوری، سیوطی، طبری ۱۱/۱۸، قرطبی ۸/۲۵۳)

انہوں نے بظاہر جس مقصد کے لیے مسجد بنائی تھی وہ بھی ظاہر ہو گیا، بباطن جو کچھ ان کا ارادہ اور پروگرام تھا وہ بھی اللہ نے آشکار کر دیا، اور اللہ نے انہیں یہ کہہ کر ذلیل ورسوا کیا کہ اللہ انہیں جانتا ہے یہ جھوٹے لوگ ہیں۔

مسجد نبوی، مسجد قبا، مسجد ضرار، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ {۱۰۸} اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ {۱۰۹} لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ {۱۱۰} التوبه

جواب ترجمہ: آپ اس مسجد میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں۔ البتہ جس مسجد کی بنیاد پہلے ہی دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہو وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ خوب پاک ہونے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ کیا جس کی بنیاد اللہ کے ڈر اور خوشنودی پر رکھی گئی وہ بہتر ہے یا وہ بہتر ہے جس کی بنیاد کسی گھاٹی کے کنارے پر رکھی گئی ہو جو گرنے والی ہے پھر وہ اسے لے کر دوزخ کی آگ میں گر پڑے، اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ انہوں نے جو عمارت بنائی وہ ہمیشہ ان کے دلوں میں کھٹکتی رہے گی۔ اِلاّ یہ کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ: اے نبی ﷺ! اس مسجد میں ہر گز کھڑے نہ ہوں جسے منافقین نے نفاق اور تفرقہ کے ارادے سے تعمیر کیا ہے، ان کی دعوتِ نماز کو قبول نہ کیجیے، کیونکہ وہ مسجد جس کی بنیاد اوّل دن سے تقویٰ پر رکھی گئی، یعنی مسجدِ قباء، اس بات کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ وہاں قیام فرمائیں۔

مسجد تقویٰ کا مصداق کون سی مسجد ہے؟ اس بارے میں علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے تین مصداق لکھے ہیں ① ایک مسجد نبوی شریف ② دوسرا مسجد قبا اور ③ تیسرا ہر وہ مسجد مراد جو مدینہ میں بنائی گئی ہے۔ لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَى کے بارے میں اہلِ تحقیق مفسرین کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد اصلاً مسجد قباء ہے، کیونکہ آیت کا سیاق مسجدِ ضرار کے مقابلے میں ہے اور متعدد آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اسی کی تائید کرتے ہیں، تاہم صحیح حدیث میں نبی ﷺ سے اس آیت کے بارے میں سوال ہونے پر آپ ﷺ نے مسجد نبوی کی طرف اشارہ فرمایا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ نزولی پس منظر کے اعتبار سے مصداقِ اوّل مسجدِ قباء ہے، لیکن معنی کے عموم کے لحاظ سے مسجدِ نبوی بھی اس وصف میں بدرجۂ اولیٰ داخل ہے، کیونکہ وہ بھی تقویٰ ہی کی بنیاد پر قائم ہوئی، یوں اصولِ تفسیر کے قاعدے اَلْعِبْرَةُ بِعُمُومِ اللَّفْظِ لَا بِخُصُوصِ السَّبَبِ کے مطابق سببِ نزول خاص ہو سکتا ہے مگر حکم اور فضیلت کا مفہوم عام رہتا ہے۔

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ: وہاں ایسے لوگ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) ہیں جو ظاہر و باطن کی طہارت کے طالب ہیں، وہ جسمانی آلودگی کو پانی سے اور روحانی میل کو توبہ و استغفار سے دھوتے ہیں اور اللہ کو وہی بندے محبوب ہیں جو پاکیزگی کو شعار بنا لیتے ہیں۔

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَى مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ: کیا وہ شخص برابر ہو سکتا ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقویٰ اور اس کی رضا پر رکھی ہو، اوامر کی پیروی اور نواہی سے اجتناب کے ذریعے، اس شخص کے ساتھ جس نے ایک مسجد ہی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے، کفر کو تقویت دینے

اور اہلِ ایمان میں تفرقہ ڈالنے کے لیے کھڑی کی ہو؟ ہر گز نہیں، پہلی عمارت مضبوط اور پائیدار ہے، جسے زوال کا اندیشہ نہیں اور دوسری کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے اپنی تعمیر کسی کھائی کے کنارے کھڑی کی ہو، جو کسی بھی لمحے ڈھے کر اسے لے کر جہنم کی گہرائی میں جا گرے، اللہ ایسے ظالموں کو جو کفر اور نفاق میں ڈوبے ہوں راہِ توفیق نہیں دکھاتا۔

لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ: اور یہ مسجد جو انہوں نے ضرر پہنچانے کے لیے بنائی، ان کے دلوں میں شک اور نفاق کی ایک مستقل یادگار بنی رہے گی، یہاں تک کہ موت یا تلوار ان کے دلوں کو پارہ پارہ کر دے، اللہ اپنے بندوں کے اعمال سے خوب باخبر ہے اور اپنے فیصلوں میں سراسر حکمت والا ہے، وہ خیر و شر کے مطابق ہی جزا و سزا کا حکم صادر فرماتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عہدِ خدا کے امین اور جنت کے یقینی وارث

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ {۱۱۱} اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ {۱۱۲} التوبه

جواب ترجمہ: بیشک اللہ نے مومنین سے اس بات کے عوض ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا کہ ان کے لیے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کر دیئے جاتے ہیں اس پر اللہ کا سچا وعدہ ہے جو توریت، انجیل اور قرآن میں ہے، اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔ سو تم لوگ اپنی اس بیع پر خوش ہو جاؤ جس کا تم نے معاملہ کیا ہے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ یہ لوگ توبہ کرنے والے ہیں۔ عبادت کرنے والے ہیں، حمد کرنے والے ہیں۔ روزہ رکھنے والے ہیں،

رکوع کرنے والے ہیں۔ سجدہ کرنے والے ہیں۔ نیک باتوں کی تعلیم دینے والے ہیں، اور بری باتوں سے روکنے والے ہیں اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور آپ مومنین کو خوشخبری سنا دیجیے۔

شانِ نزول: محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جب انصار رضی اللہ عنہم نے مکہ میں لیلۃ العقبہ یعنی گھاٹی میں بیعت کی، یہ ستر افراد تھے عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا یارسول اللہ! آپ اپنے رب کے واسطے اور اپنی ذات کے واسطے جو شرائط چاہیں رکھیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اپنے رب کے لیے یہ شرط رکھتا ہوں کہ آپ لوگ اس کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور اپنے لیے یہ شرط رکھتا ہوں کہ آپ لوگ میرا دفاع اسی طرح کریں جس طرح آپ اپنے آپ کا کرتے ہیں انصار رضی اللہ عنہم نے پوچھا اگر ہم یہ شرائط پوری کریں تو ہمیں کیا حاصل ہو گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ کو جنت ملے گی انصار نے کہا کہ رَبِحَ البَیعُ یعنی سودا نفع کا ہے، نہ ہم دستبردار ہوں گے اور نہ ہونے دیں گے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (اسباب)

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ: اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں، حالانکہ وہ سب اسی کے عطا کردہ ہیں، مگر یہ اس کا فضل ہے کہ اس نے اس خریداری کی قیمت جنت مقرر فرمائی، وہ اس کی راہ میں اس لیے لڑتے ہیں کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، وہ دشمن کو قتل کرتے ہیں اور خود بھی شہادت کا جام نوش کرتے ہیں، یہ وعدہ محض زبانی نہیں، بلکہ تورات، انجیل اور قرآن، تینوں آسمانی کتابوں میں ثبت شدہ ایک سچا عہد ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ پس اے اہلِ ایمان! اس سوداگری پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اپنے رب سے کی ہے، یہ ایسا نفع بخش معاملہ ہے جس میں خسارے کا کوئی اندیشہ نہیں اور یہی درحقیقت عظیم کامیابی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صفات: اور یہ بشارت انہی لوگوں کے لیے ہے جو گناہ اور نافرمانی سے پلٹ کر اطاعت اور رضا کی طرف لوٹ آتے ہیں؛ جو اللہ کے حضور عاجزی اور خشوع اختیار کرتے ہیں، اسی کی

بندگی میں جھکے رہتے ہیں، ہر حال میں اس کی حمد کرتے ہیں، روزہ رکھتے، نماز قائم کرتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی حفاظت اتباع سے کرتے اور ممنوعات سے بچ کر اس کی حدود کی پاسداری کرتے ہیں، اے میرے حبیب ﷺ! ایسے اہلِ ایمان (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کو دنیا و آخرت کی مسرتوں کی خوشخبری سنا دیجیے، کہ یہی لوگ اس وعدۂ الٰہی کے سچے خریدار اور اس عظیم تجارت کے کامیاب وارث ہیں۔

نبی ﷺ اور اہل ایمان مشرکوں کیلیے دعا نہیں کر سکتے

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ {۱۱۳} وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ {۱۱۴} وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ {۱۱۵} التوبه

جواب ترجمہ: نبی کے لیے اور ایمان والوں کے لیے درست نہیں کہ وہ شرک کرنے والوں کے لیے استغفار کریں خواہ وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں جبکہ ان پر کھل چکا کہ وہ دوزخ والے ہیں۔ اور اپنے والد کے لیے ابراہیم کا استغفار تو صرف اس وعدہ کی بنا پر تھا جو وہ ان سے کر چکے تھے پھر جب ان پر کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو ان سے بے تعلق ہو گئے، بلاشبہ ابراہیم بڑے دردمند تحمل والے تھے۔ اور اللہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ نہیں کرتا جب تک ان کو بتا نہیں دیتا کہ وہ کن چیزوں سے پرہیز کریں بیشک اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

شانِ نزول: جب نبی کریم ﷺ کے چچا ابو طالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو نبی کریم ﷺ ان

کے پاس تشریف لے گئے، اس وقت ابو طالب کے پاس ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ تھے، آپ ﷺ نے کہا کہ اے چچا! میرے ساتھ دھرایئے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یہ ایسا کلمہ ہے جس کی وجہ سے میں اللہ کے نزدیک آپ کی حجت پیش کروں گا ابو جہل اور ابن ابی امیہ بول پڑے اے ابو طالب! کیا آپ عبد المطلب کے دین سے منہ موڑیں گے؟ یہ دونوں برابر اپنی یہی بات کہتے رہے، یہاں تک کہ ان سے آخری کلمہ یہ کہلوایا کہ عَلٰی مِلَّۃِ عَبدُ المُطَّلِب، یعنی میں عبد المطلب کے دین پر مرتا ہوں اس پر نبی ﷺ نے فرمایا میں ہر حال میں آپ کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہوں گا، جب تک مجھے اس سے روکا نہیں جاتا اس پر یہ آیت نازل ہوئی مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ

روافض کی تفسیر منہج الصادقین میں یہ شان نزول بیان نہیں کیا گیا، بلکہ یہ شان نزول بیان کیا گیا کہ مسلمانوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ﷺ کیوں ہمارے ان آباؤاجداد کے لیے استغفار نہیں کرتے جو زمانہ جاہلیت میں فوت ہوگئے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (منہج الصادقین ج ۵ ص ۱۰۱) یہ روافض کی طرف سے یکطرفہ تعصب ہے جس کی بناء پر سچی بات ان کی زبانوں سے اور ان کی قلموں سے تحریر نہیں ہوتی، وہ ابو طالب کو حضرت علی المرتضیٰ کے والد ہونے کی بناء پر ذکر نہیں کرتے۔

علامہ واحدی نے اسباب النزول میں ایک ایسی روایت بھی پیش کی ہے جس میں نبی کریم ﷺ اللہ سے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اجازت مانگ رہے ہیں تو آپ ﷺ کو اجازت دی گئی، آپ ﷺ نے والدہ کے لیے شفاعت کی اجازت چاہی تو اجازت نہیں ملی، اس سے کچھ ضعیف اور کمزور مدلس راویوں کی روایت نے امت میں فتنہ پیدا کیا ہے، اس روایت کو درست تسلیم کیا جائے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کی والدہ مشرکہ تھیں، حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔

والدین مصطفٰے کریم ﷺ: سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کے مشرکہ ہونے پر جو روایت پیش کی جاتی ہے وہ سنداً ضعیف ہے، کیونکہ اس میں ضعیف اور مدلس راوی موجود ہیں اور ائمہ حدیث نے اس پر جرح کی ہے،

اس کے مقابلے میں صحیح مسلم کی روایت سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اجازت دی گئی، اگر وہ معاذ اللہ مشرکہ ہوتیں تو قرآن کے حکم وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ کے مطابق آپ ﷺ کو ان کی قبر پر کھڑے ہونے کی اجازت نہ دی جاتی، جہاں تک استغفار کی اجازت نہ ملنے کا تعلق ہے تو اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ غیر معصوم کے لیے استغفار بعض اوقات معصیت کے وہم کو جنم دیتا ہے، اس لیے اجازت نہ دی گئی، لہٰذا معتبر دلائل کی رو سے سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کے مشرکہ ہونے کا قول ثابت نہیں ہوتا۔

بعض روایات میں نقل ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے والدین کو وفات کے بعد زندہ کیا گیا اور انہوں نے ایمان کی روشنی میں آپ ﷺ پر ایمان لایا، کچھ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ چونکہ آپ کے والدین اُس زمانہ فترت میں انتقال کر گئے، جب وحی کی روشنی غائب تھی اور وہ صریح شرک اور بت پرستی سے دور رہے، اس لیے ان کے لیے آخرت میں نجات ممکن ہو سکتی ہے۔

لیکن عقلمندانہ، دانشمندانہ اور مؤمنانہ رویہ یہی ہے کہ اس معاملے میں توقف اختیار کیا جائے، یعنی خاموش رہنا بہتر ہے اور حضور ﷺ کے والدین کے بارے میں کسی قسم کی گستاخی یا بے ادبی سے زبان محفوظ رکھی جائے، کیونکہ یہ مسئلہ نہ عقائد کا جزو ہے اور نہ ایمان کا حصہ اور نہ ہی آخرت میں ہم سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا، یہ محتاط خاموشی، ادبِ الٰہی اور احترامِ رسول ﷺ کا تقاضا ہے۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ: نبی ﷺ کے لیے اور اہلِ ایمان کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جب یہ بات واضح ہو چکی ہو کہ وہ شرک پر مرے اور جہنم کے مستحق ہو گئے، ایمان کا تعلق محض نسب سے نہیں، بلکہ عقیدہ اور انجام سے ہے، جب انجام ظاہر ہو جائے تو دعا کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ: اور ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ

کے لیے استغفار کرنا کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی نہ تھا، بلکہ ایک وعدے کے تحت تھا جو انہوں نے امیدِ ہدایت میں کیا تھا، جب ان پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ ان کا باپ اللہ کا دشمن ہے یا تو اس لیے کہ نصیحت بے اثر رہی، یا اس لیے کہ وحی کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ وہ کفر پر ہی مرے گا، تو انہوں نے فوراً اس سے اظہارِ براءت کر دیا، ان کا استغفار اجتہادی جذبۂ شفقت کا مظہر تھا، نہ کہ کسی الٰہی حکم سے روگردانی، بے شک ابراہیم علیہ السلام نہایت درجہ نرم دل، کثرت سے آہ وزاری کرنے والے اور اپنی قوم کی زیادتیوں پر بھی حلم و درگزر اختیار کرنے والے تھے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدٰاهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُوْنَ: اور اللہ کا طریقہ یہ نہیں کہ وہ کسی قوم کو ہدایت عطا کرنے کے بعد بلا بیان و توضیح گمراہی کا حکم دے دے، وہ پہلے واضح کرتا ہے کہ کن امور سے بچنا لازم ہے، پھر اگر لوگ علم کے باوجود ان ممنوعات کا ارتکاب کریں تو وہ خود اپنے لیے ضلالت کا راستہ اختیار کرتے ہیں، اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے، اس سے کوئی حال پوشیدہ نہیں اور وہی ہے جس نے تمہیں وہ کچھ سکھایا جو تم نہ جانتے تھے، یہاں عدلِ الٰہی اور ذمہ داریِ انسانی دونوں ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔

مالک و مختار ایک اللہ

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ {۱۱۶} التوبه

جواب ترجمہ: بیشک اللہ ہی کے لیے ہے ملک آسمانوں کا اور زمین کا، وہ زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے اور تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی یار اور مددگار نہیں۔

ربطِ آیات: یہ آیت سورۃ التوبہ کے اُس حصے کے بعد وارد ہوئی ہے جہاں بعض لوگوں کے ایمان، بعض کے نفاق اور بعض کی توبہ کا ذکر ہے، خاص طور پر اس سے پہلے ان خوش نصیب صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم کی توبہ کا بیان ہے جو غزوۂ تبوک کے موقع پر پیچھے رہ گئے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، اسی تسلسل میں یہ آیت گویا ایک جامع اعلان ہے: یہ سب کچھ، قبولِ توبہ، مہلت، گرفت، عزت یا ذلت، کسی انسانی اختیار کا نتیجہ نہیں، بلکہ اُس ذاتِ واحد کی مشیت کے تابع ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زمین و آسمان کی بادشاہی ہے، یوں یہ آیت دلوں کو اس حقیقت کی طرف موڑتی ہے کہ انجامِ کار کا فیصلہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، نہ کسی گروہ کی قوت میں، نہ کسی جماعت کی سیاست میں۔

شانِ نزول: مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اس مقام پر اہلِ ایمان کو یہ تنبیہ مقصود تھی کہ وہ کسی ظاہری سہارے یا قبیلائی طاقت پر اعتماد نہ کریں، غزوۂ تبوک جیسے کٹھن مرحلے نے یہ واضح کر دیا تھا کہ ظاہری اسباب کمزور پڑ سکتے ہیں، مگر ربِّ کائنات کی نصرت کبھی کمزور نہیں پڑتی۔ پس اس آیت میں اعلان کیا گیا کہ زندگی اور موت، عزت اور نصرت، ولایت اور کارسازی، سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ محض ایک عقیدہ نہیں، بلکہ ایک روحانی انقلاب ہے، جب دل یہ مان لیتا ہے کہ إِنَّ ٱللَّهَ لَهُۥ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ تو پھر خوف کے بت ٹوٹنے لگتے ہیں، آسمانوں کی وسعتیں، زمین کی پہنائیاں، سب اسی کی ملکیت ہیں، نہ اس کی سلطنت میں کوئی شریک، نہ اس کے اقتدار میں کوئی مد مقابل، کوئی ذرہ اس کے علم سے باہر نہیں، کوئی سرگوشی اس کی سماعت سے اوجھل نہیں، وہی حیات بخشتا ہے، بے جان مٹی کو انسان بنا دیتا ہے، وہی موت دیتا ہے اور تخت و تاج کو مٹی میں ملا دیتا ہے۔

پھر بندے سے کہا جاتا ہے: اے انسان! اللہ کے سوا تیرا کون ہے؟ کسے اپنا کارساز سمجھ بیٹھا ہے؟ کون ہے جو تیرے معاملات سنبھالے؟ کون ہے جو تجھے مصیبت سے بچالے؟ اگر رب نہ چاہے تو لشکر کچھ نہیں، اور اگر رب چاہے تو تنہا بندہ بھی غالب آسکتا ہے۔

یہ آیت ہمیں تین بڑے سبق دیتی ہے: ① توحیدِ خالص: ہر قسم کے ظاہری اور باطنی سہاروں سے دل کو آزاد کر کے صرف اللہ پر اعتماد کرنا۔ ② توکل و یقین: مشکلات کے وقت مایوسی نہیں، بلکہ یہ یقین کہ حیات و ممات کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ③ غیر اللہ سے بے نیازی: مخلوق سے تعلق رکھو، مگر اعتماد خالق پر رکھو، اسباب اختیار کرو، مگر دل کو اسباب کا اسیر نہ بناؤ۔

مہاجرین وانصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان امتیازی

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ {۱۱۷} التوبہ

جواب ترجمہ: بلاشبہ اللہ نے نبی پر اور مہاجرین پر اور انصار پر مہربانی فرمائی جنہوں نے اس کے بعد تنگی کے وقت نبی کا ساتھ دیا جبکہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں تزلزل ہو چلا تھا، پھر اللہ نے ان پر توجہ فرمائی۔ بلاشبہ وہ ان پر مہربان ہے رحم فرمانے والا ہے،

یہ آیت غزوۂ تبوک کے اُس کٹھن مرحلے کی یاد تازہ کرتی ہے جسے قرآن نے سَاعَةِ الْعُسْرَةِ تنگی اور مشقت کی گھڑی قرار دیا، گرمی اپنے جوبن پر تھی، سفر طویل تھا، ساز و سامان نہایت کم، دشمن طاقتور اور راستہ دشوار، ایسے میں ایمان کا امتحان ہوا، کچھ دلوں میں لمحاتی کمزوری نے سر اٹھایا، قدم ڈگمگانے کو ہوئے، نگاہیں پیچھے مڑنے لگیں۔ تَابَ يَتُوبُ کا اصل معنی رجوع کرنے کا ہے، بندہ اللہ کی طرف گناہ کے بعد رجوع کرتا ہے، اس لیے اسے تائب اور تواب کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربانی کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے، مہربانی فرماتا ہے اسی لیے لفظ تَوَّابٌ اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فضل فرمانا، توبہ کی توفیق دینا، توبہ کو قبول فرمانا، معاملہ میں آسانی فرما دینا، تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ اس سب کو شامل ہے، صاحب قاموس کہتے ہیں تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ کی توفیق دی اور اس سے سختی کو ہٹا کر آسانی کر دی یا اپنے فضل و قبولیت کے ساتھ اس پر توجہ فرمائی اور وہ اپنے بندوں کے لیے تَوَّاب ہے۔

لیکن یہ وہ جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم تھی جسے رب نے چن لیا تھا، لغزش کے دہانے تک پہنچ کر بھی وہ گرے نہیں، ان کے دلوں میں اضطراب آیا، مگر ارتداد نہیں، کمزوری آئی، مگر بے وفائی نہیں اور پھر آسمان سے رحمت اتری، اللہ تعالیٰ نے انہیں ثابت قدمی عطا فرمائی، قدموں کو جما دیا اور وہ اسی پیغمبرِ

حق ﷺ کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے جس کی صداقت پر وہ جان نثار کر چکے تھے، آیت کا آغاز ہی کس جلال اور شفقت کے ساتھ ہوتا ہے: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ، گویا ربِّ کریم نے اپنے محبوب ﷺ کو بھی اپنی رحمت کے سایۂ قبول میں لے لیا کہ آپ ﷺ نے بعض منافقین کو پیچھے رہنے کی اجازت دے دی تھی، یہ کوئی گناہ نہ تھا، مگر مقامِ نبوت کی رفعت کے پیشِ نظر رب نے اپنی خصوصی عنایت کا اظہار فرمایا، پھر مہاجرین و انصار کا ذکر ہے، وہ خوش نصیب لوگ جنہوں نے تنگی کی گھڑی میں رسول اللہ ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا۔

آخر میں فرمایا: إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ، وہ ان پر نہایت مہربان، بے حد رحم فرمانے والا ہے، یہ محض قبولِ توبہ نہیں، بلکہ محبت کی تجدید ہے، یہ محض معافی نہیں، بلکہ قرب کا اعلان ہے۔ اس میں نبی کریم ﷺ کے اصحاب کی فضیلت تمام لوگوں پر ثابت ہو گئی۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی توبہ

سوال اس آیت مبارکہ میں کن تین لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے؟

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ {۱۱۸} يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ {۱۱۹} التوبة.

جواب ترجمہ: اور ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین باجود فراخی کے ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہو گئیں اور انہوں نے جان لیا کہ خدا (کے ہاتھ) سے خود اس کے سوا کوئی پناہ نہیں۔ پھر خدا نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں۔ بیشک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

یہ تین شخص کعب بن مالک، ہلال بن امیّہ اور مرارہ بن الربیع ہیں، جو باوجود مومن مخلص ہونے

کے محض تن آسانی اور سہل انگاری کی بناء پر بدون عذر شرعی کے تبوک کی شرکت سے محروم رہے۔

جب حضور ﷺ واپس تشریف لائے تو نہ انہوں نے منافقین کی طرح جھوٹے عذر پیش کئے اور نہ بعض صحابہ کی طرح اپنے آپ کو ستونوں سے باندھا۔ جو واقعہ تھا صاف صاف عرض کر دیا، اور اپنی کوتاہی اور تقصیر کا اعلانیہ اعتراف کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین کی طرف سے بظاہر اغماض کر کے ان کے بواطن کو خدا کے سپرد کیا گیا۔ "اصحاب سواری" کی (یعنی جو مسجد کے ستونوں سے بندھے ہوئے تھے) توبہ قبول کر لی گئی۔ اور ان تینوں کا فیصلہ تادیباً کچھ مدت کے لیے ملتوی رکھا گیا۔ پچاس دن گزرنے کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی پیچھے رکھے جانے کا یہ ہی مطلب ہے۔

ربط و مفہوم: اوپر کی دو آیتوں میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے دونوں ساتھیوں کی توبہ قبول ہونے کا ذکر ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ یہ آیت بھی انہی آیات کے ساتھ نازل ہوئی۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے سچ بولا اور سچ ہی کی وجہ سے نجات ہوئی، اس آیت میں سچائی کی اہمیت اور ضرورت بتانے کے لیے عامۃ المسلمین کو حکم فرمایا کہ تم اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ، اللہ سے ڈرنے کا حکم قرآن مجید میں جگہ جگہ وارد ہوا ہے، اس آیت میں تقویٰ حاصل ہونے کا ایک طریقہ بتادیا اور وہ یہ ہے کہ صادقین کے ساتھ ہو جاؤ، عربی میں صادق سچے کو کہتے ہیں اور سچائی کو صدق کہتے ہیں، دین اسلام میں صدق کی بہت بڑی اہمیت اور فضیلت ہے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی ایمان، اقوال اور اعمال سب میں ضرورت ہے۔ اس کی ضد کذب یعنی جھوٹ ہے، جھوٹ سے دین اسلام کو بہت سخت نفرت ہے اور اس کی شدید ممانعت ہے۔ (انوار البیان)

جہادی سفر میں سپہ سالار کا ساتھ، سفر میں خرچ کا اجر و ثواب

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ {۱۲۰} وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ {۱۲۱} التوبه

جواب ترجمہ: مدینے والے اور ان کے آس پاس کے رہنے والے دیہات کے لوگوں کے لیے یہ زیبا نہیں تھا کہ رسول اللہ کے ساتھ جانے سے پیچھے رہ جائیں اور نہ یہ بات کہ وہ رسول اللہ کو چھوڑ کر اپنی جانوں کو لے کر بیٹھ جائیں، یہ اس وجہ سے کہ انہیں جو بھی کوئی پیاس یا تھکن یا بھوک اللہ کی راہ میں پہنچتی ہے اور وہ کسی جگہ جو قدم رکھتے ہیں جس سے کافروں کو جلن ہوتی ہے اور دشمن سے جو بھی کوئی چیز لے لیتے ہیں تو اس سب کی وجہ سے ان کے لیے نیک عمل لکھا جاتا ہے۔ بلاشبہ اللہ اچھے کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتا۔ اور وہ لوگ جو بھی کوئی چھوٹا بڑا خرچہ کرتے ہیں اور جس کسی میدان کو قطع کرتے ہیں تو یہ ان کے لیے لکھ لیا جاتا ہے تاکہ اللہ ان کو ان کے عمل کا اچھے سے اچھا بدلہ عطا فرمائے۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ: اہل مدینۃ الرسول اور ان کے گرد دیہاتیوں کو نہ چاہیے کہ وہ کسی بھی غزوہ رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہیں خصوصاً وہ لوگ غزوہ تبوک میں پیچھے رہے جب کہ وہ اہل ایمان ہیں اور نہ ان کو حضور ﷺ کی سفر وجہاد میں صحبت اور معاونت اور غزوہ میں جو وہ تکالیف اٹھاتے ہیں اپنے نفوس کے لحاظ میں اس سے بے رخی اختیار نہ کرنی چاہیے، اس وجہ سے کہ آپ ﷺ کی معیت میں حالت سفر میں ان کو جو پیاس، تھکاوٹ اور نصرت و قیام دین میں بھوک پہنچتی ہے، اس سب کا اجر ملتا ہے، اسی طرح کفار کے نشانات کو مٹانے اور ان کی سرزمین کو روندنے میں جو مشقت پیش آتی ہے، اللہ تعالیٰ دشمنوں کے جو اموال، انفس واولاد جو بھی وہ حاصل کرتے ہیں ان سب کے بدلے نیک عمل کا ثواب لکھا جاتا ہے اور

اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی مخلوق میں کسی ایسے عمل والے کو بلا بدلہ نہیں چھوڑتی جس نے کہ اپنے عمل میں اللہ تعالیٰ کی پوری پوری اطاعت کی ہو اور اس کی ممنوعات سے بچا ہو کہ اسے اس کے احسان کا بدلہ نہ دے اور صالح عمل کا ثواب عنایت نہ کرے، اس وجہ سے اس نے اہل مدینہ اور ان کے اطراف والے دیہاتیوں کے لئے ان کے افعال پر ثواب لکھ دیا اور اس کے فعل کا اجر ضائع نہیں کیا۔ (تفسیر طبری)

وَلَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ: یعنی اصل مقصود تو ہے جہاد: لیکن اس مقصود کو پانے میں ضمنی طور پر آدمی جن مرحلوں سے گزرتا ہے، ان پر بھی ان کو اجر حاصل ہوتا ہے، جیسے ایک شخص نماز ادا کرنے کے لیے مسجد جائے تو اصل مقصد تو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا ثواب حاصل کرنا ہے: لیکن اس کا ہر قدم جو مسجد کی طرف اٹھے گا اور ٹھنڈک اور گرمی کی تکلیف جو جاتے ہوئے اٹھائے گا، وہ بھی اس کے لیے نیکی شمار ہو گی اور اس پر بھی اسے اجر حاصل ہو گا، یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص ہے، ورنہ تو دنیا کا نظام یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صبح آٹھ بجے اپنے گھر سے نکلا، مشقتیں اٹھاتے ہوئے دس بجے اپنے دفتر کو پہنچا تو اس کی ڈیوٹی دس بجے سے شمار ہوتی ہے، اس سے پہلے کے عمل کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا۔ (آسان تفسیر)

جہاد اور طلب علم

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کیجیے

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ {۱۲۲} التوبة.

جواب ترجمہ: اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں ”گذشتہ رکوعات میں جہاد میں نکلنے کی فضیلت اور نہ نکلنے پر ملامت تھی، ممکن تھا کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ ہمیشہ ہر جہاد میں تمام مسلمانوں پر نکلنا فرض عین ہے، اس آیت میں فرمایا کہ نہ ہمیشہ یہ ضروری ہے، نہ مصلحت ہے کہ سب مسلمان ایک دم جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ مناسب یہ ہے کہ ہر قبیلہ اور قوم میں سے ایک جماعت نکلے، باقی لوگ دوسری ضروریات میں مشغول ہوں۔

اب اگر نبی کریم ﷺ بنفس نفیس جہاد کے لیے تشریف لے جارہے ہوں تو ہر قوم میں سے جو جماعت آپ کے ہمراہ نکلے گی وہ حضور ﷺ کی صحبت میں رہ کر اور سینکڑوں حوادث وواقعات میں سے گزر کر دین اور احکام دینیہ کی سمجھ حاصل کرے گی اور واپس آکر اپنی باقی ماندہ قوم کو مزید علم و تجربہ کی بناء پر بھلے برے سے آگاہ کرے گی اور فرض کیجئے اگر حضور ﷺ خود مدینہ میں رونق افروز رہے تو باقی ماندہ لوگ جو جہاد میں نہیں گئے حضور ﷺ کی خدمت سے مستفید ہو کر دین کی باتیں سیکھیں گے۔ اور مجاہدین کی غیبت میں جو وحی و معرفت کی باتیں سنیں گے ان سے واپسی کے بعد مجاہدین کو خبر دار کریں گے۔

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ہر قوم میں سے چاہیے بعض لوگ پیغمبر کی صحبت میں رہیں تاکہ علم دین سیکھیں اور پچھلوں کو سکھائیں۔ اب پیغمبر اس دنیا میں موجود نہیں لیکن علم دین اور علماء موجود ہیں۔ طلب علم فرض کفایہ ہے اور جہاد بھی فرض کفایہ ہے۔ البتہ اگر کسی وقت امام کی طرف سے نفیر عام ہو جائے تو فرض عین ہو جاتا ہے۔ تبوک میں یہ ہی صورت تھی اس لیے پیچھے رہنے والوں سے باز پرس ہوئی۔ واللہ اعلم۔

ابو حیان کے نزدیک یہ آیت جہاد کے لیے نہیں، طلب علم کے بارہ میں ہے۔ جہاد اور طلب کی آیات میں مناسبت یہ ہے کہ دونوں میں خروج فی سبیل اللہ ہے اور دونوں کی غرض احیاء و اعلائے دین ہے۔ ایک میں تلوار سے دوسرے میں زبان وغیرہ سے۔ (عثمانی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قبائل عرب میں سے ہر ہر قبیلہ سے جماعتیں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوتیں اور وہ حضور سے دین کے مسائل سیکھتے اور تَفَقُّہ حاصل کرتے اور اپنے لئے احکام دریافت کرتے اور اپنی قوم کے لئے، حضور انہیں اللہ اور رسول کی فرماں برداری کا حکم دیتے اور نماز زکوٰۃ وغیرہ کی تعلیم کے لئے انہیں ان کی قوم پر مامور فرماتے، جب وہ لوگ اپنی قوم میں پہنچتے تو اعلان کر دیتے کہ جو اسلام لائے وہ ہم میں سے ہے اور لوگوں کو خدا کا خوف دلاتے اور دین کی مخالفت سے ڈراتے یہاں تک کہ لوگ اپنے والدین کو چھوڑ دیتے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دین کے تمام ضروری علوم تعلیم فرما دیتے۔ (خازن) یہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ عظیمہ ہے کہ بالکل بے پڑھے لوگوں کو بہت تھوڑی دیر میں دین کے احکام کا عالم اور قوم کا ہادی بنا دیتے تھے۔

اس آیت سے چند مسائل معلوم ہوئے۔

مسئلہ: علم دین حاصل کرنا فرض ہے جو چیزیں بندے پر فرض و واجب ہیں اور جو اس کے لئے ممنوع و حرام ہیں اس کا سیکھنا فرضِ عین ہے اور اس سے زائد علم حاصل کرنا فرضِ کفایہ حدیث شریف میں ہے علم سیکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ علم سیکھنا نفل نماز سے افضل ہے۔

مسئلہ: طلبِ علم کے لئے سفر کا حکم حدیث شریف میں ہے جو شخص طلبِ علم کے لئے راہ چلے اللہ اس کے لئے جنت کی راہ آسان کرتا ہے۔ (ترمذی)

مسئلہ: فقہ افضل ترین علم ہے۔ حدیث شریف میں ہے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ جس کے لئے بہتری چاہتا ہے اس کو دین میں فقیہ بناتا ہے، میں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ دینے والا۔ (بخاری و مسلم) حدیث میں ہے ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے۔ (ترمذی)

قرآن کریم میں واضح بتایا گیا ہے کہ اہل علم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے، سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں جن لوگوں نے علم سیکھا یہ انبیاء کرام کے وارث ہیں اور حضرات انبیاء کرام درھم اور دینار وراثت میں نہیں چھوڑتے بلکہ ان کی وراثت علم ہی ہوتی ہے، اسی سے آدمی ممتاز ہوتا ہے۔

آس پاس کے کفار سے قتال کا حکم

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے اور یَلُوْنَکُمْ کا مطلب کیا ہے؟

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ {۱۲۳} التوبۃ

جواب ترجمہ: اے ایمان والو اپنے نزدیک کے کافروں سے لڑو اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

جہاد فرض کفایہ ہے جو ترتیب طبعی کے موافق اول ان کفار سے ہونا چاہیے جو مسلمانوں سے قریب تر ہوں بعدہ، ان کے قریب رہنے والوں سے۔ اسی طرح درجہ بدرجہ حلقہ جہاد کو وسیع کرنا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے جہاد اسی ترتیب سے ہوئے دفاعی جہاد میں بھی فقہاء نے یہ ہی ترتیب رکھی ہے کہ جس اسلامی ملک پر کفار حملہ آور ہوں، وہاں کے مسلمانوں پر دفاع واجب ہے اگر وہ کافی نہ ہوں یا سُستی کریں تو ان کے متصل رہنے والوں پر وہ کافی نہ ہوں تو پھر جو ان سے متصل ہیں۔ اسی طرح اگر ضرورت پڑے تو درجہ بدرجہ مشرق سے مغرب تک جہاد فرض ہوتا چلا جائے گا۔

یَلُوْنَکُمْ کا مطلب یہ ہے کہ جو تم میں سب سے زیادہ قریب ہو، پھر اس کے بعد جو تم سے سب سے زیادہ قریب ہو۔ ساتھ ہی ہدایت کی جارہی ہے کہ مسلمان کو کافروں کے مقابلے میں سخت ہونا چاہیے، جیسے دوسرے مقام پر بھی ہے کہ مسلمان کافروں پر سخت اور آپس میں شیر وشکر ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے لیے نرم اور کافروں کے لیے سخت۔ اس کے ساتھ متقی کی شان بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ متقی اور پرہیز گار ہوتے ہیں ان کے ساتھ اللہ ہوتا ہے۔

منافقین کی چالاکیاں، مکاریاں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ {۱۲۴} وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ {۱۲۵} اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ {۱۲۶} وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۚ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ {۱۲۷} التوبه

جواب ترجمہ: اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کے ایمان کو بڑھایا، سو جو لوگ اہل ایمان ہیں اس سورت نے ان کے ایمان کو بڑھا دیا اور وہ خوش ہوتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے سو اس سورت نے ان کی گندگی پر گندگی بڑھا دی۔ اور وہ اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر ہیں۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو بار کسی نہ کسی مصیبت میں ڈالے جاتے ہیں پھر وہ رجوع نہیں کرتے اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں کہ تمہیں کوئی شخص دیکھ تو نہیں رہا، پھر چل دیتے ہیں، اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا۔ اس وجہ سے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ: اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ قرآن کی کوئی سورت اپنے پیغمبر ﷺ پر اتارتے ہیں، یہ آیت مذکور شدہ منافقین اس طرح کہتے ہیں اے لوگو! اس سورت کی وجہ سے کس کے ایمان میں اضافہ ہوا؟ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور آیات کی تصدیق کے طور پر فرماتے ہیں کہ وہ مومن جن کو یہ بات کہی گئی اس سورت کی وجہ سے ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ایمان و یقین ملنے پر خوش ہیں۔ (تفسیر طبری)

سوال ایمان کلام عرب میں اقرار و تصدیق کا نام ہے؟

جواب جی! ایمان کلام عرب میں اقرار و تصدیق کا نام ہے۔

سوال پھر سورت سے تصدیق و اقرار میں کس طرح اضافہ کیا؟

جواب اس کے نزول کے وقت ان کے ایمان میں اضافہ ہوا اس لئے کہ اس کے نزول سے پہلے اس کا اقرار و عمل فرض نہ تھا البتہ جملہ ایمان میں یہ چیز داخل تھی جو ان کے پیغمبر لائے وہ برحق ہے، جب اللہ تعالیٰ نے سورت کو اتار دیا تو اقرار میں لازم کر دیا تو ان پر قرآن کے تمامی احکام وحدود و فرائض واجب ہو گئے، یہ وہ اضافہ ہے جس نے نزول سورت سے بوقت نزول ان کے ایمان و تصدیق میں اضافہ کر دیا۔ (طبری)

وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے میں شک و نفاق والا مرض ہے، تو اس اترنے والی سورت نے ان کی گندگی اور رجس میں مزید اضافہ کر دیا ہے، وہ اس طرح کہ انہوں نے سورت کے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہونے میں شک کیا اور ان کو یقین نہ آیا اور نہ انہوں نے اس کی تصدیق کی، یہ اللہ تعالیٰ کے قرآن میں پیدا ہونے والے شک میں اضافہ ہوا حالانکہ ان کو اس پر ایمان لانا چاہیے تھا بلکہ انہوں نے اس کے متعلق شک کیا، اس سے ان کے افعال کی گندگی اور بڑھ گئی جبکہ اسی کی مثل نفاق و گندگی پہلے بھی موجود تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی نفاق والی گندگی میں اضافہ کر دیا، پھر جب انہیں ملک الموت نے آگھیرا تو کافر ہو کر مر گئے، یہ لوگ آیات ربانیہ میں شکوک وشبہات کے بعد ان کا انکار کر رہے تھے۔

أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ: یعنی قحط، بیماری اور اس طرح کی مصیبتیں ان منافقین پر آتی رہتی ہیں، عام طور پر مصیبتیں انسانی دلوں کو نرم کر دیتی ہیں اور ان کی وجہ سے انسان میں اپنے عمل پر پچھتاوا پیدا ہوتا ہے، لیکن ان کا حال یہ ہے کہ اس کے باوجود ان میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور نافرمانیوں سے باز رہنے کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوتا اس کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ ہر سال ایک دو بار سفر جہاد کی نوبت آتی ہے اور اس میں اپنے نفاق کی وجہ سے ان کو

شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے، اس کے باوجود ان کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، پہلی تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ وغیرہ سے منقول ہے اور دوسری قتادہ رحمہ اللہ سے۔ (مفاتیح الغیب: ج۸ ص۲۲۶، آسان تفسیر)

وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ نَظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ: یعنی جب ایسی آیات نازل ہوتی ہیں، جن میں ان کے نفاق اور ان کی غلط حرکتوں کا ذکر ہوتا ہے تو انہیں اس سچائی کو سن کر تکلیف ہوتی ہے اور وہ ادھر ادھر دیکھتے ہیں کہ کہیں کوئی مخلص مسلمان تو نہیں سن رہا ہے: کیوں کہ فضیحت کی باتیں اگر دوسروں کے سامنے ہوں تو یہ انسان کے لئے زیادہ ندامت اور شرمندگی کا باعث ہوتی ہیں، اس کے علاوہ ان کا مزاج یہ بھی تھا کہ جب قرآن مجید کے احکام کو سنتے تو اپنی بے توفیقی کی وجہ سے ان کا مذاق اڑاتے، لیکن یہ بھی خیال ہوتا کہ کہیں ان کے قریب مخلص مسلمان تو موجود نہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا نفاق لوگوں کے سامنے آجائے، اس لیے وہ ادھر ادھر دیکھتے کہ کوئی انہیں دیکھ تو نہیں رہا ہے، پھر موقع دیکھ کر وہاں سے کھسک جاتے۔ (آسان تفسیر مولانا سیف اللہ رحمانی)

رحمت عالم ﷺ رؤف ورحیم

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کیجیے

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ {۱۲۸} فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ {۱۲۹} التوبة

جواب (لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں۔ (اور) مومنوں پر نہایت شفقت کرنیوالے (اور) مہربان ہیں۔ پھر اگر یہ لوگ پھر جائیں اور (نہ) مانیں تو کہہ دو کہ اللہ مجھے کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے مخاطب ہیں کہ میں نے تم ہی میں سے ایک عظمت والا رسول بھیجا ہے، تمہیں جو بات ناپسند ہوتی ہے، جس سے تمہیں تکلیف پہنچتی ہے وہ میرے نبی ﷺ پر سخت گراں گزرتی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ تم لوگ ایمان لے آؤ، تمہارے حالات درست ہو جائیں، میرے نبی ﷺ کی شان یہ ہے کہ وہ ایمان والوں کے لیے بہت ہی مہربان اور کریم ہیں۔

آپ ﷺ دین حنیف لے کر آئے، اللہ کی آخری شریعت لے کر آئے، آپ ﷺ نے اپنے پیروکاروں پر مشقت اور سختی کی بجائے نرمی اختیار کی اور جب صحابہ کرام کو اپنا نمائندہ بنا کر کسی مقام کی طرف روانہ کرتے تھے تو انہیں بھی ہدایت کرتے تھے کہ لوگوں کو متنفر نہ کرنا، انہیں خوشخبریاں سنانا، لوگوں کے ساتھ آسانی والا معاملہ کرنا انہیں مشکل میں نہ ڈالنا۔

آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد دوسرے مقام پر بیان کیا گیا ہے جس میں کلام اللہ کی تلاوت، انسانی دلوں کا تزکیہ، کتاب وحکمت کی تعلیم دینا شامل ہے، انہی باتوں سے انسانی دل ودماغ تبدیل ہوتے ہیں، کفر وشرک کی جگہ توحید وسنت کے چراغ روشن ہوتے ہیں، گندگیوں اور بے ہودگیوں کا خاتمہ ہوتا ہے، انسان درست نہج کو اختیار کرتا ہے۔

اس سورت کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر یہ لوگ تیری شریعت سے منہ پھیر لیں تو تو کہہ دے کہ مجھے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میرا توکل اسی کی پاک ذات پر ہے۔ جیسے فرمان ہے مشرق ومغرب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اس کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں تو اسی کو اپنا کارساز ٹھہرا۔ وہ رب عرش عظیم ہے، یعنی ہر چیز کا مالک وخالق وہی ہے، عرش عظیم تمام مخلوقات کی چھت ہے، آسمان وزمین اور کل کائنات بقدرت رب عرش تلے ہے، اس اللہ کا علم ہر چیز پر شامل ہے اور ہر چیز کو اپنے احاطے میں کئے ہوئے ہے، اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے وہ ہر ایک کا کارساز ہے، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں سب سے آخری آیت قرآن کی یہی ہے۔

ان دو آیتوں کے بڑے فضائل حدیث میں مذکور ہیں، حضرت ابو الدرداء فرماتے ہیں کہ جو شخص صبح وشام یہ آیتیں سات مرتبہ پڑھ لیا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام کام آسان فرمادیتے ہیں (قرطبی)

علامہ محمود آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں ابن سنی کے حوالے سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرمایا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص صبح اور شام کے وقت حَسْبِيَ ٱللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ، وَهُوَ رَبُّ ٱلْعَرْشِ ٱلْعَظِيمِ، سَبْعَ مَرَّاتٍ، كَفَاهُ ٱللّٰهُ تَعَالَىٰ مَا أَهَمَّهُ مِنْ أَمْرِ ٱلدُّنْيَا وَٱلْآخِرَةِ، سات مرتبہ پڑھ لے گا اللہ تعالیٰ اس کے دنیوی اور اخروی غموں سے اس کے لیے کافی ہو جائے گا۔ حضرت حسین فرماتے ہیں کہ جس نے صبح کے وقت سات مرتبہ یہ ورد کر لیا اسے آج کے دن اور آج کی رات کوئی درد، تکلیف اور رنج و غرق کا حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ (روح المعانی)

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

اضافات و ترمیمات: ۲۰ فروری ۲۰۲۶ء، ۲ رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ

سورۃ یونس (تعارف)

سوال سورۃ یونس کا تعارف کروائیے۔

جواب سورۂ یونس قرآنِ حکیم کی اُن بابرکت سورتوں میں سے ہے جو عہدِ مکہ کے پُر آشوب ماحول میں نازل ہوئیں، جب توحید کی صدا نئی تھی، مخالفتیں شدید تھیں اور اہلِ ایمان آزمائشوں میں گھرے ہوئے تھے، اس وقت یہ سورت دلوں کو یقین، عقلوں کو دلیل اور روحوں کو تسکین دینے کے لیے اتری، اکثر مفسرین کے نزدیک یہ مکی سورت ہے اور اس کی آیات کی تعداد ایک سو نو بیان کی گئی ہے، بعض حضرات نے چند آیات کو مدنی قرار دیا ہے، مگر جمہور کی رائے یہی ہے کہ اس کا اصل مزاج، اسلوب اور موضوعات اسے مکی سورتوں کی صف میں نمایاں کرتے ہیں، اس سورت کا لہجہ پُر عزم ہے، اس کی دعوت واضح ہے اور اس کا استدلال نہایت بلیغ اور عقلی ہے، یہ دل کو جھنجھوڑتی بھی ہے اور عقل کو قائل بھی کرتی ہے۔

وجہِ تسمیہ: اس سورت کا نام "یونس" اس لیے رکھا گیا کہ اس میں حضرت یونس علیہ السلام اور ان کی قوم کا نہایت معنی خیز انداز میں ذکر آیا ہے، قرآن مجید میں بہت سی اقوام کا انجام بطورِ عبرت بیان ہوا ہے، مگر قومِ یونس کا ذکر ایک امتیازی شان رکھتا ہے، دیگر اقوام نے عذاب کو سامنے دیکھ کر بھی سرکشی نہ چھوڑی، لیکن قومِ یونس نے بروقت رجوع کیا، ایمان لایا اور یوں عذاب ٹل گیا، یہ نام دراصل امید کی علامت ہے، یہ اعلان ہے کہ اگر قومیں پلٹ آئیں تو درِ رحمت بند نہیں ہوتا۔

اہم مضامین: سورۂ یونس کے مضامین نہایت جامع اور ہمہ گیر ہیں، ان کا مرکزی محور تین بنیادی عقائد ہیں: توحید، رسالت اور آخرت۔ ① توحید کا عقلی اور فطری اثبات: سورت یونس بار بار انسان کو کائنات کی نشانیوں کی طرف متوجہ کرتی ہے: آسمان و زمین کی تخلیق، دن اور رات کی گردش، سمندر کی روانی، بارش کا نزول، یہ سب اللہ کی قدرت کے روشن دلائل ہیں، گویا سورت انسان سے کہتی ہے: اگر تم آنکھ کھول کر دیکھو تو کائنات کا ہر ذرہ "لاشریک لہ" کی گواہی دے رہا ہے۔

② کفار کے اعتراضات کا مدلل رد: مشرکینِ مکہ نبی کریم ﷺ کی رسالت پر مختلف اعتراضات کرتے تھے، کبھی وحی کا انکار، کبھی معجزہ طلبی، کبھی قیامت کا استہزاء، سورت ان اعتراضات کو نقل بھی کرتی ہے اور نہایت حکیمانہ انداز میں ان کا جواب بھی دیتی ہے، ان کے باطل عقائد کو بے نقاب کر کے یہ واضح کیا گیا کہ اصل اندھاپن دلیل کی کمی نہیں، دل کی ہٹ دھرمی ہے۔

③ آخرت کا یقین اور انجامِ کار: ایمان اور کفر کے نتائج کو نمایاں کیا گیا ہے، جو لوگ دنیا کی عارضی لذتوں میں کھو گئے، ان کے لیے خسارہ ہے، اور جو اللہ پر ایمان لائے اور عملِ صالح اختیار کیا، ان کے لیے ابدی کامیابی ہے، یہ سورت آخرت کو محض ایک نظریہ نہیں بلکہ ایک یقینی حقیقت کے طور پر پیش کرتی ہے۔

④ سابقہ اقوام کے واقعات: قومِ نوح، آلِ فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کے ذریعے بتایا گیا کہ تاریخ ہمیشہ حق و باطل کے معرکے کی گواہ رہی ہے، باطل بظاہر غالب آتا ہے، مگر انجام ہمیشہ حق کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اور پھر قومِ یونس کی مثال دے کر یہ واضح کر دیا کہ اگر قوم اجتماعی توبہ کرے تو عذاب بھی ٹل سکتا ہے۔

اسلوب اور پیغام: سورۂ یونس کا اسلوب نہایت دل نشین ہے، اس میں انذار بھی ہے، بشارت بھی، استدلال بھی ہے، جذباتی اپیل بھی، یہ سورت دل سے شرک کے سائے مٹاتی ہے، عقل سے شبہات دور کرتی ہے اور انسان کو یہ یقین دلاتی ہے کہ ہدایت کا راستہ کھلا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ دل ضد سے خالی ہو۔

عظمت قرآن اور حکمت رسالت کا اعلان

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝ {۱} اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ

هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ{۲}یونس

جواب ترجمہ: الر، یہ حکمت سے بھری کتاب کی آیتیں ہیں۔ کیالوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے انہیں میں سے ایک شخص کی طرف وحی بھیجی کہ لوگوں کو ڈرایئے اور ان لوگوں کو بشارت دیجئے جو ایمان لائے یہ کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑا مرتبہ ہے۔ کافروں نے کہا کہ بیشک یہ کھلا جادوگر ہے۔

شانِ نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا تو کافروں نے ماننے سے انکار کر دیا، انہوں نے کہا کہ اللہ کی ذات اس سے کہیں برتر ہے کہ محمد جیسا ایک بشر اس کا رسول ہو اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ (اسباب النزول)

{الٓرٰ} یہ حروفِ مقطعات ہیں، حروف مقطعات کا ذکر اس سے پہلے سورۂ بقرہ کے آغاز میں آچکا ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ یہ جو آیات اس سورت میں تلاوت کی جا رہی ہیں، یہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ قرآنِ حکیم کی وہ مضبوط، محکم اور نہایت پختہ آیات ہیں جو حکمت سے لبریز اور احکام سے مزین ہیں، گویا اعلان کیا جارہا ہے کہ یہ کتاب کسی انسانی ذہن کی تراشیدہ تحریر نہیں، بلکہ ایک ایسا کلام ہے جس کی بنیاد استحکام پر ہے، جس کا ہر لفظ میزانِ حکمت میں تولا ہوا ہے اور جس کی ہر ہدایت انسان کی اصلاح کے لیے مقرر کی گئی ہے، یہاں قرآن اپنی ہیئت اور حقیقت دونوں کا تعارف خود کراتا ہے، یہ آیات ہیں اور وہ بھی ایسی جو محکم ہیں، نہ ان میں اضطراب ہے، نہ تضاد، نہ ان میں کمزوری ہے، نہ بے ربطی۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ: پھر انسان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر سوال اٹھایا جاتا ہے، کیالوگوں کے لیے یہ بات باعثِ تعجب ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک انسان پر وحی نازل کی؟ کیا انہیں اس پر حیرت ہو رہی ہے کہ ان کی اپنی جنس کا ایک فرد، ان کے درمیان رہنے والا ایک انسان، اللہ کی طرف سے پیغام لے کر آیا ہے، انہیں عذابِ الٰہی سے ڈرائے اور اہلِ ایمان کو خوشخبری دے کہ ان کے لیے ان کے رب کے ہاں بلند مرتبہ اور عظیم اجر ہے؟

یہ دراصل کفار کے اُس اعتراض کا جواب ہے جو وہ رسالتِ محمدی ﷺ پر کرتے تھے، انہیں تعجب تھا کہ نبی کوئی فرشتہ کیوں نہ ہوا! حالانکہ حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ پیغام پہنچانے والا انسان ہی ہو، تاکہ وہ انسانوں کے لیے نمونہ بن سکے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ : پھر فرمایا گیا کہ اے رسول! ایمان والوں کو بشارت سنا دیجئے کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس سچی قدر و منزلت ہے، ان کے اعمالِ صالحہ رائیگاں نہیں جائیں گے۔

قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ : مگر دوسری طرف انکار کا شور بھی بلند ہوا، کافروں نے کہا: یہ شخص جو یہ آیات لے کر آیا ہے، کھلا جادوگر ہے! یوں تاریخ کا پرانا منظر دوبارہ سامنے آتا ہے، جب دلیل کم پڑ جائے تو الزام تراشی آسان ہو جاتی ہے، جب حق کی روشنی آنکھوں کو چبھنے لگے تو اسے جادو کہہ کر رد کر دینا سہل معلوم ہوتا ہے۔

دلائل توحید و قدرت الٰہی کے درخشاں پہلو

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ {۳} اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ {۴} هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ {۵} اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ {۶} یونس

جواب ترجمہ: بلاشبہ تمہارا رب اللہ تعالیٰ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا پھر وہ عرش پر مستوی ہوا وہ ہر کام کی تدبیر فرماتا ہے اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے والا نہیں وہ اللہ تمہارا رب ہے سو تم اس کی عبادت کرو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ اسی کی طرف تم سب کو لوٹ جانا ہے اس نے سچا وعدہ کر رکھا ہے بلاشبہ وہی مخلوق کو ابتداً پیدا فرماتا ہے پھر وہ اسے دوبارہ لوٹا دے گا تاکہ وہ ان لوگوں کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کیلئے پینے کو کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے۔ اللہ وہ ہے جس نے سورج کو روشن بنایا اور چاند کو نور بنایا اور اس کے لیے منزلیں مقرر فرمادیں تاکہ تم برسوں کی گنتی جان لو اور حساب کو معلوم کرلو یہ چیزیں اللہ نے حق ہی کے ساتھ پیدا فرمائی ہیں وہ جاننے والوں کیلئے تفصیل کے ساتھ نشانیاں بیان فرماتا ہے۔ بیشک رات اور دن کے ایک دوسرے کے بعد آنے جانے میں اور جو کچھ اللہ نے آسمان اور زمین میں پیدا فرمایا ہے ان میں ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں جو ڈرتے ہیں۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہارا رب وہی ہے جس نے آسمانوں کو ان کی وسعت و رفعت کے ساتھ اور زمین کو اس کے پھیلاؤ کے ساتھ چھ دن میں پیدا فرمایا، پھر عرش پر اپنی شانِ الوہیت کے مطابق جلوہ افروز ہوا، جب وہی خالقِ کائنات، مدبّرِ ارض و سما اور مالکِ کل ہے تو پھر اس بات پر تعجب کیسا کہ وہ تم ہی میں سے ایک انسان کو اپنا رسول بنا کر بھیج دے؟ ساری کائنات کا نظام اسی کے حکم سے چلتا ہے اور اس کی بارگاہ میں کوئی بھی سفارش اس کی اجازت اور رضا کے بغیر ممکن نہیں، یہی صفاتِ کمال کا مالک تمہارا رب ہے، لہٰذا عبادت بھی خالص اسی کے لیے ہونی چاہیے، کیا اتنے واضح دلائل کے بعد بھی نصیحت حاصل نہ کروگے؟

إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا: پھر یاد دلایا کہ قیامت کے دن تم سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے، یہ اس کا سچا وعدہ ہے جو کبھی خلاف نہیں ہو سکتا، وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی مرنے کے بعد

دوبارہ زندہ کرے گا، تاکہ ایمان والوں کو ان کے اعمالِ صالحہ کا پورا اور منصفانہ بدلہ دے، نہ ان کی نیکیوں میں کمی ہو گی اور نہ ان پر ظلم اور جنہوں نے کفر کیا اور رسولوں کو جھٹلایا، ان کے لیے کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہے، جو ان کے انکار اور سرکشی کا انجام ہو گا۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ: اسی نے سورج کو روشن چراغ بنایا جو روشنی بکھیرتا ہے اور چاند کو نور بخشا جس سے راتوں میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے، اس نے چاند کی منزلیں مقرر کیں تاکہ انسان دنوں، مہینوں اور برسوں کا حساب جان سکے، آسمان و زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے، سب کو حق اور حکمت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، تاکہ اہلِ بصیرت اس میں اس کی قدرت اور عظمت کے نشانات دیکھ سکیں۔

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ: اور بے شک رات اور دن کا یکے بعد دیگرے آنا، کبھی اندھیرا چھا جانا اور کبھی روشنی پھیل جانا، کبھی دن کا طویل ہونا اور کبھی رات کا بڑھ جانا، نیز زمین و آسمان کی بے شمار مخلوقات، یہ سب اللہ کی قدرت کے کھلے نشانات ہیں، مگر ان نشانیوں سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو دل میں تقویٰ رکھتے، احکامِ الٰہی کی تعمیل کرتے اور اس کی نافرمانی سے بچتے ہیں۔

اَہل جہنم اور اَرباب جنت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۙ﴿۷﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۹﴾ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾ یونس

جواب ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ ہمارے پاس آنے کی امید نہیں رکھتے اور وہ دنیا والی زندگی پر راضی ہو گئے اور اس پر مطمئن ہو گئے اور وہ لوگ جو ہماری آیات سے غافل ہیں۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے انہیں راہ بتادے گا ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ نعمت کے باغوں میں ہوں گے۔ ان میں ان کی یہ بات ہو گی کہ اے اللہ! تو پاک ہے اور اس میں ان کا تحیہ سلام ہو گا اور ان کی آخری بات الحمد للہ رب العالمین ہو گی۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ اطۡمَاَنُّوۡا بِہَا : ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ سے ملاقات کے یقین سے محروم ہیں، نہ انہیں حساب کا خوف ہے، نہ جواب دہی کی فکر، وہی دراصل دنیا کی عارضی زندگی پر مطمئن ہو بیٹھتے ہیں، فنا پذیر لذتوں کو بقا کی نعمتوں پر ترجیح دیتے ہیں اور اسی میں دل لگا کر بے خبر ہو جاتے ہیں، اللہ کی آیات ان کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہیں، مگر وہ التفات نہیں کرتے، دل کھیل تماشوں میں مشغول اور نگاہیں حقیقت سے اوجھل رہتی ہیں، ایسے ہی لوگ غفلت کی چادر اوڑھے زندگی گزار دیتے ہیں۔

اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمُ النَّارُ : ان کا انجام بھی انہی کے اختیار کا منطقی نتیجہ ہے، ان کا ٹھکانا آگ ہے، یہ کوئی بے سبب سزا نہیں، بلکہ ان کے اپنے اعمال، ان کے کفر، ان کے انکارِ آخرت اور تکذیبِ حق کا حاصل ہے، جو بیج انہوں نے بویا، وہی فصل کاٹیں گے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَہۡدِیۡہِمۡ رَبُّہُمۡ بِاِیۡمَانِہِمۡ : اس کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو عملِ صالح سے آراستہ کیا، اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کی برکت سے انہیں مزید ہدایت عطا فرماتا ہے، ایسی ہدایت جو انہیں اس کے قرب اور رضا تک پہنچا دے، پھر قیامت کے دن انہیں دائمی نعمتوں سے آراستہ باغوں میں داخل فرمایا جائے گا، جہاں ان کے قدموں تلے نہریں بہتی ہوں گی اور ہر سمت راحت و سرور کی فضا ہو گی۔

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ : جنت میں ان کی زبانوں پر سب سے پہلا نغمہ تسبیح و تقدیسِ الٰہی کا ہو گا، ان کا باہمی تحفہ اور ملائکہ کی جانب سے ان کے لیے سلامتی کا پیغام ہو گا، "سلام" اور ان کی ہر دعا کا اختتام اس حمد پر ہو گا جو تمام جہانوں کے رب کے لیے مخصوص ہے، گویا ان کی زندگی کا آغاز بھی حمد سے تھا اور انجام بھی حمد پر ہو گا۔

ان آیات میں گویا انسان کے سامنے دو راستے رکھ دیے گئے ہیں، ایک غفلت کا، جو دنیا کی چمک سے شروع ہو کر جہنم کی تاریکی پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا ایمان کا، جو ہدایت سے چل کر جنت کی روشنی اور سلامتی تک پہنچتا ہے، اب فیصلہ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ وہ کس منزل کا مسافر بننا چاہتا ہے۔

انسان کی بے صبری سے وحی کی صداقت تک، سنت الٰہی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ{۱۱}وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ{۱۲}وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ {۱۳} ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ{۱۴}وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ{۱۵}قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ{۱۶}فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ{۱۷}وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا

يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ {۱۸} یونس

جواب ترجمہ: اور اگر اللہ لوگوں پر نقصان واقع کرنے میں جلدی کرتا جیسے کہ وہ بھلائی کیلئے جلدی مچاتے ہیں تو ان کا وعدہ پورا ہو چکا ہوتا سو جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ہم ان کی سرکشی میں انہیں سرگرداں چھوڑ دیتے ہیں۔ اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے لیٹے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور کھڑے ہوئے پھر جب ہم اس کی تکلیف ہٹا دیتے ہیں تو وہ اس حال میں گزر جاتا ہے کہ گویا اس نے ہمیں کسی تکلیف کے پہنچ جانے پر پکارا ہی نہ تھا اسی طرح حد سے بڑھ جانے والوں کیلئے ان کے اعمال مزین کر دیئے گئے ہیں۔ اور ہم نے تم سے پہلے بہت سی جماعتوں کو ہلاک کیا جبکہ انہوں نے ظلم کیا اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے اور وہ لوگ ایمان لانے والے نہ تھے ہم اسی طرح مجرموں کو سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر ہم نے تمہیں زمین میں ان کے بعد خلیفہ بنا دیا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو؟ اور جب ان پر ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے یوں کہتے ہیں کہ آپ اس قرآن کے علاوہ دوسرا قرآن لے آیئے یا اس کو بدل دیجئے آپ فرما دیجئے کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اسے اپنے پاس سے بدل دوں میں تو بس اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے بیشک میں اگر اپنے رب کی نافرمانی کروں تو بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ آپ فرما دیجئے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں تم لوگوں پر اس کی تلاوت نہ کرتا اور نہ تمہیں اللہ اس کی اطلاع دیتا سو میں تمہارے درمیان اس سے پہلے عمر کے ایک بڑے حصہ تک رہ چکا ہوں کیا تم سمجھ نہیں رکھتے۔

سو اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو گا جو اللہ پر بہتان باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے بیشک بات یہ ہے کہ مجرم کامیاب نہیں ہوتے۔ اور وہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان دے سکیں اور نہ نفع پہنچا سکیں اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں

آپ فرمادیجئے کیا تم اللہ کو وہ بات بتاتے ہو جسے وہ نہیں جانتا آسمانوں اور زمینوں میں وہ ان لوگوں کے شرک سے پاک ہے اور برتر ہے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر وہ لوگوں کی بد دعاؤں کو، جو وہ غصے اور بے صبری میں خود اپنے لیے، اپنی اولاد اور اپنے مال کے خلاف کر بیٹھتے ہیں، اسی تیزی سے قبول کر لیتا جس طرح ان کی بھلائی کی دعائیں قبول فرماتا ہے، تو وہ سب ہلاک ہو جائیں، مگر اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ مہلت دیتا ہے، ڈھیل دیتا ہے، تاکہ انسان سنبھل جائے، لیکن جو لوگ اس سے ملاقات کے یقین سے خالی ہیں، نہ سزا کا خوف رکھتے ہیں نہ ثواب کی امید، وہ اسی مہلت کو غفلت سمجھ کر شک و تردد کی وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا: انسان کی کمزوری بھی عجیب ہے، جب اسے کوئی بیماری یا مصیبت گھیر لیتی ہے تو وہ لیٹے، بیٹھے، کھڑے، ہر حال میں گڑگڑا کر اپنے رب کو پکارتا ہے، دل عاجز، زبان پر آہ وزاری، آنکھوں میں نمی، لیکن جب اللہ اس کی تکلیف دور کر دیتا ہے تو وہ یوں بے نیاز ہو جاتا ہے گویا کبھی دعا کی ہی نہ تھی، اس کے لیے اس کی سرکشی اور حد سے بڑھی ہوئی روش کو ایسا آراستہ کر دیا جاتا ہے کہ وہ اسی میں مست رہتا ہے۔

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ: پھر یاد دلایا جاتا ہے کہ تم سے پہلے کتنی ہی قومیں تھیں جنہوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا، واضح معجزات اور روشن دلائل کے باوجود راہِ حق اختیار نہ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے ظلم اور نافرمانی کے باعث ہلاک کر دی گئیں، یہ اللہ کا جاری وساری قانون ہے کہ جو قومیں سرکشی اختیار کرتی ہیں، وہ اپنے انجام کو پہنچتی ہیں۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ: اب تمہیں ان کا جانشین بنایا گیا ہے، تاکہ اس بات کو ظاہر کیا جائے کہ تم کیا روش اختیار کرتے ہو؟ اطاعت کر کے راہ جنت پر چلتے ہو یا انکار، نافرمانی، تمرد اور سرکشی اختیار کرتے ہوئے جہنم کی راہ پر گامزن ہوتے ہو۔

وَإِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا: جب ان کے سامنے قرآن کی روشن آیات پڑھی جاتی ہیں تو منکرینِ آخرت کہتے ہیں: ”اس قرآن کے سوا کوئی اور کلام لے آؤ، یا اس میں ہماری خواہش کے مطابق تبدیلی کر دو“۔ گویا وہ وحی کو بھی اپنی خواہشات کا تابع بنانا چاہتے ہیں، رسولِ اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ صاف کہہ دیں: مجھے یہ اختیار نہیں کہ اپنی طرف سے اس میں ردّ و بدل کروں، میں تو صرف اسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے آتی ہے، اگر میں تمہاری خواہش پر چلوں تو ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ: پھر دلیل دی گئی کہ اگر اللہ نہ چاہتا تو میں نہ تمہیں یہ قرآن سناتا اور نہ تم اس سے واقف ہوتے، میں تمہارے درمیان عمر کا ایک طویل حصہ، چالیس برس بغیر کسی دعوائے نبوت اور بغیر کسی تصنیف و تلاوت کے گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے کہ یہ کلام انسانی ساختہ نہیں، بلکہ ربّ العالمین کی وحی ہے؟

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ: اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ افتراء اور تحریف کا راستہ کامیابی کا نہیں، بلکہ ہلاکت کا راستہ ہے، جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں، وہ کبھی فلاح نہیں پاتے۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ: آخر میں مشرکین کے باطل عقیدے کی تردید کی گئی ہے، وہ اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبودوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان اور دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں، ان سے کہہ دیا جائے، کیا تم اللہ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو جس کا اسے خود علم نہیں؟ آسمان و زمین میں اس کا کوئی شریک نہیں، وہ ان سب باطل نسبتوں سے پاک اور بلند ہے جو مشرکین گھڑتے ہیں۔

لوگ ایک ہی امت تھے کا مطلب؟

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے، نیز بتائیے کہ اس آیت میں كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ کا کیا مطلب ہے؟

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ {۱۹} یونس

جواب ترجمہ: اور (سب) لوگ پہلے ایک ہی امت (یعنی ایک ہی ملت پر) تھے۔ پھر جدا جدا ہو گئے اور اگر ایک بات جو تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے ہو چکی ہے نہ ہوتی تو جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے ہیں ان میں فیصلہ کر دیا جاتا۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں کافر و مسلم دو قومیں الگ الگ ہیں نسلی اور وطنی قومیت لغو ہے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً یعنی تمام اولاد آدم شروع میں ایک ہی امت ایک ہی قوم موحدین کی تھی، شرک و کفر کا نام نہیں تھا، پھر توحید میں اختلاف پیدا کر کے مختلف قومیں مختلف گروہ بن گئے۔

یہ زمانہ امت واحدہ اور سب کے مسلمان ہونے کا کتنا تھا اور کب تک رہا؟ روایات حدیث و سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک یہی صورت تھی، نوح علیہ السلام کے زمانے میں شرک و کفر ظاہر ہوا، حضرت نوح علیہ السلام کو اس کا مقابلہ کرنا پڑا (مظہری)

یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام تک ایک طویل زمانہ ہے دنیا میں انسانوں کی نسلیں اور آبادی کافی پھیل چکی تھی، ان تمام انسانوں میں رنگ و روپ اور طرز معاشرت کا اختلاف ہونا بھی ایک طبعی امر ہے اور مختلف خطوں میں پھیل جانے کے بعد وطن کا اختلاف بھی یقینی ہے اور ممکن ہے کہ بول چال میں زبانیں بھی کچھ مختلف ہو گئی ہوں، مگر قرآن کریم نے اس نسبی قبائلی، لونی، وطنی اختلاف کو جو امور فطریہ ہیں، وحدت امت میں خلل انداز قرار نہیں دیا اور ان اختلافات کی وجہ سے اولاد آدم کو مختلف قومیں مختلف امتیں نہیں بلکہ امت واحدہ قرار دیا۔

ہاں جب ایمان کے خلاف کفر و شرک پھیلا تو کافر و مشرک کو الگ قوم الگ ملت قرار دے کر فَاخْتَلَفُوْا ارشاد فرمایا، قرآن کریم کی آیت هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ، نے اس مضمون کو اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ اللہ کی مخلوق اولاد آدم کو مختلف قوموں میں بانٹنے والی چیز صرف ایمان و اسلام سے انحراف ہے، نسبی و وطنی رشتوں سے قومیں الگ الگ نہیں ہوتیں، زبان اور وطن یا رنگ و نسل کی بناء پر انسانوں کو مختلف گروہ قرار دینے کی جہالت یہ نئی حماقت ہے جو نئی روشنی نے پیدا کی ہے اور آج کے بہت سے لکھے پڑھے اس نیشنلزم کے پیچھے لگ گئے جو ہزاروں فتنے اور فساد اپنے دامن میں رکھتا ہے اَعَاذَ اللّٰهُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْهُ۔ (معارف القرآن)

پہلے سے طے شدہ کلمہ کیا ہے؟ وہ طے شدہ بات یہ تھی کہ چونکہ یہ دنیا دارالعمل اور دارالامتحان ہے اس لیے کسی کو بھی اس کے جرم کی پاداش میں فوری طور پر سزا نہیں دی جائے گی اگر یہ بات پہلے سے مشیت الٰہی میں نہ ہوتی تو جب کچھ لوگ کوئی نیا فرقہ بناتے تو اللہ کا عذاب انہیں فوراً تباہ و برباد کر دیتا اور اس طرح یہ دنیا کب کی ختم ہو چکی ہوتی اور اگر کچھ لوگ بچ جاتے اور وہ ایمان لے بھی آتے تو ایسے جبری ایمان کا کچھ فائدہ بھی نہ تھا۔

عناد منکرین، فریب نعمت اور طوفان میں جاگتی فطرت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ {۲۰} وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ {۲۱} هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ {۲۲} فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ

فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ {۲۳} یونس

جواب ترجمہ: اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشانی اس کے رب کی طرف سے کیوں نہیں نازل کی گئی سو آپ فرما دیجئے کہ غیب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ سو تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ اور لوگوں کو تکلیف پہنچنے کے بعد جب ہم انہیں اپنی رحمت چکھا دیں تو اچانک ہماری آیتوں کے بارے میں مکر کرنے لگتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ بلاشبہ اللہ مکر کی سزا جلد ہی دینے والا ہے بلاشبہ ہمارے فرشتے تمہارے مکر کے کاموں کو لکھ لیتے ہیں اللہ وہ ہے جو تمہیں سمندر اور خشکی میں چلاتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتی میں موجود ہو اور وہ کشتی اچھی ہوا کے ساتھ چلنے لگے اور جو لوگ اس میں سوار ہوں وہ اس پر خوش ہو جائیں تو اس کشتی پر ایک سخت ہوا آجائے اور ہر جگہ سے ان پر موجیں آنے لگیں اور وہ یقین کر لیں کہ انہیں گھیر لیا گیا ہے تو اللہ کو پکارنے لگتے ہیں اس کیلئے خالص اعتقاد کر کے اگر تو نے ہمیں اس سے نجات دے دی تو ہم ضرور ضرور شکر گزاروں میں سے ہوں گے پھر جب اللہ انہیں نجات دے دیتا ہے تو اچانک وہ زمین میں ناحق بغاوت کرنے لگتے ہیں اے لوگو! تمہاری سرکشی تمہاری ہی جانوں پر ہے دنیاوی زندگی میں فائدہ اٹھا رہے ہو پھر ہماری طرف تم کو لوٹ کر آنا ہے سو ہم تمہیں بتا دیں گے جو تم کرتے تھے۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ: مشرکینِ مکہ، جو حق کو پہچان کر بھی انکار پر مُصر تھے، کہتے تھے "کیوں نہ محمد ﷺ پر ان کے رب کی طرف سے کوئی نشانی اتاری جائے جو ان کی صداقت پر دلالت کرے؟" یہ مطالبہ دراصل ہدایت کی جستجو نہیں تھا، بلکہ ضد اور عناد کی ایک صورت تھی، چنانچہ رسولِ اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ ان سے کہہ دیجیے، معجزات کا نزول اللہ کے علمِ غیب کے تحت ہے، وہی جانتا ہے کہ کب، کس صورت میں اور کس حکمت کے ساتھ نشانیاں ظاہر کرنی ہیں۔

فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ: تم اگر کسی حسی معجزے کے منتظر ہو تو انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں، گویا فیصلہ تمہاری خواہش پر نہیں، بلکہ ربّ العالمین کی مشیت پر موقوف ہے۔

جب اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو قحط اور تنگی کے بعد بارش اور خوش حالی کی نعمت عطا فرماتا ہے تو بجائے شکر کے، وہ آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔

وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِنْ بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُمْ مَكْرٌ فِي آيَاتِنَا: یہ کیسی ناسپاسی ہے کہ مصیبت میں عاجزی اور راحت میں سرکشی! فرمایا گیا: ان سے کہہ دیجیے کہ اللہ تدبیر میں تم سے کہیں زیادہ تیز ہے، تم جو خفیہ سازشیں اور مکر کرتے ہو، وہ سب فرشتے لکھ رہے ہیں، تمہاری کوئی چال اللہ کی گرفت سے باہر نہیں۔ سوچنے کی بات ہے: جب تمہارا مکر ملائکہ کے قلم سے محفوظ ہو رہا ہے تو خالقِ کائنات کی نگاہ سے کیسے اوجھل رہ سکتا ہے؟ اور انجام کار تمہیں اسی مکر کا بدلہ مل کر رہے گا۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّى إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ: اللہ ہی ہے جو تمہیں خشکی میں تمہارے قدموں اور سواریوں کے ذریعے چلاتا ہے اور وہی تمہیں سمندر میں کشتیوں کے ذریعے سفر کراتا ہے، جب کشتی موافق ہوا کے ساتھ روانی سے چلتی ہے تو سوار خوشی سے سرشار ہو جاتے ہیں، مگر اچانک تند و تیز آندھی چلتی ہے، موجیں ہر سمت سے اٹھتی ہیں اور موت آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ اس گھڑی نہ کوئی بت یاد رہتا ہے، نہ کوئی جھوٹا معبود، زبان سے صرف ایک صدا نکلتی ہے: ''اے اللہ! اگر تُو نے ہمیں اس ہلاکت سے بچا لیا تو ہم ضرور شکر گزار بندے بن جائیں گے!'' یہ وہ لمحہ ہے جب فطرت کی اصل آواز ابھرتی ہے، اور توحید دل کی گہرائی سے پکارتی ہے۔

فَلَمَّا أَنْجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ: مگر جب اللہ ان کی دعا قبول کر کے انہیں طوفان سے نجات دے دیتا ہے تو وہی لوگ دوبارہ زمین میں فساد اور معصیت کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں، ان سے کہا گیا: اپنے ظلم و سرکشی کے نتائج سے ہوشیار ہو جاؤ! تمہاری بغاوت کا وبال تم ہی پر لوٹے گا، اللہ کو تمہارے طغیان سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، دنیا کی یہ چند روزہ لذتیں فانی ہیں، پھر تم سب کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، وہاں تمہارے اعمال کا پورا حساب ہو گا اور ہر نیکی و بدی کا بدلہ دیا جائے گا۔

دنیا کی فنائیت اور بے ثباتی

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کَمَآءٍ اَنْزَلْنٰہُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِہٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْکُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰٓی اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَھَا وَازَّیَّنَتْ وَظَنَّ اَھْلُھَآ اَنَّھُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْھَآ اَتٰىھَآ اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَھَارًا فَجَعَلْنٰھَا حَصِیْدًا کَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ کَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ {۲۴} یونس.

جواب ترجمہ: دنیا کی زندگی کی مثال مینہ کی سی ہے کہ ہم نے اس کو آسمان سے برسایا۔ پھر اس کے ساتھ سبزہ جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں مل کر نکلا یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہو گئی اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں۔ ناگہاں رات کو یا دن کو ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا تو ہم نے اس کو کاٹ (کر ایسا کر) ڈالا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ جو لوگ غور کرنے والے ہیں ان کے لئے ہم (اپنی قدرت کی) نشانیاں اسی طرح کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہاری دنیا کی زندگی اور وہ چیزیں جن پر تم دنیا میں ایک دوسرے پر فخر کرتے ہو، زیب وزینت اور مال ودولت ان کی مثال تو بارش کی طرح ہے جسے ہم آسمان سے زمین کی طرف اتارتے ہیں، اس کے ذریعے ہم مختلف قسم کی چیزیں زمیں سے اگاتے ہیں، جو ایک دوسرے کے ساتھ خط ملط ہو جاتی ہیں، ان میں پھل وغیرہ انسان کھاتے ہیں، بوٹیاں گھاس جانور کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب اس کا حسن وجمال ظاہر ہو جاتا ہے تو اس زمین کے باشندے یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اس کو کاٹنے اور اس سے نفع اٹھانے پر قادر ہیں، اچانک اس پر ہمارا امر آتا ہے، اسے تباہ وبرباد کرنے کا حکم ہے، پھر دن ہو یا رات ہمارا حکم چلتا ہے تو نہ کوئی جڑی بوٹی رہتی ہے، نہ گھاس پھونس رہتا ہے، نہ حسن وجمال اور اس کی خوبصورتی رہتی ہے، ان بوٹیوں، ان گھاسوں، ان درختوں کو ہم ریزہ ریزہ اور

کٹے ہوئے کی طرح کر دیتے ہیں، یوں لگتا ہے جیسے یہاں کچھ تھا ہی نہیں، یوں دکھائی دیتا ہے جیسے یہ کھیتیاں یہاں کبھی کھڑی ہی نہیں ہوئیں تھیں۔

اسی طرح جن چیزوں پر تم فخر ومباہات کرتے ہو، اپنی دنیا کے حسن وجمال، اس کی ملمع سازیوں اور میناکاریوں پر تم اکڑتے اور تکبر کرتے ہو اللہ انہیں بھی ہلاک وبرباد کر دے گا، اے انسانو! ہم نے تمہیں دنیا کی حقیقت اچھی طرح سمجھادی ہے، ہم نے اپنے حجج ودلائل واضح کر دیے ہیں، ان کو وہی مانیں گے اور سمجھیں گے جو اللہ کی نشانیوں میں غور وفکر سے کام لیتے ہیں، ان چیزوں کی دنیا اور آخرت میں پائی جانے والی منفعت پر غور کرتے ہیں۔

دارالسلام سے کیا مراد ہے؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے، نیز بتائیے کہ دارالسلام سے کیا مراد ہے؟

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ {۲۵} یونس

جواب ترجمہ: اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جسے چاہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو دارالسلام کی طرف دعوت دیتا ہے یعنی ایسے گھر کی طرف جس میں ہر طرح کی سلامتی ہی سلامتی ہے نہ اس میں کسی طرح کی کوئی تکلیف ہے نہ رنج وغم، نہ بیماری کا خطرہ، نہ فنا ہونے یا حالت بدل جانے کی فکر۔

دارالسلام سے مراد جنت ہے، اس کو دارالسلام کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کی سلامتی اور امن وسکون ہر شخص کو حاصل ہوگا، دوسری وجہ بعض روایات میں ہے کہ جنت کا نام دارالسلام اس لئے بھی رکھا گیا ہے کہ اس میں بسنے والوں کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیز فرشتوں کی طرف سے سلام پہنچتا رہے گا، بلکہ لفظ سلام ہی اہل جنت کی اصطلاح ہوگی، جس کے ذریعہ وہ اپنی خواہشات کا اظہار کریں گے اور فرشتے ان کو مہیا کریں گے، جیسا کہ اس سے پہلی آیات میں گزر چکا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ نے اس آیت کی تفسیر میں بطور نصیحت عوام کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے

آدم کے بیٹے! تجھ کو اللہ تعالیٰ نے دارالسلام کی طرف بلایا، تو اس دعوت الٰہیہ کی طرف کب اور کہاں سے قدم اٹھائے گا، خوب سمجھ لے کہ اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے اگر تو نے دنیا ہی سے کوشش شروع کر دی تو وہ کامیاب ہو گی اور تو دارالسلام میں پہنچ جائے گا اور اگر تو نے اس دنیا کی عمر کو ضائع کرنے کے بعد یہ چاہا کہ قبر میں پہنچ کر اس دعوت کی طرف چلوں گا تو تیرا راستہ روک دیا جائے گا، تو وہاں ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے گا، کیونکہ وہ دارالعمل نہیں۔

جنت اور دیدار خداوندی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے نیز الحسنیٰ اور زیادہ سے کیا مراد ہے؟

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ{۲۶} یونس.

جواب ترجمہ: جن لوگوں نے نیکوکاری کی ان کے لئے بھلائی ہے اور (مزید برآں) اور بھی اور ان کے مونہوں پر نہ تو سیاہی چھائے گی اور نہ رسوائی۔ یہی جنتی ہیں کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یہاں جس نے نیک اعمال کئے اور باایمان رہا وہاں اسے بھلائیاں اور نیک بدلے ملیں گے۔ احسان کا بدلہ احسان ہے۔ ایک ایک نیکی بڑھا چڑھا کر زیادہ ملے گی ایک کے بدلے سات سات سو تک۔ جنت حور قصور وغیرہ وغیرہ آنکھوں کی طرح طرح کی ٹھنڈک، دل کی لذت اور ساتھ ہی اللہ عزوجل کے چہرے کی زیارت یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کا لطف و رحم ہے بہت سے سلف خلف صحابہ وغیرہ سے مروی ہے کہ زیادہ سے مراد اللہ عزوجل کا دیدار ہے۔

حضور ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے اور اس وقت ایک منادی کرنے والا ندا کرے گا کہ اے جنتیو! تم سے اللہ کا ایک وعدہ ہوا تھا، اب وہ بھی پورا ہونے کو ہے۔ یہ کہیں گے الحمد اللہ ہمارے میزان بھاری ہو گئے، ہمارے چہرے نورانی ہو گئے، ہم جنت میں پہنچ گئے، ہم جہنم سے دور ہوئے، اب کیا چیز باقی ہے؟ اس وقت حجاب ہٹ

جائے گا اور یہ اپنے پاک پروردگار کا دیدار کریں گے۔ واللہ کسی چیز میں انہیں وہ لذت و سرور نہ حاصل ہوا ہو گا جو دیدار الٰہی میں ہو گا۔ (مسلم) اور حدیث میں کہ منادی کہے گا حسنیٰ سے مراد جنت تھی اور زیادت سے مراد دیدار الٰہی تھا۔

انجام شرک، برھان توحید اور قیامت کی بے نقاب حقیقت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ {۲۷} وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَاۗؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاۗؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ {۲۸} فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ {۲۹} هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ ۚ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ {۳۰} قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ {۳۱} فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ {۳۲} كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَي الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ {۳۳} قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ {۳۴} قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۭ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۠ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ {۳۵} وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ {۳۶} یونس

جواب ترجمہ: اور جن لوگوں نے برے کام کئے ان کی برائی کی سزا برائی کے برابر ملے گی اور ان پر

ذلت چھا جائے گی انہیں اللہ سے کوئی بچانے والا نہ ہو گا گویا کہ ان کے چہرے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیے گئے ہیں۔ یہ لوگ دوزخ والے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے پھر ہم ان لوگوں سے کہیں گے جنہوں نے شرک کیا کہ تم اور تمہارے شریک اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو پھر ہم ان کے آپس میں جدائی کر دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔ سو اللہ ہمارے تمہارے درمیان گواہ کافی ہے بیشک بات یہ ہے کہ ہم تمہاری عبادت سے غافل تھے۔ اس موقع پر ہر شخص اپنے ان کاموں کو جانچ لے گا جو اس نے پہلے کئے تھے اور وہ اپنے مالک حقیقی کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے اور جو کچھ جھوٹ تراش رکھا تھا وہ سب غائب ہو جائے گا۔ آپ فرما دیجئے وہ کون ہے جو تمہیں آسمان سے اور زمین سے رزق دیتا ہے یا وہ کون ہے جو کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے اور وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور وہ کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر فرماتا ہے سو وہ ضرور یوں کہیں گے کہ اللہ ہی ہے تو آپ فرما دیجئے کہ پھر کیوں نہیں ڈرتے ہو۔ سو وہ اللہ تمہارا حقیقی رب ہے سو پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے؟ پھر کہاں پھرے جا رہے ہو۔

اسی طرح آپ کے رب کی یہ بات نافرمانوں کے بارے میں ثابت ہو چکی ہے کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے۔ آپ فرما دیجئے کیا تمہارے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو مخلوق کو ابتداً پیدا فرمائے پھر اسے دوبارہ زندہ کرے؟ آپ فرما دیجئے کہ اللہ مخلوق کو ابتداً پیدا فرماتا ہے پھر اس کو دوبارہ پیدا فرمائے گا۔ سو تم کہاں پھرے جا رہے ہو؟

آپ فرما دیجئے کہ تمہارے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو حق کی طرف راہ بتائے؟ آپ فرما دیجئے کہ اللہ حق کی راہ بتاتا ہے سو جو حق کی راہ بتاتا ہو وہ زیادہ اتباع کے لائق ہے یا وہ شخص جو ہدایت نہیں پاتا مگر جبکہ اسے راہ بتائی جائے سو تمہیں کیا ہوا تم کیسی تجویزیں کرتے ہو۔ اور ان میں سے اکثر لوگ صرف اٹکل کے پیچھے چلتے ہیں بلاشبہ اٹکل حق کے بارے میں ذرا بھی مفید نہیں ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کاموں کو جاننے والا ہے جن کاموں کو وہ کرتے ہیں۔

وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ: جو لوگ کفر اور معصیت کی راہوں پر چلتے رہے، ان کے لیے بدی کا بدلہ اسی کے برابر ہو گا، قیامت کے دن ذلت و رسوائی ان کے چہروں پر اس طرح چھا جائے گی گویا اندھیری رات کا سیاہ پردہ ان پر ڈال دیا گیا ہو۔

مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ: کوئی ان کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا نہ ہو گا۔

كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا: ان کی بدصورتی کا یہ حال ہو گا کہ گویا ان کے چہروں کو اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیا گیا ہے، کافر دنیا میں کتنا ہی خوبصورت ہو قیامت کے دن نہایت ہی بدترین صورت میں ہو گا، جس کا یہاں اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ: جہنم ان کا ٹھکانا ہو گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ انجام اس غرور کا ہے جو دنیا میں اختیار کیا گیا اور اس سرکشی کا جو حق کے مقابلے میں دکھائی گئی۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ: قیامت کے دن تمام مخلوق جمع ہو گی، مشرکین سے کہا جائے گا، ”تم اور تمہارے وہ معبود، جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے تھے، اپنے اپنے مقام پر ٹھہر جاؤ“! پھر ایک عجیب منظر ہو گا، معبود اور عابد کے درمیان جدائی ڈال دی جائے گی، جن بتوں اور ہستیوں کو دنیا میں سجدے کیے جاتے تھے، وہ اپنے پجاریوں سے براءت کا اعلان کریں گے، ”تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے، تم اپنے وہم اور خواہشات کی پیروی کرتے تھے، ہم نے نہ تمہیں حکم دیا، نہ ہم اس پر راضی تھے، اللہ گواہ ہے کہ ہمیں تمہاری اس عبادت کا شعور تک نہ تھا!“

هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَا أَسْلَفَتْ: اس لمحے ہر جان اپنے اعمال کو جانچ لے گی، مشرکین اپنے حقیقی رب کی طرف لوٹا دیے جائیں گے اور جن جھوٹے سہاروں پر وہ تکیہ کیے ہوئے تھے وہ سب سراب کی طرح غائب ہو جائیں گے۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ: رسولِ اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ ان سے پوچھیں: کون

ہے جو تمہیں آسمان سے رزق دیتا ہے؟ کون زمین سے اناج، پھل، اور معدنیات نکالتا ہے؟ کون زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ کون کائنات کے نظام کو چلا رہا ہے؟ وہ خود اقرار کریں گے: ''اللہ!'' تو پھر سوال یہ ہے: جب خالق، رازق اور مدبر ایک ہی ہے، تو عبادت میں اس کا شریک کیوں؟ یہی وہ حق ہے جو تمہارے سامنے واضح ہے، اس کے بعد حق سے ہٹنا صرف گمراہی ہے، عقل کی آنکھیں کیوں بند ہو جاتی ہیں؟

كَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ: جب کوئی شخص ضد اور ہٹ دھرمی سے حق کا انکار کرتا ہے تو اس پر اللہ کی تقدیری بات پوری ہو جاتی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا، یہ محرومی اچانک نہیں آتی، یہ مسلسل انکار اور تکبر کا نتیجہ ہوتی ہے، یہ کسی انسان کی بڑی بدنصیبی اور بدقسمتی ہے کہ وہ ایمان جیسی عظیم دولت سے محروم رہے۔

قُلْ هَلْ مِن شُرَكَائِكُم مَّن يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ: پوچھا جائے، کیا تمہارے شریکوں میں کوئی ہے جو پہلی بار مخلوق کو بغیر نمونے کے پیدا کرے، پھر مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے؟ جواب واضح اور صاف ہے: یہ قدرت صرف اللہ کے لیے ہے، پھر یہ بھی پوچھو: کیا تمہارے معبودوں میں کوئی ایسا ہے جو خود ہدایت یافتہ ہو اور دوسروں کو ہدایت دے سکے؟ ہدایت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہی راستہ دکھاتا ہے، وہی دلوں کو سیدھا کرتا ہے، بھلا جو خود محتاجِ ہدایت ہو وہ دوسروں کا رہبر کیسے بن سکتا ہے؟ یہ فیصلہ کیسا ہے کہ خالق کو چھوڑ کر مخلوق کو سجدہ کیا جائے؟

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا: اکثر مشرکین حقیقت پر نہیں، بلکہ گمان اور وہم پر چلتے ہیں، حالانکہ شک کبھی علم کا قائم مقام نہیں بن سکتا، اندازہ اور قیاس یقین کی جگہ نہیں لے سکتے، اللہ ان کے تمام اعمال سے باخبر ہے، کوئی فعل اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں اور وہی ہر عمل کا پورا بدلہ دے گا۔

قرآن اللہ کی نازل کردہ کتاب

سوال اس آیت کا ترجمہ کیجیے اور لٰکِن تَصْدِیقَ الَّذِی بَیْنَ یَدَیْهِ کا کیا مطلب ہے؟

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ {۳۷} یونس.

جواب ترجمہ: اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے جو افتراء کیا گیا ہو اللہ کی طرف سے نہ ہو۔ بلکہ وہ ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے پہلے ہیں اور احکام ضروریہ کی تفصیل بیان کرنے والا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رب العالمین کی طرف سے ہے

قرآن کریم کے اعجاز کا اور قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کا بیان ہو رہا ہے کہ کوئی اس کا بدل اور مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس جیسا قرآن بلکہ اس جیسی دس سورتیں بلکہ ایک سورت بھی کسی کے بس کی نہیں۔ یہ بے مثل قرآن بے مثل اللہ کی طرف سے ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت، اس کی وجاہت و حلاوت، اس کے معنوں کی بلندی، اس کے مضامین کی عمدگی بالکل بے نظیر چیز ہے اور یہی دلیل ہے اس کی کہ یہ قرآن اس اللہ کی طرف سے ہے جس کی ذات بے مثل صفتیں بے مثل، جس کے اقوال بے مثل، جس کے افعال بے مثل، جس کا کلام اس چیز سے عالی اور بلند کہ مخلوق کا کلام اس کے مشابہ ہو سکے۔ یہ کلام تو رب العالمین کا ہی کلام ہے، نہ کوئی اور اسے بنا سکے، نہ یہ کسی اور کا بنایا ہوا۔ یہ تو سابقہ کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، ان پر نگہبانی کرتا ہے، ان کا اظہار کرتا ہے، ان میں جو تحریف تبدیل تاویل ہوئی ہے اسے بے حجاب کرتا ہے، حلال و حرام جائز و ناجائز غرض کل امور شرع کا شافی اور پورا بیان فرماتا ہے۔ پس اس کے کلام اللہ ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ کا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن کریم جو نازل کیا گیا ہے ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پہلے نبیوں پر نازل کی ہیں، اس لیے کہ اللہ کا دین تو ایک ہی ہے۔

اعجاز قرآن

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ {۳۷} اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ {۳۸} بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ {۳۹} وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ {۴۰} وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ {۴۱} وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ {۴۲} وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ {۴۳} یونس

جواب ترجمہ: کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو اپنی طرف سے بنالیا ہے؟ کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تم بھی اس طرح کی ایک سورت بنالاؤ اور خدا کے سوا جن کو تم بلا سکو بلا بھی لو۔ کیا وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس کو آپ نے اپنے پاس سے بنالیا ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ تم اس جیسی سورت لے آؤ اور اللہ کے علاوہ جن لوگوں کو بلا سکتے ہو انہیں بلا لو اگر تم سچے ہو۔ بلکہ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے اسے جھٹلایا جسے اپنے احاطہ علمی میں نہیں لائے اور ابھی اس کا نتیجہ ان کے سامنے نہیں آیا ایسے ہی جھٹلایا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے سو دیکھ لیجئے ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس پر ایمان لائیں گے اور بعض وہ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اور آپ کا رب فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ فرما دیجئے کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے تم اس سے بری ہو جو میں کام کرتا ہوں اور جن کاموں کو تم کرتے ہو میں

ان سے بری ہوں۔ اور ان میں بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف کان لگاتے ہیں کیا آپ بہروں کو سنادیں گے اگرچہ وہ سمجھ بھی نہ رکھتے ہوں۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں کیا آپ اندھوں کو راہ بتادیں گے اگرچہ وہ دیکھتے بھی نہ ہوں۔

وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ: قرآن کریم میں کئی مقامات پر کفار کو چیلنج کیا گیا کہ وہ قرآن کریم جیسی کوئی کتاب لے کر آئیں، اگر وہ ایسی کتاب نہیں لاسکتے تو اس جیسی دس سورتیں ہی لے آئیں، اگر ایسا کرنے سے بھی عاجز ودرماندہ ہیں تو چلو ایک سورت وہ بھی چھوٹی سی اس جیسی لے آئیں۔

مگر تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا زبان دان منکر قرآن اس جیسی کتاب پیش نہ کرسکا، عرب کے وہ شعرا جنہیں اپنی زبان دانی پر ناز تھا، جن کے اشعار فخریہ انداز میں خانہ کعبہ شریف میں آویزاں کیے جاتے تھے وہ بھی قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت کے سامنے ڈھیر ہوگئے تھے، جیسے عصائے موسیٰ کو سانپ بنتے دیکھ کر جادوگران مصر موسیٰ پر ایمان لے آئے تھے، معجزات عیسویہ کو دیکھ کو عصر عیسیٰ کے اطباء اور حکماء ایمان لے آئے تھے، اسی طرح قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت کے سامنے بڑے بڑے فصحاء نے گردنیں جھکادی تھیں۔

عرب علماء کرام کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے انہوں نے قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت پر بہترین کتابیں تحریر کی ہیں، جن میں بڑی شرح وبسط کے ساتھ انہوں نے اس فصیحانہ کلام کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ اعجاز قرآنی پر سورۃ البقرہ میں تفصیلی مضمون موجود ہے۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ: انہوں نے قرآن کا جواب دلیل سے نہیں دیا، بلکہ اسے سمجھے بغیر، غور کیے بغیر اور اس کے انجام سے خبردار ہوئے بغیر جھٹلا دیا، یہ انکار تحقیق کے بعد نہیں، بلکہ عجلت اور تعصب کے زیرِ اثر تھا، وہ عذاب جس سے ڈرایا گیا تھا، ابھی آیا نہیں تھا، مگر قریب تھا، یہی روش پچھلی قوموں نے بھی اختیار کی تھی، انہوں نے بھی حق کو سنے بغیر رد کیا اور پھر تاریخ نے دیکھا کہ ان پر کیسا عذاب نازل ہوا، پس اے میرے حبیب ﷺ! آپ دیکھ لیجیے کہ جھٹلانے والی قوموں کا

انجام کیا ہوا، اللہ نے انہیں نیست و نابود کر دیا، یہ تاریخ محض قصہ نہیں، زندہ تنبیہ ہے۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يُؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهٖ: سب لوگ ایک جیسے نہیں، مشرکین میں کچھ ایسے ہیں جو آخر کار ایمان لے آئیں گے، موت سے پہلے حق کو قبول کر لیں گے، اور کچھ ایسے ہیں جو ضد اور تکبر کے باعث آخری سانس تک انکار پر قائم رہیں گے، آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون اصرارِ کفر میں ڈوبا ہوا ہے، وہی ہر شخص کو اس کے باطن اور عمل کے مطابق بدلہ دے گا، ہدایت دروازہ کھٹکھٹاتی ہے، مگر دروازہ کھولنا بندے کے اختیار میں ہے۔

وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ لِي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ: اگر آپ کی قوم آپ کو جھٹلائے تو صاف کہہ دیجئے: ”میرے عمل کا اجر اور اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور تمہارے عمل کا بدلہ تمہارے لیے ہے، تم میرے اعمال کے وبال سے بری ہو اور میں تمہارے اعمال کے وبال سے بری ہوں، یہ اعلان دعوت کی تکمیل ہے، پیغام پہنچانا فرض ہے، قبول کرانا نہیں، یہاں داعی کو تسلی بھی ہے اور اصول بھی، حق کی ادائیگی کے بعد انسان اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ: کچھ لوگ قرآن سنتے ہیں، مگر سننا محض آواز تک محدود رہتا ہے، ان کے کان الفاظ تو وصول کرتے ہیں، مگر دل قبول نہیں کرتا، فرمایا گیا: کیا آپ ان لوگوں کو سنا سکتے ہیں جو درحقیقت بہرے ہو چکے ہوں؟ یہ بہرہ پن جسمانی نہیں، روحانی ہے، جب دل ضد سے بند ہو جائے تو آوازِ حق اس تک نہیں پہنچتی۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ: اور کچھ ایسے ہیں جو آپ کو دیکھتے ہیں، مگر حقیقت کو نہیں دیکھتے، ان کی آنکھیں سلامت ہیں، مگر بصیرت چھن چکی ہے، کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھا سکتے ہیں جب وہ دیکھنے کی صلاحیت ہی کھو چکے ہوں؟ ہدایت صرف آنکھ سے نہیں، دل سے ملتی ہے، جب دل اندھا ہو جائے تو ظاہری بینائی بے سود رہتی ہے۔

نفع اور نقصان کا مالک صرف اللہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ {۴۴}وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ{۴۵}وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ {۴۶}وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ{۴۷}وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ {۴۸}قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ {۴۹}یونس.

جواب ترجمہ: بلاشبہ اللہ لوگوں پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ اپنی جان پر ظلم کرتے ہیں۔ اور جس دن اللہ انہیں جمع فرمائے گا گویا کہ وہ دن کے حصہ میں سے صرف ایک گھڑی ٹھہرے ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے بیشک وہ لوگ خسارہ میں پڑ گئے جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور وہ ہدایت پانے والے نہ تھے۔ اور اگر ہم اس میں سے کچھ حصہ آپ کو دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں یا ہم آپ کو وفات دے دیں تو ہماری طرف ان سب کو لوٹنا ہے پھر اللہ اس پر گواہ ہے جو کام وہ لوگ کرتے ہیں۔ اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے سو جب ان کے پاس ان کا رسول آجاتا ہے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔ اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہو گا اگر تم سچے ہو۔ آپ فرما دیجئے کہ میں اپنی جان کے لیے کسی بھی ضرر یا نفع کا مالک نہیں مگر جو اللہ چاہے۔ ہر امت کیلئے ایک وقت مقرر ہے جب ان کا وقت مقرر آجاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ذرّہ برابر ظلم نہیں کرتا، اس کی ذات ہر نقص اور بے انصافی سے پاک ہے، مگر انسان خود اپنی جان پر ظلم ڈھاتا ہے، جب تعصب، ہٹ دھرمی اور باطل کی محبت میں حق کو ٹھکرا دیتا ہے، وہ اپنے قدم خود ہلاکت کی طرف بڑھاتا ہے، پھر شکوہ تقدیر سے کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بربادی کا بیج انسان کے اپنے باطن میں ہوتا ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِنَ النَّهَارِ: قیامت کے دن جب سب لوگ حساب کے لیے جمع ہوں گے تو انہیں یوں محسوس ہوگا جیسے دنیا کی زندگی اور برزخ کا قیام بس دن کی ایک گھڑی تھا، وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے، مگر یہ پہچان زیادہ دیر باقی نہ رہے گی، کیونکہ قیامت کے مناظر، اس کی دہشت اور اس کے ہولناک مشاہدے ہر تعلق کو ماند کر دیں گے، سچا خسارہ انہی کا ہے جنہوں نے اپنے رب سے ملاقات کو جھٹلایا اور دنیا میں یومِ بعث پر ایمان نہ لائے، ایمان ہی خسارے سے نجات کی ضمانت ہے اور انکار اس کی جڑ۔

وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ: اے میرے حبیب ﷺ اگر ہم آپ کو ان میں سے کچھ عذاب دنیا میں دکھا دیں، یا اس سے پہلے آپ کو وفات دے دیں، دونوں صورتوں میں ان سب کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے، وقت ہمارا مقرر کردہ ہے، اللہ ان کے تمام اعمال سے باخبر ہے، کوئی حرکت، کوئی نیت، کوئی سازش اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں، اور پھر جزا و سزا پورے عدل کے ساتھ ہوگی۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ: ہر امت کی طرف ایک رسول بھیجا گیا، جب رسول نے پیغام پہنچا دیا اور قوم نے انکار کیا تو فیصلہ عدل کے ساتھ ہوا، اللہ نے اپنے فضل سے رسول کو نجات دی اور اپنے عدل سے منکرین کو ہلاک کیا، یہ ہلاکت ظلم نہ تھی، بلکہ ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی، تاریخِ انبیا اسی قانون کی شاہد ہے۔

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ: منکرین تمسخر کے انداز میں پوچھتے ہیں: ”وہ عذاب کب آئے گا جس کا تم وعدہ کرتے ہو، اگر تم سچے ہو؟“ یہ سوال جستجو کا نہیں، چیلنج اور استہزا کا تھا۔ جواب میں فرمایا گیا:

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللهُ: میں اپنے لیے بھی نفع وضرر کا مالک نہیں، مگر جو اللہ چاہے، غیب کا علم میرے اختیار میں نہیں، ہر امت کے لیے ایک مقررہ وقت ہے، جب اس کی مہلت پوری ہو جائے تو نہ ایک لمحہ آگے بڑھ سکتی ہے، نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے، وقت کا تعین انسان کے ہاتھ میں نہیں، رب کے ہاتھ میں ہے۔

مہلت دنیا، وعدۂ عذاب اور عدل مطلق کا فیصلہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ {۵۰} اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ اٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ {۵۱} ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ {۵۲} وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ {۵۳} وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ {۵۴} اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ {۵۵} هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ {۵۶} یونس

جواب ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ تم بتاؤ اگر اللہ کا عذاب رات کے وقت آجائے یا دن کے وقت آجائے تو اس میں وہ کون سی چیز ہے جس کی مجرمین جلدی مچا رہے ہیں کیا پھر جب وہ واقع ہو ہی جائے تو اس پر ایمان لاؤ گے۔ اب ایمان لاتے ہو حالانکہ تم اس کے جلد آنے کا تقاضا کرتے تھے پھر ان لوگوں سے کہا جائے گا جنہوں نے ظلم کیا کہ ہمیشگی کا عذاب چکھ لو تمہیں انہیں اعمال کا بدلہ دیا جائے گا

جن کی تم کمائی کرتے تھے۔ اور وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کیا یہ حق ہے؟ آپ فرما دیجئے ہاں میرے رب کی قسم بلاشبہ وہ حق ہے اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ ہر وہ شخص جس نے ظلم کیا اگر اس کے لیے وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے تو وہ اپنی جان کو عذاب سے چھڑانے کیلئے اس سب کو خرچ کر ڈالے گا۔ اور جب وہ عذاب دیکھیں گے تو پشیمانی کو پوشیدہ رکھیں گے اور ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہو گا۔ خبردار بیشک اللہ ہی کیلئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے خبردار بلاشبہ اللہ کا وعدہ حق ہے لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ وہی زندہ فرماتا ہے وہی موت دیتا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا مَاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ: اے حبیب! ان سے کہہ دیجئے: بتاؤ، اگر اللہ کا عذاب تم پر رات کے کسی پہر یا دن کی کسی ساعت میں آ جائے تو تم اس میں سے کس چیز کی جلدی کر رہے ہو؟ جو چیز سراسر ہلاکت ہے، اس کی جلدی کیوں؟ یہ مطالبہ دراصل جرأت نہیں، غفلت کی انتہا ہے۔

أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ آلْآنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ: کیا تم اس وقت ایمان لاؤ گے جب عذاب آ چکے گا؟ حالانکہ اس گھڑی کا ایمان نافع نہیں ہو گا، کیونکہ ایمان وہی معتبر ہے جو غیب پر ہو، مشاہدۂ عذاب کے بعد نہیں، تم پہلے تکذیب کے طور پر عذاب کو جلدی لانے کا مطالبہ کرتے رہے، اب جب وہ آ پہنچے تو ایمان کی بات کرو گے؟ یہ ایمان نہیں، مجبوری کی آہ ہو گی اور مجبوری کا اقرار نجات نہیں دیتا۔

ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ: پھر جب وہ عذاب میں ڈال دیے جائیں گے اور نکلنے کی فریاد کریں گے تو کہا جائے گا: چکھو اس ہمیشگی والے عذاب کا مزہ! تمہیں وہی بدلہ دیا جا رہا ہے جو تم کرتے رہے، یہ انتقام نہیں، اعمال کا آئینہ ہے۔

وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ: مشرکین پوچھتے ہیں: کیا واقعی یہ عذاب سچ

ہے؟ کہہ دیجئے: ہاں، میرے رب کی قسم! یہ حق ہے اور تم اس سے بچ نہ سکو گے، یہ کوئی دھمکی نہیں، اٹل حقیقت ہے۔

وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْأَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهِ: اگر کسی مشرک کے پاس زمین بھر خزانے ہوں تو وہ سب کچھ دے کر بھی عذاب سے نجات چاہے گا، مگر یہ سودا قبول نہ ہو گا، جب وہ عذاب دیکھیں گے تو دل میں شدید ندامت چھپالیں گے، مگر اس ندامت کا اظہار بھی انہیں فائدہ نہ دے گا، فیصلہ عدل کے ساتھ ہو گا اور کسی پر ذرّہ برابر ظلم نہ ہو گا۔

أَلَا إِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ: آگاہ رہو! آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اللہ کے لیے ہے، کافروں کے عذاب کا وعدہ سچا ہے، اس میں کوئی شک نہیں، مگر اکثر لوگ لاعلمی یا غفلت کے باعث شک میں مبتلا رہتے ہیں، حقیقت روشن ہے، آنکھوں پر پردہ خود ڈالا جاتا ہے۔

هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ: وہی زندگی دیتا ہے، وہی موت دیتا ہے، اور اسی کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے، قیامت کے دن تمہارے اعمال تمہارے سامنے رکھ دیے جائیں گے۔

قرآن کریم موعظہ اور بیماریوں کے لیے شفا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے اور بتائیے کہ **مَّوْعِظَةٌ** کا کیا مطلب ہے؟

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ {٥٧} يونس.

جواب ترجمہ: اے لوگو تمہارے رب سے نصیحت اور دلوں کے روگ کی شفا تمہارے پاس آئی ہے اور ایمان داروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے

اپنے رسول کریم ﷺ پر قرآن عظیم نازل فرمانے کے احسان کو اللہ رب العزت بیان فرما رہے ہیں کہ اللہ کا وعظ تمہارے پاس آچکا جو تمہیں بدیوں سے روک رہا ہے، جو دلوں کے شکوک دور کرنے والا ہے، جس سے ہدایت حاصل ہوتی ہے، جس سے اللہ کی رحمت ملتی ہے۔ جو اس سچائی کی تصدیق

کریں اسے مانیں، اس پر یقین رکھیں، اس پر ایمان لائیں وہ اس سے نفع حاصل کرتے ہیں۔ یہ ہمارا نازل کردہ قرآن مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے، ظالم تو اپنے نقصان میں ہی بڑھتے رہتے ہیں۔

قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ہے کہ کہہ دے کہ یہ تو ایمانداروں کے لیے ہدایت اور شفاء ہے۔ اللہ کے فضل و رحمت یعنی اس قرآن کے ساتھ خوش ہونا چاہیے۔ دنیائے فانی کے دھن دولت پر ریجھ جانے اور اس پر شادماں و فرحاں ہو جانے سے تو اس دولت کو حاصل کرنے اور اس ابدی خوشی اور دائمی مسرت کو پالینے سے بہت خوش ہونا چاہیے۔

مَوْعِظَةٌ اور وعظ کے اصلی معنی ایسی چیزوں کا بیان کرنا ہے جن کو سن کر انسان کا دل نرم ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے، دنیا کی غفلت کا پردہ چاک ہو آخرت کی فکر آجائے، قرآن کریم اول سے آخر تک اسی موعظہ حسنہ کا نہایت بلیغ مبلغ ہے، اس میں ہر جگہ وعدہ کے ساتھ وعید، ثواب کے ساتھ عذاب، دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی کے ساتھ ناکامی اور گمراہی وغیرہ کا ایسا ملا جلا تذکرہ ہے جس کو سن کر پتھر بھی پانی ہو جائے پھر اس پر قرآن کریم کا اعجاز بیان جو دلوں کی کایا پلٹنے میں بے نظیر ہے۔

مَوْعِظَةٌ کے ساتھ **مِنْ رَّبِّكُمْ** کی قید نے قرآنی وعظ کی حیثیت کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا کہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ وعظ کسی اپنے جیسے عاجز انسان کی طرف سے نہیں جس کے ہاتھ میں کسی کا نفع و نقصان یا عذاب و ثواب کچھ نہیں، بلکہ رب کریم کی طرف سے ہے جس کے قول میں غلطی کا امکان نہیں اور جس کے وعدے اور عید میں کسی عجز و کمزوری یا عذر کا کوئی خطرہ نہیں۔

قرآن کریم کی دوسری صفت **شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ**، ارشاد فرمائی، شفاء کے معنے بیماری دور ہونے کے ہیں اور صدور، صدر کی جمع ہے جس کے معنی سینہ کے ہیں، مراد اس سے قلب ہے۔

معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم دلوں کی بیماریوں کا کامیاب علاج اور صحت و شفاء کا نسخہ اکسیر ہے، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ قرآن کی اس صفت سے معلوم ہوا کہ وہ خاص دلوں کی بیماری کے لئے شفاء ہے، جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں (روح المعانی)

مگر دوسرے حضرات نے فرمایا کہ در حقیقت قرآن ہر بیماری کی شفاء ہے خواہ قلبی و روحانی ہو یا بدنی اور جسمانی، مگر روحانی بیماریوں کی تباہی انسان کے لئے جسمانی بیماریوں سے زیادہ شدید ہے اور اس کا علاج بھی ہر شخص کے بس کا نہیں، اس لئے اس جگہ ذکر صرف قلبی اور روحانی بیماریوں کا کیا گیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جسمانی بیماریوں کے لئے شفاء نہیں ہے۔

روایات حدیث اور علمائے امت کے بے شمار تجربات اس پر شاہد ہیں کہ قرآن کریم جیسے قلبی امراض کے لئے اکسیر اعظم ہے اسی طرح وہ جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے سینے میں تکلیف ہے، آپ نے فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ، یعنی قرآن شفاء ہے ان تمام بیماریوں کی جو سینوں میں ہوتی ہیں (روح المعانی)۔

اسی طرح حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیان کیا کہ میرے حلق میں تکلیف ہے، آپ نے اس کو بھی یہی فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو۔

علماء امت نے کچھ روایات و آثار سے اور کچھ اپنے تجربوں سے آیات قرآنی کے خواص و فوائد مستقل کتابوں میں جمع بھی کر دیئے ہیں، امام غزالی رحمہ اللہ کی کتاب خواص قرآنی اس کے بیان میں مشہور و معروف ہے جس کی تلخیص مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اعمال قرآنی کے نام سے فرمائی ہے، اور مشاہدات و تجربات اتنے ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کریم کی مختلف آیتیں مختلف امراض جسمانی کے لئے بھی شفاء کلی ثابت ہوتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ نزول قرآن کا اصلی مقصد قلب و روح کی بیماریوں کو ہی دور کرنا ہے اور ضمنی طور پر جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔

اس سے ان لوگوں کی بے وقوفی اور کجروی بھی ظاہر ہوگئی جو قرآن کریم کو صرف جسمانی بیماریوں کے علاج یا دنیوی حاجات ہی کے لئے پڑھتے پڑھاتے ہیں، نہ روحانی امراض کی اصلاح کی طرف دھیان دیتے ہیں نہ قرآن کی ہدایات پر عمل کرنے کی طرف توجہ کرتے ہیں، ایسے ہی لوگوں

کے لئے علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا ہے:

تراحاصل زیٰسٓ اش جزین نیست کہ از ہم خواندنش آسان بمیری

یعنی تم نے قرآن کی سورہ یٰس سے صرف اتنا ہی فائدہ حاصل کیا کہ اس کے پڑھنے سے موت آسان ہو جائے، حالانکہ اس سورت کے معانی اور حقائق و معارف میں غور کرتے تو اس سے کہیں زیادہ فوائد و برکات حاصل کر سکتے تھے۔ (معارف القرآن)

فضل اور رحمت سے کیا مراد ہے؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے، نیز بتائیے کہ فضل اللہ اور رحمت سے کیا مراد ہے؟

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ {۵۸} یونس

جواب ترجمہ: کہہ دو کہ (یہ کتاب) خدا کے فضل اور اس کی مہربانی سے (نازل ہوئی ہے) تو چاہئے کہ لوگ اس سے خوش ہوں۔ یہ اس سے کہیں بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں

اس آیت میں دو چیزوں کو فرحت و مسرت کا سامان قرار دیا ہے ایک فضل دوسرے رحمت، ان دونوں سے مراد یہاں کیا ہے؟ اس بارے میں ایک حدیث حضرت انس کی روایت سے یہ منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے فضل سے مراد قرآن ہے اور رحمت سے مراد یہ ہے کہ تم کو قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشی۔ (روح المعانی از ابن مردویہ)۔

یہی مضمون حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے اور بہت سے حضرات مفسرین نے فرمایا کہ فضل سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد اسلام ہے، اور مطلب اس کا بھی وہی ہے جو حدیث سابق سے معلوم ہوا کہ رحمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن سکھایا اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشی، کیونکہ اسلام اسی حقیقت کا ایک عنوان ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک روایت میں ہے کہ فضل سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں، قرآن کریم کی آیت وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ سے اس مضمون

کی تائید ہوتی ہے، اور حاصل اس کا بھی پہلی تفسیر سے کچھ مختلف نہیں، کیونکہ عمل بالقرآن یا اسلام رسول اللہ ﷺ ہی کی پیروی کے مختلف عنوانات ہیں۔

حلال و حرام کی حقیقت اور نگرانیِ الٰہی کا اعلان

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ {۵۹} وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ {۶۰} وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ {۶۱} یونس

جواب ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ تم بتاؤ جو رزق اللہ نے تمہارے لیے نازل فرمایا تم نے اس میں سے خود ہی بعض کو حرام اور بعض کو حلال تجویز کر لیا۔ آپ فرما دیجئے کہ اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دی ہے یا اللہ پر افتراء کرتے ہو' اور قیامت کے دن کے بارے میں ان لوگوں کا کیا گمان ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ بلا شبہ اللہ لوگوں پر فضل فرمانے والا ہے اور لیکن ان میں سے بہت سے لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ اور آپ جس کسی حال میں بھی ہوں اور قرآن مجید کا جو بھی کوئی حصہ تلاوت کر رہے ہوں اور تم لوگ جو بھی کوئی عمل کرتے ہو ہم ضرور اس سے باخبر ہوتے ہیں جبکہ تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو اور زمین اور آسمان میں ذرہ کے برابر کوئی چیز ایسی نہیں جو تیرے رب کے علم میں نہ ہو۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس سے چھوٹی ہو یا بڑی ہو جو کتاب مبین میں نہ ہو۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا: اے میرے حبیب ﷺ! ان مشرکین سے کہہ دیجیے: کیا تم نے کبھی غور کیا اس رزق پر جو اللہ نے تم پر

نازل فرمایا؟ وہی رزق جسے تم اپنی خواہشات کے تابع کر کے کچھ کو حلال اور کچھ کو حرام قرار دیتے پھرتے ہو، بتاؤ، کیا اس تقسیم و تحریم کی اجازت اللہ نے دی ہے؟ یا تم اس کے نام پر خود افترا باندھ رہے ہو؟

وَمَا ظَنُّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: یہ کیسا جسارت آمیز طرزِ عمل ہے کہ بندہ اپنی خواہش کو قانون بنالے اور پھر اسے خدا کی طرف منسوب کر دے! ذرا سوچو، جو لوگ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں، وہ قیامت کے دن اپنے انجام کے بارے میں کیا گمان رکھتے ہیں؟ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں معافی مل جائے گی؟ ہرگز نہیں، اللہ تو لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے کہ فوراً گرفت نہیں کرتا، مہلت دیتا ہے، سانس لینے کا موقع دیتا ہے، لیکن اکثر لوگ اسی مہلت کو غفلت سمجھ لیتے ہیں اور نعمت کو پہچاننے کے بجائے ناشکری میں مبتلا رہتے ہیں۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُو مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا تُفِيضُونَ فِيهِ: اور حقیقت یہ ہے کہ نہ آپ کسی حال میں ہوتے ہیں، نہ قرآن کی کوئی آیت تلاوت کرتے ہیں اور نہ ہی اہلِ ایمان کوئی عمل شروع کرتے ہیں، مگر ہم تمہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں، تمہارے احوال سے باخبر ہوتے ہیں، تمہاری حرکات و سکنات ہماری نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتیں، تم جب کسی کام میں مشغول ہوتے ہو، ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں۔

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ: زمین و آسمان میں ذرّہ برابر کوئی شے بھی ایسی نہیں جو آپ کے رب کے علم سے پوشیدہ ہو، نہ اس سے چھوٹی کوئی چیز، نہ اس سے بڑی، سب ایک واضح کتاب میں محفوظ ہے، جہاں کوئی چھوٹی بڑی بات چھوڑی نہیں گئی، سب کچھ شمار کر لیا گیا ہے۔

شانِ اولیاء اللہ اور بشارتیں

سوال اولیاء اللہ کون ہوتے ہیں؟ ان آیات کی روشنی میں وضاحت فرمائیے۔

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ

{۶۳}لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ {۶۴} یونس.

جواب ترجمہ: خبردار بیشک جو اللہ کے دوست ہیں نہ ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ جو لوگ ایمان لائے اور ڈرتے رہے۔ ان کے لیے بشارت ہے دنیاوی زندگی میں اور آخرت میں۔ اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں' یہ بڑی کامیابی ہے۔

اولیاء ولی کی جمع ہے، لفظ ولی عربی زبان میں قریب کے معنی میں بھی آتا ہے اور دوست و محب کے معنی میں بھی، اللہ تعالیٰ کے قرب و محبت کا ایک عام درجہ تو ایسا ہے کہ اس سے دنیا کا کوئی انسان و حیوان بلکہ کوئی چیز بھی مستثنیٰ نہیں، اگر یہ قرب نہ ہو تو سارے عالم میں کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی، تمام عالم کے وجود کی اصلی علت وہی خاص رابطہ ہے جو اس کو حق تعالیٰ شانہ سے حاصل ہے گو اس رابطہ کی حقیقت کو نہ کسی نے سمجھا اور نہ سمجھ سکتا ہے مگر ایک بے کیف رابطہ کا ہونا یقینی ہے، مگر لفظ اولیاء اللہ میں یہ درجہ ولایت کا مراد نہیں بلکہ ولایت و محبت اور قرب کا ایک دوسرا درجہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے ساتھ خاص ہے یہ قرب محبت کہلاتا ہے جن لوگوں کو یہ قرب خاص حاصل ہو وہ اولیاء اللہ کہلاتے ہیں۔ (معارف القرآن)

اور اس ولایت خاصہ کے درجات بے شمار اور غیر متناہی ہیں، اس کا اعلیٰ درجہ انبیاء علیہم السلام کا حصہ ہے، کیونکہ ہر نبی کا ولی اللہ ہونا لازمی ہے، اور اس میں سب سے اونچا مقام سید الانبیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور ادنیٰ درجہ اس ولایت کا وہ ہے جس کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں درجہ فنا کہا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایسا مستغرق ہو کہ دنیا میں کسی کی محبت اس پر غالب نہ آئے وہ جس سے محبت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، جس سے نفرت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، اس کے حب و بغض اور محبت و عداوت میں اپنی ذات کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں مشغول رہتا ہے اور وہ ہر ایسی چیز سے پرہیز

کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہو، اسی حالت کی علامت ہے کثرت ذکر اور دوام طاعت، یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا اور ہمیشہ ہر حال میں اس کے احکام کی اطاعت کرنا، یہ دو وصف جس شخص میں موجود ہوں وہ ولی اللہ کہلاتا ہے جس میں ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو وہ اس فہرست میں داخل نہیں، پھر جس میں یہ دونوں موجود ہوں اس کے درجات ادنی و اعلی کی کوئی حد نہیں، انہیں درجات کے اعتبار سے اولیاء اللہ کے درجات متفاضل اور کم و بیش ہوتے ہیں۔ (معارف القرآن)

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ امت کے افراد کو یہ درجہ ولایت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فیض صحبت سے حاصل ہو سکتا ہے، اسی سے تعلق مع اللہ کا وہ رنگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا اپنے حوصلہ کے مطابق اس کا کوئی حصہ امت کے اولیاء کو ملتا ہے، پھر یہ فیض صحبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بلا واسطہ حاصل تھا۔

اسی وجہ سے ان کا درجہ ولایت تمام امت کے اولیاء و اقطاب سے بالاتر تھا بعد کے لوگوں کو یہی فیض ایک واسطہ یا چند واسطوں سے حاصل ہوتا ہے جتنے وسائط بڑھتے جاتے ہیں اتنا ہی اس میں فرق پڑ جاتا ہے، یہ واسطہ صرف وہی لوگ بن سکتے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوئے آپ کی سنت کے پیرو ہیں ایسے لوگوں کی کثرت سے مجالست اور صحبت جبکہ اس کے ساتھ ان کے ارشادات کی پیروی اور اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت بھی ہو، یہی نسخہ ہے درجہ ولایت حاصل کرنے کا جو تین جزء سے مرکب ہے۔ کسی ولی اللہ کی صحبت، اس کی اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت، بشرطیکہ یہ کثرت ذکر مسنون طریقہ پر ہو، کیونکہ کثرت ذکر سے آئینہ قلب کو جلا ہوتی ہے تو وہ نور ولایت کے انعکاس کے قابل بن جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ ہر چیز کے لئے صیقل اور صفائی کا کوئی طریقہ ہوتا ہے، قلب کی صیقل ذکر اللہ سے ہوتی ہے، اس کو بیہقی نے بروایت ابن عمر نقل فرمایا ہے۔ (مظہری)

اولیاء اللہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے اللہ جل شانہ کو سچا جانا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی، رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ اللہ کی طرف سے لے کر آئے ان لوگوں نے اس کی پیروی کی، وہ اللہ کے

احکامات کی پیروی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا ان سے رک جاتے ہیں، اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اولیا اللہ وہ ہیں جن کے دلوں میں ایمان ویقین ہو، جن کا ظاہر تقویٰ اور پرہیز گاری میں ڈوبا ہوا ہو، جتنا تقویٰ ہو گا، اتنی ہی ولایت ہو گی۔ ایسے لوگ محض نڈر اور بے خوف ہیں قیامت کے دن کی وحشت ان سے دور ہے، نہ وہ کبھی غم ورنج سے آشنا ہوں گے۔ دنیا میں جو چھوٹ جائے اس پر انہیں حسرت وافسوس نہیں ہوتا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بہت سے سلف صالحین فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ وہ ہیں جن کے چہرہ دیکھنے سے اللہ یاد آجائے۔

ابن جریر میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں جن پر انبیاء اور شہدا بھی رشک کریں گے لوگوں نے پوچھا یارسول اللہ! وہ کون ہیں؟ ہمیں بتایئے تاکہ ہم بھی ان سے محبت والفت رکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ لوگ ہیں جو صرف اللہ کی وجہ سے آپس میں محبت رکھتے ہیں۔ مالی فائدے کی وجہ سے نہیں، رشتے داری اور نسب کی بناء پر نہیں۔ صرف اللہ کے دین کی وجہ سے ان کے چہرے نورانی ہوں گے یہ نور کے منبروں پر ہوں گے۔ سب کو ڈر خوف ہو گا لیکن یہ بالکل بے خوف اور محض نڈر ہوں گے جب لوگ غمزدہ ہوں گے یہ بے غم ہوں گے۔ پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ دور دراز کے رہنے والے خاندانوں اور برادریوں سے الگ شدہ لوگ جن میں کوئی رشتہ کنبہ قوم برادری نہیں وہ محض توحید وسنت کی وجہ سے اللہ کی رضامندی کے حاصل کرنے کے لیے آپس میں ایک ہو گئے ہوں گے اور آپس میں میل ملاپ، محبت، مؤدت، دوستی اور بھائی چارہ رکھتے ہوں گے۔ دین میں سب ایک ہوں گے۔ ان کے لیے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نورانی منبر بچھادے گا جن پر وہ عزت سے تشریف رکھیں گے۔ لوگ پریشان ہوں گے لیکن یہ باطمینان ہوں گے۔ یہ ہیں وہ اللہ کے اولیا جن پر کوئی خوف غم نہیں۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی فرماتے ہیں ”ولی کی اصل ولاء سے ہے جو قرب و نصرت کے معنی میں ہے۔ ولی اللہ وہ ہے جو فرائض سے قربِ الٰہی حاصل کرے اور اطاعت الٰہی میں مشغول رہے اور اس کا دل نور جلالِ الٰہی کی معرِفت میں مستغرق ہو جب دیکھے دلائلِ قدرت الٰہی کو دیکھے اور جب سنے اللہ کی آیتیں ہی سنے اور جب بولے تو اپنے رب کی ثناہی کے ساتھ بولے اور جب حرکت کرے طاعت الٰہی میں حرکت کرے اور جب کوشش کرے اسی امر میں کوشش کرے جو ذریعہ قُربِ الٰہی ہو، اللہ کے ذکر سے نہ تھکے اور چشم دل سے خدا کے سوا غیر کو نہ دیکھے، یہ صفت اولیاء کی ہے ، بندہ جب اس حال پر پہنچتا ہے تو اللہ اس کا ولی و ناصر اور معین و مددگار ہوتا ہے۔

متکلمین کہتے ہیں ولی وہ ہے جو اعتقادِ صحیح مبنی بر دلیل رکھتا ہو اور اعمالِ صالحہ شریعت کے مطابق بجالاتا ہو۔ بعض عارفین نے فرمایا کہ ولایت نام ہے قُربِ الٰہی اور ہمیشہ اللہ کے ساتھ مشغول رہنے کا جب بندہ اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس کو کسی چیز کا خوف نہیں رہتا اور نہ کسی شے کے فوت ہونے کا غم ہوتا ہے۔ (خزائن العرفان)

اولیاء اللہ کے لیے بشارتیں: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ان نیکوکاروں کے لیے دنیا میں تو یہ اعزاز ہے کہ انہیں اللہ خوشخبری دیتا ہے جس سے یہ خوش ہوتے ہیں، آخرت میں اللہ ان کو جنت عطا فرمائے گا، اللہ اپنے وعدہ کے خلاف بھی نہیں کرتا اور اس میں تبدیلی بھی نہیں کرتا، یہ ان لوگوں کے لیے بڑی کامیابی ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں اولیاء اللہ کے لیے دنیا میں کئی طرح کی بشارتیں ہیں مثلاً حق تعالیٰ نے انبیاء کی زبانی جو لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وغیرہ کی بشارت دی ہے، یا فرشتے موت کے قریب ان کو کہتے ہیں وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (فصلت:۳۰) یا کثرت سے سچے اور مبارک خواب انھیں نظر آتے ہیں یا ان کی نسبت دوسرے بندگان خدا کو دکھائی دیتے ہیں جو حدیث صحیح کے موافق نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔ یا ان کے معاملات میں

خدا کی طرف سے خاص قسم کی تائید و امداد ہوتی ہے یا خواص میں اور کبھی خواص سے گزر کر عوام میں بھی ان کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے اور لوگ ان کی مدح و ثناء اور ذکر خیر کرتے ہیں۔ یہ سب چیزیں دنیاوی بشارت کے تحت میں درجہ بدرجہ آسکتی ہیں۔ مگر اکثر روایات میں لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی تفسیر رویائے صالحہ سے کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔ رہی بشارت اخروی، وہ خود قرآن میں منصوص ہے۔ بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اور حدیث میں بھی یہی تفسیر منقول ہے۔

قول باطل کی تردید اور اللہ کی کبریائی کا اعلان

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ {٦٥} اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ {٦٦} هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ {٦٧} قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ هُوَ الْغَنِيُّ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِهٰذَا ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ {٦٨} قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ {٦٩} مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ {٧٠} یونس

جواب ترجمہ: اور آپ کو ان کی بات رنجیدہ نہ کرے بلاشبہ ساری عزت اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ سننے والا ہے اور جاننے والا ہے۔ خبردار اس میں شک نہیں کہ اللہ ہی کے لیے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسرے شرکاء کو پکار رہے ہیں وہ کس چیز کا اتباع کر رہے ہیں۔ یہ لوگ صرف گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور صرف اٹکل پچو گمان کرتے ہیں۔ اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات کو پیدا فرمایا تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو دیکھنے کا ذریعہ

بنایا۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں۔ ان لوگوں نے کہا کہ اللہ نے بیٹا بنالیا ہے وہ اس سے پاک ہے وہ غنی ہے اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ تم اللہ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے۔ آپ فرمادیجئے بیشک جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوں گے۔ دنیا میں تھوڑا سا فائدہ اٹھانا ہے پھر ہماری ہی طرف ان کو لوٹنا ہے پھر ہم انھیں ان کے کفر کی وجہ سے سخت عذاب چکھائیں گے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ: اے میرے حبیب ﷺ! ان لوگوں کی باتوں سے دل گرفتہ نہ ہوں جو آپ کے دین پر طعن کرتے اور عیب جوئی میں مشغول رہتے ہیں، عزت، غلبہ اور اقتدار سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے، کوئی قوت اس کے ارادے کو عاجز نہیں کر سکتی، وہ ان کی ہر بات سن رہا ہے، ان کے ہر عمل سے باخبر ہے اور عنقریب انہیں ان کے کیے کا پورا بدلہ دے گا۔

أَلَا إِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ: الخ سن لو! آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کی ملکیت ہے، پھر یہ مشرک کس چیز کی پیروی کر رہے ہیں جب وہ اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں؟ درحقیقت وہ کسی یقین کے پیچھے نہیں چل رہے، محض گمان کے اسیر ہیں اور جھوٹ کو عقیدہ بنا بیٹھے ہیں، اللہ ان کی گھڑی ہوئی باتوں سے کہیں بلند و برتر ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا: وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات کو سکون کا پردہ بنایا تاکہ تم مشقت کے بعد آرام پاسکو اور دن کو روشن کیا تاکہ تم اپنی معیشت کی جستجو میں سرگرم رہو، جو لوگ سننے کا ہنر رکھتے ہیں، یعنی سمجھ کر، قبولیت کے ساتھ سنتے ہیں، ان کے لیے اس نظامِ کائنات میں کھلی نشانیاں موجود ہیں۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ هُوَ الْغَنِيُّ: ان میں سے ایک گروہ نے یہاں تک کہا کہ اللہ نے

فرشتوں کو اپنی بیٹیاں بنا لیا ہے، کسی نے اللہ کا بیٹا تجویز کیا، یہود نے حضرت عزیز علیہ السلام کو، نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا! سبحان اللہ! وہ ہر نقص سے پاک ہے، وہ سب سے بے نیاز ہے، آسمان و زمین کی ساری بادشاہی اسی کی ہے، اے مشرکو! تمہارے پاس اپنے اس دعوے پر کوئی دلیل نہیں، کیا تم اللہ کی طرف ایسی بات منسوب کرتے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں؟ یہ تو بہت بڑا اور سنگین قول ہے۔

قُلْ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ: اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے فرما دیجیے: جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ نہ اپنی خواہشات میں کامیاب ہوں گے اور نہ اپنے اندیشوں سے بچ سکیں گے۔

مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ: دنیا کی چند روزہ لذتیں انہیں دھوکا نہ دیں، یہ سب عارضی سامان ہے، تھوڑی دیر کا متاع ہے، پھر سب کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے اور وہاں، ان کے کفر اور تکذیب کے سبب، ہم انہیں سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

تذکرہ نوح علیہ السلام اور انجام قوم نوح

سوال ان آیات کی روشنی میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ کیجیے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ {۷۱} فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ {۷۲} فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ {۷۳} ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ {۷۴} یونس

جواب ترجمہ: اور آپ ان کو نوح کا قصہ پڑھ کر سنایئے جبکہ نوح نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم اگر میرا قیام کرنا اور اللہ کی آیات کی یاد دہانی کرنا تم پر بھاری ہے تو میں نے صرف اللہ پر بھروسہ کیا سو تم سب مل کر اپنے شرکاء کے ساتھ اپنی تدبیر کرلو پھر وہ تمہاری تدبیر ڈھکی چھپی نہ رہے پھر تم میرے بارے میں جو چاہو فیصلہ کرلو اور مجھے مہلت نہ دو۔ سو اگر تم روگردانی کرو تو میں نے تم سے کسی معاوضہ کا سوال تو کیا نہیں۔ میرا اجر تو صرف اللہ پر ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرمان برداروں میں سے رہوں۔ سو انہوں نے ان کو جھٹلایا پھر ہم نے ان کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دے دی اور ہم نے انہیں پہلے لوگوں کے بعد زمین کا آباد کرنے والا بنا دیا اور ہم نے ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا سو اے مخاطب! دیکھ لے جن کو ڈرایا گیا تھا ان کا کیسا انجام ہوا۔ پھر ہم نے نوح کے بعد کتنے ہی پیغمبر بھیجے جو اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے۔ سو وہ ان کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے سو وہ ایسے نہ تھے کہ جس چیز کو پہلے جھٹلا چکے تھے اس پر ایمان لے آئیں۔ ہم اسی طرح حد سے نکل جانے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَاقَوْمِ: الخ اے میرے حبیب ﷺ! ان جھٹلانے والے مشرکین کے سامنے نوح علیہ السلام کا قصہ بیان کیجیے، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اگر تمہیں میرا تمہارے درمیان قیام کرنا گراں گزرتا ہے اور اللہ کی آیات کے ذریعے میری نصیحت تم پر شاق گزرتی ہے اور تم نے مجھے مٹانے کا ارادہ کرلیا ہے، تو سن لو! میں نے اپنا بھروسا صرف اللہ پر رکھا ہے، تم اپنے ساتھیوں کو جمع کرلو، اپنے معبودوں کو بلالو، اپنی تدبیریں پختہ کرلو، اور میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو علانیہ کرلو، تمہاری چال کوئی پوشیدہ راز نہ رہے، پھر جو فیصلہ کرنا ہے کر گزرو، مجھے مہلت دینے کی ضرورت نہیں۔

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ: اور اگر تم نے میری دعوت سے منہ موڑ ہی لیا ہے تو کم از کم یہ تو جانتے ہو کہ میں نے تم سے اس پیغام پر کوئی معاوضہ نہیں مانگا، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے، تم

ایمان لاؤ یا انکار کرو، مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں اسی کے حضور سرِ اطاعت خم کیے رہوں، اسی کی بندگی میں ثابت قدم رہوں۔

فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ: الخ لیکن قوم نے انہیں جھٹلایا، تب ہم نے نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھ کشتی میں سوار اہلِ ایمان کو نجات دی اور انہیں زمین میں ان لوگوں کا جانشین بنایا جو اس سے پہلے تھے اور جنہوں نے آیات و دلائل کو جھٹلایا، انہیں طوفان کی موجوں میں غرق کر دیا، اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم ! ذرا غور کیجیے، انجام کیسا ہوا ان لوگوں کا جنہیں خبردار کیا گیا تھا مگر وہ ایمان نہ لائے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ: پھر نوح علیہ السلام کے بعد ہم نے وقفۂ زمانہ کے بعد کئی رسول ان کی اپنی اپنی قوموں کی طرف بھیجے، وہ روشن نشانیاں اور واضح دلائل لے کر آئے، مگر جنہوں نے پہلے ہی تکذیب کو اپنا شعار بنا لیا تھا، ان کے دل ایمان کے لیے آمادہ نہ ہوئے، یوں ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور یہی سنت ہر دور کے ان لوگوں کے ساتھ جاری رہتی ہے جو حد سے گزر کر کفر و سرکشی اختیار کرتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جن جلیل القدر انبیاءِ کرام علیہم السلام کو مختلف اقوام کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا، ان میں حضرت ہود علیہ السلام قومِ عاد کی طرف، حضرت صالح علیہ السلام قومِ ثمود کی طرف، حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی سرکش قوم اور اہلِ بابل کی طرف، حضرت لوط علیہ السلام قومِ سدوم و عمورہ کی طرف، حضرت اسماعیل علیہ السلام اہلِ مکہ و جرہم کی طرف، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام بنی اسرائیل کی ابتدائی نسلوں کی طرف، حضرت یوسف علیہ السلام اہلِ مصر کی طرف، حضرت شعیب علیہ السلام قومِ مدین اور اصحابِ ایکہ کی طرف، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام فرعون اور بنی اسرائیل کی طرف، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف، حضرت الیاس علیہ السلام اہلِ بعل (بنی اسرائیل کے ایک گروہ) کی طرف، حضرت الیَسع علیہ السلام بھی بنی اسرائیل کی طرف، حضرت یونس علیہ السلام

اہلِ نینویٰ کی طرف، اور حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل ہی کی اصلاح وہدایت کے لیے مبعوث ہوئے۔

تذکرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگرانِ مصر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور خلاصہ تفسیر کیجیے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ {۷۵} فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ {۷۶} قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ اَسِحْرٌ هٰذَا ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ {۷۷} قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ {۷۸} وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ {۷۹} فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ {۸۰} فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ {۸۱} وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ {۸۲} فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰي خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ {۸۳} وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ {۸۴} فَقَالُوْا عَلَي اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ {۸۵} وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ {۸۶} یونس

جواب ترجمہ: پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی آیات کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی طرف بھیجا سو ان لوگوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔ سو جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آگیا تو کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ جب تمہارے پاس حق آگیا تو کیا تم اس کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو؟ کیا یہ جادو ہے؟ اور جادو کرنے والے کامیاب

نہیں ہوتے۔ وہ کہنے لگے کہ تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ جس چیز پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے تو ہمیں اس سے ہٹادے۔ اور زمین میں تم دونوں کو سرداری مل جائے اور ہم تم دونوں پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اور فرعون نے کہا کہ میرے پاس ہر جادوگر کو لے آؤ جو خوب جاننے والا ہو۔ سو جب جادوگر آئے تو موسیٰ نے ان سے کہا ڈال دو تم جو کچھ ڈالنے والے ہو۔ سو جب انہوں نے ڈالا تو موسیٰ نے کہا تم جو کچھ لائے ہو یہ جادو ہے بلاشبہ عنقریب اللہ اسے باطل کر دے گا بیشک اللہ فساد کرنے والوں کا کام نہیں بننے دیتا اور اللہ اپنے وعدہ کے موافق حق کو ثابت فرماتا ہے اگرچہ مجرمین برا مانیں۔ سو موسیٰ پر ان کی قوم میں سے تھوڑے سے لوگ ایمان لائے وہ بھی فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں وہ انہیں فتنے میں نہ ڈالے اور بلاشبہ فرعون اس زمین میں بلندی والا تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ حد سے آگے بڑھ جانے والوں میں سے تھا اور موسیٰ نے کہا کہ اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہوئے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم فرمان بردار ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا اے ہمارے رب! تو ہمیں ظالم قوم کے لیے فتنہ نہ بنا۔ اور اپنی رحمت سے ہمیں کافر قوم سے نجات دے۔

خلاصہ تفسیر: قرآن کریم میں بہت سے متفرق مقامات پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کیا گیا ہے، گزشتہ سورتوں میں بھی ذکر موسیٰ علیہ السلام ہو چکا ہے، آئندہ بھی ہو گا، یہاں بھی ہے، اس لیے یہاں خلاصہ تفسیر پر اکتفا کیا گیا ہے۔

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ نوح علیہ السلام اور سابقہ رسولوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعونِ مصر اور اس کے درباری سرداروں کی طرف روشن نشانیوں کے ساتھ مبعوث فرمایا، مگر وہ اپنے تکبر اور سرکشی کے باعث ایمان نہ لائے اور حق کو جادو قرار دے کر ردّ کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے واضح کیا کہ جادو کبھی فلاح نہیں دے سکتا اور جو کچھ وہ لائے ہیں وہ کھلا ہوا حق ہے، فرعون نے مقابلے کے لیے ماہر جادوگروں کو

جمع کیا، مگر جب مقابلہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پر کامل اعتماد کے ساتھ اعلان کیا کہ جو کچھ وہ دکھا رہے ہیں وہ محض جادو ہے اور اللہ اسے باطل کر دے گا؛ چنانچہ اللہ نے اپنے حکم سے حق کو غالب اور باطل کو رسوا کر دیا، اگرچہ فرعونی سردار اسے ناپسند ہی کرتے رہے، اس کے باوجود اکثریت ہٹ دھرمی پر قائم رہی اور بنی اسرائیل میں سے بھی صرف کچھ نوجوان خوف کے باوجود ایمان لائے، کیونکہ فرعون ظلم، جبر اور قتل و تعذیب میں حد سے بڑھا ہوا تھا۔ اس موقع پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو سچی ایمانی وابستگی کے ساتھ اللہ ہی پر توکل کی تلقین کی، تو انہوں نے عرض کیا کہ ہم نے اسی پر بھروسا کیا ہے، اے ہمارے رب! ہمیں ظالموں کا نشانہ نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہمیں فرعون اور اس کی کافر قوم کے پنجۂ ستم سے نجات عطا فرما۔

قرآن و تفاسیر کی روشنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کی دو واضح جماعتیں بیان ہوئی ہیں: سب سے پہلے وہ جادوگر تھے جو فرعون کے مقابلے کے بعد اللہ کی نشانیوں کو دیکھ کر فوراً سجدہ کر کے ایمان لے آئے، طبری اور دیگر تفاسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے ذکر ہے کہ جب انہوں نے معجزہ دیکھا تو فوراً کہا: عرفت أن ذلك أَمْرٌ مِّنَ السَّمَاءِ... خَرُّوا سُجَّداً وَّقَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ العَالَمِينَ۔ بعض روایات کے مطابق یہ جادوگر تقریباً ساٹھ ہزار تھے، اس کے بعد بنی اسرائیل کی بڑی تعداد، جو جادوگروں کے ایمان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ شامل ہوئی، چھ لاکھ کے قریب بیان کی گئی ہے، یوں ایمان لانے والوں میں ابتدائی طور پر جادوگر اور بعد میں بہت سے بنی اسرائیل شامل ہوئے، جو حق کی ہدایت کے لیے اپنے رہنما حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے چل پڑے۔

بنی اسرائیل کے لیے مصر میں نئے مکانات بنانے کا حکم

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے، نیز وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً کا مطلب بیان کیجیے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً

وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ {۸۷} یونس

جواب ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے لوگوں کے لئے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ (یعنی مسجدیں) ٹھیراؤ اور نماز پڑھو۔ اور مومنوں کو خوشخبری سنادو۔

حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں جب فرعون کی ہلاکت کا وقت قریب آیا تو حکم ہوا کہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو ان میں شامل نہ رکھو اپنا محلہ جُدا بساؤ کہ آگے ان پر آفتیں آنے والی ہیں، اس وقت تمہاری قوم ظاہری طور پر بھی آفتوں سے الگ تھلگ رہے۔ مفسرین نے تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا (یونس:۸۷) سے مراد یہ لی ہے کہ اپنے مکانوں میں ٹھہرے رہو اور ان میں سے بعض کو عبادت کے لیے مخصوص کرلو، فرعون نے مسجدیں اور عبادت گاہیں خراب کر دی تھیں کوئی باہر نکل کر خدا کی عبادت نہ کر سکتا تھا، بحالت مجبوری حکم ہوا کہ مکان میں کوئی جگہ نماز کے لیے رکھو جو قبلہ رو ہو، نماز ترک مت کرو کہ اسی کی برکت سے خدا کی مدد آتی ہے۔ (عثمانی)

حضرت مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل اپنے مذہب کے مطابق اس کے پابند تھے کہ نماز صرف اپنے عبادت خانوں میں ادا کریں، فرعون جو ان کو طرح طرح کی ایذائیں دیتا اور ان پر ظلم ڈھاتا تھا، اس نے یہ دیکھ کر ان کے تمام عبادت خانوں کو مسمار کر دیا تاکہ یہ اپنے مذہب کے مطابق نماز نہ پڑھ سکیں، اس پر حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے دونوں پیغمبروں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو وہ حکم دیا جو اس آیت میں مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کیلئے مصر میں مکان نئے بنائے جائیں اور ان مکانات کا رخ قبلہ کی طرف ہو، تاکہ وہ انہی سکونتی مکانات میں نماز ادا کر سکیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین رحمہم اللہ کے مطابق، گھروں کو مساجد بنا کر خوف فرعون میں عبادت جاری رکھنے کی ہدایت دی گئی، جمال الدین القاسمی رحمہ اللہ کے نزدیک قبلۃ سے مراد گھر میں نماز ادا کرنے کی جگہ ہے اور مجیر الدین حنبلی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یہ گھریلو عبادت گاہیں خفیہ طور پر نماز پڑھنے کے لیے تھیں، یوں اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ گھروں کو عبادت و قبلہ گاہ میں بدل کر فرعون کے ظلم و نگرانی سے بچتے ہوئے اللہ کی عبادت جاری رکھنی چاہیے۔

دعا سے فرعونی اموال پتھر بن گئے

سوال آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ {۸۸} یونس

جواب ترجمہ: اور موسیٰ نے کہا، اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں (بہت سا) ساز و برگ اور مال وزر دے رکھا ہے۔ اے پروردگار! ان کا مآل یہ ہے کہ تیرے راستے سے گمراہ کر دیں۔ اے پروردگار! ان کے مال کو برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ ایمان نہ لائیں جب تک کہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔

جب فرعون اور فرعونیوں کا تکبر، تجبر، تعصب بڑھتا ہی گیا، ظلم و ستم بے رحمی اور جفاکاری انتہا کو پہنچ گئی تو اللہ کے صابر نبیوں نے ان کے لیے بد دعا کی کہ یا اللہ تو نے انہیں دنیا کی زینت و مال خوب خوب دیا اور تو بخوبی جانتا ہے کہ وہ تیرے حکم کے مطابق مال خرچ نہیں کرتے۔ یہ صرف تیری طرف سے انہیں ڈھیل اور مہلت ہے۔

یہ مطلب تو ہے جب لیضلّوا پڑھا جائے جو ایک قرأت ہے اور جب لِيُضِلُّوا پڑھیں تو مطلب یہ ہے کہ یہ اس لئے کہ وہ اوروں کو گمراہ کریں جن کی گمراہی تیری چاہت میں ہے ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گا کہ یہی لوگ اللہ کے محبوب ہیں ورنہ اتنی دولت مندی اور اس قدر عیش و عشرت انہیں کیوں نصیب ہوتا ہے؟ اب ہمای دعا ہے کہ ان کے یہ مال تو غارت اور تباہ کر دے۔ چنانچہ ان کے تمام مال اسی طرح پتھر بن گئے۔ سونا چاندی ہی نہیں بلکہ کھیتیاں تک پتھر کی ہو گئیں۔

حضرت محمد بن کعب سورہ یونس کی تلاوت امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے کر رہے تھے جب اس آیت تک پہنچے تو خلیفۃ المسلمین نے سوال کیا کہ یہ طمس کیا چیز ہے؟ آپ

نے فرمایا ان کے مال پتھر بنا دیئے گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا صندوقچہ منگوا کر اس میں سے سفید چنا نکال کر دکھایا جو پتھر بن گیا تھا۔ اور دعا کی کہ پروردگار! ان کے دل سخت کر دے ان پر مہر لگا دے کہ انہیں عذاب دیکھنے تک ایمان لانا نصیب نہ ہو۔ یہ بد دعا صرف دینی حمیت اور دینی دل سوزی کی وجہ سے تھی یہ غصہ اللہ اور اس کے دین کی خاطر تھا۔

دعائے موسیٰ علیہ السلام پر ہارون کی آمین

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کریں، نیز یہ بتایئے کہ دعا کرنے والے تو صرف اکیلے حضرت موسیٰ تھے، اللہ نے یہ کیوں فرمایا کہ میں نے تم دونوں کی دعا قبول کی؟

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ {۸۹} یونس

جواب (اللہ نے) فرمایا کہ تمہاری دعا قبول کر لی گئی تو تم ثابت قدم رہنا اور بے عقلوں کے راستے نہ چلنا۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں تثنیہ کا صیغہ اس لیے استعمال فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا مانگتے جارہے تھے اور حضرت ہارون ان کی دعا پر آمین کہہ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ آمین کہنے والا بھی دعا کرنے والے میں شامل ہوتا ہے۔

سرکش فرعون کا عبرت ناک انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ {۹۰} اٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ {۹۱} فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ {۹۲} یونس

جواب ترجمہ: اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار دیا پھر بغاوت اور زیادتی کرتے ہوئے فرعون اور اس کا لشکر ان کے پیچھے ہو لیا یہاں تک کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو کہنے لگا کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں فرمان برداروں میں سے ہوں۔ کیا اب ایمان لاتا ہے؟ حالانکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور تو فساد کرنے والوں میں سے ہے۔ سو آج بچائے دیتے ہیں ہم تیرے بدن کو تاکہ ہووے تو اپنے پچھلوں کے واسطے نشانی اور بیشک بہت لوگ ہماری قدرتوں پر توجہ نہیں کرتے۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدْوًا: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے سمندر کو پھاڑ کر راستہ فراہم کیا تاکہ وہ سالم و سلامت عبور کر سکیں، لیکن فرعون اور اس کے لشکر نے ظلم اور سرکشی کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، جب سمندر اپنے گھیراؤ میں آ گیا اور ان پر غرقاب ہونے کا وقت آیا، تب فرعون نے کہا کہ اب میں ایمان لایا کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے وہی حق ہے اور میں اس کی اطاعت کرنے والا ہوں۔

آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ: مگر اللہ نے اسے خبردار کیا کہ اب ایمان لانا کس کام آئے گا، جب موت قریب آ چکی ہے اور تم پہلے ہی اپنی سرکشی، کفر اور دوسروں کو گمراہ کرنے کے جرم میں فسادی بن چکے ہو، یہ آیات فرعون کے عہدِ کفر اور اس کے آخری لمحوں میں توبہ نہ قبول ہونے کو واضح کرتی ہیں اور ایمان و اطاعت کی اہمیت کو نمایاں کرتی ہیں۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً: اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا، مرنے کے بعد اس کی لاش کو زمین کے بلند حصے پر پہنچا دیا، تاکہ جو لوگ اس کے ہلاک ہونے کا انکار کرتے تھے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ فرعون ہلاک ہو چکا ہے، بعد میں آنے والے اس کی لاش کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے "تو آج ہم تیرے بدن کو (دریا سے) نکال لیں گے تاکہ تو پچھلوں کیلئے عبرت ہو۔ اور بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ دریا سے عبور کرنے کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ہلاک ہونے کی خبر دی تو وہ لوگ فرعون سے کچھ اس قدر مرعوب و مغلوب تھے کہ اس کا انکار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ فرعون ہلاک نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی اور دوسروں کی عبرت کے لئے دریا کی ایک موج کے ذریعہ فرعون کی مردہ لاش کو ساحل پر ڈال دیا جس کو سب نے دیکھا اور اس کے ہلاک ہونے کا یقین آیا اور اس کی یہ لاش سب کے لئے نمونہ عبرت بن گئی، پھر معلوم نہیں کہ اس لاش کا کیا انجام ہوا، جس جگہ فرعون کی لاش پائی گئی تھی آج تک وہ جگہ جبل فرعون کے نام سے معروف ہے۔

کچھ عرصہ ہوا اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ فرعون کی لاش صحیح سالم برآمد ہوئی اور عام لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا اور وہ آج تک قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے، مگر یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ وہی فرعون ہے جس کا مقابلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا یا کوئی دوسرا فرعون ہے کیونکہ لفظ فرعون کسی ایک شخص کا نام نہیں، اس زمانے میں مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کا لقب دیا جاتا تھا۔ (معارف القرآن)

مصر و شام واردن بنی اسرائیل کا ٹھکانہ

سوال آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے، نیز اس میں وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ کا کیا مطلب ہے؟

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ {۹۳} یونس

جواب ترجمہ: اور ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کو عمدہ جگہ دی اور کھانے کو پاکیزہ چیزیں عطا کیں لیکن وہ باوجود علم حاصل ہونے کے اختلاف کرتے رہے۔ بیشک جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے رہے

ہیں تمہارا پروردگار قیامت کے دن ان میں ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا۔

یعنی فرعونیوں کو ہلاک کر کے اول ملک مصر دیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد عمالقہ کو نکال کر ملک شام دیا گیا۔ دونوں ملک سرسبز و شاداب ہیں جہاں ستھری اور لذیذ چیزوں کی افراط ہے۔ غرض یہ ہے کہ بنی اسرائیل حلال وطیب نعمتوں سے مالامال کر دیئے گئے۔

فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اچھا ٹھکانہ عطا فرمایا کہ پورا ملک مصر بھی ان کو مل گیا اور اردن و فلسطین کی ارض مقدسہ بھی ان کو مل گئی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم اور ان کی ذریت کے لئے میراث بنا دیا تھا۔

اچھے ٹھکانے کو قرآن میں مُبَوَّاَ صِدْقٍ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، صِدْقٍ کے معنی اس جگہ صالح اور مناسب کے ہیں، مطلب یہ کہ ایسا ٹھکانا ان کو دیا جو ان کے لئے ہر اعتبار سے لائق اور مناسب تھا پھر فرمایا کہ ہم نے ان کو حلال پاک چیزوں سے رزق دیا کہ دنیا کی تمام لذائذ اور راحتیں ان کو عطا فرما دیں۔

یقین رسالت اور منکرین کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ {۹۴}وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ{۹۵}اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ {۹۶}وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ {۹۷}یونس

جواب ترجمہ: سو اگر آپ کو اس میں شک ہے جو ہم نے آپ کی طرف اتارا تو آپ ان لوگوں سے دریافت کر لیجئے جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں۔ بلاشبہ آپ کے رب کے پاس سے آپ کے پاس حق آگیا ہے۔ سو آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔ اور ان لوگوں میں سے ہرگز نہ

ہو جایئے جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا ورنہ آپ نقصان اٹھانیوالوں میں سے ہو جائیں گے۔ بیشک جن لوگوں پر آپ کے رب کی بات ثابت ہو چکی ہے وہ ایمان نہ لائیں گے۔ اگرچہ ان کے پاس تمام دلیلیں آجائیں۔ جب تک کہ وہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ :الخ عربی میں ”شک“ کا اصل معنی کسی چیز کو دوسری چیز کے ساتھ جوڑ دینا اور ضم کر دینا ہے، جیسے شکار کو تیر سے اس طرح مارنا کہ اس کے اعضاء ایک دوسرے سے جڑ جائیں، یا صف در صف گھر بنے ہوں، پھر یہی لفظ اس کیفیت کے لیے بولا جانے لگا جب انسان دو احتمالوں کے درمیان کھڑا ہو، یعنی اس کا دل ایک بات کو دوسری کے ساتھ ملا کر دیکھے۔

لیکن یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے: کیا معاذ اللہ رسولِ اکرم ﷺ کبھی شک میں تھے؟ مفسرین نے واضح کیا کہ ایسا ہرگز نہیں، علامہ زمخشری، ابو حیان اندلسی اور دیگر اہلِ علم نے فرمایا کہ ”اِن“ شرطیہ ہونا ضروری نہیں کہ وقوعِ شک کو ثابت کرے، قرآن میں اسلوبِ شرط کبھی محال کو بھی بیان کرتا ہے، جیسے اِن كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ، حالانکہ اللہ کے لیے اولاد ہونا محال ہے، اسی طرح یہاں بھی شک کا فرضی ذکر ہے، حقیقی نہیں۔

شیخ ابن عطیہ رحمہ اللہ اور جمہور محققین نے لکھا کہ خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ سے ہے مگر مراد آپ ﷺ کی امت ہے، خاص طور پر وہ لوگ جو تذبذب میں تھے، جیسے قرآن میں آیا يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ يالَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ، حالانکہ حضور ﷺ سے شرک کا تصور بھی محال ہے، مقصد دراصل دوسروں کو متنبہ کرنا ہے۔

بعض اہلِ علم نے فرمایا کہ یہاں ”شک“ سے مراد دل کی تنگی یا تعجب بھی ہو سکتا ہے، یعنی اگر کفار کے انکار سے دل پر بوجھ ہو تو اہلِ کتاب کے اہلِ علم سے پوچھ لیجیے کہ ان کی کتابوں میں بھی آپ کی بعثت کی بشارت موجود ہے، چنانچہ مؤمن اہلِ کتاب جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام وغیرہ اس کی تصدیق کرتے تھے۔

علامہ زمخشری نے ایک اور لطیف نکتہ بیان کیا کہ آیت کا مقصد شک پیدا کرنا نہیں بلکہ یقین کو مزید مضبوط کرنا ہے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا :رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ تاکہ دل کا اطمینان بڑھ جائے۔

خود رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ اس آیت کے نزول پر فرمایا:لَا أَشُكُّ وَلَا أَسْأَلُ، بَل أَشْهَدُ أَنَّهُ الْحَقُّ، میں نہ شک کرتا ہوں، نہ سوال کرتا ہوں، بلکہ گواہی دیتا ہوں کہ یہ سراسر حق ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی :لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ اور وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ یعنی آپ ﷺ حق پر ثابت قدم رہیں، مریہ (شک) اور تکذیب (جھٹلانے) کی کوئی گنجائش نہیں۔

پھر آگے فرمایا :إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں جن پر اللہ کا فیصلہ نافذ ہو چکا ہے، وہ تمام نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے، اس میں قضا و قدر کا مسئلہ بھی مضمر ہے کہ ہدایت کا حقیقی مالک اللہ ہے، دلائل تبھی نافع ہوتے ہیں جب اللہ کی توفیق شامل ہو۔

خلاصہ یہ کہ آیت میں شک کا اثبات نہیں بلکہ فرضی اسلوب کے ذریعے یقین کی تاکید، امت کی تعلیم اور حق کی قطعیّت کو اجاگر کرنا مقصود ہے، حضور ﷺ کا مقام ہر شبہے سے بالا ہے اور قرآن اپنی سچائی میں ایسا روشن ہے کہ اہلِ کتاب کی گواہی بھی اسی کی تائید میں کھڑی نظر آتی ہے۔

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ : اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ کو مخاطب فرما کر آگاہ کرتے ہیں کہ آپ ہرگز ان لوگوں میں شامل نہ ہوں جو اللہ کی حجتوں اور روشن دلیلوں کو جھٹلاتے ہیں، ورنہ انسان اپنے ہی نفس کو خسارے میں ڈال دیتا ہے، تاہم یہ خطاب دراصل امت کی تعلیم اور تنبیہ کے لیے ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ ہر قسم کے شک اور تکذیب سے معصوم ہیں، مقصد یہ بتانا ہے کہ انکار اور تردد کا انجام انتہائی ہلاکت خیز ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ : پھر فرمایا گیا کہ وہ لوگ جن پر اللہ کا فیصلہ ان کے مسلسل اصرارِ کفر کے باعث ثابت ہو چکا ہے، وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے، ان کے دل ضد، ہٹ دھرمی اور سرکشی کے سبب اس قدر بند ہو چکے ہیں کہ ہدایت کی کوئی کرن ان میں اثر نہیں کرتی۔

وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّى يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ : یہاں تک کہ اگر ان کے پاس ہر قسم کی نشانی آجائے، خواہ شرعی دلائل ہوں یا کائناتی معجزات، تب بھی وہ ایمان قبول نہ کریں گے، الا یہ کہ جب دردناک عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، مگر اس وقت کا ایمان بے سود ہو گا، کیونکہ وہ ایمان اضطرار کا ہو گا، اختیار اور یقین کا نہیں، اس طرح یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ ہدایت اسی کے لیے ہے جو دل سے طلبگار ہو اور ضدی انکار انسان کو اس مقام تک پہنچا دیتا ہے جہاں نشانیاں بھی بے اثر ہو جاتی ہیں۔

قوم یونس پر آیا عذاب کیسے ٹلا؟

سوال قوم یونس پر عذاب آنے کے بعد ٹل گیا، اس کی وجہ کیا تھی؟

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ {۹۸} یونس

جواب ترجمہ: تو کوئی بستی ایسی نہ ہوئی کہ ایمان لاتی تو اس کا ایمان اسے نفع دیتا۔ ہاں یونس کی قوم کہ جب ایمان لائی تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان سے ذلت کا عذاب دور کر دیا اور ایک مدت تک (فوائد دنیاوی سے) ان کو بہرہ مند رکھا۔

کسی بستی کے تمام باشندے کسی نبی پر کبھی ایمان نہیں لائے۔ یا تو سب نے ہی کفر کیا یا اکثر نے۔ سورہ یٰسین میں فرمایا بندوں پر افسوس ہے ان کے پاس جو رسول آئے انہوں نے ان کا مذاق اڑایا۔ ایک آیت میں ہے ان سے پہلے رسول آئے، انہیں لوگوں نے جادوگر یا مجنون کا ہی خطاب دیا۔ تجھ سے پہلے جتنے رسول آئے سب کو ان کی قوم کے سرکشوں ساہوکاروں نے یہی کہا کہ ہم نے تو اپنے بڑوں کو جس لکیر پر پایا اسی کے فقیر بنے رہیں گے۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں مجھ پر انبیاء پیش کئے گئے کسی نبی کے ساتھ تو لوگوں کا ایک گروہ تھا۔ کسی کے ساتھ صرف ایک آدمی، کوئی محض تنہا۔ پھر آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کی کثرت کا بیان کیا۔ پھر اپنی امت کا، اس سے بھی زیادہ ہونا، زمین کے مشرق مغرب کی سمت کو ڈھانپ لینا بیان فرمایا۔

الغرض تمام انبیاء میں سے کسی کی ساری امت نے انہیں نبی نہیں مانا۔ سوائے اہل نینویٰ کے جو حضرت یونس علیہ السلام کی امت کے لوگ تھے۔ یہ بھی اس وقت جب نبی علیہ السلام کی زبان سے عذاب کی خبر معلوم ہوگئی۔ پھر اس کے ابتدائی آثار بھی دیکھ لیے۔ ان کے نبی علیہ السلام انہیں چھوڑ کر چلے بھی گئے۔ اس وقت یہ سارے کے سارے اللہ کے سامنے جھک گئے اس سے فریاد شروع کی، اس کی جناب میں عاجزی اور گریہ و زاری کرنے لگے، اپنی مسکینی ظاہر کرنے لگے اور دامن رحمت سے لپٹ گئے۔ سارے کے سارے میدان میں نکل کھڑے ہوئے اپنی بیویوں، بچوں اور جانوروں کو بھی ساتھ اٹھا کر لے گئے اور آنسوؤں کی جھڑیاں لگا کر اللہ تعالیٰ سے فریاد کرنے دعائیں مانگنے لگے کہ یارب! عذاب ہٹالے۔ رحمت رب جوش میں آئی، پروردگار نے ان سے عذاب ہٹالیا اور دنیا کی رسوائی کے عذاب سے انہیں بچالیا۔ اور ان کی عمر تک کی انہیں مہلت دے دی اور اس دنیا کا فائدہ انہیں پہنچایا۔

یہاں جو فرمایا کہ دنیا کا عذاب ان سے ہٹالیا۔ اس سے بعض نے کہا ہے کہ اُخروی عذاب دور نہیں لیکن یہ ٹھیک نہیں اس لیے کہ دوسری آیت میں ہے فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ الصافات: ۱۴۸) وہ ایمان لائے اور ہم نے انہیں زندگی کا فائدہ دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ ایمان لائے اور یہ ظاہر ہے کہ ایمان آخرت کے عذاب سے نجات دینے والا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل کفر کی کسی بستی کا عذاب دیکھ لینے کے بعد ایمان لانا نفع بخش نہیں ثابت ہوا، سوائے قوم یونس علیہ السلام کے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے نبی ان میں سے نکل گئے اور انہوں نے خیال کر لیا کہ اب اللہ کا عذاب آیا چاہتا ہے، اس وقت توبہ استغفار کرنے لگے ٹاٹ پہن کر خشوع و خضوع سے میلے کچیلے میدان میں آکھڑے ہوئے بچوں کو ماؤں

سے دور کر دیا، جانوروں کے تھنوں سے ان کے بچوں کو الگ کر دیا، اب جو رونا دھونا اور فریاد شروع کی تو چالیس دن رات اسی طرح گزار دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کی سچائی دیکھ لی۔ ان کی توبہ و ندامت قبول فرمائی اور ان سے عذاب دور کر دیا۔

یہ لوگ موصل کے شہر نینویٰ کے رہنے والے تھے۔ فَلَو لَا کی جگہ فَهَلَّا قرأت بھی ہے ان کے سروں پر عذاب رات کی سیاہی کے ٹکڑوں کی طرح گھوم رہا تھا ان کے علماء نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ جنگل میں نکل کھڑے ہو اور اللہ سے دعا کرو کہ وہ ہم سے اپنے عذاب کو دور کر دے اور یہ کہو یَاحَیُّ حِینَ لَاحَیُّ یَاحَیُّ مُحیِیُ المَوتَی یَاحَیُّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنتَ

مشیت الٰہی، اختیار انسان اور انجام اقوام

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ {۹۹} وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ {۱۰۰} قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ {۱۰۱} فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ {۱۰۲} ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ {۱۰۳} یونس

جواب ترجمہ: اور اگر آپ کا رب چاہتا تو زمین میں جتنے بھی لوگ ہیں سارے کے سارے ایمان لے آتے کیا آپ لوگوں پر زبردستی کریں گے تاکہ وہ مومن ہو جائیں۔ اور کسی شخص سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے حکم کے بغیر ایمان لے آئے اور اللہ ان لوگوں پر گندگی واقع فرماتا ہے جو سمجھ نہیں رکھتے۔ آپ فرما دیجئے دیکھ لو آسمانوں میں اور زمین میں کیا چیزیں ہیں اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے انہیں دلائل اور ڈرانے والی چیزیں نفع نہیں دیتیں۔ سو کیا وہ یہ انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس

انہیں لوگوں کے واقعات آجائیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ تم انتظار کرلو میں تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ پھر ہم اپنے رسولوں کو نجات دیتے ہیں اور اسی طرح ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہمارے ذمہ ہے کہ ہم ایمان والوں کو نجات دیں گے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا: ارشاد ہوتا ہے کہ اگر آپ کا رب چاہتا تو روئے زمین کے تمام انسان ایمان لے آتے، مگر اس کی حکمت کا تقاضا یہ نہیں تھا، اس نے انسان کو ارادہ واختیار عطا کیا، پھر عدل کے تقاضے سے جسے چاہا گمراہی میں چھوڑ دیا اور فضل سے جسے چاہا ہدایت عطا فرمائی، لہٰذا اے میرے حبیب ﷺ! آپ کے اختیار میں یہ نہیں کہ لوگوں کو زبردستی مومن بنا دیں، دلوں کا پلٹنا اور ایمان کی توفیق دینا صرف اللہ کے دستِ قدرت میں ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ: فرمایا کہ کوئی جان اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتی، ایمان محض انسانی خواہش یا ذہنی میلان کا نام نہیں، بلکہ وہ اللہ کی مشیّت اور توفیق سے نصیب ہوتا ہے، اس لیے آپ ان کے انکار پر غم سے اپنے آپ کو ہلاک نہ کیجیے، جو لوگ اللہ کی حجتوں، احکام اور نشانیوں کو سمجھنے سے انکار کرتے ہیں، اللہ ان پر عذاب اور رسوائی مسلط کر دیتا ہے۔

قُلِ انْظُرُوا مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ: اس کے بعد منکرین کو دعوتِ فکر دی گئی، آسمانوں اور زمین میں پھیلی ہوئی نشانیوں پر غور کرو، کائنات کا نظم، قدرت کی نشانیاں، تخلیق کی حکمت، یہ سب اللہ کی وحدانیت اور اقتدار کی گواہ ہیں، مگر جن کے دل کفر پر اڑے ہوں، ان کے لیے نئی نشانیاں اور معجزے بھی بے سود ہوتے ہیں، کیونکہ اصل رکاوٹ دلیل کی کمی نہیں بلکہ ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ: پھر تنبیہ فرمائی گئی کہ یہ جھٹلانے والے آخر کس چیز کے منتظر ہیں؟ کیا وہ بھی انہی واقعات کے انتظار میں ہیں جو سابقہ جھٹلانے والی قوموں پر گزر چکے؟ اگر وہ عذاب ہی کا انتظار کر رہے ہیں تو کہہ دیجیے: تم بھی انتظار کرو، میں بھی اپنے رب کے وعدے کا منتظر ہوں۔

ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنجِ الْمُؤْمِنِينَ: آخر کار فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ جب عذاب نازل ہوتا ہے تو اللہ اپنے رسولوں اور اہلِ ایمان کو بچالیتا ہے اور منکرین اپنے انجام کو پہنچتے ہیں، یہ اللہ کا ثابت اور اٹل قانون ہے کہ وہ حق کے علمبرداروں کو سرخرو کرتا ہے اور باطل پر اصرار کرنے والوں کو نیست ونابود کر دیتا ہے۔

توحید خالص کی دعوت

سوال ان آیات کا ترجمہ کیجیے اور مختصر سی وضاحت بھی فرمایئے

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي شَكٍّ مِّن دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ {۱۰۴} وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۖ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ {۱۰۵} وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِن فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظَّالِمِينَ {۱۰۶} یونس

جواب ترجمہ: (اے میرے حبیب ﷺ) فرمادیجیے کہ لوگو! اگر تم کو میرے دین میں کسی طرح کا شک ہو تو (سن رکھو کہ) جن لوگوں کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا۔ بلکہ میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔ جو تمہاری روحیں قبض کرلیتا ہے اور مجھ کو یہی حکم ہوا ہے کہ ایمان لانے والوں میں ہوں؟ اور یہ کہ (اے میرے حبیب ﷺ سب سے) یکسو ہو کر دین (اسلام) کی پیروی کئے جاؤ۔ اور مشرکوں میں ہرگز نہ ہونا۔ اور اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کو نہ پکارنا جو نہ تمہارا کچھ بھلا کرسکے اور نہ کچھ بگاڑ سکے۔ اگر ایسا کروگے تو ظالموں میں ہو جاؤ گے۔

یکسوئی والا سچا دین جو میں اپنے اللہ کی طرف سے لے کر آیا ہوں اس میں اے لوگو! اگر تمہیں کوئی شک شبہ ہے تو ہو، یہ تو ناممکن ہے کہ تمہاری طرح میں بھی مشرک ہو جاؤں اور اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش کرنے لگوں۔ میں تو صرف اسی اللہ کا بندہ ہوں اور اسی کی بندگی میں لگا رہوں گا جو تمہاری موت پر بھی ویسا ہی قادر ہے جیسا تمہاری پیدائش پر قادر ہے تم سب اسی کی طرف لوٹنے

والے اور اسی کے سامنے جمع ہونے والے ہو۔ اچھا اگر تمہارے یہ معبود کچھ طاقت و قدرت رکھتے ہیں تو ان سے کہو کہ جو ان کے بس میں ہو مجھے سزا دیں۔ حق تو یہ ہے کہ نہ کوئی سزا ان کے قبضے میں نہ جزا۔ یہ محض بے بس ہیں، بے نفع و نقصان ہیں، بھلائی برائی سب میرے اللہ کے قبضے میں ہے۔ وہ واحد اور لاشریک ہے، مجھے اس کا حکم ہے کہ میں مومن رہوں۔ یہ بھی مجھے حکم مل چکا ہے کہ میں صرف اسی کی عبادت کروں۔ شرک سے یکسو اور بالکل علیحدہ رہوں اور مشرکوں میں ہرگز شمولیت نہ کروں۔ خیر و شر نفع ضرر، اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی اور کو کسی امر میں کچھ بھی اختیار نہیں۔ پس کسی اور کی کسی طرح کی عبادت بھی لائق نہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ اپنی پوری عمر اللہ تعالیٰ سے بھلائی طلب کرتے رہو۔ رب کی رحمتوں کے موقع کی تلاش میں رہو۔ ان کے موقعوں پر اللہ پاک جسے چاہے اپنی بھرپور رحمتیں عطا فرما دیتا ہے۔ اس سے پہلے عیبوں کی پردہ پوشی اپنے خوف ڈر کا امن طلب کیا کرو۔ پھر فرماتا ہے کہ جس گناہ سے جو شخص جب بھی توبہ کرے، اللہ اسے بخشنے والا اور اس پر مہربانی کرنے والا ہے۔

مالک نفع اور ضرر صرف اللہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ {۱۰۷} یونس

جواب ترجمہ: اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچا دے تو اللہ کے سوا اسے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ خیر کا ارادہ فرمائے تو اس کے فضل کو کوئی بھی ہٹانے والا نہیں۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اپنے فضل سے نواز دے۔ وہ غفور ہے رحیم ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے محبوب پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو مخاطب فرما کر ایک ایسی حقیقت واضح کرتے ہیں جو توحید کی روح اور ایمان کی بنیاد ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف، آزمائش یا مصیبت

پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اسے دور کر سکے اور اگر وہ تمہارے لیے بھلائی، نعمت، عافیت اور مسرت کا فیصلہ کر دے تو پھر کوئی قوت ایسی نہیں جو اس فضل کو روک سکے، یا اس نعمت کے درمیان حائل ہو جائے۔

یہ اعلان دراصل عقیدۂ توحید کی قطعی توضیح ہے، مصیبت بھی اسی کے اذن سے آتی ہے اور راحت بھی اسی کے حکم سے ملتی ہے، جن ہستیوں کو لوگ پکارتے، جن کے سامنے جھکتے اور جن سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں، وہ نہ تو کسی تکلیف کو ٹال سکتی ہیں اور نہ کوئی نعمت عطا کر سکتی ہیں، اختیارِ مطلق، تصرفِ کامل اور حکمِ نافذ صرف اور صرف اللہ رب العزت کا ہے۔

یہ آیت انسان کے دل سے غیر اللہ کا خوف اور غیر اللہ کی امید دونوں کا خاتمہ کرتی ہے، جب بندہ جان لیتا ہے کہ نفع و ضر کا مالک ایک ہی ہے تو وہ مخلوق کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کے بجائے خالق کے حضور جھک جاتا ہے، وہ سمجھ لیتا ہے کہ رزق کی کشادگی ہو یا تنگی، صحت ہو یا بیماری، عزت ہو یا آزمائش، سب اسی کی حکمت کے تحت ہے۔

اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے آسانی کے دروازے کھول دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے آزمائش کا مرحلہ مقرر کر دیتا ہے، مگر اس کی کوئی تقدیر حکمت سے خالی نہیں، وہ اپنے بندوں کو کبھی نعمت دے کر آزماتا ہے اور کبھی محرومی دے کر سنوارتا ہے، جو بندہ اس کی طرف رجوع کرتا ہے، توبہ و انابت اختیار کرتا ہے، اسے وہ کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان و اطاعت کی روشنی میں لے آتا ہے۔ اور وہ اپنے فرمانبردار بندوں پر بے حد مہربان ہے، جب بندہ صدقِ دل سے پلٹ آتا ہے تو وہ اسے اس کے ماضی کی خطاؤں پر مؤاخذہ کرنے کے بجائے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیتا ہے، یہی ربوبیت کی شان ہے اور یہی مغفرت و رحمت کا کمال۔ اس آیت کا پیغام یہ ہے کہ دل کا تعلق صرف اللہ سے ہو، امید بھی اسی سے وابستہ ہو اور خوف بھی اسی کا ہو، کیونکہ حقیقی مؤثر، کارساز اور مشکل کشا وہی ہے، اس کے سوا سب بے بس اور محتاج ہیں۔

دعوت حق کا اعلان اور انسان کی اپنی ذمہ داری

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ {۱۰۸} یونس

جواب ترجمہ: میرے حبیب ﷺ! آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس حق آگیا ہے سو جو شخص ہدایت پائے وہ اپنی ہی جان کے لیے ہدایت پاتا ہے اور جو شخص گمراہی میں رہے تو اس کی گمراہی اسی کے نفس پر پڑنے والی ہے۔ اور میں تم پر مسلط نہیں کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ اپنے رسولِ مکرم ﷺ کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیتے ہیں کہ اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے حق تمہارے پاس پہنچ چکا ہے، اب فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے، جو اس حق کو قبول کرے گا، وہ اپنی ہی بھلائی کا سامان کرے گا اور جو اس سے منہ موڑے گا، اس کی گمراہی کا بوجھ بھی اسی پر ہو گا۔

یہاں ایک بنیادی اصول واضح کیا گیا ہے کہ ہدایت کا فائدہ کسی اور کو نہیں بلکہ خود ہدایت پانے والے کو پہنچتا ہے، ایمان انسان کو آخرت کی کامیابی، قلبی اطمینان اور رب کی رضا کا مستحق بناتا ہے، اس کے برعکس گمراہی کا نقصان بھی شخصی ہے، جو انکار اور سرکشی کا راستہ اختیار کرتا ہے، وہ درحقیقت اپنی ہی جان کے خلاف فیصلہ کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ کو یہ ذمہ داری نہیں دی گئی کہ وہ لوگوں کو زبردستی ایمان قبول کروائیں، آپ ﷺ کا منصب حق کو واضح کر دینا ہے، دلوں کا بدلنا اللہ کے اختیار میں ہے، مخلوق پر کلی اختیار اور کنٹرول اسی ذات حق کے پاس ہے۔

یہ آیت دعوتِ حق کے ساتھ ساتھ تسلی کا پیغام بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، راہِ حق میں رکاوٹیں آئیں گی، تکلیفیں پہنچیں گی، طعن و تشنیع ہو گی، مگر داعی کا کام ثابت قدمی ہے، نتائج کا معاملہ

اللہ کے سپرد ہے اور وہی بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے، وہ اپنی حکمت اور عدل کے مطابق طے کرے گا کہ کون دنیا میں بھی اپنے انجام کو پہنچے اور کون آخرت میں مواخذہ کا سامنا کرے۔

ان آیات میں نہایت بلیغ نصیحت پوشیدہ ہے، مومنوں کے لیے وعدۂ نصرت و کامیابی اور منکرین کے لیے تنبیہ و وعید، ساتھ ہی رسولِ اکرم ﷺ کے قلبِ اطہر کے لیے تسکین کا سامان بھی ہے کہ آپ ﷺ کا فریضہ تبلیغ ہے، ہدایت دینا آپ ﷺ کے اختیار میں نہیں۔

پس ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفع و نقصان پر خود غور کرے، حق سامنے آچکا ہے، اب کامیابی یا محرومی کا راستہ خود چننا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو پہچاننے، اسے اختیار کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

آسمانی وحی کی اتباع کا حکم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ {۱۰۹} یونس

جواب ترجمہ: اور (میرے حبیب ﷺ) آپ اس کا اتباع کیجئے جس کی آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے اور صبر کیجئے یہاں تک کہ اللہ فیصلہ فرمائے اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

اللہ جلّ شانہٗ اپنے محبوب نبی حضرت محمد ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ جو وحی آپ ﷺ کی طرف نازل کی جارہی ہے، آپ ﷺ پوری استقامت کے ساتھ اس کی پیروی کیجیے، یہ رب کی طرف سے آنے والی وحی محض الفاظ نہیں، بلکہ ایک مکمل دستورِ حیات ہے، اس پر عمل پیرا ہونا ہی نبوت کی حقیقی ادائیگی ہے۔

ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ مشرکینِ مکہ کی جانب سے جو اذیتیں، طعن و تشنیع اور مخالفتیں پیش آئیں، ان پر صبر کیجیے، دعوتِ حق کا راستہ ہمیشہ گل و گلزار نہیں ہوتا، پھولوں کی مالا نہیں ہوتا بلکہ اس

میں کانٹے بھی ہیں اور آزمائشیں بھی، مگر اہلِ حق کا شیوہ یہی ہے کہ وہ صبر و ثبات کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور فیصلے کو اپنے رب پر چھوڑ دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ وہ خود فیصلہ فرمائے گا، ایسا فیصلہ جو حق و باطل کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دے، وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کامل عدل فرمانے والا ہے، چنانچہ تاریخ نے دیکھا کہ بدر کے دن اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو گیا، باطل کی شوکت ٹوٹ گئی اور اہلِ ایمان کو سرفرازی نصیب ہوئی، باقی منکرین کے لیے بھی دروازہ کھلا رکھا گیا کہ یا تو توبہ کریں، یا اطاعت کا راستہ اختیار کریں، ورنہ اپنے انجام کے خود ذمہ دار ہوں۔

سورۂ یونس کا یہ اختتامی پیغام ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ وحی کی اتباع، صبر کی استقامت اور اللہ کے فیصلے پر کامل اعتماد ہی کامیابی کی کنجی ہے، حق کا راستہ وقتی طور پر کٹھن سہی، مگر انجام کار سرخروئی اسی کے لیے ہے جو ثابت قدم رہے اور اپنے رب پر بھروسا رکھے۔

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی

اضافات جدیدہ وترمیمات: ۲۲ فروری ۲۰۲۶ء ۴ رمضان المبارک ۱۴۴۷ء بعد اذان فجر

سورۃ ھود (تعارف)

سوال سورۃ ھود کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۂ ہود مکی سورت ہے اور اپنے اسلوب و مضمون کے اعتبار سے عقائدِ اسلام کے بنیادی ستونوں، توحید، رسالت، بعث بعد الموت اور جزا و سزا کو نہایت قوت اور وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب رسولِ اکرم ﷺ کو مکہ میں شدید مخالفت اور اذیتوں کا سامنا تھا، خصوصاً حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حالات مزید سخت ہو گئے تھے، ایسے نازک دور میں یہ سورت نازل ہوئی اور اس نے آپ ﷺ کے قلبِ اطہر کو تسلی دی، صبر و استقامت کا حوصلہ بخشا اور سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات کے ذریعے یہ پیغام دیا کہ راہِ دعوت ہمیشہ آزمائشوں سے آراستہ رہی ہے۔

سورت کا آغاز قرآنِ حکیم کی عظمت کے بیان سے ہوتا ہے، یہ کتابِ الٰہی محکم آیات پر مشتمل ہے، جس میں نہ کوئی خلل ہے اور نہ تناقض، اس لیے کہ اسے اُس ربِّ حکیم نے نازل فرمایا ہے جس کے علم سے بندوں کے مصالح و مفاسد کی کوئی بات پوشیدہ نہیں، اس کے بعد دعوتِ اسلامی کے بنیادی عناصر کو عقلی و فطری دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور ہدایت یافتہ اور گمراہ گروہوں کا تقابل نہایت مؤثر انداز میں کیا گیا ہے، قرآن ان دونوں فریقوں کا فرق یوں بیان کرتا ہے جیسے اندھا اور بہرا، بینا اور سننے والا، کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

پھر انبیائے کرام علیہم السلام کے حالات بیان کیے گئے ہیں، سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر آتا ہے، جو طوفانِ عظیم کے بعد انسانی نسل کے دوبارہ پھیلاؤ کا ذریعہ بنے، اسی لیے انہیں "ابو البشر ثانی" کہا جاتا ہے، انہوں نے طویل عمر پائی، سخت آزمائشیں برداشت کیں اور بے مثال صبر کا مظاہرہ کیا۔

اس کے بعد حضرت ہود علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا، جن کے نام پر سورت موسوم ہے، آپ کو سرکش قومِ عاد کی طرف مبعوث کیا گیا، جو اپنی جسمانی قوت اور ظاہری طاقت پر نازاں تھی اور کہتی تھی ہم سے

بڑھ کر طاقتور کون ہے؟ مگر جب انہوں نے حق کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں تند و تیز آندھی کے عذاب سے نیست و نابود کر دیا اور وہ متکبروں کے لیے نشانِ عبرت بن گئے۔

اسی تسلسل میں حضرت صالح، حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہم السلام کے واقعات بیان ہوئے ہیں، ان قصص کے ذریعے واضح کیا گیا کہ جب قومیں اپنے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب پر اصرار کرتی ہیں تو ان کا انجام عبرتناک ہوتا ہے، یہ عذاب ظلم کی پاداش میں آتا ہے، کیونکہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں، ان کے معبودانِ باطل انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے جب اللہ کا فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے۔

سورت کے اختتام پر ان تمام واقعات کی حکمت بیان کی گئی ہے، یہ قصے محض تاریخ نہیں بلکہ دلوں کو ثابت قدم رکھنے کا ذریعہ ہیں، ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو تقویت دی گئی اور اہلِ ایمان کو نصیحت و یاد دہانی فراہم کی گئی، منکرین کو تنبیہ کی گئی کہ وہ اپنی روش پر قائم رہیں اور اہلِ حق بھی اپنے موقف پر ڈٹے رہیں، فیصلہ آخر کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، جو آسمانوں اور زمین کے غیب کا مالک ہے اور اسی کی طرف ہر امر لوٹایا جائے گا،

یوں سورۂ ہود اپنے اندر وعظ، تسلی، انذار اور تبشیر کا جامع پیغام سموئے ہوئے ہے، ایک طرف منکرین کے لیے عبرت اور دوسری جانب اہلِ ایمان کے لیے ثبات و اطمینان کا سرچشمہ۔

عظمت قرآن اور دعوت توحید

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴿۱﴾ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ﴿۲﴾ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ﴿۳﴾ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴﴾ ھود

جواب ترجمہ: الر۔ یہ کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں پھر واضح طور پر بیان کی گئی ہیں۔ حکمت والے باخبر کی طرف سے ہے یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو بیشک میں تمہیں اللہ کی طرف سے ڈرانے والا ہوں اور بشارت دینے والا ہوں۔ اور یہ بات کہ تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو پھر اس کے حضور میں توبہ کرو وہ تمہیں مقرر کردہ اجل تک خوش عیش زندگی دے گا اور ہر زیادہ عمل کرنے والے کو اس کا ثواب عنایت فرمائے گا اور اگر تم اعراض کرو تو میں تم پر بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ تم کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر: سورۂ ہود کا آغاز حروفِ مقطعات ﴿ الٓرٰ ﴾ سے ہوتا ہے، ان حروف کا حقیقی مفہوم اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، البتہ مفسرین نے لکھا ہے کہ ان کا ایک مقصد قرآنِ مجید کی اعجازی شان کو نمایاں کرنا ہے، یعنی یہی سادہ حروفِ تہجی جن سے عرب واقف تھے، انہی سے ایسا کلام ترتیب پایا جو فصاحت و بلاغت میں بے نظیر اور انسان کے بس سے باہر ہے۔

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ: یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں، پھر تفصیل کے ساتھ بیان کی گئیں اور یہ سب ایک حکمت والے، ہر بات سے باخبر رب کی طرف سے ہے۔ **أُحْكِمَتْ** سے مراد یہ ہے کہ قرآن کی آیات اپنے مضامین، اسلوب اور معانی کے اعتبار سے مضبوط، مستحکم اور ہر قسم کے تناقض سے پاک ہیں، ان میں کوئی خلل، تضاد یا بے ربطی نہیں۔ **ثُمَّ فُصِّلَتْ** کا مطلب یہ ہے کہ احکام، عقائد، قصص اور مواعظ کو کھول کھول کر واضح انداز میں بیان کیا گیا، تاکہ ہدایت کے متلاشی کے لیے کوئی ابہام باقی نہ رہے، اس کتاب کا نازل کرنے والا چونکہ "حکیم" ہے، اس لیے اس کی ہر بات حکمت سے بھرپور ہے؛ اور چونکہ وہ "خبیر" ہے، اس لیے انسانی زندگی کے تمام تقاضوں اور ضرورتوں سے پوری طرح واقف ہے۔

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ: اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یہی تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا خلاصہ اور دینِ حق کی اساس ہے، اس کے ساتھ رسولِ اکرم ﷺ کی زبان سے اعلان کروایا گیا:

إِنَّنِي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ: میں تمہارے لیے اسی کی طرف سے ڈرانے والا بھی ہوں اور خوشخبری سنانے والا بھی، نافرمانی اور شرک پر عذاب کی وعید اور ایمان و اطاعت پر مغفرت و کامیابی کی بشارت، یہ دونوں پہلو دعوتِ نبوت کے لازمی اجزاء ہیں۔

وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ: اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، پھر سچے دل سے اسی کی طرف رجوع کرو، استغفار گناہوں کی معافی کی طلب ہے اور توبہ آئندہ کے لیے اطاعت و فرمانبرداری کا عزم۔ اس کا نتیجہ یہ بیان فرمایا:

يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى: اللہ تمہیں ایک مقررہ مدت تک عمدہ زندگی سے نوازے گا، یعنی دنیا کی زندگی میں برکت، سکون اور باعزت رزق عطا ہو گا۔

وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ: ہر صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا، یعنی جو جتنا اخلاص اور نیکی میں بڑھا ہوا ہو گا، اللہ اس کے درجے اسی قدر بلند فرمائے گا۔ لیکن ساتھ ہی تنبیہ بھی ہے:

وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ: اگر تم نے منہ موڑا تو مجھے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے، یہ "یوم کبیر" قیامت کا دن ہے، جب ہر عمل کا حساب ہو گا۔ اگلی آیت میں عقیدۂ آخرت کو نہایت جامع انداز میں بیان فرمایا:

إِلَى اللهِ مَرْجِعُكُمْ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ: تم سب کا لوٹنا اللہ ہی کی طرف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہی موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے، حساب لینے اور جزا و سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

اللہ کو سب کچھ معلوم ہے

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ {۵}هود.

جواب ترجمہ: دیکھو یہ اپنے سینوں کو دوہرا کرتے ہیں تاکہ اللہ سے پردہ کریں۔ سُن رکھو جس

وقت یہ کپڑوں میں لپٹ کر پڑتے ہیں (تب بھی) وہ ان کی چھپی اور کھُلی باتوں کو جانتا ہے وہ تو دلوں تک کی باتوں سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول: یہ آیت اخنس بن شریق کے متعلق نازل ہوئی یہ شخص شیریں کلام والا اور خوش منظر تھا رسول اللہ ﷺ سے ایسے رویے سے ملتا جسے آپ ﷺ پسند فرماتے اور اپنے دل میں ایسی بات پوشیدہ رکھتا جسے آپ ﷺ ناپسند کرتے۔ (قرطبی ۹/۵)

کلبی کہتے ہیں کہ یہ نبی ﷺ کے ساتھ بیٹھتا اور آپ ﷺ کے سامنے ایسے امور ظاہر کرتا جس سے آپ ﷺ خوش ہوتے لیکن اپنے دل میں اس کے برخلاف (آپ ﷺ کے ناپسندیدہ امور) مخفی رکھتا تو اللہ نے اس کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔

فرماتے ہیں کہ یہ اپنے سینوں میں محمد ﷺ کی عداوت پوشیدہ رکھتے ہیں۔ (نیشاپوری ۲۲۴، سیوطی ۵۴، زادالمسیر ۴/۷۶) معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے سینوں میں عداوت چھپائے رکھتے ہیں جیسے کپڑے کی تہ میں کوئی چیز چھپائی جاتی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ بعضے منافقین کی عادت تھی کہ جب رسولِ کریم ﷺ کا سامنا ہوتا تو سینہ اور پیٹھ جھکاتے اور سر نیچا کرتے چہرہ چھپا لیتے تاکہ انھیں رسولِ کریم ﷺ دیکھ نہ پائیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بخاری نے افراد میں ایک حدیث روایت کی کہ مسلمان بول و براز و مجامعت کے وقت اپنے بدن کھولنے سے شرماتے تھے ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ سے بندے کا کوئی حال چھپا ہی نہیں ہے لہٰذا چاہیے کہ وہ شریعت کی اجازتوں پر عامل رہے۔

مشرکین اپنے سینوں میں کفر چھپاتے ہیں، ان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ ان کے کفر کا علم اللہ سے پوشیدہ رہے گا، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب وہ اپنے کپڑوں سے اپنے جسموں کو چھپاتے ہیں، اپنے گھروں کے اندر اعمال کرتے ہیں، اپنے ظاہر اور پوشیدہ میں وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ کو سب پتا ہے۔

رزق عام اور علم تام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ {٦} هود

جواب ترجمہ: اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں ہے جس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو اور وہ ہر ایک کے ٹھکانا کو جانتا ہے وہ ٹھکانا زیادہ عرصہ رہنے کا ہو یا چند رہنے کا ہو سب کچھ کتاب مبین میں ہے

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا: ربط ما قبل: یہ آیتِ کریمہ سابقہ مضمون کی تکمیل اور توضیح ہے، اس سے پہلے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ظاہر و باطن، ان کے پوشیدہ ارادوں اور علانیہ اعمال سب کو جانتا ہے، اب اس کے بعد ایسی دلیل بیان فرمائی گئی جو اس علمِ کامل پر ایک اور روشن مہر ثبت کرتی ہے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو اور وہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ اور اس کے سپرد کیے جانے کے مقام کو بھی جانتا ہے اور یہ سب کچھ ایک روشن کتاب میں درج ہے۔

علمِ الٰہی اور نظامِ رزق: امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے علمِ محیط کا ذکر کیا تو اس کے بعد اس کی ایسی شان بیان کی جو تمام معلومات پر اس کے کامل احاطے کی دلیل ہے، کیونکہ ہر جاندار تک اس کا رزق پہنچنا ایک عظیم انتظام اور مسلسل تدبیر کا تقاضا کرتا ہے، اگر وہ ہر شے کا جاننے والا نہ ہوتا تو اتنے بے شمار انواع و اقسام کے حیوانات کی ضروریات کس طرح پوری ہوتیں؟ زمین، سمندر، پہاڑ، جنگل اور فضاء، ہر جگہ زندگی کی رنگا رنگ صورتیں بکھری ہوئی ہیں، ہر ایک کی طبیعت جدا، ساخت جدا، خوراک جدا، رہائش جدا، نفع و ضرر جدا، کوئی زہر سے زندہ ہے اور کوئی زہر سے ہلاک، کسی کی غذا سبزہ ہے اور کسی کی گوشت، کوئی اندھیروں میں پلتا ہے اور کوئی روشنی میں، ان سب کی ساخت، ان کے اعضاء، ان کی عادات، ان کی غذائیں اور ان کے مساکن، یہ سب اللہ تعالیٰ کے

علم میں ہیں، جو رب آسمانوں اور زمینوں کے طبقات کا مدبر ہے، وہ حیوان و نبات کی باریکیوں سے کیسے بے خبر ہو سکتا ہے؟

دابّۃ کا مفہوم: لغت کے اعتبار سے دابّۃ ہر اس جاندار کو کہتے ہیں جو زمین پر چلتا ہے، یہ لفظ "دبیب" سے ماخوذ ہے، یعنی آہستہ چلنا، اگرچہ عرب کے عرف میں کبھی یہ لفظ گھوڑے کے لیے خاص ہو جاتا ہے، لیکن اس آیت میں اس کا اصل لغوی مفہوم مراد ہے، لہٰذا تمام حیوانات اس میں داخل ہیں، خواہ خشکی کے ہوں یا تری کے، چھوٹے ہوں یا بڑے۔

ایک ایمان افروز واقعہ: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی کا نزول ہوا تو ان کے دل میں اپنے اہل و عیال کا خیال آیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ اپنے عصا سے ایک چٹان پر ضرب لگائیں، چٹان شق ہوئی اور اس میں سے دوسری چٹان نکلی، پھر وہ بھی پھٹی اور تیسری ظاہر ہوئی، تیسری پر ضرب لگانے سے اس کے اندر سے ایک نہایت چھوٹا کیڑا برآمد ہوا جس کے منہ میں اس کی خوراک موجود تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے پردہ ہٹا دیا تو انہوں نے سنا کہ وہ ننھا کیڑا کہہ رہا ہے: **سُبْحَانَ مَنْ یَرَانِی، وَیَسْمَعُ کَلَامِی، وَیَعْرِفُ مَکَانِی، وَیَذْکُرُنِی وَلَا یَنْسَانِی**، پاک ہے وہ ذات جو مجھے دیکھتی ہے، میری آواز سنتی ہے، میرا ٹھکانا جانتی ہے، مجھے یاد رکھتی ہے اور کبھی نہیں بھولتی۔ یہ منظر گویا اس آیت کی عملی تفسیر تھا، رزق کا انتظام ایسی باریکی سے ہو رہا ہے کہ چٹانوں کی تہہ میں پلنے والا کیڑا بھی فراموش نہیں۔

عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا: کیا اس میں وجوب ہے؟ بعض اہلِ کلام نے اس آیت سے یہ استدلال کیا کہ چونکہ لفظ علیٰ وجوب کے لیے آتا ہے، اس لیے رزق پہنچانا اللہ پر واجب ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ وجوب ذاتی یا جبری نہیں، بلکہ وعدہ، فضل اور احسان کے اعتبار سے ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے یہ ذمہ لیا ہے، نہ کہ کسی کے مجبور کرنے سے۔

رزق اور حلال و حرام کا مسئلہ: اہلِ سنت کے بعض علماء نے اس آیت سے یہ بھی استدلال کیا کہ رزق میں حلال و حرام دونوں داخل ہو سکتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار تک رزق

پہنچانے کا وعدہ فرمایا ہے، اب ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ ساری عمر حرام ہی کھاتے ہیں، اگر حرام کو رزق نہ کہا جائے تو لازم آئے گا کہ اللہ نے اس تک اس کا رزق نہیں پہنچایا اور یہ بات اس کے وعدے کے خلاف ہو گی، جو محال ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ رزق کا مفہوم عام ہے، البتہ حلال و حرام کا حکم بندے کے فعل سے متعلق ہے۔

وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا: ''مستقر'' سے مراد وہ جگہ ہے جہاں جاندار ٹھہرتا اور رہتا ہے اور ''مستودع'' وہ مقام ہے جہاں وہ اس سے پہلے سپرد کیا گیا ہو، جیسے باپ کی پشت، ماں کا رحم یا انڈا، بعض مفسرین نے فرمایا کہ ''مستقر'' وہ جگہ ہے جہاں وہ دن یا رات کو پناہ لیتا ہے اور ''مستودع'' وہ مقام ہے جہاں اس کی موت واقع ہوتی ہے، گویا زندگی کی ابتدا، قیام، نقل و حرکت اور انجام، سب اللہ کے علم میں ہیں۔

كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ: آخر میں فرمایا یہ سب ایک واضح کتاب میں درج ہے، بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد علمِ الٰہی ہے اور بعض کے نزدیک لوحِ محفوظ، جس طرح دوسری جگہ فرمایا گیا کہ کوئی تر و خشک چیز ایسی نہیں جو کتابِ مبین میں نہ ہو۔ یہ آیت بندے کو دو عظیم حقائق کی طرف متوجہ کرتی ہے: اوّل یہ کہ رزق کی فکر میں بے قراری ایمان کے شایانِ شان نہیں، کیونکہ رازق خود ذمہ لے چکا ہے۔ دوم یہ کہ جو رب چٹان کے اندر پلنے والے کیڑے کو نہیں بھولتا، وہ انسان کے اعمال اور احوال کو بھی نظر انداز نہیں کرتا، پس بندے کو چاہیے کہ توکل اور تقویٰ دونوں کو اختیار کرے، کیونکہ رزق اس کے ہاتھ میں ہے اور حساب بھی اسی کے سامنے دینا ہے۔

تخلیق کائنات، عرش الٰہی اور مقصد امتحان

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا

اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ {۷}ھود

جواب ترجمہ: اور وہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں اچھا عمل کرنے والا کون ہے اور اگر آپ ان سے کہیں کہ بیشک تم موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو کافر لوگ ضرور یوں کہیں گے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔

وَهُوَ الَّذِی خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالۡأَرۡضَ فِی سِتَّةِ أَيَّامٍ: وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور اگر آپ کہیں کہ تم مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے تو کافر ضرور کہیں گے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔

اس آیت میں قدرتِ الٰہی کی ایک نئی جہت نمایاں کی گئی ہے، اس سے پہلے علمِ کامل کا بیان تھا، یہاں قدرتِ کاملہ کا اعلان ہے، درحقیقت علم اور قدرت ایک دوسرے سے جدا نہیں، جو ہر شے کو جانتا ہے وہی ہر شے پر قادر بھی ہوتا ہے اور جو قادرِ مطلق ہے اس کا علم بھی محیط ہوتا ہے، یہ دونوں دلیلیں مل کر ربوبیت کی جامع تصویر پیش کرتی ہیں۔

تخلیقِ کائنات اور "چھ دن": آسمان و زمین کی تخلیق "چھ دن" میں ہوئی، اس کی تفصیل دیگر مقامات پر گزر چکی ہے، یہاں اصل توجہ ایک اور حقیقت کی طرف مبذول ہے **:وَكَانَ عَرۡشُهُ عَلَى الۡمَاءِ**، اس کا عرش پانی پر تھا، یہ جملہ محض ایک تاریخی اطلاع نہیں، بلکہ عظمتِ قدرت کی نشانی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش اور پانی کا وجود آسمان و زمین سے پہلے تھا، اس ابتدائی مرحلے کی کیفیت کیا تھی، اس کی قطعی تفصیل انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہے، لیکن اتنا واضح ہے کہ کائنات کا نظم ایک تدریجی اور حکیمانہ ترتیب کے ساتھ قائم ہوا۔

بعض اہلِ علم نے اس کی کیفیت یوں بیان کی کہ عرش پانی کے اوپر تھا، مگر اس طرح نہیں کہ ایک چیز دوسری سے چپکی ہوئی ہو، بلکہ یہ ایک نسبت اور ترتیب کا بیان ہے، جیسے ہم کہتے ہیں کہ آسمان زمین کے اوپر ہے، مقصود یہ ہے کہ تخلیق کی ابتدا میں ایک ایسا مرحلہ تھا جہاں پانی اور عرش کا ذکر بطور اصل کے آتا ہے، اور بعد میں آسمان و زمین کی ساخت وجود میں آئی۔

عرش اور پانی کا ذکر کیوں؟ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آسمان وزمین کی تخلیق سے پہلے عرش کے پانی پر ہونے کا ذکر کیوں کیا گیا؟ اس میں قدرتِ الٰہی کے کئی پہلو جھلکتے ہیں ①: عرش کو مخلوقات میں عظیم ترین قرار دیا گیا ہے، اگر اتنی بڑی مخلوق پانی پر قائم ہو اور پانی خود کسی مضبوط ٹھکانے پر نہ ہو، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسے سنبھالنے والی ذات کسی سہارے کی محتاج نہیں۔ ②: پانی اپنی طبع کے اعتبار سے ٹھہراؤ کا مظہر نہیں، اس کو قرار دینا اور اس پر عظیم مخلوق کو قائم رکھنا اس قدرت کی نشانی ہے جو اسباب کی محتاج نہیں۔ ③: بعد میں جب آسمانوں کو بغیر ستون کے قائم رکھا گیا اور یہ عظیم نظام خلا میں معلق رہا، تو وہ بھی اسی قدرت کا تسلسل ہے، نہ نیچے کوئی ستون، نہ اوپر کوئی زنجیر، صرف حکمِ الٰہی کا سہارا۔

تخلیق کا مقصد، آزمائش: پھر فرمایا لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا، تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے، یہاں "آزمائش" کا مفہوم انسانی انداز سے مختلف ہے، انسان کسی امر کا انجام جاننے کے لیے امتحان لیتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا تصور محال ہے، کیونکہ وہ انجام سے پہلے انجام کو جانتا ہے، پس یہاں امتحان کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کے اعمال کو ظاہر کر دیا جائے، تاکہ عدل وجزا کا نظام قائم ہو سکے اور ہر شخص اپنے عمل کے مطابق پہچانا جائے۔

یہ کائنات بے مقصد نہیں، اگر انسان کو اختیار دیا گیا ہے، نیکی وبدی کا شعور دیا گیا ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب اس اختیار کا حساب ہو گا، امتحان کا مفہوم ہی یہ ہے کہ کامیاب کو انعام اور ناکام کو سزا ملے اور یہ تبھی ممکن ہے جب بعث بعد الموت اور قیامت کا عقیدہ تسلیم کیا جائے۔

انکارِ بعث اور "جادو" کا الزام: اسی مناسبت سے فرمایا گیا کہ اگر آپ لوگوں سے کہیں کہ مرنے کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے تو کافر کہیں گے: "یہ تو کھلا جادو ہے"۔ یہاں "جادو" کہنا دراصل انکار اور تمسخر کی ایک صورت ہے، وہ اس عقیدے کو یا تو دھوکہ قرار دیتے تھے، گویا یہ دنیا کی لذتوں سے

روکنے کا ایک حربہ ہے؛ یا اسے سراسر باطل کہتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک جو چیز عقلِ محدود میں نہ آئے وہ حقیقت نہیں ہو سکتی، ایک پہلو یہ بھی تھا کہ چونکہ قرآن بعث کا اعلان کر رہا تھا، اس لیے قرآن ہی کو "جادو" کہہ کر اس کی بنیاد پر ضرب لگانے کی کوشش کی گئی، اصل کو مشکوک بنا دیا جائے تو شاخیں خود بخود کمزور ہو جاتی ہیں۔ بعض قرأتوں میں "ساحر" بھی آیا ہے، یعنی وہ نبی کو جادوگر کہتے تھے، اس کا مقصد یہی تھا کہ دعوت کو مشتبہ بنا کر اس کی تاثیر کو ختم کر دیا جائے۔

یہ آیت ہمیں تین بڑے حقائق سے آشنا کرتی ہے ①: کائنات کا وجود محض اتفاق نہیں، بلکہ حکیمانہ تدبیر کا نتیجہ ہے۔ ② اس نظام کے پیچھے ایسی قدرت کار فرما ہے جو بغیر سہارے کے عظیم ترین مخلوقات کو قائم رکھ سکتی ہے۔

③ انسان اس نظام میں بے مقصد نہیں رکھا گیا، اس کی زندگی امتحان ہے اور امتحان کا لازمی تقاضا حساب اور جزا ہے۔ جو شخص اس ترتیب کو سمجھ لے، اس کے لیے قیامت کا عقیدہ کوئی بعید بات نہیں رہتا اور جو محض ظاہر پر نظر رکھے، وہ ہر ماورائی حقیقت کو "جادو" کہہ کر ٹال دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انکار سے حقیقت بدلتی نہیں؛ کائنات اپنے خالق کی گواہی دیتی رہتی ہے، اور انسان کو ایک دن اسی کے حضور حاضر ہونا ہے۔

تاخیرِ عذاب، مزاجِ انسان اور شانِ رسالت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ {٨} وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ {٩} وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ {١٠} اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ {١١} هود

جواب ترجمہ: اور اگر ہم عذاب کو ان سے ایک طے شدہ مدت تک موخر کر دیں تو وہ ضرور کہیں گے کہ کس نے اس کو روک رکھا ہے، خبر دار ہو جاؤ جس دن بھی وہ ان پر آجائے گا تو پھر وہ ان سے ٹلائے نہیں ٹلے گا اور جس پر وہ (اب تک) ہنسی کرتے رہے تھے وہ سب کچھ ان ہی پر الٹ پڑے گا۔ اور ہم اگر انسان کو اپنی رحمت چکھا دیں پھر ہم اسے اس سے چھین لیں تو وہ ناامید ناشکرا ہو جاتا ہے۔ اور اگر کسی تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی تھی ہم اسے نعمت چکھا دیں تو وہ کہتا ہے کہ میری ساری بدحالیاں دفع ہو گئیں بیشک وہ اترانے لگتا ہے شیخی بگھارتا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے صبر کو اختیار کیا اور نیک کام کرتے رہے یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے مغفرت ہے اور بڑا اجر ہے۔

وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَعْدُودَةٍ: امامِ تفسیر فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب کفار نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "جادوگر" کہہ کر جھٹلایا تو یہ ان کی ایک باطل بات تھی، اس آیت میں ان کی دوسری گمراہی بیان ہوئی کہ جب وعدۂ عذاب میں تاخیر دیکھتے تو تمسخر کرتے ہوئے کہتے: "آخر اسے روکے کیا ہوئے ہے؟" اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ جس دن مقررہ وقت آپہنچے گا، اس دن وہ عذاب نہ ٹلے گا اور نہ واپس ہو گا، بلکہ چاروں طرف سے انہیں گھیر لے گا۔

عذاب سے مراد کیا ہے؟: امام رازی رحمہ اللہ نے اس پر چند احتمالات ذکر کیے ①: بعض کے نزدیک یہ عذابِ استیصال ہے جو دنیا میں نازل ہوتا، مگر اللہ نے اسے قیامت تک مؤخر فرمایا، اسی تاخیر پر وہ استہزا کرتے تھے۔ ② بعض نے کہا کہ اس سے مراد بدر کا عذاب ہے، جب کفار پر دنیا ہی میں گرفت آئی۔

أُمَّةٍ مَعْدُودَةٍ: "امت" اصل میں جماعت یا وقتِ مقرر کے لیے آتا ہے، مراد یہ ہے کہ ایک گنے ہوئے وقت تک مہلت دی گئی، گویا عذاب کا ایک معین لمحہ ہے، نہ وہ پہلے آتا ہے نہ بعد میں، اللہ کے ہاں ہر کام تقدیرِ حکیم کے مطابق ہے۔

"وَحَاقَ" بصیغۂ ماضی کیوں؟: حالانکہ عذاب ابھی واقع نہ ہوا تھا، مگر اسے ماضی کے صیغہ میں بیان کیا گیا، یہ اسلوب قرآن میں کثرت سے آیا ہے کہ قیامت کے احوال کو اس قدر یقینی بنا کر پیش کیا جاتا

ہے گویا وہ واقع ہو چکے ہوں، تاکہ وعید کی تاکید اور قطعیت ظاہر ہو۔

وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ: یہاں "الإنسان" کے بارے میں دو قول ہیں ①: عام انسان مراد ہے، کیونکہ بعد میں صبر و عملِ صالح والے مستثنیٰ کیے گئے۔ ② بعض کے نزدیک خاص کافر مراد ہے، کیونکہ يَؤُوسٌ، كَفُورٌ، فَرِحٌ، فَخُورٌ جیسی صفات اسی پر صادق آتی ہیں۔ دنیا کی نعمتیں بذاتِ خود قلیل ہیں اور انسان کو ان کا صرف "چکھنا" نصیب ہوتا ہے، لفظِ أَذَاقَة اسی قلت و عارضیت کو ظاہر کرتا ہے، مگر انسان کی طبیعت عجیب ہے: تھوڑی سی نعمت ملے تو غرور میں آجاتا ہے، شکر بھول جاتا ہے، ذرا سی تکلیف آئے تو مایوس ہو کر کفران کرنے لگتا ہے، کافر چونکہ نعمت کو محض اتفاق یا اپنی محنت کا نتیجہ سمجھتا ہے، اس لیے زوال پر ناامید اور حصول پر ناشکرا ہوتا ہے، مؤمن اس کے برعکس ہر حال کو فضلِ الٰہی جانتا ہے، زوال پر امید رکھتا ہے اور عطا پر شکر ادا کرتا ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ: یہ وہ بندے ہیں جو مصیبت میں صابر اور نعمت میں شاکر رہتے ہیں۔ ان کے لیے دو عظیم بشارتیں ہیں: مغفرت (عذاب سے نجات) اجرِ کبیر (ثوابِ عظیم) یہاں قرآن نے انسانی مزاج کی کمزوری اور ایمان کی بلندی دونوں کو نہایت جامع انداز میں واضح فرمایا۔ ان آیات میں دو حقیقتیں نمایاں ہیں ① عذاب کی تاخیر استہزا کا جواز نہیں، ہر وعید کا وقت مقرر ہے۔ ② دنیا کی نعمت و مصیبت امتحان ہیں، کامیاب وہ ہے جو صبر و شکر کے ساتھ جیتا ہے۔

مطاعن کفار اور اعجاز قرآنی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَنْ يَقُولُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ إِنَّمَا أَنْتَ نَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ {۱۲} أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ

صٰدِقِيْنَ {۱۳}فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ {۱۴}هود

جواب ترجمہ: سو ایسا ہونے والا تو نہیں ہے کہ آپ ان احکام میں سے بعض احکام کو چھوڑ دیں جو آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجے جاتے ہیں اور اس بات سے آپ کا دل تنگ ہو رہا ہے کہ وہ یوں کہہ رہے ہیں کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نازل نہیں کیا گیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور اللہ ہر چیز کا اختیار رکھنے والا ہے۔ کیا وہ یوں کہتے ہیں کہ اس نے خود سے بنالیا ہے آپ فرما دیجئے کہ تم اس جیسی دس سورتیں لے آؤ جو بنائی ہوئی ہوں اور اللہ کے سوا جس کو بھی بلا سکتے ہو بلا لو اگر تم سچے ہو۔ سو اگر وہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو یقین کر لو کہ یہ اللہ کے علم کے مطابق اتارا گیا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو کیا تم اسلام قبول کرنے والے ہو۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ: مکہ کے سردار کہتے تھے، اگر آپ ﷺ رسول ہیں تو مکہ کے پہاڑ سونا بنا دیجیے، یا کوئی فرشتہ ساتھ لائیے، یا ایسا کلام سنائیے جس میں ہمارے معبودوں کی مذمت نہ ہو، یہ کلمات سن کر حضور ﷺ کا دل تنگ ہوتا تھا، آیت میں **لَعَلَّكَ** شک کے لیے نہیں بلکہ تنبیہ و تسکین کے لیے ہے، یعنی آپ ﷺ ہرگز وحی کا کوئی حصہ ترک نہ کیجیے، خواہ وہ اسے ناپسند کریں۔

ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ: میں لطیف نکتہ یہ ہے کہ تنگی عارضی ہے، مستقل نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ کشادہ دل تھے، اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ نبی کا منصب صرف انذار و تبشیر ہے، خزانوں کا نازل کرنا یا فرشتوں کو لانا آپ ﷺ کے اختیار میں نہیں، جو بھیجنے والا ہے وہی قادرِ مطلق ہے، چاہے تو عطا کرے، چاہے تو نہ کرے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ: وہی کارساز، محافظ اور اعمال کا حساب لینے والا ہے۔

اس آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ رسول کا منصب پیغام پہنچانا ہے، معجزات کا تقاضا کرنا ضد اور عناد ہے۔ یہ اسلوبِ بیان بتاتا ہے کہ قرآن اپنے الفاظ ہی نہیں، اپنے معانی میں بھی معجز ہے، وہ انسانی نفس

کی گہرائیوں کو کھول کر رکھ دیتا ہے اور ایمان کے راستے کو واضح کر دیتا ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ: کفارِ مکہ جب معجزہ طلب کرتے اور دلائلِ روشن کے باوجود ضد پر قائم رہتے تو ان سے فرمایا گیا، اگر تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ قرآن گھڑا ہوا کلام ہے، تو پھر تم بھی اس جیسی دس سورتیں بنالاؤ اور صرف اپنے زورِ بیان پر اکتفانہ کرو، بلکہ اللہ کے سوا جس جس کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو بلالو، اگر اپنے دعوے میں سچے ہو، یہ محض دعوتِ مقابلہ نہیں، بلکہ اعلانِ اعجاز ہے۔

معجزہ طلب کرنے والوں کو جواب: امامِ تفسیر فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب مخالفین نے رسولِ اکرم ﷺ سے معجزہ چاہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: میرا معجزہ یہی قرآن ہے، جب ایک واضح معجزہ موجود ہو تو مزید کا مطالبہ سرکشی اور جہالت کے سوا کچھ نہیں، پھر اس اعجاز کو ثابت کرنے کے لیے قرآن نے انہیں مقابلہ کی کھلی دعوت دی، اگر یہ انسانی کلام ہے تو انسان اس کا ہم پلہ کلام پیش کر سکتے ہیں، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ عرب کے فصحا و بلغاء، جو فصاحت و بلاغت کے تاجدار تھے، اس میدان میں قدم نہ جما سکے۔

"مثلہ" کا مفہوم: "مثلہ" میں دو احتمال ہیں ①: ہر سورت اپنی انفرادی حیثیت میں ایسی ہو جو قرآن کی کسی سورت کی مثل ہو۔ ② یا دس سورتوں کا مجموعہ بحیثیتِ کل قرآن کے اسلوب و شان کا ہم پلہ ہو۔ ہر دو صورتوں میں چیلنج موجود ہے اور ہر دو میں عجز نمایاں۔

چیلنج کی تدریج: یہاں دس سورتوں کا چیلنج دیا گیا، اس سے پہلے ایک سورت کا بھی مطالبہ آیا تھا (جیسا کہ سورۃ البقرہ اور سورۃ یونس میں مذکور ہے)۔ اہلِ علم نے واضح کیا ہے کہ عام طور پر تدریج یوں ہوتی ہے کہ پہلے زیادہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، پھر کم پر اکتفا کیا جاتا ہے، تاکہ عجز پوری طرح ظاہر ہو جائے، گویا ابتدا میں فرمایا: دس سورتیں لاؤ، جب یہ نہ ہو سکا تو کہا گیا: ایک ہی سورت لے آؤ۔ اس ترتیب میں حکمت یہ ہے کہ مقابلہ کا دروازہ بند نہ ہو، بلکہ مخالفین کی بے بسی سب پر عیاں ہو جائے۔

اعجاز کا اصل پہلو کیا ہے؟: علماء نے قرآن کے اعجاز کے کئی پہلو بیان کیے: فصاحت و بلاغت، اسلوب کی جدت، معانی کی جامعیت، عدمِ تناقض، غیبی خبریں، علومِ کثیرہ کا اشتمال، یا "صرفہ" (یعنی قدرت سلب کر لینا) لیکن راجح قول یہی ہے کہ اصل اعجاز اس کی بے مثال فصاحت و بلاغت میں ہے۔ دلیل یہ ہے کہ آیت میں فرمایا "مفتریات" یعنی تم چاہو تو گھڑ لو، اگر اعجاز صرف غیبی خبروں یا علوم کی کثرت میں ہوتا تو "مفتریات" کہنا بے معنی ہوتا۔ فصاحت ایسی صفت ہے جو صدق و کذب دونوں میں پائی جا سکتی ہے، مگر قرآن کی فصاحت انسانی طاقت سے باہر ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا اسلوب، اس کی ترکیب، اس کی معنوی گہرائی اور لفظی جمال، یہ سب مل کر ایسی شان رکھتے ہیں جو انسانی قدرت سے ماورا ہے۔

وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: جب فرمایا کہ اللہ کے سوا جسے چاہو مدد کے لیے بلا لو، تو اس میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے: اگر تمہارے معبود واقعی کچھ قدرت رکھتے ہیں تو اس عظیم کام میں تمہاری مدد کریں، مگر جب وہ کسی طرح مدد نہ کر سکے، تو یہ بات خود بخود واضح ہو گئی کہ وہ نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر، یوں قرآن کا اعجاز نہ صرف نبوتِ محمدی ﷺ کی دلیل بنا بلکہ الوہیتِ واحدہ کی شہادت بھی۔

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ: یہاں دو احتمال ہیں ①: خطاب رسول اللہ ﷺ اور مؤمنین سے ہے، یعنی اگر کفار مقابلہ نہ کر سکیں تو تم اور زیادہ یقین کر لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوا ہے۔ ② خطاب خود کفار سے ہے، یعنی اگر تمہارے مددگار تمہاری پکار پر لبیک نہ کہیں تو جان لو کہ یہ قرآن اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ دوسرا احتمال زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ سیاقِ کلام میں خطاب کفار سے تھا، اور ضمیر قریب ترین مرجع کی طرف لوٹتی ہے۔

اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ، "اللہ کے علم سے نازل ہوا" کا مطلب یہ نہیں کہ صرف علم کے ساتھ نازل ہوا، بلکہ یہ کنایہ ہے کہ وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ جیسے کوئی حاکم کہے: "یہ فیصلہ میرے علم سے ہوا"، یعنی میری طرف سے صادر ہوا، گویا جب تم اس کے مثل لانے سے عاجز ہو گئے تو یہ ثابت ہو گیا کہ یہ کلام انسانی نہیں، ربانی ہے۔

وَأَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ: یہاں توحید کا ذکر تین جہات سے جڑا ہوا ہے ①: جب تمہارے معبود تمہاری مدد نہ کر سکے تو ان کی الوہیت باطل ہو گئی۔ ② جب قرآن کا اعجاز ثابت ہوا تو رسول اللہ ﷺ کی صداقت ثابت ہوئی، اور آپ ﷺ نے جو توحید کا اعلان کیا وہ بھی ثابت ہوا۔ ③ یہ جملہ تہدید بھی ہے، جب حق واضح ہو گیا تو اب اللہ کے عذاب سے ڈرو اور اسلام قبول کرو۔ سورۃ البقرہ میں بھی اسی طرح کا چیلنج کیا گیا ہے کہ **فَاتَّقُوا النَّارَ** جب مقابلہ نہ کر سکو تو آگ سے ڈرو۔

فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ: اگر خطاب مؤمنین سے ہو تو معنی یہ ہو گا: کیا تم اخلاص میں اور بڑھو گے؟ اور اگر خطاب کفار سے ہو تو مطلب یہ ہو گا: اب جبکہ حجت قائم ہو چکی، کیا تم اسلام قبول کرو گے؟ یہ استفہام دراصل دعوت بھی ہے اور تنبیہ بھی۔

ان آیات میں تین عظیم اصول بیان ہوئے ①: قرآن خود اپنے اعجاز کی دلیل ہے۔ ② اعجازِ قرآن نبوتِ محمدی ﷺ کی قطعی شہادت ہے۔ ③ نبوت کی صداقت توحیدِ خالص کی بنیاد ہے۔ یوں یہ تحدّیِ قرآن یہ چیلنج صرف ادبی مقابلہ نہیں، بلکہ ایمان و کفر کے درمیان فیصلہ کن حدِ فاصل ہے، جو اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے وہ ہدایت پائے اور جو عناد پر قائم رہے وہ اپنے ہی عجز کا اعلان کرتا ہے۔

دنیا تو ہاتھ آگئی مگر آخرت برباد

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ {۱۵} اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ {۱۶} هود.

جواب ترجمہ: جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں (آتش جہنم) کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور جو عمل انہوں نے دنیا میں کئے سب برباد

اور جو کچھ وہ کرتے رہے سب ضائع ہوا۔

حضرت مفتی شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہاں یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ قرآن میں اس جگہ مَنۡ اَرَادَ کا مختصر لفظ چھوڑ کر مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ کا لفظ اختیار فرمایا ہے جو دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے جس کا ترجمہ ارادہ کرتا رہا، کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ حال صرف ایسے لوگوں کا ہے جو شخص آخرت کی فکر اور وہاں کی نجات کے لئے عمل کرتا ہے پھر اس کے ساتھ کچھ دنیا کا بھی ارادہ کرلے تو وہ اس میں داخل نہیں۔ ائمہ تفسیر کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ آیت کفار کے حق میں آئی ہے یا مسلمانوں کے یا مسلم و کافر دونوں سے متعلق ہے؟

آیت کے آخری جملہ میں جو الفاظ آئے ہیں کہ آخرت میں ان کے لئے بجز دوزخ کے کچھ نہیں، اس سے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار ہی کے متعلق ہے کیونکہ مسلمان کتنا ہی گناہگار ہو، گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد آخر کار جنت میں جائے گا، اسی لئے ضحاک وغیرہ مفسرین نے اس کو کفار ہی کے متعلق قرار دیا ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو اپنے نیک اعمال سے صرف دنیا کی بھلائی، راحت، دولت، عزت کے طلبگار ہیں، نیک عمل اسی نیت سے کرتے ہیں کہ دنیا میں عزت و راحت ملے، اور مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہے جب تک اپنے اعمال بد کی سزا نہ بھگت لیں گے اس وقت تک ان کو بجز دوزخ کے کچھ نہ ملے گا۔

اور زیادہ راجح اور واضح بات یہ ہے کہ یہ آیت ان لوگوں سے متعلق ہے جو اپنے اعمال صالح کو صرف دنیا کے فوائد دولت، عزت، صحت وغیرہ کی نیت سے کرتے ہیں خواہ ایسا کرنے والے کافر ہوں جو آخرت کے قائل ہی نہیں، یا مسلمان ہوں جو زبان سے آخرت کے قائل ہیں مگر عمل میں اس کی فکر نہیں رکھتے، بلکہ ساری فکر دنیا ہی کے فوائد سے وابستہ رکھتے ہیں، حضرات مفسرین میں سے مجاہد، میمون بن مہران، معاویہ رضی اللہ عنہم نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔ (معارف القرآن)

رسول کریم ﷺ کی مشہور حدیث اِنَّمَا الاَعمَالُ بِالنِّیَّاتِ سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے کہ جو شخص اپنے عمل میں جس چیز کی نیت کرتا ہے، اس کو وہی ملتی ہے، جو دنیا کی نیت کرتا ہے اس کو دنیا ملتی ہے، جو آخرت کی نیت کرتا ہے آخرت ملتی ہے، جو دونوں کی نیت کرتا ہے اس کو دونوں ملتی ہیں، تمام اعمال کا مدار نیت پر ہونا ایک ایسا اصول ہے جو ہر ملت و مذہب میں تسلیم کیا گیا ہے۔ (قرطبی)

نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد میں ہے کہ قیامت کے روز ان لوگوں کو لایا جائے گا جو دنیا میں عبادت اس لئے کرتے تھے کہ لوگوں کی نظر میں ان کی عزت ہو، ان سے کہا جائے گا کہ تم نے نماز پڑھی، صدقہ خیرات کیا، جہاد کیا، قرآن کی تلاوت کی مگر یہ سب اس نیت سے کیا کہ تم نمازی اور سخی اور غازی اور قاری کہلاؤ تو جو تم چاہتے تھے وہ تمہیں مل گیا، دنیا میں تمہیں یہ خطابات مل چکے اب یہاں تمہارے ان اعمال کا کوئی بدلہ نہیں اور سب سے پہلے جہنم میں ان لوگوں کو ڈالا جائے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ حدیث نقل کرکے رو پڑے اور فرمایا کہ قرآن کریم کی آیت مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَزِيۡنَتَهَا سے اس حدیث کی تصدیق ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتے، مؤمن جو نیک کام کرتا ہے اس کو دنیا میں بھی کچھ بدلہ ملتا ہے اور آخرت میں ثواب ملتا ہے، اور کافر (چونکہ آخرت کی فکر ہی نہیں رکھتا اس لئے اس) کا حساب دنیا ہی میں بھگتا دیا جاتا ہے، اس کے نیک اعمال کے بدلہ میں دنیا کی دولت، عزت، صحت، راحت اس کو دے دیجاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچتا ہے تو اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا جس کا معاوضہ وہاں پائے۔ (مسلم)

حضرت قاضی ثناء اللہ رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں کہ مؤمن اگرچہ دنیا کی فلاح کا بھی خواہش مند ہوتا ہے مگر آخرت کا ارادہ غالب رہتا ہے اس لئے اس کو دنیا میں بقدر ضرورت ہی ملتا ہے اور بڑا معاوضہ آخرت میں پاتا ہے۔

حضرت فاروق اعظم ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے مکان پر حاضر ہوئے تو سارے گھر میں چند

گنی چنی چیزوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تو آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو بھی دنیا کی وسعت عطا فرماویں، کیونکہ ہم فارس وروم کو دیکھتے ہیں وہ دنیا میں بڑی وسعت اور فراخی میں ہیں حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے، آنحضرت ﷺ تکیہ سے کمر لگائے ہوئے تھے، حضرت عمر کے یہ الفاظ سن کر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا: اے عمر! تم اب تک اسی خیال میں پڑے ہو، یہ تو وہ لوگ ہیں جن کی نیکیوں کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیا گیا ہے۔ (تفسیر مظہری)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کی نیت اپنے اعمال میں طلب آخرت کی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ دنیا میں اس کے دل کو غنی کر دیتے ہیں اور اس کی ضروریات کو پورا فرما دیتے ہیں اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے، اور جس شخص کی نیت طلب دنیا کی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ محتاجی اس کے سامنے کر دیتے ہیں کہ اس کی حاجت کبھی پوری ہی نہیں ہوتی کیونکہ ہوس دنیا اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی ایک حاجت پوری ہونے سے پہلے دوسری حاجت سامنے آجاتی ہے اور بے شمار فکریں اس کو لگ جاتی ہیں اور ملتا صرف وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے لکھ دیا ہے۔ (مسند احمد، ترمذی)

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ریاکاروں کی نیکیوں کا بدلہ سب کچھ اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔ ذرا سی بھی کمی نہیں ہوتی۔ پس جو شخص دنیا میں دکھاوے کے لے نماز پڑھے، روزے رکھے یا تہجد گزاری کرے، اس کا اجر اسے دنیا میں ہی مل جاتا ہے۔ آخرت میں وہ خالی ہاتھ اور محض بے عمل اُٹھتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے یہ آیت یہود و نصاریٰ کے حق میں اتری اور اور مجاہد کہتے ہیں ریاکاروں کے بارے میں اتری ہے۔ الغرض کس کا جو قصد ہو اسی کے مطابق اس سے معاملہ ہوتا ہے دنیا طلبی کے لیے جو اعمال ہوں وہ آخرت میں کار آمد نہیں ہو سکتے۔ مومن کی نیت اور مقصد چونکہ آخرت طلبی ہی ہوتا ہے اللہ اسے آخرت میں اس کے اعمال کا بہترین بدلہ عطا فرماتا ہے اور دنیا میں بھی اس کی نیکیاں کام آتی ہیں۔ (ابن کثیر)

شہادتِ حق، انجامِ باطل

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ {۱۷}وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۭ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ {۱۸} الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ {۱۹} اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۭ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ {۲۰} اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ {۲۱} لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ {۲۲} ھود

جواب ترجمہ: جو شخص قرآن پر قائم ہے جو اس کے رب کے پاس سے آیا ہے اور اس کے ساتھ اسی میں سے گواہ بھی ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی کیا منکر آدمی اس کے برابر ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جماعتوں میں سے جو شخص اس کا منکر ہو سو دوزخ اس کی جگہ ہے جس میں اس کے بھیجنے کا وعدہ ہے۔ سوائے مخاطب تو اس کے بارے میں شک میں نہ پڑ بیشک وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے اور لیکن بہت سے لوگ ایمان نہیں لاتے۔ اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو گا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔ یہ لوگ اپنے رب پر پیش کئے جائیں گے اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی طرف نسبت کر کے جھوٹ بولا۔ خبر دار ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔ جو اللہ کی راہ سے روکتے رہے اور اس میں کجی تلاش کرتے رہے اور یہ لوگ آخرت کے منکر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں عاجز کرنے والے نہ تھے اور اللہ کے سوا

ان کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ ان کو دوہرا عذاب کر دیا جائے گا۔ یہ لوگ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ دیکھتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی جانوں کو برباد کر بیٹھے اور وہ جو کچھ انھوں نے جھوٹ بنایا تھا وہ سب غائب ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ آخرت میں سب سے زیادہ خسارہ میں ہوں گے۔

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهِ: یہاں آیت کا آغاز استفہامِ انکاری سے ہوتا ہے، گویا ایک واضح سوال سامنے رکھا گیا ہے، کیا وہ شخص جو اپنے رب کی عطا کردہ روشن دلیل پر قائم ہو، اس کے برابر ہو سکتا ہے جو انکار کی تاریکی میں بھٹک رہا ہو؟ وہ شخص جو قرآن کو تھامے ہوئے ہے، محض تقلید کی بنیاد پر نہیں بلکہ دلیل و بصیرت کے ساتھ اس پر ایمان رکھتا ہے، اس کے پاس دو عظیم شہادتیں موجود ہیں: اوّل: خود قرآن کا اعجاز، اس کی بے مثال فصاحت، اس کا مربوط نظامِ ہدایت اور اس کی معنوی گہرائی۔ دوم: سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق، خصوصاً وہ کتاب جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، وہ کتاب رہنما بھی تھی اور رحمت بھی اور اس کی تعلیمات قرآن کی حقانیت پر گواہی دیتی ہیں۔

پس جو شخص ان دلائل کے باوجود انکار پر اڑا رہے، وہ اس صاحبِ بصیرت کے ہم پلہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ایمان والے وہ ہیں جو اس کلامِ الٰہی کو قبول کرتے ہیں، خواہ وہ اولین صحابہ رضی اللہ عنہم ہوں یا قیامت تک آنے والے اہلِ اسلام، لیکن جو گروہ، خواہ کسی بھی مذہبی نسبت سے وابستہ ہو، قرآن کا انکار کرے، اس کے لیے انجام کی وعید واضح ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس تک آپ کی رسالت کی خبر پہنچے اور وہ ایمان لائے بغیر دنیا سے رخصت ہو جائے، وہ نجات سے محروم ہو گا، خواہ وہ کسی بھی سابقہ شریعت کا دعوے دار ہو، اس کے باوجود بہت سے انسان حق کو قبول نہیں کرتے، حالانکہ وہ اپنے رب کی طرف سے سراسر حق ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ مشرکین نے اپنے خود ساختہ معبودوں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا، انہیں سفارشی قرار دیا اور عبادت کا جواز یہ پیش کیا کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے، یہ سب دعوے ان کی اپنی

گھڑی ہوئی باتیں تھیں، نہ کوئی وحی، نہ کوئی دلیل، اللہ پر جھوٹ باندھنا محض فکری خطا نہیں بلکہ سنگین ظلم ہے، قیامت کے دن یہ لوگ اپنے رب کے حضور پیش کیے جائیں گے، وہاں انبیاء علیہم السلام، ملائکہ اور خود ان کے اعضاء وجوارح گواہی دیں گے کہ انہوں نے اپنے رب پر افترا کیا تھا۔ اس وقت اعلان ہو گا اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ خبردار! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے، یہ لعنت دراصل رحمتِ الٰہی سے دائمی محرومی کا اعلان ہے۔

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا: ان ظالموں کی ایک بڑی پہچان یہ تھی کہ وہ خود تو حق سے دور رہے ہی، دوسروں کو بھی اللہ کے راستے سے روکتے رہے، وہ دین میں عیب ڈھونڈتے، شبہات پھیلاتے اور سیدھے راستے کو ٹیڑھا ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے، یہ محض فکری اختلاف نہ تھا، بلکہ شعوری انکار تھا، اور اس کی جڑ آخرت سے بے اعتقادی تھی، جو آخرت پر ایمان نہ رکھے، اس کے لیے حق کی کوئی قدر باقی نہیں رہتی۔

اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ زمین میں اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے تھے، نہ وہ کہیں چھپ سکتے تھے، نہ موت سے بچ سکتے تھے، نہ حساب سے بھاگ سکتے تھے، جنہیں وہ اپنا حامی اور سفارشی سمجھتے تھے، وہ سب بے بس نکلیں گے، کوئی ولی، کوئی مددگار انہیں اللہ کے فیصلے سے نہ بچا سکے گا۔

يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ: ان کے لیے عذاب دوہرا ہو گا، ایک اپنے کفر کا، اور دوسرا دوسروں کو گمراہ کرنے کا۔

مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ: وہ حق سننے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی ایسے تھے گویا سن نہیں سکتے، نشانیاں آنکھوں کے سامنے تھیں، مگر وہ بصیرت سے محروم تھے، ضد اور عناد نے ان کی سماعت وبصارت کو بے اثر کر دیا تھا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈال

دیا، دنیا کی تجارت میں انسان مال گنواتا ہے، مگر یہاں معاملہ جان کا ہے، انہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی، ابدی راحت کے عوض عارضی دنیا کو اختیار کیا، اگرچہ وجود باقی رہے گا، مگر جب جان دائمی عذاب میں مبتلا ہو جائے تو وہ زندگی بھی کیسی؟ نہ موت آئے گی کہ راحت ملے، نہ زندگی ہو گی کہ آسودگی نصیب ہو، یہی حقیقی بربادی ہے، ان کے خودساختہ معبود، ان کی امیدیں، ان کے دعوے، سب باطل ثابت ہوں گے اور کچھ کام نہ آئیں گے۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ: آخر میں فیصلہ کن انداز میں فرمایا گیا، بلاشبہ یہ لوگ آخرت میں سب سے زیادہ خسارے میں ہوں گے، یہ ایسا حکم ہے جس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں، دنیا کی وقتی کامیابی انہیں دھوکہ نہ دے، اصل معیار آخرت ہے اور وہاں میزانِ عدل میں سب کچھ کھل جائے گا۔

ان آیات میں ایمان اور کفر کے درمیان حدِ فاصل بڑی وضاحت سے کھینچ دی گئی ہے، ایک طرف وہ ہے جو دلیلِ روشن پر قائم ہے، دوسری طرف وہ جو عناد اور افتراء میں ڈوبا ہوا ہے، یہ آیات ہمیں بتاتی ہیں کہ حق کو پہچان لینے کے بعد انکار محض فکری غلطی نہیں بلکہ اخلاقی جرم ہے اور جو شخص اپنی بصیرت کو زندہ رکھے، وہ دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب ہو گا، لیکن جو دل کی آنکھ بند کر لے، وہ خود اپنے آپ کو خسارے کے حوالے کر دیتا ہے۔

جنت جانے کے لیے تین اہم صفات

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کیجیے اور اس میں **وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ** کا کیا مطلب ہے؟

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ{۲۳}هود.

جواب ترجمہ: البتہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اور اپنے رب کے سامنے عاجزی کی وہ جنت میں رہنے والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

بروں کے ذکر کے بعد اچھے لوگوں کا بیان ہو رہا ہے جن کے دل ایمان والے، جن کے جسمانی اعضا فرماں برداری کرنے والے تھے، قول و فعل سے فرمان رب بجالانے والے اور رب کی نافرمانی سے بچنے والے تھے یہ لوگ جنت کے وارث ہوں گے۔ بلند و بالا بالا خانے، بچھے بچھائے تخت، چکھے ہوئے خوشوں اور میووں کے درخت ابھرے ابھرے فرش، خوبصورت بیویاں، قسم قسم کے خوش ذائقہ پھل، چاہت کے لذیذ کھانے پینے اور سب سے بڑھ کر دیدار الٰہی یہ نعمتیں ہوں گی جو ان کے لیے ہمیشہ کے لیے ہوں گی۔ نہ انہیں موت آئے گی نہ بڑھاپا، نہ بیماری، نہ غفلت، نہ رفع حاجت ہو گی، نہ تھوک، نہ ناک مشک، نہ بو والا پسینہ آیا اور غذا ہضم۔

پہلے بیان کردہ کافر شقی لوگ اور یہ مومن متقی لوگ بالکل وہی نسبت رکھتے ہیں جو اندھے بہرے اور بینا۔ اور سنتے میں ہے کافر دنیا میں حق کو دیکھنے میں اندھے تھے اور آخرت کے دن بھی بھلائی کی راہ نہیں پائیں گے نہ اسے دیکھیں گے۔ وہ حقانیت کی دلیلوں کی سننے سے بہرے تھے، نفع دینے والی بات سنتے ہی نہ تھے، اگر ان میں کوئی بھلائی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انہیں ضرور سناتا۔

اس کے برخلاف مومن سمجھ دار، ذکی، عاقل، عالم، دیکھتا، بھالتا، سوچتا، سمجھتا حق و باطل میں تمیز کرتا۔ بھلائی لے لیتا، برائی چھوڑ دیتا، دلیل اور شبہ میں فرق کر لیتا اور باطل سے بچتا، حق کو مانتا۔ بتلایئے یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ تعجب ہے کہ پھر بھی تم ایسے دو مختلف شخصوں میں فرق نہیں سمجھتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اَخْبَتُوْٓا کا معنیٰ ہے انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کیا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کا معنیٰ ہے انہوں نے اللہ کی اطاعت کی۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کا معنیٰ ہے انہوں نے خشوع اور خضوع کیا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اَخْبَتُوْٓا کا معنیٰ ہے انہوں نے خلوص کے ساتھ کام کیا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اخبات اس خشوع کو کہا جاتا ہے جو ڈر و خوف کی وجہ سے دل میں ہو۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اخبات اصل میں نشیبی زمین کو کہا جاتا ہے، خبت عربی میں پست و کشادہ زمین کو کہا جاتا ہے، اخبات خشوع اور اطمینان کو کہا جاتا ہے۔

ایک مطلب اس کا یہ بھی ہے کہ وہ لوگ سر تسلیم خم کرلیں ہر اس حکم خداوندی پر جس کا انہیں حکم دیا گیا ہے اور ہر اس کام سے رک جائیں جس سے انہیں رک جانے کا کہا گیا ہے۔

یہاں جنت والوں کے لیے تین اہم صفات کا ذکر فرمایا گیا ہے، ایک یہ کہ وہ ایمان والے ہوں، دوسرا یہ کہ وہ اعمال صالح والے ہوں، تیسرا وہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہوں، تب انہیں ہمیشہ کی جنت ملے گی۔

مومن اور کافر کی مثال

سوال آیت کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ {۲۴} هود.

جواب ترجمہ: دونوں فرقوں (یعنی کافر و مومن) کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا بہرا ہو اور ایک دیکھتا سنتا۔ بھلا دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے؟ پھر تم سوچتے کیوں نہیں؟

یہ دو فریق کافر اور مومن ہیں۔ کافر اندھا بھی ہوتا ہے اور بہرا بھی۔ اسے کائنات میں ہر طرف اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے کچھ بھی نظر نہیں آتا اور اگر کوئی اسے بتلانا چاہے تو سن بھی نہیں سکتا کیونکہ وہ بہرا ہے۔ اب دیکھیے ایک اندھا کسی راہ پر چل رہا ہو تو اس کے گمراہ ہونے یا کسی کھڈ میں جا گرنے سے بچنے کا کوئی امکان ہوتا ہے بالخصوص اس صورت میں اگر کوئی اسے راستہ بتلائے بھی تو وہ اس کی بات سن بھی نہ سکے اس کے مقابلہ میں ایک شخص خود ہی راستہ دیکھ رہا ہے اور وحی الٰہی کی روشنی میں اپنی منزل طے کر رہا ہے اور وہ منزل اس کے سامنے ہے اور اگر اسے کہیں اشتباہ پیدا ہو جائے تو راستہ بتلانے والے بھی موجود ہیں جن کی آواز وہ سن بھی سکتا ہے اور سننا چاہتا بھی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے راہ گم کر دینے یا کسی حادثہ کا شکار ہونے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں اور اس کا اپنی منزل پر بسلامت پہنچ جانا یقینی ہوتا ہے یہی وہ نمایاں فرق ہے جو ایک کافر اور مومن کی زندگی کے سفر میں ہوتا ہے۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

دعوت نوح علیہ السلام، آغازِ رسالت اور ندائے توحید

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ {۲۵} اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ {۲۶} ھود

جواب ترجمہ: اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا انہوں نے کہا کہ میں تمہیں واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو بلاشبہ میں تمہارے بارے میں میں ایک بڑے تکلیف دینے والے دن کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَى قَوْمِهِ: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا، یہ بعثت محض ایک تاریخی واقعہ نہ تھی بلکہ رحمتِ الٰہی کا ظہور تھی، تاکہ گمراہ انسانوں کو ہدایت کی راہ دکھائی جائے۔

إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ: حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے نہایت دردمندانہ انداز میں فرمایا: اے میری قوم! میں تمہارے لیے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں، میں اس عذاب سے خبردار کرنے آیا ہوں جو اللہ کی نافرمانی کے سبب تم پر آسکتا ہے اور میں وہ پیغام واضح طور پر تم تک پہنچا رہا ہوں جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے، یہاں ''نذیر مبین'' کے الفاظ میں دو حقیقتیں جمع ہیں: اوّل، انجامِ بد سے تنبیہ، دوم، پیغام کی وضاحت، یعنی نہ تو بات مبہم رکھی گئی اور نہ ہی ذمہ داری ادھوری چھوڑی گئی۔

أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ: پھر آپ علیہ السلام نے اپنی دعوت کا مرکزی نکتہ بیان فرمایا: اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا کسی کو معبود نہ بناؤ، یہی تمام انبیاء علیہم السلام کی مشترکہ دعوت رہی ہے، توحیدِ خالص، عبادت میں کسی کو شریک کرنا دراصل انسان کو اپنے خالق سے کاٹ دیتا ہے۔

إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ: حضرت نوح علیہ السلام نے مزید فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر تم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو ایک دردناک دن کا عذاب تمہیں آلے گا، یہ خوف ذاتی نہ تھا بلکہ قوم

کی خیر خواہی میں لپٹا ہوا درد تھا، نبی کا دل اپنی امت کے لیے تڑپتا ہے، وہ عذاب کی خبر اس لیے دیتا ہے تاکہ لوگ اس سے بچ جائیں۔

ان دو آیات میں رسالت کے تین بنیادی پہلو نمایاں ہوتے ہیں ①: اللہ کی طرف سے بھیجا جانا۔ ② توحید کی دعوت دینا۔ ③ عذابِ الٰہی سے خبر دار کرنا۔ یہی وہ اساس ہے جس پر ہر آسمانی پیغام قائم ہے، واضح دعوت، مخلصانہ خیر خواہی اور انجام سے آگاہی۔

قوم نوح نے پیروی کیوں نہ کی؟

سوال حضرت نوح علیہ السلام کی قوم ان کی پیروی کس بنیاد پر نہیں کرتی تھی؟ اس آیت کی روشنی میں وضاحت فرمائیے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ {۲۷} هود.

جواب ترجمہ: تو ان کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے کہ ہم تم کو اپنے ہی جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں۔ اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تمہارے پیرو وہی لوگ ہوئے ہیں جو ہم میں ادنیٰ درجے کے ہیں اور وہ بھی رائے ظاہر سے (نہ غور و تعمق سے) اور ہم تم میں اپنے اوپر کسی طرح کی فضیلت نہیں دیکھتے بلکہ تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے لوگ ان کے بارے میں یوں کہتے تھے کہ نوح فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ بھی نہیں ہے، وہ تو ایک انسان ہے، نوح تو بشر ہے، اس کے پیروکار نیچ طبقہ کے غریب لوگ ہیں، جو بغیر کسی غور و فکر کے اس کی پیروی کرنے لگ گئے ہیں، ہمارے اوپر نوح کو کسی طرح کی برتری اور فضیلت حاصل نہیں ہے، نہ اس کے پاس وافر مقدار میں رزق ہے اور نہ ہی اس کے پاس بہت زیادہ مال ہے، یہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کو جھوٹا سمجھتے تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا اندازِ بیان

سوال قوم نوح نے جب پیغمبر کا انکار کیا تو اس پر حضرت نوح علیہ السلام نے کیا رد عمل ظاہر کیا؟ قرآنی آیات کی روشنی میں وضاحت فرمائیے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ{۲۸}وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ{۲۹}وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ {۳۰}وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۖ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ {۳۱}هود.

جواب ترجمہ: انہوں نے کہا کہ اے قوم! دیکھو تو اگر میں اپنے پروردگار کی طرف دلیل (روشن) رکھتا ہوں اور اس نے مجھے اپنے ہاں سے رحمت بخشی ہو جس کی حقیقت تم سے پوشیدہ رکھی گئی ہے تو کیا ہم اس کے لئے تمہیں مجبور کر سکتے ہیں؟ اور تم ہو کہ اس سے ناخوش ہو رہے ہو۔ اور اے قوم! میں اس (نصیحت) کے بدلے تم سے مال وزر کا خواہاں نہیں ہوں۔ میرا صلہ تو خدا کے ذمے ہے اور جو لوگ ایمان لائے ہیں میں ان کو نکالنے والا بھی نہیں ہوں۔ وہ تو اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نادانی کر رہے ہو۔ اور برادران ملت اگر میں ان کو نکال دوں تو (عذاب) خدا سے (بچانے کے لئے) کون میری مدد کر سکتا ہے؟ بھلا تم غور کیوں نہیں کرتے؟ میں نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور نہ ان لوگوں کی نسبت جن کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو یہ کہتا ہوں کہ اللہ ان کو بھلائی (یعنی اعمال کی جزائے نیک) نہیں دے گا جو ان کے دلوں میں ہے اسے اللہ خوب جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو بے انصافوں میں ہوں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے واضح اور دوٹوک انداز میں اپنی قوم کو آگاہ کیا کہ میں اللہ کا نبی ہوں، مجھے رسالت و نبوت جیسی عظیم الشان چیز کے ساتھ نوازا گیا ہے، یہ اللہ کی رحمت اور مہربانی ہے، تم اگر اس چیز کو نہیں سمجھ سکتے، اس حقیقت کو نہیں پاسکتے تو ہم تم پر زبردستی مسلط نہیں کرسکتے، میں اپنی دعوت کے عوض وصلے میں تم سے کسی چیز کی ڈیمانڈ نہیں کرتا، کوئی اجرت نہیں مانگتا، میں تو اللہ کا نمائندہ ہوں وہی میرے معاملات کا ذمہ دار ہے، میں تمہاری وجہ سے اپنے قریب سے غریبوں کو دور نہیں کروں گا، کیونکہ یہ غریب اللہ پر ایمان لانے والے ہیں، تمہاری وجہ سے انہیں اٹھاؤں گا تو اللہ کی ناراضی سے مجھے کون بچائے گا، قرآن کریم میں حضرت نوح علیہ السلام کے ارشادات کو محفوظ کیا گیا

ضد اور تکبر کا جواب

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کریں، نیز یہ بتائیں یہ باتیں کہنے والا کون ہے؟

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ {۳۲} قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ {۳۳} وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ {۳۴} اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ {۳۵} ھود.

جواب ترجمہ: وہ کہنے لگے کہ اے نوح تم ہم سے جھگڑے اور تم نے ہم سے زیادہ جھگڑا کرلیا۔ لہٰذا ہمارے پاس وہ لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو اگر تم سچے ہو۔ نوح نے جواب دیا کہ اس چیز کو تمہارے پاس اللہ ہی لائے گا اگر وہ چاہے۔ اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور میری خیر خواہی تمہیں فائدہ نہیں دے سکتی اگر میں تمہاری خیر خواہی کا ارادہ کروں۔ اگر اللہ کا یہ ارادہ ہو کہ وہ تمہیں گمراہ کرے۔ وہ تمہارا رب ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ کیا وہ کہتے ہیں کو اس نے قرآن کو اپنے پاس سے بنالیا۔ آپ فرمادیجئے کہ اگر میں نے اس کو اپنے پاس سے بنالیا ہے تو مجھ ہی پر اس کا جرم ہے اور میں اس سے بری ہوں جو جرم تم کرتے ہو۔

قَالُوا يَانُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا: جب حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت مسلسل جاری رہی اور وہ صبر و حکمت کے ساتھ اپنی قوم کو سمجھاتے رہے تو سردارانِ قوم نے عناد اور تکبّر سے جواب دیا۔ کہنے لگے: اے نوح! تم ہم سے بہت جھگڑ چکے، بار بار بحث و مناظرہ کر چکے، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس سے ہمیں ڈراتے ہو، یہ مطالبہ دراصل دلیل کا نہیں بلکہ ہٹ دھرمی کا اظہار تھا، جب دل حق قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو تو انسان دلیل کے بجائے عذاب کا تقاضا کرنے لگتا ہے، گویا اپنے انجام کو خود دعوت دے رہا ہو۔

قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ: حضرت نوح علیہ السلام نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا: عذاب لانا میرے اختیار میں نہیں، وہ تو اللہ ہی لائے گا، اگر وہ چاہے اور جب اس کا فیصلہ آجائے گا تو تم اسے ٹال نہ سکو گے، نہ کہیں بھاگ سکو گے، یہ جواب توحیدِ ربوبیت کی واضح تعلیم ہے، نبی پیغام پہنچاتا ہے، فیصلے کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدْتُ أَنْ أَنْصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ: پھر فرمایا کہ اگر اللہ تمہارے مسلسل عناد اور سرکشی کے باعث تمہیں گمراہی میں چھوڑ دے، تو میری خیر خواہی اور نصیحت تمہارے لیے سود مند نہ ہو گی، وہی تمہارا رب ہے، تمہارے انجام کا مالک وہی ہے، اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے اور وہی تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔ یہاں ایک گہرا اصول بیان ہوا: جب انسان جان بوجھ کر حق سے منہ موڑتا ہے تو اس کی ہدایت کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، نصیحت اسی دل کو فائدہ دیتی ہے جو قبولِ حق کے لیے کھلا ہو۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي: پھر ان کے کفر کی اصل جڑ بیان کی گئی کہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ نوح علیہ السلام نے یہ دین خود گھڑ لیا ہے اور اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیا ہے، اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ اگر بالفرض میں نے اسے گھڑا ہوتا تو اس کا گناہ مجھ پر ہوتا اور تمہارے انکار کا وبال تم پر، میں تمہارے جرم کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اور تم میرے ذمہ دار نہیں ہو سکتے، یہ اعلانِ براءت تھا، دعوت اپنی جگہ، ذمہ داری اپنی جگہ، ہر شخص اپنے عمل کا خود جواب دہ ہے۔

ان آیات میں ضد اور خیر خواہی کا واضح تقابل سامنے آتا ہے، ایک طرف وہ قوم ہے جو دلیل کے بجائے عذاب کا تقاضا کرتی ہے، دوسری طرف اللہ کا نبی ہے جو حلم، توکل اور یقین کے ساتھ حق بیان کرتا ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ حق کا کام انجام تک پہنچانا انسان کے بس میں نہیں، اس کا کام صرف ابلاغ اور نصیحت ہے، ہدایت اور گمراہی کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور انجامِ کار ہر ایک کو اپنے عمل کے مطابق بھگتنا ہے۔

فیصلۂ الٰہی اور سفینہ نجات

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ {۳۶} وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ {۳۷} وَیَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَیْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ {۳۸} فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَیَحِلُّ عَلَیْهِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ {۳۹} حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ {۴۰} هود.

جواب ترجمہ: اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ بلاشبہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے علاوہ اور کوئی شخص ہرگز ایمان نہ لائے گا۔ سو یہ لوگ جو کام کرتے تھے آپ ان کی وجہ سے رنجیدہ نہ ہوں۔ اور ہمارے حکم سے کشتی بنا لیجئے اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے خطاب نہ کرنا۔ بلاشبہ یہ لوگ غرق کئے جانے والے ہیں۔ اور وہ کشتی بنا رہے تھے اور جب ان کی قوم کے سرداران پر گزرتے تھے تو ان سے ہنسی کرتے تھے۔ وہ جواب دیتے تھے کہ اگر تم ہم پر ہنس رہے ہو تو بلاشبہ ہم تم پر ہنسیں گے جیسا کہ تم ہنسی کر رہے ہو۔ سو عنقریب تم جان لو گے کہ کس کے پاس عذاب آتا ہے جو

اس کو رسوا کر دے گا اور اس پر دائمی عذاب نازل ہو گا۔ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور تنور سے پانی ابلنے لگا تو ہم نے کہا اس کشتی میں ایک ایک نر ایک ایک مادہ (یعنی ہر جنس سے دو عدد) سوار کر دو اور اپنے گھر والوں کو بھی سوار کر دو سوائے اس کے جس کے بارے میں پہلے سے فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور ان لوگوں کو بھی سوار کر لو جو ایمان لائے ہیں اور ان کے ساتھ کم آدمی ایمان لائے۔

وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ: جب طویل مدت تک حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو سمجھاتے رہے اور تکذیب و تمسخر کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا، تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی کہ اے نوح! تمہاری قوم میں سے اب وہی ایمان لائے گا جو پہلے لا چکا ہے، اس کے بعد کوئی نیا ایمان نصیب نہ ہو گا، لہٰذا جو کچھ وہ کرتے رہے، اس پر غم نہ کرو، یہ اعلان دراصل ایک مرحلۂ فیصلہ تھا، دعوت کا دروازہ کھلا رہا، دلیلیں پیش ہوئیں، مہلتیں ملیں، مگر جب دلوں نے اصرارِ کفر کو اپنا مقدر بنالیا تو ہدایت کی توفیق اٹھالی گئی، نبی کے لیے یہ لمحہ صبر آزما ضرور تھا، مگر اللہ نے تسلی دی کہ اب ان کے اعمال پر رنجیدہ نہ ہو۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا: اللہ کی طرف سے نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کرو اور ان ظالموں کے بارے میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا یہ لازماً غرق کیے جائیں گے۔ یہ الفاظ اپنے اندر کئی معانی رکھتے ہیں، کشتی کا بننا محض ایک فنی عمل نہ تھا، بلکہ اللہ کی حفاظت اور رہنمائی کے تحت ایک مقدر کی تکمیل تھی، ہماری آنکھوں کے سامنے کا مفہوم یہی ہے کہ یہ کام براہِ راست حفاظتِ الٰہی میں ہو رہا تھا اور یہ بھی کہ کشتی کی تیاری بذریعہ وحی سکھائی گئی، گویا ہر تختہ، ہر کیل ایک حکمِ الٰہی کے تحت جڑ رہی تھی۔

وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ: یہ اللہ کی طرف نوح علیہ السلام کو تنبیہ کی گئی کہ جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، ان کے لیے مہلت کی درخواست نہ کرنا، فیصلہ صادر ہو چکا تھا، طوفان ان کے اصرارِ کفر کا لازمی انجام تھا۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ: حضرت نوح علیہ السلام نے بلا تردد حکم کی تعمیل شروع کی اور کشتی بنانے کا آغاز کر دیا، وہ زمین جہاں نہ دریا تھا نہ سمندر، وہاں ایک عظیم کشتی کا بننا قوم کے لیے مذاق کا سامان بن گیا، جب بھی سردارانِ قوم وہاں سے گزرتے، طنز کرتے، ہنستے اور کہتے کہ یہ کیا کر رہے ہو؟

قَالَ إِنْ تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ: مگر نوح علیہ السلام نے وقار کے ساتھ فرمایا اگر آج تم ہم پر ہنستے ہو تو عنقریب ہم تم پر ہنسیں گے، اس وقت جب تمہیں اپنے انجام کا علم ہو گا، یہ جواب انتقام کا اعلان نہ تھا بلکہ حقیقت کا بیان تھا، آج ان کی نگاہ میں کشتی مضحکہ تھی، کل وہی کشتی نجات کا وسیلہ بنے گی اور ان کا استہزا ان کے اپنے لیے حسرت کا سبب ہو گا۔

حَتّٰٓى إِذَا جَآءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ : حسب فرمان ربی آسمان سے موسلا دھار لگاتار بارش برسنے لگی اور زمین سے بھی پانی ابلنے لگا اور ساری زمین پانی سے بھر گئی اور جہاں تک منظور رب تھا پانی بھر گیا اور حضرت نوح کو رب العالمین نے اپنی نگاہوں کے سامنے چلنے والی کشتی پر سوار کر دیا۔ اور کافروں کو ان کے کیفر کردار کو پہنچا دیا۔ تنور کے ابلنے سے بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ مطلب ہے کہ روئے زمین سے چشمے پھوٹ پڑے یہاں تک کہ آگ کی جگہ تنور میں سے بھی پانی ابل پڑا۔ یہی قول جمہور سلف و خلف ہے کا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تنور صبح کا نکلنا اور فجر کا روشن ہونا ہے یعنی صبح کی روشنی اور فجر کی چمک لیکن زیادہ غالب پہلا قول ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ اور شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ تنور کوفے میں تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ہند میں ایک نہر ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں جزیرہ میں ایک نہر ہے جسے عین الوردہ کہتے ہیں۔ لیکن یہ سب اقوال غریب ہیں۔ بعض ارباب تفسیر کہتے ہیں کہ یہ تنور حضرت نوح علیہ السلام کا تھا۔ بعض کہتے ہیں حضرت آدم علیہ السلام کا تھا۔ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تنور پتھر کا بنا ہوا تھا، حضرت حواء استعمال کرتی تھیں، پھر حضرت نوح علیہ السلام کا ہو گیا۔ امام شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ

یہ تنور کوفہ کے ایک کونے میں تھ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ تنور کوفہ کی مسجد میں تھا، اس مسجد میں ستر انبیاء کرام علیہم السلام نے نماز ادا کی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تنور شام میں اس مقام پر تھا جسے عین وردان کہا جاتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ ہند میں اس تنور نے جوش مارا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی اس تنور میں روٹیاں پکاتی تھی، اسی نے اس تنور سے پانی نکلنے کی اطلاع دی۔

الغرض ان علامتوں کے ظاہر ہوتے ہی نوح علیہ السلام کو اللہ کا حکم ہوا کہ اپنے ساتھ کشتی میں جاندار مخلوق میں سے ہر قسم کا ایک ایک جوڑا نر مادہ سوار کر لو۔ کہا گیا ہے کہ غیر جاندار کے لیے بھی یہی حکم تھا۔ جیسا نباتات۔ کہا گیا ہے کہ پرندوں میں سب سے پہلے درہ کشتی میں آیا اور سب سے آخر میں گدھا سوار ہونے لگا۔ ابلیس اس کی دم میں لٹک گیا جب اس کے دو اگلے پاؤں کشتی میں آ گئے اس کا اپنا دھڑ اٹھانا چاہا تو نہ اٹھا سکا کیونکہ دم پر اس ملعون کا بوجھ تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام جلدی کر رہے تھے یہ بہتیرا چاہتا تھا مگر پچھلے پاؤں چڑھ نہیں سکتے تھے۔ آخر آپ نے فرمایا آج تیرے ساتھ ابلیس بھی ہو آیا تب وہ چڑھ گیا اور ابلیس بھی اس کے ساتھ ہی آیا۔ بعض سلف کہتے ہیں کہ شیر کو اپنے ساتھ لے جانا مشکل ہو گیا، آخر اسے بخار چڑھ آیا تب اسے سوار کر لیا۔

ابن ابی حاتم کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب تمام مویشی اپنی کشتی میں سوار کر لیے تو لوگوں نے کہا شیر کی موجودگی میں یہ مویشی کیسے آرام سے رہ سکیں گے؟ پس اللہ تعالیٰ نے اسے بخار ڈال دیا۔ اس سے پہلے زمین پر یہ بیماری نہ تھی۔

پھر لوگوں نے چوہے کی شکایت کی یہ ہمارا کھانا اور دیگر چیزیں خراب کر رہے ہیں تو اللہ کے حکم سے شیر کی چھینک میں سے ایک بلی نکلی جس سے چوہے دبک کر کونے کھدرے میں بیٹھ رہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنے گھر والوں کو بھی اپنے ساتھ کشتی میں بٹھالو مگر ان میں سے جو ایمان نہیں لائے انہیں ساتھ نہ لینا۔ آپ کا لڑکا یام بھی انہیں کافروں میں تھا وہ الگ ہو گیا۔ یا آپ کی بیوی کہ وہ بھی اللہ کے رسول کی منکر تھی اور تیری قوم کے تمام مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ بٹھالے

لیکن ان مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔

ساڑھے نو سو سال کے قیام کی طویل مدت میں آپ پر بہت ہی کم لوگ ایمان لائے تھے۔ اب عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کل اسی (۸۰) آدمی تھے جن میں عورتیں بھی تھیں۔ کعب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں سب بہتر (۷۲) اشخاص تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ دس افراد تھے۔ ایک قول ہے حضرت نوح تھے اور ان کے تین لڑکے تھے سام، حام، یافث اور چار عورتیں تھیں۔ تین تو ان تینوں کی بیویاں اور چوتھی یام کی بیوی اور کہا گیا ہے کہ خود نوح علیہ السلام کی بیوی، لیکن اس میں نظر ہے ظاہر یہ ہے نوح علیہ السلام کی بیوی ہلاک ہونے والوں میں ہلاک ہوئی۔ اس لیے کہ وہ اپنی قوم کے دین پر ہی تھی تو جس طرح لوط علیہ السلام کی بیوی قوم کے ساتھ ہلاک ہوئی اسی طرح یہ بھی باقی لوگوں کے ساتھ ہلاک ہوئی۔ (ابن کثیر)

طوفان، فراق اور سلام الٰہی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۴۱} وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَنَادٰى نُوْحُ ِۨ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ {۴۲} قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ {۴۳} وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ {۴۴} وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ {۴۵} قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۫ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ {۴۶} قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ {۴۷} قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ

ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ {۴۸}ھود

جواب ترجمہ: اور نوح نے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ۔ اللہ کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا۔ بلاشبہ میرا رب بالیقین بخشنے والا ہے مہربان ہے۔ اور وہ کشتی ان کو لے کر پہاڑوں جیسی موجوں میں چلنے لگی اور نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور وہ ان سے ہٹا ہوا تھا کہ اے میرے چھوٹے سے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ مت ہو۔

وہ کہنے لگا کہ میں عنقریب کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی سے بچالے گا۔ نوح نے جواب دیا کہ آج اللہ کے حکم سے کوئی بچانے والا نہیں مگر وہی جس پر وہی رحم فرمائے اور ان دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی سو وہ غرق کئے جانے والوں میں سے ہو گیا۔ اور حکم ہوا کہ اے زمین اپنے پانی کو نگل لے اور اے آسمان تھم جا۔ اور پانی کم ہو گیا اور فیصلہ کر دیا گیا اور کشتی جودی پر ٹھہر گئی۔ اور کہہ دیا گیا کہ کافروں کے لیے دوری ہے۔

اور (نوح) نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا اے میرے رب بیشک میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو احکم الحاکمین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نوح بلاشبہ وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ بیشک اس کا عمل درست نہیں سو تو مجھ سے اس چیز کا سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں شامل نہ ہونا۔

نوح نے عرض کیا کہ اے میرے رب بیشک میں اس بات کی آپ سے پناہ چاہتا ہوں کہ میں آپ سے وہ سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں اور اگر آپ نے میری بخشش نہ فرمائی تو میں خسارہ والوں میں سے ہو جاؤں گا۔

حکم ہوا کہ اے نوح تم اتر جاؤ سلامتی کے ساتھ جو ہماری طرف سے ہے اور برکتوں کے ساتھ جو تم پر اور ان جماعتوں پر ہیں جو تمہارے ساتھ ہیں اور بہت سی جماعتیں ایسی ہیں جنہیں ہم نفع پہنچائیں گے پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا: جب کشتی تیار ہو چکی اور فیصلۂ الٰہی کا وقت آ پہنچا تو حضرت نوح علیہ السلام نے اہلِ ایمان سے فرمایا: ”اس کشتی میں سوار ہو جاؤ، اس کا چلنا بھی اللہ کے نام سے ہے اور اس کا ٹھہرنا بھی اسی کے نام سے، بے شک میرا رب بڑا بخشنے والا، نہایت مہربان ہے“۔

وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ: یہ الفاظ محض آغازِ سفر کا اعلان نہ تھے، بلکہ توکل کی کامل تصویر تھے، کشتی لکڑی کی تھی، موجیں پہاڑوں جیسی تھیں، مگر سہارا اللہ کے نام کا تھا، اسی کی رحمت نے ایمان والوں کو ہلاکت سے بچانے کا سامان کیا، کشتی عظیم موجوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، لہریں گویا پہاڑوں کی مانند اٹھتی تھیں، اسی عالم میں باپ کے دل میں شفقت موجزن ہوئی۔

وَنَادٰى نُوحُ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَعَنَا: حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے اس بیٹے کو، جو ایمان سے محروم تھا اور الگ کھڑا تھا، پکارا: ”اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جا، کافروں کے ساتھ نہ رہ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تو بھی غرق ہو جائے“۔ یہ دعوت صرف ایک نبی کی نہیں، ایک باپ کے دل کی صدا تھی۔ قَالَ سَاٰوِيٓ إِلٰى جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ: مگر بیٹے نے جواب دیا: ”میں کسی بلند پہاڑ کی پناہ لے لوں گا، وہ مجھے پانی سے بچا لے گا“۔ یہ جواب انسان کے اس گمان کی علامت ہے جو ظاہری اسباب پر بھروسا کرتا ہے اور تقدیرِ الٰہی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ: حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: ”آج اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں، سوائے اس کے جس پر وہ خود رحم فرمائے“۔

وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ: باپ اور بیٹے کے درمیان یہ گفتگو جاری تھی کہ اتنے میں ایک موج اٹھی اور باپ بیٹے کے درمیان حائل ہو گئی، وہ بیٹا اپنے کفر کے سبب ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا، یوں ثابت ہو گیا کہ نسبتِ خونی نجات کی ضمانت نہیں، اصل نسبت ایمان کی ہے۔

وَقِيلَ يٰٓأَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيٰسَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ: طوفان کا خاتمہ اور عدلِ الٰہی کا ظہور ہوا، جب فیصلہ پورا ہو چکا تو حکم ہوا: ”اے زمین! اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان! رک

جا"۔ زمین نے پانی جذب کر لیا، آسمان نے برسنا چھوڑ دیا اور پانی گھٹتا گیا یہاں تک کہ کشتی "جودی" پہاڑ پر آ ٹھہری، کافروں کے لیے اعلان ہوا: "ہلاکت ہو ان لوگوں پر جنہوں نے حد سے تجاوز کیا"۔ یہ منظر قدرتِ کاملہ کی جھلک تھا، جس نے موجوں کو اٹھایا، اسی نے انہیں ساکن کیا، جس نے زمین کو پھاڑا، اسی نے اسے سمیٹ لیا۔

وَنَادَى نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ: طوفان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہِ ربوبیت میں عرض کیا: "اے میرے رب! میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں میں تھا، اور تیرا وعدہ سچا ہے، تو سب سے بڑھ کر انصاف فرمانے والا ہے"۔ یہ سوال ایک باپ کے درد سے نکلا تھا، مگر جواب آیا: **قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ**، "اے نوح! وہ تمہارے اہل میں سے نہیں تھا جن کی نجات کا وعدہ کیا گیا تھا، کیونکہ وہ کافر تھا، اس کے اعمال اچھے نہیں تھے، یہ سوال تمہارے مقام کے شایانِ شان نہیں، ایسی بات نہ پوچھو جس کا تمہیں علم نہیں، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ جاہلوں میں سے نہ ہو جاؤ"۔ یہاں ایک عظیم اصول بیان ہوا، اللہ کے وعدے حق ہیں، مگر ان کا مدار ایمان پر ہے، نہ کہ نسب پر۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ: حضرت نوح علیہ السلام فوراً متنبہ ہوئے اور عرض کیا: "اے میرے رب! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ ایسی بات عرض کروں جس کا مجھے علم نہیں، اگر تو مجھے معاف نہ کرے اور مجھ پر رحم نہ فرمائے تو میں خسارہ اٹھانے والوں میں ہو جاؤں گا"۔ یہ انبیاء کی شان ہے، تنبیہ پر فوراً رجوع اور عاجزی کے ساتھ استغفار، اس سے ایک باریک مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ علم غیب خاصہ خداوندی ہے، انبیاء کرام علیہم السلام غیب دان نہیں ہوتے، وہ اتنا ہی جانتے ہیں جتنا اللہ انہیں بتاتا ہے۔

قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَى أُمَمٍ مِمَّنْ مَعَكَ: پھر حکم ہوا: "اے نوح! زمین پر اتر جاؤ، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ، تم پر بھی اور ان مؤمن

نسلوں پر بھی جو تمہارے ساتھ ہیں"۔ یہ سلام محض الفاظ نہ تھا بلکہ ایک نئے عہد کا آغاز تھا، زمین پھر آباد ہونی تھی، نسلیں پھیلنی تھیں، کچھ ایمان پر قائم رہیں گی اور کچھ کو دنیا کی مہلت ملے گی، مگر انجام کار اگر وہ کفر اختیار کریں گے تو دردناک عذاب ان کا منتظر ہو گا۔

وحیٔ غیب اور پیغامِ صبر و تحمل

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ، تفسیر اور ربط بیان کیجیے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ {۴۹} ھود

جواب ترجمہ: یہ قصہ غیب کی خبروں سے ہے ہم آپ کی طرف وحی بھیجتے ہیں۔ اس سے پہلے آپ ان کو نہیں جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم مانتی تھی۔ سو آپ صبر کیجئے۔ بلاشبہ انجام کار متقیوں ہی کیلئے ہے۔

ربط و تعلق ما قبل: اپنے ما قبل سے یوں مربوط ہے کہ اس سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی پوری داستان، دعوت، قوم کی سرکشی، طوفان کا فیصلہ اور اہلِ ایمان کی نجات، تفصیل سے بیان کی گئی اور پھر اس قصے کے اختتام پر اعلان ہوا کہ یہ سب "انباءِ غیب" (غیب کی خبریں) ہیں جو وحی کے ذریعے رسول اللہ ﷺ پر منکشف کیے گئے، نہ آپ ﷺ انہیں پہلے جانتے تھے اور نہ آپ ﷺ کی قوم، یوں یہ آیت ایک طرف سابقہ بیان کی صداقت پر دلیل قائم کرتی ہے اور دوسری طرف رسولِ اکرم ﷺ کے لیے تسلی اور ہدایت کا پیغام بن کر سامنے آتی ہے کہ جس طرح نوح علیہ السلام نے طویل اذیتوں پر صبر کیا اور بالآخر کامیابی پائی، اسی طرح آپ ﷺ بھی ثابت قدم رہیں، کیونکہ انجامِ کار ہمیشہ اہلِ تقویٰ ہی کے لیے ہوتا ہے، یہ آیت گزشتہ قصے کا بامعنی خلاصہ بھی ہے، اس کی حقانیت کی شہادت بھی اور آئندہ مراحل کے لیے صبر و استقامت کی روشن ہدایت بھی۔

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ: اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ نہایت تفصیل کے ساتھ بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: "یہ سب غیب کی خبریں ہیں، جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے

ہیں، اس سے پہلے نہ آپ انہیں جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، پس صبر کیجیے، بے شک انجام کار پرہیز گاروں ہی کے لیے ہے"۔

یہاں تِلْكَ کا اشارہ ان تمام آیات اور تفصیلات کی طرف ہے جو ابھی بیان ہوئیں، گویا فرمایا جارہا ہے کہ یہ قصہ محض ایک تاریخی روایت نہیں بلکہ ان مخفی حقائق میں سے ہے جو عام انسانوں کی دسترس سے باہر تھے، انہیں ہم نے آپ پر وحی کے ذریعے منکشف کیا ہے۔

یہ بات بطورِ دلیل بھی ہے اور بطورِ اعزاز بھی، دلیل اس لیے کہ اگر یہ واقعات پہلے سے معروف نہ تھے اور نہ آپ ﷺ نے کسی استاذ سے سیکھے، تو ان کا اس تفصیل کے ساتھ بیان ہونا خود اس بات کی شہادت ہے کہ یہ علم وحیِ الٰہی سے حاصل ہوا ہے اور اعزاز اس لیے کہ اللہ نے اپنے محبوب رسول ﷺ کو غیب کی خبریں عطا فرمائیں، اس پر اہل علم وارباب فضل کا اتفاق ہے کہ علم غیب خاصہ خداوندی ہے، وہ جسے چاہے مطلع فرمائے، از خود سے کوئی غیب نہیں جان سکتا۔

مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا: ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ طوفانِ نوح کا واقعہ تو اہلِ علم میں مشہور تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ اجمالی طور پر کچھ واقعات کا چرچا ضرور تھا، مگر قرآن نے جو دقیق اور جامع تفصیلات بیان کیں، وہ نہ آپ ﷺ کو معلوم تھیں اور نہ آپ کی قوم کو، فرق ہے ایک مبہم روایت اور ایک مفصل، باحکمت اور مربوط بیان میں۔

فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ: پھر ارشاد ہوا، پس صبر کیجیے، بے شک انجام متقین کے لیے ہے۔ یہ خطاب سراسر تسلی اور رہنمائی ہے، گویا فرمایا جارہا ہے کہ جس طرح نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی طویل اذیتوں کو برداشت کیا اور آخر کار فتح ونصرت ان کا مقدر بنی، اسی طرح آپ بھی کفار کی ایذا رسانیوں پر صبر کیجیے، صبر کی راہ دشوار ضرور ہے، مگر اس کا انجام کامیابی، ظفر اور مسرت وشادمانی ہے۔

یہاں ایک لطیف نکتہ بھی ہے، اگر یہی قصہ کسی اور سورت میں بھی آیا ہو تو یہ تکرار بے فائدہ نہیں، ہر مقام پر اس کے بیان کا مقصد جدا ہے، ایک جگہ کفار کے عذاب کی تاخیر کے استہزا کا جواب دینا مقصود

تھا، تو نوح علیہ السلام کے واقعے سے واضح کیا گیا کہ عذاب تاخیر سے آتا ہے مگر آتا ضرور ہے اور یہاں، جب کفار کی ایذارسانی شدت اختیار کر چکی تھی، تو اسی واقعے کو صبر وثبات کی مثال بنا کر پیش کیا گیا، تاکہ رسول اللہ ﷺ اور اہلِ ایمان کے دل مضبوط ہوں۔ پس یہ قصہ صرف ماضی کی داستان نہیں، بلکہ ہر دور کے داعیانِ حق کے لیے پیغام ہے: اذیت عارضی ہے، صبر دائمی سرمایہ ہے، اور انجام کار تقویٰ والوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔

دعوت ھود علیہ السلام اور انجام قوم عاد

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ {۵۰} يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ {۵۱} وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ {۵۲} قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ {۵۳} اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْۤا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ {۵۴} مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ {۵۵} اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ {۵۶} فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ {۵۷} وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ {۵۸} وَتِلْكَ عَادٌ ۖؗ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ {۵۹} وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ {۶۰} هود

جواب ترجمہ: اور قوم عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا انہوں نے کہا کہ اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں تم صرف جھوٹ بولتے ہو۔ اے میری قوم میں تم سے اس پر کوئی مزدوری طلب نہیں کرتا۔ میرا اجر صرف اللہ پر ہے جس نے مجھے پیدا فرمایا کیا تم سمجھ نہیں رکھتے۔

اور اے میری قوم تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو اور اس کے حضور میں توبہ کرو وہ تم پر خوب بارشیں بھیج دے گا اور تمہیں جو قوت حاصل ہے اس سے زیادہ قوت عطا فرمائے گا اور تم مجرم بن کر روگردانی کرنے والے نہ بنو۔ کہنے لگے کہ اے ہود! تم ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں لائے اور ہم تمہارے کہنے کی وجہ سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں۔

ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تمہیں کوئی خرابی پہنچادی ہے۔ ہود نے کہا کہ بیشک میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم گواہ ہو جاؤ کہ بیشک میں ان چیزوں سے بری ہوں جنہیں تم اللہ کے علاوہ شریک قرار دیتے ہو۔ سو تم سب مل کر میرے بارے میں تدبیریں کرلو پھر مجھے مہلت نہ دو بیشک میں نے اللہ پر بھروسہ کیا جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔

زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں ہے جس کی پیشانی اس کی گرفت میں نہ ہو۔ بیشک میرا رب صراط مستقیم پر ہے۔ سو اگر تم روگردانی کرو تو میں سب کچھ پہنچا چکا ہوں جو پیغام دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے اور میرا رب تمہارے سوا کسی دوسری قوم کو تمہارے قائم مقام کردے گا۔ اور تم اسے کچھ بھی ضرر نہ پہنچا سکو گے۔

بیشک میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ اور جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود کو اور ان لوگوں کو نجات دے دی جو ایمان لا کر ان کے ساتھ تھے اور ہم نے انہیں سخت عذاب سے نجات دے دی۔ اور یہ تھے قوم عاد کے لوگ جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور ہر سرکش ضدی کی بات کا اتباع کیا۔ اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگادی گئی اور قیامت

کے دن بھی۔ خبر دار بلاشبہ قوم عاد نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا۔ خبر دار عاد کے لیے دوری ہے جو ہود کی قوم ہے۔

جرائم قوم عاد: قومِ عاد، جن کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے، شرک و بت پرستی میں مبتلا تھی اور اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت سے انکاری تھی، انہوں نے اپنے رسول کو جھٹلایا، ان کی دعوت کو بے دلیل قرار دیا اور ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا، بلکہ گستاخی کرتے ہوئے یہ تہمت بھی لگا دی کہ ان کے معبودوں نے ہود علیہ السلام کو دیوانہ بنا دیا ہے، وہ اپنی جسمانی قوت اور مادی شان و شوکت پر ناحق تکبر کرتے، زمین میں سرکشی اختیار کیے رہتے اور حق کے بجائے ہر متکبر و طاغی سردار کی اندھی پیروی کرتے تھے، واضح دلائل اور خیر خواہانہ نصیحت کے باوجود انہوں نے توبہ و استغفار سے اعراض کیا، یہاں تک کہ کفر، تکذیب اور استکبار ان کا نمایاں شعار بن گیا۔

تفسیر: سورۃ ھود کی آیت ۵۰ سے لے کر آیت ۶۰ تک میں قومِ عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کی بعثت اور ان کی دعوت کا نقشہ کھینچا گیا ہے، انہوں نے اپنی قوم کو خالص توحید کی طرف بلایا، شرک سے روکا اور صاف الفاظ میں کہا کہ وہ اس دعوت پر کوئی اجر نہیں چاہتے، ان کا صلہ صرف اللہ کے ذمہ ہے، انہوں نے قوم کو استغفار اور توبہ کی تلقین کی اور وعدہ سنایا کہ اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ ان پر موسلا دھار بارش نازل کرے گا، ان کی قوت و شوکت میں اضافہ کرے گا اور انہیں مزید عزت عطا کرے گا، مگر قوم نے ہٹ دھرمی سے کام لیا، دلیل کا مطالبہ کیا، اپنے معبودوں کو چھوڑنے سے انکار کیا، بلکہ یہ تہمت لگا دی کہ شاید ان کے معبودوں نے ہود علیہ السلام کو دیوانہ بنا دیا ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام نے نہایت جرأت اور یقین کے ساتھ اعلان کیا کہ وہ ان کے معبودانِ باطل سے بری ہیں اور اگر وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے معبود کچھ طاقت رکھتے ہیں تو سب مل کر ان کے خلاف تدبیر کر لیں، انہیں کوئی مہلت درکار نہیں، انہوں نے اپنا کامل توکل اللہ پر ظاہر کیا جو ہر جاندار کا مالک و مختار ہے اور عدل و حق پر قائم ہے، پھر واضح کر دیا کہ اگر قوم اعراض کرے تو ان کی ذمہ داری صرف پیغام پہنچانا

ہے، حجت پوری ہو چکی ہے، اب انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ چاہے تو انہیں ہلاک کر کے دوسری قوم لے آئے، آخر کار جب عذاب کا حکم آیا تو اللہ نے اپنی رحمت سے ہود علیہ السلام اور اہلِ ایمان کو بچا لیا اور قومِ عاد کو ان کے کفر، تکبر اور سرکشی کے سبب سخت عذاب اور دنیا و آخرت کی رسوائی سے دوچار کیا، یوں تکبر کا انجام ذلت اور انکار کا حاصل محرومی قرار پایا۔

دعوت صالح علیہ السلام اور انکار ثمود

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ {٦١} قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ {٦٢} قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ {٦٣} هود

جواب ترجمہ: اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ انہوں نے کہا کہ اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اس نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا اور تمہیں اس میں آباد فرمایا سو تم اس سے مغفرت طلب کرو پھر اس کے حضور توبہ کرو۔ بیشک میرا رب قریب ہے قبول کرنے والا ہے۔ وہ کہنے لگے اے صالح اس سے پہلے تو ہمیں تم سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں کیا تم ہمیں ان چیزوں کی عبادت کرنے سے روکتے ہو جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے۔ اور بلاشبہ ہم اس بات کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں جس کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو یہ شک تردد میں ڈالنے والا ہے۔ صالح نے کہا اے میری قوم تم بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت عطا فرمائی ہو۔ پھر وہ کون ہے جو مجھے

اللہ سے بچالے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ سو تم میرے لیے نقصان ہی کو بڑھا رہے ہو۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ: اللہ تعالیٰ نے قومِ ثمود کی طرف ان ہی کے برادر حضرت صالح علیہ السلام کو بھیجا، انہوں نے نہایت دل سوزی کے ساتھ اپنی قوم کو پکارا: اے میری قوم! اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبودِ برحق نہیں، وہی ہے جس نے تمہیں زمین کی مٹی سے پیدا کیا، تمہیں اسی زمین کا آباد کار بنایا اور اس میں بسنے کی صلاحیت عطا کی، پس اسی سے مغفرت طلب کرو اور اسی کی طرف رجوع کرو، طاعت کو اختیار کرو اور معصیت سے بچو، بے شک میرا رب اپنے مخلص بندوں کے قریب ہے اور پکارنے والوں کی دعا قبول فرمانے والا ہے۔

قَالُوا يَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَٰذَا: قوم نے جواب میں تعجب اور انکار کا لہجہ اختیار کیا، کہنے لگے: اے صالح! اس دعوت سے پہلے تم ہمارے نزدیک بڑی امیدوں کا مرکز تھے، ہم تمہیں دانش مند اور خیر خواہ سمجھتے تھے، کیا اب تم ہمیں ان معبودوں کی عبادت سے روکتے ہو جن پر ہمارے باپ دادا قائم رہے؟ ہمیں اس دین کے بارے میں سخت شبہ ہے جس کی طرف تم بلاتے ہو، یہاں تک کہ ہم تمہارے دعوے کو مشکوک سمجھنے لگے ہیں۔

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ حضرت صالح علیہ السلام نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا: اے میری قوم! ذرا سوچو، اگر میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھے اپنی رحمت یعنی نبوت سے سرفراز کیا ہو، تو اگر میں اس کے حکم کی نافرمانی کروں اور تم تک اس کا پیغام نہ پہنچاؤں تو کون ہے جو مجھے اس کے عذاب سے بچا سکے؟ تمہاری مخالفت مجھے اللہ کی رضا سے دور کرنے کے سوا اور کیا دے سکتی ہے؟ یوں حق واضح کر دیا گیا کہ دعوتِ نبوت کسی ذاتی مفاد کا نام نہیں، بلکہ ربّ کے حکم کی ادائیگی اور اس کے حضور جواب دہی کا معاملہ ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ

سوال اس آیت کا ترجمہ کیجیے اور حضرت صالح علیہ السلام کے معجزہ کے بارے بتایئے

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ {٦٤} هود.

جواب ترجمہ: اور اے میری قوم یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے سو اسے چھوڑ دو اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے اور اسے برائی سے چھونا بھی نہیں (ورنہ) پھر تمہیں عذاب بہت جلد آپکڑے گا۔

مدعیان نبوت بت پرستوں کے سامنے پہلے اپنی دعوت پیش کرتے ہیں، انہیں اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں کہ وہ اللہ کی عبادت اور بندگی بجالائیں، پھر وہ ان کے سامنے نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے نبی ہیں، لوگ ان سے اس دعوے کے بعد دلیل کے طور پر معجزہ طلب کرتے ہیں، حضرت صالح علیہ السلام کا معاملہ بھی کچھ یونہی تھا۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم اپنی عید کے لیے نکلی تو انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام سے کوئی نشانی طلب کی اور یوں کہا کہ وہ ایک خاص پتھر سے انہیں اونٹنی نکال کر دکھائیں، چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے مطالبہ کے عین مطابق اونٹنی نکالی۔ (تفسیر کبیر امام رازی)

اللہ تعالیٰ نے پتھر سے جو اونٹنی نکالی یہ صالح علیہ السلام کا معجزہ تھا، اس کی ① ایک وجہ تو یہ ہے کہ اللہ نے اسے چٹان سے نکالا تھا۔ ② دوسرا یہ کہ اسے پہاڑ کے درمیان میں شگاف ڈال کر نکالا تھا۔ ③ تیسرا یہ کہ یہ اونٹنی بغیر کسی اونٹ کے حاملہ ہوئی تھی۔ ④ چوتھا یہ کہ اسے ایک ہی لمحہ میں پیدا کیا تھا، ولادت والی ترتیب نہیں تھی، ⑤ پانچواں یہ کہ یہ ایک دن پانی پیتی تھی اور ایک دن صالح علیہ السلام کی قوم کے جانور پیتے تھے۔ ⑥ چھٹا یہ کہ یہ اونٹنی بہت زیادہ دودھ دیتی تھی جس سے بہت سے لوگ سیراب ہوتے تھے۔

قوم صالح علیہ السلام کو تین دن کی مہلت

سوال ان لوگوں نے اس اونٹنی کی ٹانگیں کاٹ دی تھیں، جس پر اللہ نے ان پر عذاب نازل کیا تھا، یہ بتایئے کہ اس قوم کو کتنے دن کی مہلت دی گئی تھی؟ اس آیت کی روشنی میں بتایئے۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ {٦٥}هود.

جواب ترجمہ: پھر انہوں نے اس کے پاؤں کاٹ ڈالے تب صالح نے کہا تین دن تک اپنے گھروں میں فائدہ اٹھالو یہ وعدہ ہے جو جھوٹا نہ ہو گا۔

جب لوگوں نے حکم خداوندی کی خلاف ورزی کر کے اس معجزہ والی اونٹنی کو مار ڈالا تو جیسا پہلے ان کو متنبہ کر دیا گیا تھا کہ ایسا کرو گے تو اللہ کا عذاب تم پر آئے گا، اب وہ عذاب اس طرح آیا کہ ان کو تین روز کی مہلت دی گئی اور بتلا دیا گیا کہ چوتھے روز تم سب ہلاک کئے جاؤ گے۔

قوم صالح علیہ السلام کا عبرت ناک انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ {٦٦}وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ {٦٧} كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ {٦٨}هود.

جواب ترجمہ: پھر جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ اہل ایمان تھے اپنی رحمت سے نجات دے دی اور اس دن کی رسوائی سے نجات دی۔ بیشک تیرا رب قوت والا ہے اور زبردست ہے۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا انہیں چیخ نے پکڑ لیا سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے ہوئے رہ گئے جیسا کہ ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ خبردار قوم ثمود نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا خبردار دوری ہے ثمود کیلئے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ: پھر جب ہمارے عذاب کا فیصلہ صادر ہوا اور

قومِ ثمود کی ہلاکت کا وقت آن پہنچا تو ہم نے اپنی خاص رحمت سے حضرت صالح علیہ السلام اور ان لوگوں کو جو ان پر ایمان لائے تھے، محفوظ کر لیا اور انہیں اس دن کی رسوائی اور ذلت سے بچا لیا، وہ دن کفار کے لیے ذلت و خواری کا دن تھا، مگر اہلِ ایمان کے لیے رحمت اور حفاظت کا، بے شک آپ کا رب ہی کامل قوت والا اور زبردست غلبہ رکھنے والا ہے، کوئی اس کے فیصلے کو ٹال نہیں سکتا اور نہ اس کی پکڑ سے بچ سکتا ہے، اسی قدرت و عزت کے سبب اس نے جھٹلانے والی قوموں کو نیست و نابود کر دیا۔

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ : حضرت صالح علیہ السلام کی قوم پر ایک زلزلہ آیا تھا جس کے باعث وہ صبح ہوتے ہی اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے پائے گئے تھے۔ قوم صالح نے ایک تو اپنے منہ سے معجزہ مانگا، ان کی طلب کے مطابق بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کو دندان شکن جواب دینے کے لیے اللہ نے چٹان سے اونٹنی نکالی، اس اونٹنی کی انہوں نے ٹانگیں کاٹ ڈالیں، اگرچہ یہ کارروائی کرنے والے چند لوگ تھے، مگر رضامندی بہتوں کی شامل تھی، جب اس ظلم عظم پر صالح علیہ السلام نے انہیں دھمکایا تو سینہ تان کر انہیں کہنے لگے کہ تو جس چیز کا ہمیں ڈراوا دکھاتا ہے وہ لے آ، اس پر اللہ نے ان پر عذاب بھیجا جس سے وہ صبح اپنے گھروں میں اوندھے پائے گئے۔

قوم صالح کو پہاڑوں کی طرف سے ایک کالا بادل ان کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا، یہ لوگ بڑے خوش ہوئے کہ اب بارش برسنے والی ہے، مگر یہ بارش برسانے والا بادل نہ تھا اللہ کا عذاب ڈھانے والا بادل تھا، جس میں سیاہ غلیظ گندھک کے بخارات ملا ہوا دھواں تھا، ساتھ ہی کسی پہاڑ سے کوئی لاوا پھٹا جس سے شدید زلزلہ آگیا اور اس سے ہولناک چیخوں کی آواز بھی آتی رہی، جس سے دل دھل جاتے اور کان پھٹے جاتے تھے، غلیظ دھواں جب ان کے جسموں کے اندر داخل ہوا تو ان کے دلوں اور کلیجوں کو ماؤف کر کے رکھ دیا، ان کے لیے سانس تک لینا مشکل ہو گیا، جس سے یہ ساری کی ساری قوم چیخ چیخ کر اور تڑپ تڑپ کر وہیں ڈھیر ہو گئی اور اس شدید زلزلے نے ان کے محلات کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا، پہاڑوں میں تراشے ہوئے مکانات سوائے چند ایک کے سب تباہ و برباد ہو گئے۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ تین روز جمعرات، جمعہ اور ہفتہ تھے، اتوار کے روز ان پر عذاب نازل ہوا وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ، یعنی ان ظالموں کو پکڑ لیا ایک سخت آواز نے، یہ سخت آواز حضرت جبریل علیہ السلام کی تھی جس میں ساری دنیا کی بجلیوں کی کڑک سے زیادہ ہیبت ناک آواز تھی جس کو انسانی قلب ودماغ برداشت نہیں کرسکا، ہیبت سے سب کے دل پھٹ گئے اور سب کے سب ہلاک ہوئے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قوم صالح سخت آواز کے ذریعہ ہلاک کی گئی ہے لیکن سورہ اعراف میں ان کے متعلق یہ آیا ہے فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ، یعنی پکڑ لیا ان کو زلزلہ نے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر عذاب زلزلہ کا آیا تھا، قرطبی نے فرمایا کہ اس میں کوئی تضاد نہیں، ہوسکتا ہے کہ پہلے زلزلہ آیا ہو پھر سخت آواز سے سب ہلاک کردیئے گئے ہوں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بدھ کے دن اونٹنی کی ٹانگیں کاٹی گئی تھیں، جمعرات، جمعہ اور ہفتہ تین دن تک وہ لوگ زندہ رہے، اتوار کے دن ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا، اونٹنی کی ٹانگیں کاٹنے کے بعد پہلے دن ان کے چہرے پیلے ہوگئے تھے، دوسرے دن ان کے چہرے سرخ ہوگئے تھے، تیسرے دن ان کے چہرے سیاہ ہوگئے تھے، چوتھے دن اللہ نے ان کو ہلاک کردیا تھا۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ جس چیخ کا ذکر قرآن کریم میں ہے وہ جبریل کی چیخ تھی، بعض کہتے ہیں وہ آسمان کی طرف سے آنے والی چیخ تھی جس میں بجلی کی ہر کڑک تھی، زمین میں موجود ہر چیز کی آواز تھی، جس سے ان کے دل پھٹ گئے اور وہ مرگئے، قرآن میں ایک مقام پر رجفہ کا لفظ ہے اور دوسرے مقام پر صیحہ کا لفظ ہے، مگر جیسے اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تفسیر میں ہے، جب ان لوگوں کو عذاب کا یقین ہوگیا تو ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ اگر اچانک تم پر عذاب آگیا تو تم کیا کروگے؟ کہنے لگے کہ ہم کیا کریں گے؟ چنانچہ یہ باتیں کرنے کے بعد انہوں نے اپنی تلواریں، اپنے نیزے اور اپنے خاندانوں کو لیا، ان میں

بارہ ہزار قبیلے تھے، ہر قبیلے میں بارہ بارہ ہزار جنگجو تھے، یہ سارے لوگ راستوں پر، گلیوں میں اس خیال سے کھڑے ہو گئے کہ وہ عذاب کا مقابلہ کریں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس فرشتہ کو حکم دیا جس کو سورج کی ذمہ داری دی گئی کہ وہ انہیں گرمی کا عذاب دے، چنانچہ فرشتے نے سورج ان کے سروں کے قریب کر دیا، جس نے ان کے ہاتھ بھون ڈالے، پیاس کے مارے ان کی زبانیں ان کے سینوں پر لٹکنے لگیں، جتنے جانور ان کے پاس تھے وہ سب مر گئے، گرمی کی شدت کے باعث ان کے پانی کے چشمے ابلنے لگے، یہاں تک کہ اس کے ابال سے بھاپ آسمانوں تک پہنچ گئی، جس چیز پر بھی پانی کا ابال گرتا تھا وہ اس کی گرمائش کے باعث تباہ و برباد ہو جاتی تھی، یہ سلسلہ اسی طرح رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے موت کے فرشتے کو حکم دیا کہ ان کی روحیں سورج غروب ہونے تک قبض نہیں کرنی، یہ ان کو عذاب دینے کی وجہ سے کیا، چنانچہ اس کے بعد ایک چیخ ماری گئی جس سے وہ ہلاک کر دیے گئے، تو انہوں نے صبح اس حال میں کی کہ وہ اپنے چہروں کے بل گرے ہوئے تھے، ان کے جسموں کے ساتھ مٹی اس طرح ملی ہوئی تھی جیسے مرا ہوا پرندہ مٹی میں لت پت ہوتا ہے۔

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا اِنَّ ثَمُوْدَا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ : عذاب کے بعد قومِ ثمود کا حال یہ ہوا گویا وہ اپنی سرزمین میں کبھی آباد ہی نہ تھے، نہ انہوں نے وہاں آسودگی دیکھی تھی اور نہ فراخیٔ عیش کے دن گزارے تھے، ان کے عالی شان گھر، ان کی قوت و شوکت اور ان کی خوش حالی سب یوں مٹ گئی جیسے کبھی وجود ہی نہ رکھتی ہو، آگاہ رہو کہ ثمود نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا تھا، اسی سرکشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اللہ کی رحمت سے دور کر دیے گئے، ان کے لیے دنیا میں نامرادی اور آخرت میں محرومی مقدر بنی اور یوں تکذیب و انکار کا انجام ہمیشہ کے لیے عبرت بن گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارتِ اسحاق اور جلوہ رحمت الٰہی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ

حَنِيْذٍ{۶۹}فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ{۷۰}وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ{۷۱}قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ{۷۲}قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ{۷۳}هود

جواب ترجمہ: اور ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے۔ انہوں نے سلام کے الفاظ بولے۔ ابراہیم نے سلام کا جواب دیا پھر دیر نہ لگائی کہ ایک تلا ہوا بچھڑا لے آئے۔ سو جب ابراہیم نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں پہنچ رہے ہیں تو ان کی طرف سے خوفزدہ ہو گئے انہوں نے کہا آپ ڈریں نہیں بیشک ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اور ان کی بیوی کھڑی ہوئی تھی سو ہنس پڑی سو ہم نے اسے اسحاق کی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کے پیدا ہونے کی خوشخبری سنائی۔ وہ کہنے لگی ہائے خاک پڑے۔ میں بچہ جنوں گی حالانکہ میں بڑھیا ہوں۔ اور میرے شوہر بڑے میاں ہیں۔ بیشک یہ تو ایک عجیب چیز ہے۔ وہ کہنے لگے کیا تو اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہے اے اہل بیت تم پر اللہ کی رحمت ہو اور اس کی برکتیں ہوں۔ بلاشبہ اللہ مستحق حمد ہے بڑائی والا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر آئے، یہ ایک فرزند کی بشارت تھی، اس واقعے کا پس منظر یہ تھا کہ ایک شہر تھا جسے سدوم یا سدوما کہا جاتا تھا، وہ بستی وسعت رزق اور فراوانیٔ نعمت میں بے مثال تھی، گرمیوں کے موسم میں دور دراز علاقوں سے لوگ وہاں آتے، انگور کے باغات اور دوسرے سرسبز باغات کی اضافی پیداوار سے فائدہ اٹھاتے اور اس کی خوش حالی سے بہرہ مند ہوتے۔

مگر اسی سرزمین پر شیطان لعین ایک نوخیز اور خوبرو نوجوان کی صورت میں ظاہر ہوا، وہ ان کے باغات میں آتا جاتا اور آہستہ آہستہ انہیں اپنی طرف مائل کرتا رہا، یہاں تک کہ اس نے ان کے درمیان بے حیائی کو رواج دے دیا، پھر اس نے عورتوں کو ورغلایا اور کہا کہ مردوں کو تمہاری کوئی

ضرورت نہیں رہی، یوں اس نے انہیں بھی فطرت سے ہٹا دیا، یہاں تک کہ مرد مردوں سے اپنی نفسانی خواہشات پوری کرنے لگے اور عورتیں عورتوں سے اپنی جنسی خواہشات پوری کرنے لگیں۔

جب بے حیائی، برائی، ہم جنس پرستی عام ہونے لگی تو تب اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ وہ اپنی قوم کو ایمان کی دعوت دیں اور انہیں ان بے حیائی کے کاموں سے باز رہنے کی نصیحت کریں، مگر وہ باز نہ آئے، آخر کار اللہ نے جبریل علیہ السلام کو اور ان کے ساتھ مزید فرشتوں کو ان کی ہلاکت کے لیے بھیجا، یہ فرشتے حسین نوجوانوں کی صورت میں پہلے ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچے، جب وہ آپ کے ہاں داخل ہوئے تو ابراہیم علیہ السلام نے بارہ نوخیز لڑکوں کو اپنے سامنے پایا، بعض روایات میں ان کی تعداد تین بتائی گئی ہے، جبریل، مکائیل اور اسرافیل علیہم السلام اور بعض روایات میں چار کا ذکر ہے، انہوں نے سلام کیا اور ابراہیم علیہ السلام نے بھی نہایت وقار سے سلام کا جواب دیا، گویا رحمت و امن کا تبادلہ ہوا اور ایک عظیم واقعے کا آغاز ہو گیا۔

قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمان نوازی کے طور پر فوراً ایک موٹا تازہ اور بُھنا ہوا بچھڑا پیش کیا، مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھتے تو دل میں اندیشہ پیدا ہوا، کیونکہ اس زمانے میں مہمان کا کھانا نہ کھانا خطرے کی علامت سمجھا جاتا تھا، فرشتوں نے اطمینان دلایا کہ وہ قوم لوط کی طرف عذاب کے لیے بھیجے گئے ہیں۔

شیخ سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں **لَمَّا لَمْ يَأْكُلُوا مِنَ الطَّعَامِ، قَالَ لَهُمْ إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: مَا لَكُمْ لَا تَأْكُلُونَ طَعَامِي؟ قَالُوا: إِنَّا قَوْمٌ لَا نَأْكُلُ طَعَامًا إِلَّا بِثَمَنٍ. فَقَالَ إِبْرَاهِيمُ: إِنَّ لِطَعَامِي ثَمَنًا، فَأَصِيبُوا مِنْهُ. قَالُوا: وَمَا ثَمَنُهُ؟ قَالَ: تَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ فِي أَوَّلِهِ، وَتَحْمَدُونَهُ فِي آخِرِهِ،**

جب انہوں نے کھانے میں سے کچھ نہ کھایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے فرمایا: تمہیں کیا ہوا کہ میرے طعام سے نہیں کھاتے؟ انہوں نے کہا: ہم ایسی قوم ہیں جو قیمت کے بغیر کھانا نہیں

کھاتی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میرے کھانے کی بھی ایک قیمت ہے، پس اس میں سے تناول کیجیے، انہوں نے پوچھا: اس کی قیمت کیا ہے؟ فرمایا: آغاز میں اس پر اللہ کا نام لو اور اختتام اس کی حمد و ثناء کرو، اس اخلاص پر جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ واقعی یہ ہستی اللہ کی خُلّت (دوستی) کے لائق ہے۔

شیخ سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عِجْلٍ حَنِيذٍ سے مراد موٹا تازہ بچھڑا ہے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں آیا ہے: بِعِجْلٍ سَمِينٍ (الذاریات:۲۶) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حَنِيذٍ کا معنٰی ہے خوب پکا ہوا، بعض کے نزدیک اس سے مراد ایسا بھنا ہوا گوشت ہے جس سے چکنائی ٹپک رہی ہو، اہلِ لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ اَلْحَنِيذُ وہ گوشت ہے جو تنور کے بغیر بھونا جائے، یعنی زمین میں ایک گڑھا سا بنا کر اس میں آگ کی حرارت سے اسے پکایا جائے، مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمانوں کی خدمت میں بچھڑا اس لیے پیش کیا کہ ان کے مال میں زیادہ تر گائیں تھیں، جب انہوں نے اسے قریب لا کر ان کے سامنے رکھ دیا تو وہ ہاتھ روک کر بیٹھ رہے، نہ اس میں سے کچھ کھایا اور نہ اسے چکھا۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ: اسی اثنا میں ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ سارہ علیہا السلام کھڑی تھیں، جب انہیں اسحاق علیہ السلام کی ولادت اور ان کے بعد یعقوب علیہ السلام کی بشارت دی گئی تو وہ خوشی اور تعجب سے مسکرا اٹھیں، بڑھاپے اور بانجھ پن کے احساس کے ساتھ انہوں نے کہا: کیا میں اس عمر میں اولاد پاؤں گی جبکہ میرا شوہر بھی ضعیف ہو چکا ہے؟ فرشتوں نے فرمایا: کیا تم اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ تم اہلِ بیت پر تو اللہ کی رحمت اور برکتیں ہیں، اسی گھرانے سے نبوت کا چراغ روشن ہونا ہے، پھر انہیں یقین دلایا کہ اللہ اپنے افعال میں محمود اور بزرگی میں یکتا ہے۔

یوں یہ واقعہ ایک ہی وقت میں دو جلوے دکھاتا ہے: ایک طرف سرکش قوم کے لیے عذاب کا فیصلہ اور دوسری طرف اہلِ ایمان کے گھر میں رحمت، نبوت اور برکت کی نوید۔

شفاعت ابراہیم علیہ السلام اور فیصلۂ الٰہی

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ {۷۴}اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ{۷۵}يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَآ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ{۷۶}هود

جواب ترجمہ: پھر جب ابراہیم کا خوف جاتا رہا اور اس کے پاس خوشخبری آگئی تو ہم سے قوم لوط کے بارے میں جدال شروع کر دیا۔ بیشک ابراہیم بردبار۔ رحمدل۔ رجوع کرنے والے تھے۔ اے ابراہیم اس بات سے اعراض کرو۔ بیشک تمہارے رب کا حکم آچکا ہے اور بیشک ان پر عذاب آنے والا ہے جو واپس نہ ہو گا۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل سے فرشتوں کا ابتدائی خوف جاتا رہا اور انہیں فرزند کی بشارت بھی مل گئی تو ان کا دل قومِ لوط کے حال پر متفکر ہو اٹھا، لوط علیہ السلام ان کے قریبی رشتہ دار تھے، کہا جاتا ہے کہ بھتیجے تھے، اس لیے جب انہیں ان کی قوم کی ہلاکت کا علم ہوا تو طبعِ سلیم نے شفاعت کا در کھٹکھٹایا، وہ بارگاہِ الٰہی میں عرض کرنے لگے: اگر اس بستی میں پچاس مسلمان ہوں تو کیا وہ بھی عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے؟ جواب ملا: نہیں، انہوں نے تعداد کم کر کے چالیس، پھر تیس، حتیٰ کہ دس تک پہنچا دی، بعض روایات میں ہے کہ وہ پانچ گھروں تک بات لے آئے، کہ اگر اتنے بھی اہلِ ایمان ہوں تو عذاب ٹل جائے، یہ مجادلہ دراصل ان کی رحمت، حلم اور دردمندی کا مظہر تھا۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ: اسی لیے فرمایا گیا: بے شک ابراہیم بڑے بردبار، آہ و زاری کرنے والے اور اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ أَوَّاهٌ وہ ہے جو اللہ کا ذکر سن کر دل میں سوز محسوس کرے اور آہ بھرے، اور مُنِيبٌ وہ جو ہر حال میں اسی کی طرف لوٹنے والا ہو۔

يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا : آخرکار فرشتوں نے کہا: اے ابراہیم! اب اس گفتگو سے درگزر کیجیے، آپ کے رب کا حکم آچکا ہے اور ان پر ایسا عذاب آنے والا ہے جو ٹلنے والا نہیں، جب فیصلۂ الٰہی

صادر ہو جائے تو پھر شفاعت کا در بھی بند ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں سے روانہ ہو کر قومِ لوط کی بستی کی طرف چلے، دن کے وقت وہاں پہنچے تو چند لڑکیاں نہر سدوم پر پانی بھر رہی تھیں، ان میں حضرت لوط علیہ السلام کی دو بیٹیوں میں سے ایک بیٹی بھی تھی، اس نے جب انہیں دیکھا تو ان کے اجنبی حلیے سے چونک اٹھی، اس نے ان سے حال پوچھا اور جب ان کے قیام کا ارادہ معلوم ہوا تو بستی کے لوگوں کی بد کرداری سے انہیں آگاہ کیا، انہوں نے بظاہر افسوس ظاہر کیا اور پوچھا کہ کیا کوئی ہمیں پناہ دے گا؟ اس نے اشارہ کیا کہ اس شہر میں سوائے اس بزرگ کے یعنی اس کے والد لوط علیہ السلام کوئی مہمان نوازی نہیں کرے گا، جب وہ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے اور انہوں نے ان خوبرو نوجوانوں کو دیکھا تو دل میں سخت تنگی محسوس کی کیونکہ وہ اپنی قوم کی بری خصلتوں سے آگاہ اور باخبر تھے اور آنے والے طوفانِ فتنہ کو بھانپ چکے تھے۔

فرشتوں کی آمد پر حضرت لوط کے خوف کی وجہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ {۷۷} وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ {۷۸} قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ {۷۹} قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ {۸۰} هود

جواب ترجمہ: اور جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے لوط کے پاس آئے تو وہ ان کی وجہ سے رنجیدہ ہوئے اور ان کی وجہ سے تنگ دل ہوئے اور کہنے لگے آج کا دن مصیبت کا دن ہے۔ اور ان کی قوم کے لوگ ان کے پاس جلدی جلدی دوڑتے ہوئے آ گئے۔ اور وہ اس سے پہلے برے کام کیا کرتے تھے۔

لوط نے کہا اے میری قوم یہ بیٹیاں ہیں وہ تمہارے لیے پاکیزہ ہیں سو تم اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا مانس نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ تمہیں تو معلوم ہے ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی سروکار نہیں ہے اور تم تو جانتے ہو ہمارا کیا مطلب ہے۔ لوط نے کہا کاش میرا تم پر زور چلتا ہوتا یا میں کسی مضبوط پائے کی پناہ لے لیتا۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ : حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ فرشتے اپنا بھید بتا کر وہاں سے چل دیئے اور حضرت لوط علیہ السلام کے پاس ان کے زمین میں یا ان کے مکان میں پہنچے۔ مرد خوبصورت لڑکوں کی شکل میں تھے تاکہ قوم لوط کی پوری آزمائش ہو جائے، حضرت لوط علیہ السلام ان مہمانوں کو دیکھ کر قوم کی حالت سامنے رکھ کر سٹ پٹا گئے، دل ہی دل میں پیچ تاب کھانے لگے کہ اگر انہیں مہمان بناتا ہوں تو ممکن ہے خبر پا کر لوگ چڑھ دوڑیں اور اگر مہمان نہیں رکھتا تو یہ انہی کے ہاتھ پڑ جائیں گے۔ زبان سے بھی نکل گیا کہ آج کا دن بڑا ہیبت ناک دن ہے۔ قوم والے اپنی شرارت سے باز نہیں آئیں گے۔ مجھ میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔ کیا ہو گا؟

قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، حضرت لوط علیہ السلام اپنی زمین پر تھے کہ یہ فرشتے بصورت انسان آئے اور ان کے مہمان بنے، شرماشرمی انکار تو نہ کر سکے اور انہیں لے کر گھر چلے، راستے میں صرف اس نیت سے کہ یہ اب بھی واپس چلے جائیں ان سے کہا کہ واللہ یہاں کے لوگوں سے زیادہ برے اور خبیث لوگ اور کہیں نہیں ہیں، کچھ دور جا کر پھر یہی کہا غرض گھر پہنچنے تک چار بار یہی کہا، فرشتوں کو اللہ کا حکم بھی یہی تھا کہ جب تک ان کا نبی، ان کی برائی نہ بیان کرے انہیں ہلاک نہ کرنا۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے چل کر دوپہر کو یہ فرشتے نہر سدوم پہنچے وہاں حضرت لوط علیہ السلام کی صاحبزادی جو پانی لینے گئی تھیں، مل گئیں، ان سے انہوں نے پوچھا کہ یہاں ہم کہیں ٹھہر سکتے ہیں۔ اس نے کہا آپ یہیں رکیے میں واپس آ کر جواب دوں گی۔ انہیں ڈر لگا کہ اگر قوم والوں کے ہاتھ یہ لگ گئے تو ان کی بڑی بے عزتی ہو گی۔ یہاں آ کر والد صاحب سے ذکر کیا کہ

شہر کے دروازے پر چند پردیسی نوعمر لوگ ہیں، میں نے تو آج تک نہیں دیکھے، جاؤ اور انہیں ٹھہراؤ ورنہ قوم والے انہیں ستائیں گے۔

اس بستی کے لوگوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے کہہ رکھا تھا کہ دیکھو کسی باہر والے کو تم اپنے ہاں ٹھیرایا نہ کرو۔ ہم آپ سب کچھ کر لیا کریں گے۔ آپ نے جب یہ حالت سنی تو جا کر چپکے سے انہیں اپنے گھر لے آئے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ مگر آپ کی بیوی جو قوم سے ملی ہوئی تھی، اسی کے ذریعہ بات پھوٹ نکلی۔

اب کیا تھا۔ دوڑے بھاگے آ گئے، جسے دیکھو خوشیاں مناتا جلدی جلدی لپکتا چلا آتا ہے ان کی تو یہ خو خصلت ہو گئی تھی اس سیاہ کاری کو تو گویا انہوں نے عادت بنا لیا تھا، اس وقت اللہ کے نبی علیہ السلام انہیں نصیحت کرنے لگے کہ تم اس بد خصلت کو چھوڑو اپنی خواہشیں عورتوں سے پوری کرو۔ بَنَاتِي یعنی میری لڑکیاں، اس لیے فرمایا کہ ہر نبی اپنی امت کا گویا باپ ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی ایک اور آیت میں ہے کہ اس وقت انہوں نے کہا تھا کہ ہم تو پہلے ہی آپ کو منع کر چکے تھے کہ کسی کو اپنے ہاں نہ ٹھہرایا کرو، حضرت لوط علیہ السلام نے انہیں سمجھایا اور دنیا آخرت کی بھلائی انہیں سجھائی اور کہا کہ عورتیں ہی اس بات کے لیے موزوں ہیں، ان سے نکاح کر کے اپنی خواہش پوری کرنا ہی پاک کام ہے۔

لوط علیہ السلام کی پریشانی کی وجہ: حضرت لوط علیہ السلام اس لیے خوف زدہ ہوئے کہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں تھے، اپنے بد فعلی کرنے والے گندے لوگوں سے پریشان ہوئے کہ وہ ان پر کہیں ہاتھ نہ ڈال دیں، لوط علیہ السلام کو علم نہیں تھا کہ یہ اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔

وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ: جب حضرت لوط علیہ السلام کے پاس وہ مہمان آئے تو ان کی قوم خبر پا کر بے قابو سرعت کے ساتھ دوڑی چلی آئی، گویا ایک دیرینہ عادت نے انہیں کھینچ لیا ہو، اس سے پہلے بھی وہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف شہوت کے ساتھ مائل ہوتے اور اسی قبیح فعل کو اپنا شعار بنا چکے تھے۔

حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے مہمانوں کی آبرو کی حفاظت کے لیے نہایت اضطراب اور دردمندی سے کہا: اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں تمہارے لیے موجود ہیں، انہیں نکاح میں لے آؤ، یہی تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ راستہ ہے، اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رسوا نہ کرو کیا تم میں کوئی ایک بھی صاحبِ عقل نہیں جو تمہیں اس بدکاری سے روکے؟

بیٹیوں سے کیا مراد ہے؟ جب حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کے سرکش نوجوانوں کو مہمانوں کی طرف لپکتے دیکھا تو غیرتِ نبوت اور خوفِ خدا سے ان کا دل تڑپ اٹھا اور اسی اضطراب میں انہوں نے فرمایا: هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ ، مفسرین نے اس جملے کی تفسیر میں دو بڑے اقوال نقل کیے ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد ان کی حقیقی بیٹیاں تھیں، بعض روایات میں ان کے نام بھی مذکور ہیں اور یہ کہا گیا کہ آپ علیہ السلام نے نکاح کی جائز راہ پیش کی تاکہ قوم فاحشہ فعل سے باز آجائے، کیونکہ اس زمانے میں شرعی احکام آج کی صورت میں نازل نہ ہوئے تھے۔

دوسرا قول: جسے جمہور اہلِ تفسیر نے راجح قرار دیا، یہ ہے کہ بَنَاتِيْ سے مراد قوم کی عورتیں ہیں، اس لیے کہ نبی اپنی امت کے لیے بمنزلۂ باپ ہوتا ہے، گویا آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تمہیں خواہش ہے تو نکاح کی پاکیزہ راہ اختیار کرو، یہی تمہارے لیے زیادہ طہارت والی راہ ہے، اس رائے کی تقویت اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ آپ کی حقیقی بیٹیاں تو دو ہی تھیں، جب کہ پوری قوم ایک ہجوم کی صورت میں جمع تھی، لہٰذا خطاب عام تھا اور مقصود فطری اور حلال راستے کی طرف راہنمائی تھی، نہ کہ کسی خاص فرد کی پیش کش، یوں یہ کلمات دراصل آخری نصیحت، غیرت دین اور اصلاح قوم کی ایک بے تاب کوشش کا اظہار تھے۔

مگر قوم نے سنگ دلی سے جواب دیا: اے لوط! تم خوب جانتے ہو کہ ہمیں نہ تمہاری بیٹیوں میں کوئی رغبت ہے اور نہ تمہاری قوم کی عورتوں میں، تم جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں، ہماری خواہش تو بس مردوں ہی کی طرف ہے۔ یوں حق کی نصیحت کے مقابلے میں شہوت کی سرکشی کھڑی ہو گئی، اور

فطرت کی پکار کے سامنے ضد اور بے حیائی کا اعلان کر دیا گیا۔

قَالَ لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِي إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ: اس وقت ہر طرح سے عاجز ہو کر لوط علیہ السلام کی زبان پر یہ کلمہ آیا، کاش مجھ میں اتنی قوت ہوتی کہ میں اس پوری قوم کا خود مقابلہ کر سکتا یا پھر کوئی جتھہ اور جماعت ہوتی جو مجھے ان ظالموں کے ہاتھ سے نجات دلاتی۔

فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کا یہ اضطراب دیکھ کر بات کھول دی اور کہا کہ گھبرایئے نہیں آپ کی جماعت بڑی قوی اور مضبوط ہے، ہم اللہ کے فرشتے ہیں ان کے قابو میں آنے والے نہیں ان پر عذاب واقع کرنے کے لئے آئے ہیں۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لوط پر رحم فرماویں وہ کسی مضبوط جماعت کی پناہ لینے پر مجبور ہو گئے، اور ترمذی میں اس کے ساتھ یہ جملہ بھی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کا کنبہ قبیلہ اس کا حمایتی نہ ہو۔ (قرطبی)

خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کفار قریش نے ہزار طرح کی تدبیریں کیں لیکن آپ کے پورے خاندان نے آپ کی حمایت کی، اگرچہ مذہب میں وہ سب آپ کے موافق نہ تھے، اسی وجہ سے پورے بنی ہاشم اس مقاطعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے جس میں کفار قریش نے ان پر دانا پانی بند کر دیا تھا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اس واقعہ میں جب قوم لوط ان کے گھر پر چڑھ آئی تو لوط علیہ السلام نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا اور یہ گفتگو اس شریر قوم سے پس پردہ ہو رہی تھی فرشتے بھی مکان کے اندر تھے ان لوگوں نے دیوار پھاند کر اندر گھسنے کا اور دروازہ توڑنے کا ارادہ کیا اس پر حضرت لوط علیہ السلام کی زبان پر یہ کلمات آئے، جب فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کا یہ اضطراب دیکھا تو حقیقت کھول دی اور کہہ دیا کہ آپ دروازہ کھول دیں، اب ہم ان کو عذاب کا مزہ چکھاتے ہیں، دروازہ کھولا تو جبرئیل امین نے اپنے پَر کا اشارہ ان کی آنکھوں کی طرف کیا جس سے سب اندھے ہو گئے اور بھاگنے لگے۔

حضرت لوط علیہ السلام کو فرشتوں کی نصیحت

سوال فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو کیا نصیحت کی تھی؟ اور کیوں؟ کیا لوط علیہ السلام کے گھر والوں میں سے کوئی عذاب الٰہی کی گرفت میں آیا؟ اس آیت کی روشنی میں بتائیے۔

قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْۤا اِلَیْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ اِنَّهٗ مُصِیْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ{۸۱} ھود.

جواب ترجمہ: فرشتوں نے کہا لوط! ہم تمہارے پروردگار کے فرشتے ہیں یہ لوگ ہر گز تم تک نہیں پہنچ سکیں گے تو کچھ رات رہے سہے اپنے گھر والوں کو لیکر چل دو۔ اور تم میں سے کوئی شخص پیچھے پھر کر نہ دیکھے۔ مگر تمہاری بیوی، جو آفت تم پر پڑنے والی ہے وہی اس پر پڑے گی۔ ان سے (عذاب کے) وعدے کا وقت صبح ہے۔ اور کیا صبح کچھ دور ہے؟

فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو نصیحت کی کہ وہ اور ان کے گھر والے رات کے آخری حصہ میں اس بستی سے نکل جائیں، آپ لوگوں میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے، کہیں یہ عذاب پیچھے دیکھنے والوں کو بھی اپنی گرفت میں نہ لے لے، چنانچہ اللہ کا بھیجا ہوا عذاب حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کو پہنچا۔

قوم لوط پر عذاب

سوال حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر اللہ تعالیٰ کا کیا عذاب آیا؟

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ {۸۲} مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ{۸۳} ھود.

جواب ترجمہ: تو جب ہمارا حکم آیا ہم نے اس (بستی) کو (الٹ کر) نیچے اوپر کر دیا اور ان پر پتھر کی تہ بہ تہ (یعنی پے در پے) کنکریاں برسائیں۔ جن پر تمہارے پروردگار کے ہاں سے نشان کئے ہوئے تھے اور وہ (بستی ان) ظالموں سے کچھ دور نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کی بستی کو ان کے سروں پر پلٹ دیا تھا، اوپر سے ان پر موسلا دھار پتھروں کی بارش برسائی تھی، یہ پتھر سخت مٹی کے تھے، ان پتھروں پر ان مجرموں کے نام لکھے ہوئے تھے جن پر انہوں نے لگنا تھا۔

سورج کے نکلنے کے وقت اللہ کا عذاب ان پر آگیا۔ ان کی بستی سدوم نامی تہ و بالا ہو گئی۔ عذاب نے اوپر تلے سے ڈھانک لیا۔ آسمان سے پکی مٹی کے پتھر ان پر برسنے لگے۔ جو سخت، وزنی اور بہت بڑے بڑے تھے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے سجین سجیل دونوں ایک ہی ہیں، منضود سے مراد پے بہ پے تہ بہ تہ ایک کے بعد ایک کے ہیں، ان پتروں پر قدرتی طور پر ان لوگوں کے نام لکھے ہوئے تھے، جس کے نام کا پتھر تھا اسی پر گرتا تھا۔ وہ مثل طوق کے تھے جو سرخی میں ڈوبے ہوئے تھے، یہ ان شہریوں پر بھی برسے اور یہاں کے جو لوگ اور گاؤں گوٹھ میں تھے ان پر بھی وہیں گرے، ان میں سے جو جہاں تھا وہیں پتھر سے ہلاک کیا گیا۔ کوئی کھڑا ہوا، کسی جگہ کسی سے باتیں کر رہا ہے وہیں پتھر آسمان سے آیا اور اسے ہلاک کر گیا، غرض ان میں سے ایک بھی نہ بچا۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت جبریل علیہ السلام نے ان سب کو جمع کر کے ان کے مکانات اور مویشیوں سمیت اونچا اٹھالیا یہاں تک کہ ان کے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آسمان کے فرشتوں نے سن لیں۔ آپ اپنے داہنے پر کے کنارے پر ان کی بستی کو اٹھائے ہوئے تھے۔ پھر انہیں زمین پر الٹ دیا۔ ایک کو دوسرے سے ٹکرا دیا اور سب ایک ساتھ غارت ہو گئے اکے دکے جو رہ گئے تھے ان کے بھیجے آسمانی پتھروں نے پھوڑ دیئے اور محض بے نام و نشان کر دیئے گئے۔

تفاسیر میں مذکور ہے کہ ان کی چار بستیاں تھیں، ہر بستی میں ایک لاکھ آدمیوں کی آبادی تھی، ایک روایت میں ہے تین بستیاں تھیں، بڑی بستی کا نام سدوم تھا، یہاں کبھی کبھی خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی آکر وعظ نصیحت فرما جایا کرتے تھے۔

شعیب علیہ السلام: اصلاحِ معیشت سے اصلاحِ عقیدہ تک

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ {۸۴} وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ {۸۵} بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ {۸۶} قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِىْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ {۸۷} قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَرَزَقَنِىْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِىْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ {۸۸} وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِىْۤ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَاۤ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ {۸۹} وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّىْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ {۹۰} قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۖ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ {۹۱} هود.

جواب ترجمہ: اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا انہوں نے کہا کہ اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو بیشک میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ آسودہ حال ہو بیشک میں تم پر ایک ایسے دن کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں جو گھیر لینے والا ہو گا۔ اور اے میری قوم انصاف کے ساتھ ناپ تول کو پورا کرو اور لوگوں کو چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد مچانے والے نہ بنو۔ اللہ کا دیا ہوا جو کچھ بچ جائے وہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو اور میں تم پر پہرہ دینے والا نہیں ہوں۔ وہ لوگ کہنے لگے اے شعیب کیا تمہاری نماز

تمہیں یہ بتاتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں یا یہ کہ ہم اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا چھوڑ دیں۔ بیشک تم تو بڑے بردبار ہو نیک چلن ہو۔ شعیب نے کہا کہ اے میری قوم تم بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے ایک بڑی دولت عطا فرمادی ہے تو میں تمہیں حق کی دعوت دینا کیسے چھوڑ دوں اور میں یہ نہیں چاہتا کہ میں اس طرح تمہاری مخالفت کروں کہ جن کاموں سے روکتا ہوں انہیں خود کرنے لگوں میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک مجھ سے ہو سکے۔ اور جو کچھ مجھے توفیق ہے وہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور میں اسی کی طرف رجوع ہوتا ہوں اور اے میری قوم تمہیں میری مخالفت اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تمہیں اس طرح کا عذاب پہنچ جائے جو قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح کو پہنچا۔ اور قوم لوط تم سے دور نہیں ہے۔ اور تم اپنے رب سے استغفار کرو پھر اس کے حضور میں توبہ کرو بیشک میرا رب رحم فرمانے والا ہے بڑی محبت فرمانے والا ہے۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ اے شعیب تم جو کچھ کہتے ہو اس میں سے بہت سی باتیں ہم نہیں سمجھتے۔ اور بلاشبہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے درمیان کمزور ہو اور اگر تمہارا خاندان نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے اور ہمارے نزدیک تم کچھ عزت والے نہیں ہو۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا: عرب کا قبیلہ جو حجاز و شام کے درمیان معان کے قریب رہتا تھا ان کے شہروں کا نام اور خود ان کا نام بھی مدین تھا، ان کی جانب اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت شعیب بھیجے گئے۔ آپ ان میں شریف النسب اور اعلیٰ خاندان کے تھے اور انہیں میں سے تھے۔ اسی لیے اَخَاہُم کے لفظ سے بیان کیا یعنی ان کے بھائی آپ نے بھی انبیاء کی عادت اور سنت اور اللہ کے پہلے اور تاکیدی حکم کے مطابق اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی ناپ تول کی کمی سے روکا کہ کسی کا حق نہ مارو۔ اور اللہ کا یہ احسان یاد دلایا کہ اس نے تمہیں فارغ البال اور آسودہ حال کر رکھا ہے۔ اور اپنا ڈر ظاہر کیا کہ اپنی مشرکانہ روش اور ظالمانہ حرکت سے اگر باز نہ آؤ گے تو تمہاری یہ

اچھی حالت بد حالی سے بدل جائے گی۔

وَيَاقَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ: حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو نہایت درد مندی اور خلوص کے ساتھ مخاطب کرتے ہیں: اے میری قوم! جب تم ناپو یا تولو تو پورا ناپ اور پورا تول انصاف کے ساتھ ادا کرو، لوگوں کے حقوق میں کمی نہ کرو، نہ ناپ تول میں ڈنڈی مارو، نہ دھوکا اور فریب سے کسی کا حق دباؤ اور زمین میں قتل و معصیت کے ذریعے فساد برپا نہ کرو۔

مکیال اور میزان: حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو جس بد دیانتی سے روکا، وہ صرف ایک عمومی نصیحت نہ تھی بلکہ تجارت کے بنیادی اصولوں کی اصلاح تھی۔ ''مکیال'' اور ''میزان'' دو الگ مفاہیم رکھتے ہیں: مکیال اُس پیمانے کو کہتے ہیں جس سے حجم ناپا جاتا ہے، جیسے گندم، کھجور، دودھ یا دیگر اجناس جو ناپ کر دی جاتی ہیں، جبکہ میزان اُس آلے کو کہا جاتا ہے جس سے وزن کیا جاتا ہے، یعنی اشیاء کا ثقل معلوم کیا جاتا ہے، جیسے سونا، چاندی اور دیگر سامانِ تجارت، اہلِ تفسیر نے واضح کیا ہے کہ کَیل کا تعلق حجم سے ہے اور وزن کا تعلق ثقل سے، حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم دونوں میدانوں میں خیانت کی مرتکب تھی، خریدتے وقت زیادہ لینے کی خواہش اور بیچتے وقت کمی کرنا ان کا شعار بن چکا تھا، اسی لیے انہوں نے تاکید فرمائی کہ ناپ بھی پورا دو اور تول بھی انصاف کے ساتھ کرو، کیونکہ معیشت کی دیانت ہی معاشرے کی سلامتی کی بنیاد ہے۔

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ: شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ یاد رکھو! اللہ کی دی ہوئی وہ پاکیزہ اور حلال کمائی، جو انصاف کے بعد تمہارے پاس باقی رہتی ہے، اسی میں اصل نفع اور برکت ہے، وہ اس ناجائز اضافے سے کہیں بہتر ہے جو دھوکے اور ظلم سے حاصل ہو، اگر تم حقیقتاً اہلِ ایمان ہو تو اسی تھوڑے مگر پاک رزق پر قناعت کرو۔

وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ: شعیب علیہ السلام نے لوگوں سے فرمایا کہ میں تم پر کوئی نگران نہیں کہ تمہارے

اعمال گنوں اور ان کا حساب لوں، اصل نگہبان تو وہ ذات ہے جو پوشیدہ سرگوشیوں تک سے باخبر ہے۔

قَالُوا يَاشُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا: مگر قوم نے طنز و تمسخر سے جواب دیا: اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں اور اپنے مال میں اپنی مرضی سے تصرف بھی نہ کریں؟ کیا اب ہم اپنی تجارت اور دولت کے بارے میں بھی تیری ہدایت کے پابند ہوں؟ تم تو ہمارے نزدیک بردبار اور دانا سمجھے جاتے تھے، آخر تمہیں کیا ہو گیا؟

قَالَ يَاقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَى بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا: شعیب علیہ السلام نے نہایت حکیمانہ انداز میں فرمایا: اے میری قوم! ذرا بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر قائم ہوں، اس نے مجھے پاکیزہ رزق عطا کیا ہو اور نبوت سے سرفراز کیا ہو، تو کیا میں تمہیں بھلائی کی طرف نہ بلاؤں؟ میں یہ نہیں چاہتا کہ جس چیز سے تمہیں روکتا ہوں خود اس کا ارتکاب کروں؛ میرا مقصد صرف تمہاری اصلاح ہے، جتنا میرے بس میں ہو اور میری توفیق اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، اسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

وَيَاقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ: پھر شعیب علیہ السلام نے انہیں تنبیہ کی: کہیں ایسا نہ ہو کہ میری دشمنی تمہیں اس حق کے انکار پر آمادہ کر دے اور تم پر بھی وہی عذاب آ پڑے جو قومِ نوح علیہ السلام، قومِ ہود علیہ السلام یا قومِ صالح علیہ السلام پر آیا اور قومِ لوط علیہ السلام تم سے نہ زمانے میں دور ہے نہ مکان میں، تم ان کا انجام جانتے ہو، پس عبرت حاصل کرو۔

وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ: شعیب علیہ السلام نے اپنے لوگوں سے فرمایا کہ اپنے رب سے مغفرت طلب کرو اور سچے دل سے توبہ کرو، میرا رب توبہ قبول کرنے والوں پر نہایت مہربان اور ان سے محبت فرمانے والا ہے۔

قَالُوا يَاشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا: لیکن ضد اور تکبر نے ان کے دلوں کو بند کر رکھا تھا، انہوں نے کہا: اے شعیب! تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں

آتیں اور ہم تمہیں اپنے درمیان کمزور دیکھتے ہیں، اگر تمہارا قبیلہ ہمارے مذہب پر نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر ڈالتے، تم خود ہماری نظر میں کوئی باوقعت نہیں، محض تمہارے خاندان کا لحاظ ہمیں روکے ہوئے ہے۔ یوں حق کی آواز بلند تھی، دلیل روشن تھی، مگر دلوں پر تعصب کی مہر لگی ہوئی تھی اور تاریخ گواہ ہے کہ جب قومیں نصیحت کو ٹھکرا دیتی ہیں تو انجام عبرتناک ہو کر رہتا ہے۔

قومِ شعیب علیہ السلام کی بیماریاں: حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم محض ایک برائی میں مبتلا نہ تھی، بلکہ وہ اخلاقی، معاشی اور اعتقادی انحطاط کا مکمل نمونہ بن چکی تھی، تجارت ان کا پیشہ تھا مگر دیانت ان سے رخصت ہو چکی تھی، ناپ تول میں کمی، ڈنڈی مارنا، معیار گرانا اور لوگوں کے حقوق دبانا ان کا معمول تھا، بازار ان کے لیے امانت نہیں بلکہ فریب اور استحصال کا میدان بن گیا تھا، اسی کے ساتھ زمین میں فساد، معصیت اور سماجی بے نظمی عام تھی، عقیدے کے میدان میں وہ آباء پرستی کے اسیر تھے، دلیل کی جگہ روایت کو پکڑے ہوئے تھے اور شرک کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے، جب حق کی دعوت آئی تو اسے سنجیدگی سے لینے کے بجائے انہوں نے عبادت تک کا مذاق اڑایا اور تکبر و عناد میں اس حد تک بڑھے کہ نبی کو کمزور جان کر دھمکیاں دینے لگے، گویا ان کی معیشت بددیانتی پر، ان کا عقیدہ جمود پر اور ان کا کردار انا پر قائم تھا اور جب قوموں کی بنیادیں اس طرح کھوکھلی ہو جائیں تو انجام کبھی سلامت نہیں رہتا۔

قوم شعیب علیہ السلام پر تین طرح کا عذاب

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، قوم شعیب پر آنے والے عذاب کا ذکر بھی کیجیے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ {۹۲} وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ {۹۳} وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ {۹۴} كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ {۹۵} ھود.

جواب ترجمہ: شعیب نے کہا کہ اے میری قوم کیا میرا خاندان تمہارے نزدیک عزت میں بڑھ کر اللہ سے زیادہ ہے۔ اور تم نے اسے پس پشت ڈال دیا۔ بلاشبہ میرا رب ان کاموں کا احاطہ کئے ہوئے ہے جنہیں تم کرتے ہو۔ اور اے میری قوم تم اپنی جگہ پر کام کرتے رہو میں بھی عمل کر رہا ہوں۔ تم عنقریب جان لوگے کہ کس کے پاس عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا۔ اور یہ بھی جان لوگے کہ وہ کون شخص ہے جو جھوٹا ہے۔ انتظار کرو بیشک میں تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ اور جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے اپنی رحمت سے شعیب کو اور ان لوگوں کو نجات دیدی جو ان کے ساتھ ایمان لائے اور جن لوگوں نے ظلم کیا انہیں سخت آواز نے پکڑ لیا سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے گھرے ہوئے رہ گئے۔ گویا کہ وہ ان میں رہے ہی نہ تھے خبردار مدین کے لیے دوری ہے جیسا کہ ثمود دور ہوئے۔

قَالَ يَاقَوْمِ أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ: حضرت شعیب علیہ السلام نے جب اپنی قوم کی سرکشی اور گستاخی دیکھی تو نہایت جلال آمیز مگر درد بھری آواز میں فرمایا: اے میری قوم! کیا میری برادری تمہارے نزدیک اللہ سے زیادہ معزز اور باوقعت ہے؟ تم نے محض قبیلے کے لحاظ سے میرا قتل روک رکھا ہے، مگر اُس ربِّ عظیم کو پسِ پشت ڈال دیا جس نے تمہیں پیدا کیا اور جس نے مجھے تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا، تم نے اس کے رسول کا انکار کر کے گویا اللہ کو نظر انداز کر دیا، حالانکہ میرا رب تمہارے ہر عمل کو گھیرے ہوئے ہے، نہ تمہاری کوئی چال اس سے پوشیدہ ہے اور نہ کوئی تدبیر اوجھل، وہ تمہارے اعمال کا بدلہ دنیا میں ہلاکت اور آخرت میں رسوائی کے عذاب کی صورت میں دے گا۔

وَيَاقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَى مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُونَ: حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: اے میری قوم! تم اپنی راہ پر جو کچھ کر سکتے ہو کر لو، میں بھی اپنی راہ پر ثابت قدم رہوں گا، عنقریب تم پر حقیقت کھل جائے گی کہ ہم میں سے کس پر ذلت آمیز عذاب آتا ہے اور کون اپنے دعوے میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے، تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں، فیصلہ اب اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور اس کا فیصلہ ہی آخری اور اٹل ہے۔

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب قوم شعیب سے متعلق ہمارا عذاب والا فیصلہ آیا تو ہم نے اپنے رسول شعیب علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے لوگوں کو ان کی قوم پر اترنے والے عذاب سے بچا لیا یہ ہماری شعیب اور ان پر ایمان لانے والوں پر مہربانی تھی۔

وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ: آیت کے اس حصہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ظالموں کو آسمانی چیخ نے آپکڑا اور وہ کوئلے کی طرح بجھ گئے، ان کو اپنے رب کے انکار کی وجہ سے ہلاک کر دیا گیا، قوم شعیب کا چنگھاڑ (فرشتہ کی چیخ) سے ہلاک ہونا مذکور ہے اور اعراف میں زلزلہ کا ذکر ہوا ہے اور سورہ شعراء میں عذاب یوم الظلۃ کا ذکر ہے یعنی عذاب کے بادل سائبان کی طرح ان پر محیط ہو گئے تھے گویا اس قوم پر تینوں قسم کا عذاب آیا ہے اور قرآن نے ہر مقام پر صرف اس عذاب کا ذکر فرمایا جیسا کہ مضمون چل رہا تھا مثلاً اس سورہ میں قوم کا لہجہ تلخ اور باتیں گستاخانہ تھیں جو سنگسار کرنے کی دھمکی دے رہے تھے تو یہاں سخت قسم کے جگر خراش عذاب یعنی چنگھاڑ کا ذکر فرمایا سورہ اعراف میں یہ ذکر تھا کہ قوم نے دھمکی دی تھی کہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس سرزمین سے نکال دیں گے تو وہ خود اسی سرزمین کے زلزلے سے ہلاک ہوئے تھے اور سورہ شعراء میں یہ مضمون ہے کہ قوم نے شعیب سے کہا: اگر تم سچے ہو تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دو اسی مناسبت سے وہاں عذاب کے بادلوں کا ذکر فرمایا اور یہ ممکن ہے کہ ہر مقام پر عذاب کی مختلف اوقات کی کیفیت مذکور ہو۔

اس سہ گونہ عذاب سے وہ اپنے اپنے گھروں میں ہی مر گئے اور اوندھے منہ زمین سے اس لیے چمٹ گئے تھے کہ عذاب کی تکلیف کچھ کم محسوس ہو اور ان کا یہ علاقہ یوں ویران اور بے آباد نظر آتا تھا جیسے کبھی کوئی وہاں آباد ہوا ہی نہ تھا۔ (تیسیر القرآن)

كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ: جب عذابِ الٰہی نے مدین کو اپنی لپیٹ میں لیا تو منظر ایسا تھا گویا وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے، نہ بازاروں کی چہل پہل باقی رہی، نہ گھروں کی

رونق، نہ زندگی کی کوئی آہٹ، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی بستیاں تاریخ کے اوراق سے مٹادی گئی ہوں، خبردار! مدین والے اللہ کی رحمت سے اسی طرح دور کر دیے گئے جیسے اس سے پہلے ثمود اپنے انجام کو پہنچے تھے، جب غضبِ خداوندی نازل ہوتا ہے تو آبادی ویرانی میں بدل جاتی ہے اور نام ونشان تک باقی نہیں رہتا، یہ محض ایک واقعہ نہیں، بلکہ اعلان ہے کہ جو قومیں سرکشی اور ظلم پر اصرار کرتی ہیں، وہ رحمت سے محرومی اور قہرِ الٰہی کی گرفت سے نہیں بچ سکتیں

لعنت کا لگاتار سلسلہ

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ وتفسیر کیجیے نیز وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ اور بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ اور قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ کا کیا مطلب ہے؟

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ{۹۶}اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ{۹۷}يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ{۹۸}وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ{۹۹}ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ{۱۰۰}هود.

جواب ترجمہ: اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور روشن دلیل کے ساتھ بھیجا۔ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف سو ان لوگوں نے فرعون کی بات کا اتباع کیا اور فرعون کی بات صحیح نہ تھی۔ قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا پھر وہ ان کو دوزخ میں اتار دے گا اور وہ بری جگہ ہے جس میں ان لوگوں کا اترنا ہوگا۔ اور ان کے پیچھے اس دنیا میں لعنت لگادی گئی اور قیامت کے دن بھی ان پر لعنت ہوگی۔ برا انعام ہے جو انہیں دیا گیا۔ یہ بستیوں کی خبریں ہیں جن کو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں ان میں سے بعض بستیاں قائم ہیں اور بعض بالکل ختم ہوگئیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَى بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُبِينٍ: اور بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی روشن نشانیوں اور واضح دلائل کے ساتھ بھیجا، ایسی آیات کے ساتھ جو توحیدِ الٰہی پر صاف دلالت کرتی تھیں

اور اس پیغام کی صداقت کو آفتاب کی طرح نمایاں کر دیتی تھیں۔

آیات اور سلطان مبین: آیات سے مراد وہ معجزات اور نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئیں، جیسے عصا کا اژدہا بن جانا، یدِ بیضاء، اور وہ دیگر نشانیاں جو فرعون اور اس کی قوم کے سامنے ظاہر ہوئیں۔ یہ نشانیاں اللہ کی قدرت اور توحید کی واضح دلیل تھیں، جو آنکھوں سے دیکھی جاسکتی تھیں۔

سلطانٍ مبین (واضح غلبہ بخش حجت) "سلطان" کے معنی ہیں مضبوط دلیل، غالب برہان، ایسی حجت جو مخالف کو لاجواب کر دے۔ "مبین" یعنی بالکل واضح، اس سے مراد وہ عقلی، کلامی اور استدلالی قوت ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی، ایسی روشن دلیل جو حق کو نمایاں اور باطل کو بے نقاب کر دے، بعض مفسرین کرام نے اپنے معجزات ہی کی تاکید قرار دیا ہے اور بعض نے اسے الگ حیثیت دی ہے یعنی آیات ظاہری معجزات اور سلطان مبین غالب دلیل اور الٰہی نصرت۔

إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاتَّبَعُوا أَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ: ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی طرف مبعوث کیا، مگر ان متکبر اشراف نے حق کی پیروی کے بجائے فرعون کے حکم کو اختیار کیا، حالانکہ فرعون کا حکم کوئی ایسا فیصلہ نہ تھا جس میں ہدایت کی رمق بھی ہوتی، وہ محض سرکشی اور گمراہی کا عَلَم بردار تھا اور اس کے پیروکار اندھی تقلید میں اس کے پیچھے چل پڑے۔

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ: قیامت کے دن یہی فرعون اپنی قوم کی پیشوائی کرے گا، مگر اس بار نجات کی طرف نہیں بلکہ آگ کی دہکتی ہوئی کھائی کی جانب، کیسا برا گھاٹ ہے جہاں وہ انہیں لا کھڑا کرے گا۔ **وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ**، وِرْد: اصل میں اُس گھاٹ یا پانی کے مقام کو کہتے ہیں جہاں لوگ یا جانور پانی پینے کے لیے پہنچیں۔ المَوْرُود: وہ جگہ جہاں پہنچایا جائے۔ معنیٰ یہ ہوا: "کتنا برا گھاٹ ہے جہاں انہیں لے جایا جارہا ہے!" یعنی فرعون قیامت کے دن اپنی قوم کو جس منزل تک لے جائے گا وہ جہنم ہے، وہ پانی کا گھاٹ نہیں بلکہ آگ کا گھاٹ ہے،

جس طرح پیاسا شخص امید کے ساتھ پانی کی طرف بڑھتا ہے، اسی طرح وہ اس کے پیچھے چلیں گے، مگر انجام آگ ہو گا، یہ تعبیر انتہائی طنزیہ اور عبرت انگیز ہے۔

وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ: دنیا میں بھی ان پر لعنت کی مُہر ثبت ہوئی، دریا کی موجوں نے انہیں نگل لیا اور رحمتِ الٰہی سے دوری ان کا مقدر بنی اور آخرت میں بھی یہی دوری اور لعنت ان کا تعاقب کرے گی، یوں ان پر دوہری محرومی اور دوہرا عذاب جمع ہو گیا، دنیا کی ہلاکت اور آخرت کی رسوائی۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یعنی رہتی دنیا تک لوگ فرعون اور فرعونیوں پر لعنت بھیجتے رہیں گے، پھر قیامت میں ملائکۃ اللہ اور اہل موقف کی طرف سے لعنت پڑے گی، غرض لعنت کا سلسلہ لگاتار ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہے گا، گویا یہ انعام ہے جو ان کے کارناموں پر دیا گیا۔ (عثمانی)

بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ کے بارے میں بعض تفاسیر میں ہے کہ ان پر جو لعنت کی گئی ہے ایک کے بعد ایک لعنت ان کے لیے بہت ہی بری ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد دنیا اور آخرت کی لعنت ہے، کسائی اور ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ **رِفْدٌ** کا معنیٰ اعانت اور عطیہ ہے، عربی میں عطیہ کو **رِفْدٌ** کہا جاتا ہے، مطلب یہ کہ جو کچھ ان لوگوں کو دیا جائے گا وہ بہت ہی برا عطیہ اور بہت ہی بری اعانت ہو گی، بعض کہتے ہیں کہ **رِفْدٌ** بڑے پیالے کو کہا جاتا ہے، **مَرْفُودٌ** جو کچھ اس پیالے میں ہو، مطلب یہ کہ ان لوگوں کو دوزخ میں جو کچھ پینے کے لیے دیا جائے گا وہ بہت ہی برا ہو گا۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے ایک مراد تو دنیا میں غرق ہونا ہے جب کہ آخرت میں دوزخ کے عذاب میں پڑنا ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد دنیا میں اہل ایمان کی طرف سے لعنت کا پڑنا ہے اور آخرت میں فرشتوں کی طرف سے لعنت کا پڑنا ہے۔ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ لعنت بدترین عطیہ ہے۔

علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور نبیوں کی لعنت ان پر دنیا میں بھی

پڑے گی اور آخرت میں بھی برابر رہے گی۔

ذَالِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْقُرَى نَقُصُّهُ عَلَيْكَ مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيدٌ: اس آیت میں نبی کریم ﷺ سے براہ راست خطاب کیا جارہا ہے، قرآن کا اسلوب یہی ہے کہ گزشتہ اقوام کے واقعات بیان کرنے کے بعد فرمایا جاتا ہے: ''ہم یہ خبریں آپ کو سنا رہے ہیں''یعنی اے محمد ﷺ! یہ محض تاریخی روایات نہیں، بلکہ وحی کے ذریعے آپ کو سنائی جانے والی سچی خبریں ہیں، تاکہ آپ کو تسلی ہو، آپ کی دعوت مضبوط ہو اور منکرین پر حجت قائم ہو۔

جن بستیوں کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے یہ وہ بستیاں ہیں جن کے حالات ہم آپ کو سنا رہے ہیں، ان میں سے بعض کے آثار اب بھی کھڑے ہیں، دیواریں گواہی دیتی ہیں اور کھنڈر عبرت سناتے ہیں اور بعض ایسی ہیں جن کے نشانات تک مٹ چکے، نہ نام باقی، نہ نشان، مگر ان کی کہانی باقی ہے، تاکہ حق کے منکروں کو یاد رہے کہ اقتدار، لشکر اور شان و شوکت سب فانی ہیں اور باقی رہنے والی صرف اللہ کی حجت اور اس کا فیصلہ ہے۔

قَائِمٌ وَحَصِيدٌ: قائم: کھڑا ہوا، باقی، جس کے آثار موجود ہوں۔ حَصِيدٌ کاٹا ہوا، جڑ سے مٹا دیا گیا (جیسے کھیتی کاٹ دی جائے)۔ معنیٰ: بعض بستیاں ایسی ہیں جن کے آثار اب بھی قائم ہیں اور بعض ایسی جو مکمل طور پر کاٹ کر مٹا دی گئیں، نہ دیوار باقی، نہ نشان۔ یہ تعبیر نہایت بلیغ ہے، گویا اللہ فرما رہا ہے: ہم آپ کو ان بستیوں کی خبریں سنا رہے ہیں، کچھ کے آثار آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں اور کچھ کو ایسا مٹا دیا گیا کہ نشان تک باقی نہیں۔ اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ کہ اقتدار، لشکر، معیشت، شان و شوکت، سب وقتی ہیں، جو حق کو جھٹلاتے ہیں وہ کبھی کھنڈر بن کر کھڑے رہتے ہیں، کبھی تاریخ سے مٹا دیے جاتے ہیں؛ مگر اللہ کا فیصلہ باقی رہتا ہے، اور یہاں ایک اہم نکتہ سمجھ لیجیے کہ یہ صرف قصہ گوئی نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی تسلی بھی ہے کہ جس طرح سابق انبیاء علیہم السلام کی مخالفت ہوئی اور بالآخر حق غالب آیا، اسی طرح آپ کی دعوت بھی انجام کار غالب ہو گی، قرآن تاریخ نہیں سناتا، سنتِ الٰہی بیان کرتا ہے۔

بت پرستی نے آخرت تباہ کر دی

سوال آیت مبارکہ کا ترجمہ کریں اور بتائیں کہ یہاں تَتبِیب کا کیا معنٰی ہے؟

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ{۱۰۱}ھود.

جواب ترجمہ: اور ہم نے ان لوگوں پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ غرض جب تمہارے پروردگار کا حکم آپہنچا تو جن معبودوں کو وہ خدا کے سوا پکارا کرتے تھے وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آئے اور تباہ کرنے کے سوا ان کے حق میں اور کچھ نہ کر سکے۔

یعنی خدا نے کسی کو بے قصور نہیں پکڑا جس سے ظلم کا وہم ہو سکے، جب وہ جرائم کے ارتکاب میں حد سے آگے نکل گئے اور اس طرح اپنے کو کھلم کھلا سزا کا مستحق ٹھہرا دیا تب خدا کا عذاب آیا۔ پھر دیکھ لو جن معبودوں (دیوتاؤں) کا انھیں بڑا سہارا تھا اور جن سے بڑی بڑی توقعات قائم کر رکھی تھیں وہ ایسی سخت مصیبت کے وقت کچھ بھی کام نہ آئے۔

باطل معبود کام کیا آتے؟ الٹے ہلاکت کا سبب بنے۔ جب انھیں نفع و ضرر کا مالک سمجھا، امیدیں قائم کیں، چڑھاوے چڑھائے تعظیم اور ڈنڈوت کی، تو یہ روز بد دیکھنا پڑا۔ تکذیب انبیاء وغیرہ کا جو عذاب ہوتا شرک و بت پرستی کا عذاب اس پر مزید رہا۔ (عثمانی) تَتبِیبٍ کا معنٰی ہے بتوں کی پوجا پاٹ نے ان کے آخرت کے اجر و ثواب کو تباہ و برباد کر ڈالا ہے۔

سنت الٰہی مہلت کے بعد مؤاخذہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ{۱۰۲}اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ {۱۰۳}وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ{۱۰۴}ھود

جواب ترجمہ: اور ایسی ہی ہے پکڑ تیرے رب کی جب پکڑتا ہے بستیوں کو اور وہ ظلم کرتے ہوتے ہیں بیشک اس کی پکڑ دردناک ہے شدت کی۔ بلاشبہ اس میں اس شخص کے لیے عبرت ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہو۔ یہ ایسا دن ہو گا جس میں تمام آدمی جمع کئے جائیں گے اور یہ وہ دن ہو گا جو سب کی حاضری کا دن ہے۔ اور ہم اسے موخر نہیں کر رہے ہیں مگر تھوڑی سی مدت کیلئے۔

وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ: اور جب اللہ کی گرفت آتی ہے تو وہ محض ایک تنبیہ نہیں ہوتی بلکہ جڑ سے اکھاڑ دینے والی، دردناک اور نہایت سخت ہوتی ہے، جن بستیوں نے ظلم کو شعار بنایا، حق کو ٹھکرایا اور سرکشی میں حد سے بڑھ گئیں، انہیں اسی طرح پکڑا گیا کہ نہ قوت کام آئی نہ تدبیر، یہ گرفت ایسی تھی جو دل دہلا دے، بنیادیں ہلا دے اور تاریخ میں عبرت کا عنوان بن جائے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ: بے شک اس شدید مواخذے میں اس شخص کے لیے بڑی نصیحت ہے جو قیامت کے عذاب سے ڈرتا ہے، وہ دن جب سب انسان حساب کے لیے جمع کیے جائیں گے، کوئی پوشیدہ نہ رہے گا، کوئی فرار کی راہ نہ پائے گا، وہ دن مشہود ہو گا، ساری مخلوق اس منظر کی گواہ ہو گی اور ہر آنکھ اپنے انجام کو دیکھ رہی ہو گی۔

وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مَّعْدُودٍ: اور ہم اس مشہود دن کو محض ایک مقررہ مدت تک مؤخر رکھتے ہیں، ایک ایسا وقت جو اللہ کے علم میں معین ہے، نہ ایک لمحہ آگے نہ پیچھے، جب وہ گھڑی آ پہنچے گی تو نہ تاخیر ممکن ہو گی نہ مہلت، پس جو دل رکھتا ہے، وہ ان بستیوں کے انجام میں اپنے لیے آئینہ دیکھ لے۔

انجام انسان: شقاوت سعادت کا منظر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ﴿١٠٥﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ﴿١٠٦﴾ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ﴿١٠٧﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا

مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ {۱۰۸}فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ {۱۰۹}هود

جواب ترجمہ: جس وقت وہ دن آئے گا کوئی شخص اللہ کی اجازت کے بغیر بات نہ کر سکے گا سو ان میں شقی ہوں گے اور سعید ہوں گے۔ سو جو لوگ شقی ہوں گے وہ دوزخ میں ہوں گے اس میں ان کی چیخ و پکار ہو گی۔ وہ اس میں ہمیشہ ٹھہرے رہیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین قائم رہیں الاّ یہ کہ آپ کے رب کی مشیت ہو۔ بیشک آپ کا رب جو کچھ چاہے پورے طور پر کر سکتا ہے۔ اور لیکن وہ لوگ جو سعید ہوں گے وہ جنت میں ہوں گے اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں الاّ یہ کہ آپ کے رب کی مشیت ہو۔ یہ بخشش کبھی منقطع نہ ہو گی۔ سوائے مخاطب جس چیز کی یہ لوگ عبادت کرتے ہیں تو اس کے بارے میں شک میں نہ پڑنا یہ لوگ اسی طرح عبادت کر رہے ہیں جیسا کہ پہلے ان کے باپ دادا عبادت کرتے تھے اور ہم ان کو ان کا پورا پورا حصہ دے دیں گے جس میں کچھ بھی کمی نہ ہو گی۔

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ: یہ آیت قیامت کے دن کے منظر کو نہایت عمیق انداز میں بیان کرتی ہے، اس دن ہر انسان کی زبان خاموش ہو جائے گی، کوئی اپنے لیے دلیل یا کسی کی سفارش نہیں پیش کر سکے گا، مگر وہی جو اللہ کی اجازت سے بات کرے، اس دن کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں کیے گئے اعمال کا فیصلہ بالکل منصفانہ اور قطعی ہو گا، سب کے سامنے حق واضح ہو گا، جو لوگ کفر و بداعمالی کے ساتھ زندگی بسر کریں گے، انہیں شقاوت اور آگ میں ڈالا جائے گا اور جو ایمان اور نیک اعمال کے حامل ہوں گے، وہ جنت کی نعمتوں میں داخل ہوں گے۔ یہ آیت انسان کی دنیاوی زندگی میں اعمال کی اہمیت اور آخرت میں ہر کسی کے لیے الگ منزل کی نشاندہی کرتی ہے اور یہ یاد دلاتی ہے کہ قیامت میں ہر شے اللہ کے اختیار اور اجازت کے تابع ہو گی۔

اس آیت سے ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے جو اپنے بزرگوں کی سفارش پر تکیہ لگائے بیٹھے

ہیں ہمیں اولیاء کے تذکروں میں بکثرت ایسی حکایات ملتی ہیں کہ فلاں بزرگ اکڑ کر بیٹھ جائیں گے اور اپنے ایک ایک مرید کو بخشوائے بغیر راضی نہ ہوں گے اور نہ خود جنت میں داخل ہوں گے اور بالآخر وہ اللہ میاں کو اپنی بات منوا کے ہی چھوڑیں گے حالانکہ وہ دن ایسا سخت ہو گا کہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی اللہ کے حضور لوگوں کی سفارش کرنے سے ہچکچائیں گے اور بالآخر قرعہ فال رسول اللہ ﷺ پر پڑے گا اور وہی اللہ کے حضور سفارش کریں گے۔

بلاشبہ دوسرے انبیاء علیہم السلام اور بعض دوسرے نیک لوگوں کی سفارش کرنا بھی احادیث سے ثابت ہے مگر اس سفارش کے لیے بڑی کڑی شرائط ہیں، ایک یہ کہ صرف وہی شخص سفارش کر سکے گا جس کو اللہ کی طرف سے اجازت حاصل ہو گی اور وہ بھی صرف اس شخص کے حق میں سفارش کر سکے گا جس کے حق میں اللہ کو منظور ہو گا اور خاص اس جرم کے لیے جس کی سفارش اللہ کو منظور ہو گی لہذا ایسی سفارش پر بھروسہ کرنے والوں کو وہاں سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے کفر اور بداعمالیوں کے باعث شقاوت (بدبختی) کے مستحق ٹھہرے، وہ آگ میں ڈال دیے جائیں گے، اس کی لپٹوں کی شدت سے ان کی سانسیں بے قابو ہوں گی، چیخیں بلند ہوں گی اور ہر آہ و فغاں اس عذاب کی سنگینی کی گواہی دے گی جس میں وہ گرفتار ہوں گے۔

خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ: یہ بدبخت اور اہل شقاوت اس دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، مگر جسے تمہارا رب چاہے، یعنی اہلِ توحید میں سے وہ گنہگار جن پر عارضی سزا مقدر ہو تو وہ اپنے اختیارِ کامل سے نکال لے گا، بے شک تمہارا رب جو ارادہ فرمائے، اسے پورا کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے، کوئی اس کے فیصلے کو روکنے والا نہیں۔

زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ: اس آیت کے پہلے جملے میں اہل جہنم کی دو آوازوں کا ذکر کیا گیا ہے، اہل تفسیر لکھتے ہیں کہ اس جملہ کے دو مطلب ہیں ایک تو وہی ہے جو ترجمہ میں بیان کیا گیا ہے اور یہ مطلب قرآن کے

دوسرے مقامات سے بھی ثابت ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جہنم کے بھڑکنے سے ایسی جگر خراش آوازیں پیدا ہوں گی جو ان بدبختوں کی مصیبت اور گھبراہٹ میں مزید اضافہ کرتی جائیں گی اور یہ مطلب بھی قرآن کے دوسرے مقامات سے ثابت ہے۔

اشکال: ان الفاظ سے بعض لوگوں کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ کافروں کے لئے جہنم کا عذاب دائمی نہیں ہے بلکہ موقت ہے یعنی اس وقت تک رہے گا جب تک آسمان وزمین رہیں گے۔

جواب یہ بات صحیح نہیں کیونکہ یہاں مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اہل عرب کے روزمرہ کی گفتگو اور محاورے کے مطابق نازل ہوا ہے۔ عربوں کی عادت تھی کہ جب کسی چیز کا دوام ثابت کرنا مقصود ہوتا تو وہ کہتے تھے (یہ چیز اسی طرح ہمیشہ رہے گی۔ جس طرح آسمان وزمین کا دوام ہے) اسی محاورے کو قرآن کریم میں استعمال کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کفر وشرک جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ جس کو قرآن نے متعدد جگہ خَالِدِيْنَ فِيْهَا کے الفاظ سے ذکر کیا ہے۔

ایک دوسرا مفہوم اس کا یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آسمان وزمین سے مراد جنس ہے، یعنی دنیا کے آسمان وزمین اور ہیں جو فنا ہو جائیں گے لیکن آخرت کے آسمان وزمین ان کے علاوہ اور ہوں گے، جیسا کہ قران کریم میں اس کی صراحت ہے، يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (سورۃ ابراہیم ۴۸)، اس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی بدل دیئے جائیں گے اور آخرت کے یہ آسمان وزمین، جنت اور دوزخ کی طرح ہمیشہ رہیں گے۔ اس آیت میں یہی آسمان وزمین مراد ہے نہ کہ دنیا کے آسمان وزمین جو فنا ہو جائیں گے۔ (ابن کثیر)

ان دونوں مفہوموں میں سے کوئی بھی مفہوم مراد لے لیا جائے، آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے اور وہ اشکال پیدا نہیں ہوتا جو مذکور ہوا۔ تفسیر مکہ)

یہ الفاظ بطور محاورہ استعمال کیے گئے ہیں کیونکہ اہل عرب دوام اور لا محدود مدت بیان کرنے کے لیے یہی الفاظ استعمال کرتے تھے ورنہ یہ موجودہ زمین و آسمان تو قیامت کے وقت ختم کر دیے جائیں

گے، البتہ ظاہری الفاظ کا لحاظ رکھتے ہوئے ان سے عالم اخروی کے زمین و آسمان مراد لیے جاسکتے ہیں۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ کا مطلب یہ ہے کہ اہل توحید گناہ گاروں کو ایک مدت دوزخ میں ٹھہرنے کے بعد وہاں سے نکالا جائے گا۔ تفسیر مکہ میں ہے کہ اس استثناء کے بھی کئی مفہوم بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ صحیح مفہوم یہی ہے کہ یہ استثناء ان گناہ گاروں کے لئے ہے جو اہل توحید و اہل ایمان ہوں گے، اس اعتبار سے اس سے ما قبل آیت میں شَقِي کا لفظ عام یعنی کافر اور عاصی دونوں کو شامل ہو گا اور إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ سے عاصی مومنوں کا استثناء ہو جائے گا اور مَا شَآءَ میں مَا مَنْ کے معنی میں ہے۔

وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ: اور رہے وہ لوگ جن کے لیے ایمان اور نیک اعمال کی بدولت سعادت پہلے ہی لکھ دی گئی، تو ان کا ٹھکانا جنت ہے، وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، مگر جن اہلِ ایمان سے لغزش ہوئی اور جن کے لیے حکمتِ الٰہی کے تحت پہلے تطہیر لازم ہو، ان کے بارے میں بھی فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے، پھر جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو وہاں کی نعمتیں کبھی منقطع نہ ہوں گی، وہ عطا ایسی ہو گی جو نہ ٹوٹے گی، نہ گھٹے گی، نہ فنا ہو گی۔

مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ: شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ان آیات کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جس قدر مدت آسمان و زمین دنیا میں باقی رہے اتنی مدت تک اشقیاء (بدبخت لوگ) دوزخ میں اور سعداء (نیک بخت لوگ) جنت میں رہیں گے مگر جو اور زیادہ چاہے تیرا رب، وہ اسی کو معلوم ہے کیونکہ ہم جب طویل سے طویل زمانہ کا تصور کرتے ہیں تو اپنے ماحول کے اعتبار سے بڑی مدت یہ ہی خیال میں آتی ہے۔ اسی لیے مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وغیرہ الفاظ محاورات عرب میں دوام کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بولے جاتے ہیں، باقی دوام و ابدیت کا اصلی مدلول جسے لامحدود زمانہ کہنا چاہیے وہ حق تعالیٰ ہی کے علم غیر متناہی کے ساتھ مختص

ہے۔ جس کو مَا شَآءَ رَبُّكَ سے ادا کیا۔

دوسرے معنٰی آیت کے یہ ہو سکتے ہیں کہ لفظ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (ہود:۱۰۷) کو کنایہ دوام سے مانا جائے، یا آسمان و زمین سے آخرت کا زمین و آسمان مراد لیا جائے۔ جیسے فرمایا یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (ابراہیم:۴۸) مطلب یہ ہوا کہ اشقیاء (بدبخت) دوزخ اور سعداء (نیک بخت) جنت میں اس وقت تک رہیں گے جب تک آخرت کے زمین و آسمان باقی رہیں، یعنی ہمیشہ۔ مگر جو چاہے تیرا رب تو موقوف کر دے، وہاں ہمیشہ نہ رہنے دے۔ کیونکہ جنتیوں اور دوزخیوں کا خلود بھی اسی کی مشیت و اختیار سے ہے۔ لیکن وہ چاہ چکا کہ کفار و مشرکین کا عذاب اور اہل جنت کا ثواب کبھی موقوف نہ ہو گا۔

چنانچہ فرما دیا وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ۔ البقرۃ:۱۶۷) اور يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۔ المائدہ:۳۷) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النسآء:۴۸) اس پر تمام اہل اسلام کا اجماع رہا ہے اور ہمارے زمانہ کے بعض نام نہاد مفسرین نے جو کچھ اس کے خلاف چیزیں پیش کی ہیں وہ یا روایات ضعیفہ و موضوعہ ہیں یا اقوال غریبہ مُاَولہ۔ یا بعض آیات و احادیث ہیں جن کا مطلب کوتاہ نظری یا بد فہمی سے غلط سمجھ لیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ: اللہ تعالیٰ اپنے حبیب نبی کریم ﷺ کو مخاطب فرماتے ہوئے ارشاد فرما رہے ہیں کہ اے میرے حبیب ﷺ! آپ ان مشرکین کے معبودانِ باطل کے بارے میں کسی تردد میں نہ پڑیں، ان کے پاس نہ عقل کی کوئی روشن دلیل ہے، نہ شریعت کی کوئی حجت، وہ تو محض اپنے آباء کی اندھی تقلید میں بھٹک رہے ہیں اور ہم انہیں ان کے حصے کا عذاب پورا پورا دیں گے، اس میں کوئی کمی نہ کی جائے گی، یہ فیصلہ عدلِ الٰہی کا اٹل اعلان ہے۔

نبیوں کو کتاب ملنے کے بعد لوگوں نے اختلاف کیا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ کا کیا مطلب ہے؟

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ {۱۱۰} ھود.

جواب ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تو اس میں اختلاف کیا گیا اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک بات پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو ان میں فیصلہ کر دیا جاتا اور وہ تو اس سے قوی شبہے میں (پڑے ہوئے) ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کو تورات دے کر بھیجا تو آپس میں پھوٹ پڑ گئی، کسی نے قبول کیا کسی نے نہ کیا۔ جس طرح آج قرآن عظیم کے متعلق یہ ہی اختلاف ہو رہا ہے۔ بیشک خدا کو قدرت تھی کہ یہ اختلاف و تفریق پیدا نہ ہونے دیتا یا پیدا ہو چکنے کے بعد تمام مکذبین کا فوراً استیصال کر کے سارے جھگڑے ایک دم میں چکا دیتا۔ مگر اس کی حکمت تکوینی اس کو مقتضی نہ ہوئی۔ ایک بات اس کے یہاں پہلے سے طے شدہ ہے کہ انسان کو ایک خاص حد تک کسب و اختیار کی آزادی دے کر آزمائے کہ وہ کس راستہ پر چلتا ہے، آیا خالق و مخلوق کا ٹھیک ٹھیک حق پہچان کر خدا کی رحمت و کرامت کا مستحق بنتا ہے یا کجروی اور غلط کاری سے فطرت صحیحہ کی راہنمائی کو خیر باد کہہ کر اپنے کو غضب و سخط کا مظہر ٹھہراتا ہے۔

لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ: کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح لوگوں نے پہلے انبیاء کے ساتھ سلوک کیا وہ آپ کے ساتھ بھی ہو گا، چونکہ ہم وقت مقرر کر چکے ہیں چونکہ ہم بغیر حجت پوری کئے عذاب نہیں کیا کرتے اس لیے یہ تاخیر ہے ورنہ ابھی انہیں ان کے گناہوں کا مزہ یاد آجاتا ہے اور ان کے انکار و تمرد کی انہیں سزا مل جاتی، ہم نے چونکہ دنیا کو دار العمل بنایا ہے دار الجزا نہیں بنایا، اس لیے حساب کتاب اور جزا و سزا کو مخلوق کے لیے قیامت کے دن تک مؤخر کیے دیتے ہیں۔

جزا و سزا، استقامت اور اجتناب باطل

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ{۱۱۱}فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ {۱۱۲}وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ{۱۱۳}هود

جواب ترجمہ: اور بیشک جتنے لوگ ہیں آپ کا رب انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے دے گا بیشک وہ ان کے اعمال سے باخبر ہے۔ سو آپ استقامت پر رہیے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اور جو لوگ توبہ کر کے آپ کے ساتھی ہیں وہ بھی استقامت پر رہیں۔ اور حد سے آگے نہ بڑھیں بیشک وہ آپ کے اعمال کو دیکھتا ہے۔ اور ان لوگوں کی طرف نہ جھکیے جنہوں نے ظلم کیا ایسا کریں گے تو آپ کو آگ پکڑ لے گی اور آپ کے لیے اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ پھر آپ کی مدد نہ کی جائے گی۔

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ : جن لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے، خواہ وہ اختلاف کرنے والے ہوں یا حق سے روگردانی کرنے والے، ان میں سے ہر ایک کو آپ کا رب ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا، جس نے نیکی اختیار کی، اس کے لیے جزا بھی نیکی ہی ہو گی اور جس نے بدی کو اپنایا، اس کا انجام بھی بدی کے مطابق ہو گا، یہ فیصلہ نہ کسی کمی کا شکار ہو گا، نہ کسی زیادتی کا، ہر شخص اپنے کیے کا صلہ پائے گا۔

اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ : بے شک اللہ ان کے اعمال کی باریکیوں تک سے باخبر ہے، کوئی چھپی ہوئی تدبیر، کوئی پوشیدہ ارادہ، اور کوئی معمولی سا عمل بھی اس کے علم سے اوجھل نہیں، اس کا علم کامل ہے اور اس کی جزا عین عدل، اسی میں تنبیہ بھی ہے اور تسلی بھی۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا: اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو مخاطب فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے میرے حبیب ﷺ! آپ اس سیدھی راہ پر مسلسل قائم رہیں

جس کا حکم آپ کو دیا گیا ہے، اللہ کے اوامر کی پوری اطاعت کیجیے اور اس کی نافرمانی سے مکمل اجتناب رکھیے، یہ استقامت وقتی جوش یا عارضی کیفیت کا نام نہیں، بلکہ دوام اور ثابت قدمی کا تقاضا کرتی ہے اور صرف آپ ہی نہیں، بلکہ وہ اہلِ ایمان بھی جو آپ ﷺ کے ساتھ توبہ کر چکے ہیں، اسی راہِ راست پر جمے رہیں اور خبردار! حدود سے تجاوز نہ کیجیے، گناہوں کا ارتکاب، شریعت کی مقرر کردہ حدوں کو پامال کرنا، یا دین میں اپنی طرف سے اضافہ و کمی کرنا، یہ سب طغیان میں داخل ہے، راہِ اعتدال ہی مطلوب ہے، انبیاء کرام تو معصوم ہوتے ہیں، وہ چھوٹے اور بڑے گناہ کا ارتکاب نہیں کرتے، اگر کہیں لغزش کا صدور ہو جائے تو اللہ تعالیٰ معافی کا اعلان فرمارہے ہیں، جیسے کئی مقامات پر قرآن کریم میں بیان ہوا ہے، یہاں خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے جب کہ سمجھانا امت کو مقصود ہے، علامہ قرطبی نے شیخ سدی کا قول اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے، جس میں یہی بات کی گئی ہے۔

"استقامت" کے معنی ہیں سیدھی راہ پر اس طرح قائم رہنا کہ نہ افراط کی طرف جھکاؤ ہو اور نہ تفریط کی طرف، دین کے عقائد، اعمال اور اخلاق تینوں میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا ہی استقامت ہے، توحیدِ باری تعالیٰ میں ذرا سی کجی بھی انسان کو راہِ مستقیم سے ہٹا دیتی ہے، نہ ذات وصفاتِ الٰہی میں غلو روا ہے اور نہ تنقیص، اسی طرح اہلِ بیت، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، انبیاء علیہم السلام یا اولیائے عظام رحمہم اللہ کے باب میں افراط و تفریط دونوں مذموم ہیں۔

عملی زندگی میں بھی یہی میزان مطلوب ہے، عبادت میں اس قدر انہماک کہ حقوق العباد ضائع ہو جائیں، یہ بھی تجاوز ہے اور دنیا میں ایسا انہماک کہ نماز و روزہ پسِ پشت چلے جائیں، یہ بھی کوتاہی ہے، مال خرچ کرنے میں اسراف اور بخل دونوں انتہائیں ہیں، استقامت کا راستہ وہ ہے جس میں بندہ شریعت کے مقررہ حدود کے اندر رہ کر اعتدال کے ساتھ زندگی گزارے۔

استقامت کا شرعی مفہوم: حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے اسلام کے بارے میں ایسی بات بتا دیجیے کہ پھر کسی سے پوچھنے کی حاجت نہ

رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (صحیح مسلم، ترمذی، ابن ماجہ) یعنی اللہ پر ایمان کا اقرار کرو، پھر اس پر ڈٹ جاؤ، اس ارشاد میں پورے دین کا خلاصہ آگیا، کیونکہ جو شخص احکام کی پابندی اور منہیات سے اجتناب میں ثابت قدم نہ رہے، وہ استقامت سے ہٹ جاتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا (الاحقاف: ۱۳) یعنی جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر اسی پر جم گئے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ پورے قرآن میں نبی کریم ﷺ پر اس آیت سے زیادہ گراں کوئی آیت نازل نہ ہوئی، اسی لیے جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ پر بڑھاپا جلد آگیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: شَيَّبَتْنِي هُودٌ وَأَخَوَاتُهَا (ترمذی، مستدرک حاکم) یعنی سورۃ ہود اور اس جیسی سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا": استقامت اختیار کرو، اگرچہ پوری طرح اس کا حق ادا نہ کر سکو اور جان لو کہ تمہارے اعمال میں سب سے افضل نماز ہے" (ابن ماجہ، مسند احمد)

اہلِ سلوک کے نزدیک استقامت: امام ابو القاسم قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ استقامت وہ درجہ ہے جس پر تمام کمالات کی بنیاد قائم ہے، جس کے احوال میں استقامت نہ ہو، اس کی سعی بارآور نہیں ہوتی، صوفیہ نے استقامت کے مراتب بیان کیے ہیں: نفس کی تہذیب، قلب کی صفائی اور باطن کی یکسوئی، بعض نے کہا کہ استقامت یہ ہے کہ بندہ رسم و عادت سے نکل کر خلوصِ کامل کے ساتھ اللہ کے حضور کھڑا ہو جائے۔ شبلی رحمہ اللہ کے نزدیک استقامت یہ ہے کہ قیامت کا تصور ہر وقت پیشِ نظر رہے۔ (رسالہ قشیریہ)

آیت کا مجموعی پیغام: آیت میں پہلے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا: "آپ اس طرح ثابت قدم رہیں جیسے آپ کو حکم دیا گیا ہے" یعنی نہ اپنی طرف سے اضافہ، نہ کمی، پھر فرمایا: "اور وہ بھی جو آپ کے ساتھ توبہ کر چکے ہیں" گویا استقامت صرف نبی کا فریضہ نہیں بلکہ پوری امت کا شعار ہے، اس کے بعد

تنبیہ فرمائی: "اور حدود سے تجاوز نہ کرو" کیونکہ حدودِ شریعت سے تجاوز ہی طغیان ہے، یہ خطاب اگرچہ نبی کریم ﷺ کو ہے مگر اس سے مقصود امت کو سمجھانا ہے، کیونکہ نبی معصوم ہوتے ہیں، وہ ایک چھوٹا سا گناہ بھی نہیں کرسکتے چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کو غضب وغصہ دلانے والا کوئی کام کریں، یہاں کچھ مفسرین نے اس طرح کا مفہوم بیان کیا ہے کہ طبیعتوں پر بوجھ آتا ہے، اظہار بیان میں انہوں نے کوتاہی کی ہے۔

إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ: اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے، اس میں تسلی بھی ہے اور تنبیہ بھی، جو ثابت قدم رہے گا وہ اس کی نگاہِ رحمت میں ہوگا اور جو حد سے بڑھے گا وہ اس کی گرفت سے بچ نہیں سکے گا، یہ آیت درحقیقت پورے دین کا نچوڑ ہے، ایمان، اعتدال، اطاعت اور دوام، یہی استقامت ہے اور یہی کامیابی کی راہ۔

وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ: آپ لوگ ظالم کافروں کی طرف ذرا بھی مائل نہ ہوں، نہ خوشامد کے طور پر، نہ قلبی مودّت کے طور پر اور نہ کسی مصلحت کے نام پر ایسا جھکاؤ اختیار کریں، جو حق کے وقار کو مجروح کردے، کیونکہ حق سے معمولی سا انحراف بھی انجام کے اعتبار سے ہولناک ہوسکتا ہے، اگر تم نے ان کی باطل روش کے ساتھ نرمی اور مداہنت کا رویّہ اپنایا تو اس میلان کا وبال تمہیں آگ کی صورت میں گھیر لے گا۔

وَلَا تَرْكَنُوا رکون کی حقیقت کسی چیز سے سکون حاصل کرنا، اس پر اعتماد کرنا، اس کی طرف جھکنا اور اس پر راضی ہونا ہے، حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے ساتھ محبت نہ کرو اور ان کی اطاعت نہ کرو۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: ان کی طرف جھکاؤ اختیار نہ کرو۔ ابوالعالیہ رحمہ اللہ نے کہا: ان کے اعمال کو پسند نہ کرو، یہ تمام کے تمام قریب قریب ہیں۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: یہاں رکون سے مراد مداہنت ہے اور وہ یہ ہے کہ ان پر ان کے کفر کو وہ ناپسند نہ کرے۔ (قرطبی)

وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یاد رکھو! اللہ کے سوا

تمہارا کوئی کارساز نہیں جو تمہیں اس انجام سے بچا سکے، جب اس کی ناراضی آ گئی تو نہ کوئی حمایتی کام آئے گا، نہ کوئی مددگار دستِ تعاون بڑھا سکے گا، پھر نہ تمہیں پناہ ملے گی، نہ نصرت۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ظلم وجور کی ممانعت اور حرمت کے لیے اس آیت میں وہ انتہائی شدت ہے جو زیادہ تصور میں لائی جاسکتی ہے کیونکہ ظالموں کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلق ہی کو نہیں بلکہ ان کی طرف ادنی درجہ کے میلان اور جھکاؤ اور ان کے پاس بیٹھنے کو بھی اس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ (تفسیر بیضاوی) امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اس عالم سے زیادہ مبغوض نہیں جو اپنی دنیوی مفاد کی خاطر کسی ظالم سے ملنے کے لیے جائے (مظہری)۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل کفر اور اہل معصیت اور اہل بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے، بجز اس کے کہ کسی مجبوری سے ان سے ملنا پڑے اور حقیقت یہی ہے کہ انسان کی صلاح وفساد میں سب سے بڑا دخل صحبت اور ماحول کا ہوتا ہے، اسی لیے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے ان دونوں آیتوں کے دو لفظوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے دین کو دو حرف لاَ کے اندر جمع کر دیا ہے، ایک پہلی آیت میں لَا تَطْغَوْا اور دوسرا دوسری آیت میں لَا تَرْكَنُوْٓا، پہلے لفظ میں حدود شرعیہ سے نکلنے کی اور دوسرے لفظ میں برے لوگوں کی صحبت کی ممانعت ہے اور یہی سارے دین کا خلاصہ ہے۔ (معارف القرآن)

نکتہ: موفق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے امام کے پیچھے نماز پڑھی، جب اس نے یہ آیت پڑھی تو اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی، جب افاقہ ہوا تو ان سے پوچھا، کیا ہوا تو اس نے کہا یہ تو ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ظالموں کی طرف جھکنے والے ہیں، ظالم کا کیا حال ہو گا؟ (مدارک التنزیل)

یہ آیت دراصل ایمان کی غیرت اور کردار کی استقلال کا مطالبہ کرتی ہے: باطل کے سامنے جھکاؤ نہیں، ظلم کے ساتھ سمجھوتا نہیں اور حق کے اصولوں پر کوئی سودا نہیں، کیونکہ انجام کار فیصلہ اسی ذات کے ہاتھ میں ہے جو سب کچھ دیکھ رہی ہے۔

پنجگانہ نماز، نیکیوں سے گناہوں کا مٹ جانا

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے مختصر سی تفسیر بھی کیجیے

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ {۱۱۴} وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ {۱۱۵} هود.

جواب ترجمہ: اور دن کے دونوں سروں (یعنی صبح و شام) کے اوقات میں اور رات کی چند (پہلی) ساعات میں نماز پڑھا کرو۔ کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ان کے لئے نصیحت ہے جو نصیحت قبول کرنیوالے ہیں۔ اور آپ صبر کیجئے کیونکہ اس میں شک نہیں کہ اللہ اچھے کام والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دن کے کناروں پر واقع نمازیں ادا کیجیے، مثلاً صبح اور عشاء کی نماز ہے، اسی طرح صبح، ظہر اور عصر کی نماز ہے، زُلَفًا کا مطلب ہے کہ رات کے ایک حصہ میں یعنی مغرب اور عشاء کی نماز، نیکیاں انسانی گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں، جیسے پانچ اوقات کی نمازیں ادا کرنے سے انسان کے چھوٹے چھوٹے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، یہ نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے پیغام نصیحت ہے۔

شان نزول: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا پھر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو اس کی خبر دی تو اللہ نے یہ آیت وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ، نازل فرمائی۔ تو اس شخص نے پوچھا کیا یہ میرے لیے خاص طور پر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا بلکہ تمام امت کے لیے ہے۔

ابو الالیسر بن عمرو سے روایت ہے کہ میرے پاس ایک عورت کھجور خریدنے آئی میں نے کہا گھر میں اس سے عمدہ کھجور ہے تو وہ میرے ساتھ میرے گھر آگئی میں اس کی طرف جھک گیا اور اس کا بوسہ لے لیا پھر میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے آپ کے سامنے یہ ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو نے اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے جانے والے کی بیوی کے ساتھ یہ سلوک کیا؟

اور پھر اپنا سر مبارک دیر تک جھکائے رکھا یہاں تک کہ اللہ نے آپ کی طرف یہ وحی بھیجی وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ، اور نماز قائم کیجیے دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے کچھ حصوں میں، بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ: آپ اُس راہ پر ثابت قدم رہنے میں صبر کیجیے جس کا حکم آپ کو دیا گیا ہے، خواہ وہ استقامت ہو یا دیگر اوامرِ الٰہی کی بجاآوری، اسی طرح اُن کاموں سے رکنے پر بھی صبر کیجیے جن سے منع کیا گیا ہے، خصوصاً سرکشی، حد سے تجاوز اور ظالموں کی طرف میلان سے، کیونکہ راہِ حق پر چلنا محض ایک وقتی جذبہ نہیں بلکہ مستقل مزاجی اور ضبطِ نفس کا تقاضا کرتا ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کا اجر ہرگز ضائع نہیں کرتا، وہ اُن کے اعمال کو رد نہیں فرماتا بلکہ ان کی بہترین کاوشوں کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے اور اُنہیں ایسا اجر عطا فرماتا ہے جو اُن کے اعمال سے بھی بڑھ کر حسن و کرم کا مظہر ہوتا ہے۔

یہ آیت اہلِ ایمان کو یہ یقین دلاتی ہے کہ صبر اور احسان کبھی رائیگاں نہیں جاتے، ربِّ کریم کی بارگاہ میں ہر مخلص کوشش محفوظ ہے اور اُس کی جزا یقیناً مل کر رہتی ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے نیز بتائیے کہ اُولُوْا بَقِيَّةٍ کا کیا معنیٰ ہے؟

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ {۱۱۶} ھود.

جواب ترجمہ: سو جو امتیں تم سے پہلے گزری ہیں ان میں ایسے سمجھدار لوگ کیوں نہ ہوئے جو زمین میں فساد کرنے سے روکتے بجز چند آدمیوں کے جن کو ہم نے عذاب سے بچالیا۔ اور جن لوگوں نے ظلم کی راہ اختیار کی وہ اس عیش و عشرت کے پیچھے پڑے رہے جس میں وہ تھے اور یہ لوگ مجرم تھے۔

تفسیر: شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں یہ پچھلوں کا حال سنا کر امت محمدیہ کو ابھارا گیا

ہے کہ ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے بکثرت موجود رہنے چاہیں۔ گزشتہ قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ عام طور پر لوگ عیش و عشرت کے نشہ میں چور ہو کر جرائم کا ارتکاب کرتے رہے اور بڑے بااثر آدمی جن میں کوئی اثر خیر کا باقی نہیں تھا انہوں نے منع کرنا چھوڑ دیا، اس طرح کفر وعصیان اور ظلم وطغیان سے دنیا کی جو حالت بگڑ رہی تھی اس کا سنوارنے والا کوئی نہ رہا۔ چند گنتی کے آدمیوں نے امر بالمعروف کی کچھ آواز بلند کی مگر نقار خانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ منع کرنے والے عذاب سے محفوظ رہے باقی سب قوم تباہ ہو گئی۔

شاہ عبد القادر صاحب لکھتے ہیں نیک لوگ غالب ہوتے تو قوم ہلاک نہ ہوتی۔ تھوڑے تھے سو آپ بچ گئے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ جب ظالم کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے نہ روکا جائے اور لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ترک کر بیٹھیں، تو قریب ہے کہ خدا تعالیٰ ایسا عام عذاب بھیجے جو کسی کو نہ چھوڑے (العیاذ باللہ)۔

أُوْلُوا بَقِيَّةٍ کا مطلب ہے خیر وصلاح والے، دین وفضل والے لوگ۔ حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں اس آیت میں اہل الرائے اور سمجھ دار لوگوں کو لفظ أُوْلُوا بَقِيَّةٍ سے تعبیر کیا ہے، بقیہ کا لفظ باقی ماندہ چیز کیلئے بولا جاتا ہے، اور انسان کی عادت یہ ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہوتی ہے اس کو ہر حال میں اپنے لئے محفوظ اور باقی رکھنے کا اہتمام کرتا ہے، ضرورت پڑنے پر دوسری ساری چیزیں قربان کر دیتا ہے مگر اس کو نہیں دیتا، اسی لئے عقل و بصیرت کو بقیہ کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ عزیز ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے أُوْلُوا بَقِيَّةٍ کا معنٰی کیا ہے اھل اطاعت، اہل دین، اہل عقل وبصر۔ (تفسیر قرطبی)

ملک ظلم وستم سے نہیں چل سکتا

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَى بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ {۱۱۷} هود.

جواب ترجمہ: اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو جبکہ وہاں کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں ازراہ ظلم تباہ کردے۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں ظلم وجور کا کوئی امکان نہیں، جن کو ہلاک کیا جاتا ہے وہ اسی کے مستحق ہوتے ہیں اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے اور مصلحون سے مراد وہ لوگ ہیں جو باوجود مشرک کافر ہونے کے معاملات اور اخلاق اچھے رکھتے ہیں، کسی کو نقصان و ایذاء نہیں پہنچاتے، جھوٹ نہیں بولتے، دھوکہ نہیں دیتے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ دنیا کا عذاب کسی قوم پر محض ان کے مشرک کافر ہونے کی وجہ سے نہیں آتا جب تک کہ وہ اعمال واخلاق میں بھی ایسے کام نہ کرنے لگیں جن سے زمین میں فساد پھیلتا ہے، پچھلی جتنی قوموں پر عذاب آئے ان کے خاص خاص اعمال بد اس کا سبب بنے، نوح علیہ السلام کی قوم نے حضرت نوح علیہ السلام کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں، قوم شعیب علیہ السلام نے ناپ تول میں کمی کرکے فساد پھیلایا، قوم لوط علیہ السلام نے بدترین قسم کی بدکاری کو شیوہ بنایا، قوم موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام نے اپنے پیغمبروں پر ظلم ڈھائے، قرآن کریم نے دنیا میں ان پر عذاب آنے کا سبب انہی اعمال وافعال کو بتلایا ہے، نرے کفر وشرک کی وجہ سے دنیا میں عذاب نہیں آتا اس کی سزا تو جہنم کی دائمی آگ ہے، اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ ملک وسلطنت کفر وشرک کے ساتھ چل سکتے ہیں مگر ظلم وجور کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ (معارف القرآن)

اختلافِ مذموم اور اختلافِ محمود

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ {۱۱۸} اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ {۱۱۹}

هود

جواب ترجمہ: اور اگر آپ کا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی جماعت بنا دیتا اور وہ برابر اختلاف میں رہیں گے۔ مگر جس پر آپ کا رب رحم فرمائے اور اللہ نے انہیں اسی لیے پیدا فرمایا اور آپ کے رب کی بات پوری ہو گی کہ میں جہنم کو جنات سے اور انسانوں سے دونوں جماعتوں سے بھر دوں گا۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ: ارشاد ہوتا ہے اور اگر آپ کا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا، یعنی یا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا یا سب کو گمراہی پر چھوڑ دیتا، یا یوں کہ سب کو ایک ہی دینِ حق پر متفق کر دیتا کہ کوئی اختلاف باقی نہ رہتا، مگر حکمتِ الٰہی نے یہ نہ چاہا، چنانچہ فرمایا: اور وہ ہمیشہ اختلاف ہی میں رہیں گے، کوئی یہودی ہے، کوئی نصرانی، کوئی مجوسی، کوئی مشرک اور کوئی مسلمان، ادیان، افکار اور طریقوں کی یہ رنگا رنگی انسانی تاریخ کا مستقل عنوان ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس اختلاف سے مراد اہلِ حق اور اہلِ باطل کا باہمی فرق ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **اِفْتَرَقَتِ الْيَهُودُ عَلَى إِحْدَى وَسَبْعِينَ فِرْقَةً أَوِ اثْنَتَيْنِ وَسَبْعِينَ وَالنَّصَارَى كَذٰلِكَ وَسَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِينَ فِرْقَةً**، یہود اکہتر یا بہتر فرقوں میں بٹ گئے، نصاریٰ بھی اسی طرح اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو گی۔ (سنن ابی داود، سنن ترمذی) ایک روایت میں ہے کہ بہتر جہنم میں ہوں گے اور ایک جنت میں، اور وہ "جماعت" ہے (سنن ابی داود)۔ محدثین نے وضاحت کی کہ یہ فرقے ملتِ اسلامیہ سے خارج نہیں، بلکہ اہلِ بدعت و اہواء ہیں، جبکہ نجات پانے والا گروہ وہ ہے جو سنت اور جماعت کے ساتھ وابستہ رہے، قول و فعل میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرے۔ پھر ارشاد ہوا

إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ: مگر وہ جن پر آپ کے رب نے رحم فرمایا، یعنی اہلِ رحمت اختلاف کی تاریکیوں میں نہیں بھٹکتے، اللہ انہیں توفیق و ہدایت عطا فرماتا ہے، وہ حق پر مجتمع رہتے ہیں۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: لوگ مختلف ادیان میں بٹے رہتے ہیں، مگر جن پر رب کی رحمت ہو وہ اختلاف سے محفوظ رہتے ہیں۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے تو تمام انسانوں کو زبردستی قبول اسلام پر مجبور کر ڈالتے سب کے سب مسلمان ہی ہو جاتے ان میں کوئی اختلاف نہ رہتا مگر بتقاضائے حکمت اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کسی کو کسی عمل پر مجبور نہیں کرتے بلکہ اس نے انسان کو ایک قسم کا اختیار سپرد کر دیا ہے اس کے ماتحت وہ اچھا یا برا جو چاہے عمل کر سکتا ہے اور انسان کی طبائع مختلف ہیں اس لیے راہیں مختلف ہوتی ہیں اور عمل مختلف ہوتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ہمیشہ دین حق سے اختلاف کرتے ہی رہیں گے بجز ان لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی، یعنی انبیاء علیہم السلام کا اتباع کرنے والے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف سے مراد اس جگہ دین حق اور تعلیم انبیاء علیہم السلام کی مخالفت ہے، اجتہادی اختلاف جو ائمہ دین اور فقہاء اسلام رحمہم اللہ میں ہونا ناگزیر ہے اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہوتا چلا آیا ہے، وہ اس میں داخل نہیں، نہ وہ رحمت الٰہی کے خلاف ہے بلکہ مقتضائے حکمت و رحمت ہے، جن حضرات نے ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے اختلاف کو اس آیت کی رو سے غلط، خلاف رحمت قرار دیا ہے، یہ خود سیاق آیت کے بھی خلاف ہے اور صحابہ و تابعین کے تعامل کے بھی۔ (معارف القرآن)

وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ: اور اسی لیے انہیں پیدا کیا، اس جملے کی تفسیر میں اہلِ علم کے اقوال مختلف ہیں، بعض نے کہا: اختلاف کے لیے پیدا کیا؛ بعض نے کہا: رحمت کے لیے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اللہ نے لوگوں کو دو گروہوں میں پیدا کیا، ایک وہ جن پر رحمت ہو گی، وہ اختلاف سے بچے رہیں گے اور دوسرے وہ جو اختلاف میں پڑیں گے اور شقاوت کے مستحق ہوں گے، امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا گیا تو فرمایا: اللہ نے انہیں پیدا کیا تاکہ ایک گروہ جنت میں ہو اور ایک جہنم میں۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ: اسی مفہوم کی تائید میں فرمایا، اور آپ کے رب کا فیصلہ پورا ہو کر رہے گا کہ میں جہنم کو جنّوں اور انسانوں سے بھر دوں گا، یعنی ازل میں جو حکم صادر ہو چکا، وہ بدلنے والا نہیں، یہ اس کی حکمت اور عدل کا تقاضا ہے کہ جو لوگ حق کو

چھوڑ کر باطل کی راہوں پر چلیں، وہ اپنے انجام کو پہنچیں۔

اہلِ علم نے یہ بھی بیان کیا کہ جوں جوں لوگ انبیاء اور آسمانی کتابوں کی پیروی سے دور ہوتے گئے، اختلاف بڑھتا گیا، قرآن نے اجتماع و اتحاد کا حکم دیا :وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران:۱۰۳) اور تفرقہ سے منع فرمایا، پس جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے قریب رہے، وہ اختلاف سے نسبتاً محفوظ رہے اور جو جتنا دور ہوا، اتنا زیادہ تشتّت اور پراگندگی میں مبتلا ہوا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اختلاف انسانی دنیا کی آزمائش ہے، مگر رحمتِ الٰہی ان لوگوں کا حصہ ہے جو حق کو تھام لیتے ہیں، اللہ نے اہلِ باطل کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور اہلِ حق کو اپنی ہدایت سے نوازا، انجام کار فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے، ایک گروہ سعادت مند، دوسرا شقی، ایک جنت کی طرف، دوسرا جہنم کی طرف، یہی سنتِ الٰہی ہے اور اسی میں عدل بھی ہے اور حکمت بھی۔

قصص انبیاء علیہم السلام تسلی: ثبات اور توکل کا پیغام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ {۱۲۰}وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ {۱۲۱} وَانْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ{۱۲۲}وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ{۱۲۳}هود

جواب ترجمہ: اور رسولوں کے قصوں میں سے یہ قصے ہم ایسے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں اور ان قصوں میں آپ کے پاس حق آگیا ہے اور اہل ایمان کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے۔ اور آپ ان لوگوں سے فرما دیجئے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ پر عمل کرتے رہو ہم اپنی جگہ عمل کرتے ہیں۔ تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں۔ اور اللہ ہی کیلئے ہے آسمان کی اور زمین کی غیب کی چیزوں کا علم۔ اور اسی کی طرف تمام امور جمع ہوں گے۔ سو

آپ اس کی عبادت کریں اور اس پر توکل کریں اور آپ کا رب ان کاموں سے غافل نہیں جو تم کرتے ہو۔

وَكُلًّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ: ارشاد ہوتا ہے کہ اے میرے حبیب ﷺ! ہم آپ کو آپ ﷺ سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کے جو واقعات سناتے ہیں، ان کا مقصد محض تاریخ بیان کرنا نہیں، بلکہ آپ ﷺ کے دل کو حق پر مضبوط اور ثابت قدم کرنا ہے، ان قصص میں آزمائشوں کا ذکر بھی ہے اور نصرتِ الٰہی کی بشارت بھی، تاکہ آپ ﷺ جان لیں کہ حق کی راہ ہمیشہ صبر اور استقلال مانگتی ہے، مگر انجام کار فتح اسی کی ہوتی ہے۔

وَجَاءَكَ فِي هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ: اس سورت میں آپ کے پاس وہ حق آچکا ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور اس میں نصیحت بھی ہے، منکروں کے لیے تنبیہ اور اہلِ ایمان کے لیے یاد دہانی، تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ: فرمایا کہ جو لوگ ایمان نہیں لاتے اور اللہ کی توحید کو قبول نہیں کرتے، ان سے صاف کہہ دیجیے: تم اپنی روش پر عمل کرتے رہو، حق سے اعراض اور اس کی مخالفت پر قائم رہو اور ہم بھی اپنی راہ پر ثابت ہیں، ہم حق کو تھامے رہیں گے، اسی کی دعوت دیتے رہیں گے اور اسی پر صبر کریں گے، یہ گویا اعلانِ استقامت ہے، کہ باطل کی کثرت حق والوں کو متزلزل نہیں کر سکتی۔

وَانْتَظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ: اور میرے حبیب ﷺ فرما دیجیے: تم انتظار کرو کہ ہمارے بارے میں کیا ہوتا ہے، ہم بھی منتظر ہیں کہ تمہارے انجام کا فیصلہ کیسے ہوتا ہے؟ وقت خود گواہی دے گا کہ کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔ آخر میں فرمایا کہ

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ: آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ چیز کا علم صرف اللہ کو ہے، کوئی راز، کوئی تدبیر، کوئی نیت اس سے مخفی نہیں، قیامت کے دن تمام امور اسی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے، فیصلہ بھی وہی کرے گا اور حکم بھی اسی کا چلے گا، اس اے میرے حبیب

ﷺ! اسی کی عبادت کیجیے، اسی پر بھروسا رکھیے اور اپنے تمام معاملات اسی کے سپرد کیجیے، آپ ﷺ کا رب ہرگز غافل نہیں جو کچھ لوگ کر رہے ہیں، وہ سب جانتا ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔

یہ آیات دراصل ایمان والوں کے لیے پیغامِ یقین ہیں، حق واضح ہے، انجام یقینی ہے اور ربِّ کائنات کی نگرانی ہر لحظہ قائم ہے، لہٰذا عبادت میں اخلاص، دعوت میں ثبات اور معاملات میں کامل توکل ہی نجات کی راہ ہے۔ الحمدللہ سورۃ ھود کے مضامین پایہ تکمیل کو پہنچے۔

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی، جامعہ رشیدیہ لاہور

اضافات جدیدہ وترمیمات: ۲۵ فروری ۲۰۲۶ء ۷ رمضان المبارک ۱۴۴۷ء ساڑھے آٹھ علی الصبح

سورۃ یوسف (تعارف)

سوال سورۃ یوسف کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ یوسف ترتیبِ قرآنی کے اعتبار سے قرآنِ مجید کی بارہویں سورت ہے، جو اپنے جامع اور مربوط بیان کے باعث غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے، اس کی کل آیات ۱۱۱ ہیں، جب کہ اس میں ۱۲ رکوع ہیں اور سجدۂ تلاوت کی کوئی آیت موجود نہیں، کلمات (الفاظ) کی تعداد تقریباً ۱۷۹۵، اور حروف کی تعداد اندازاً ۷،۳۰۵ بیان کی جاتی ہے، اگرچہ مختلف طباعتوں اور طریقِ شمار کے باعث ان اعداد میں معمولی اختلاف ممکن ہے، یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور مکہ مکرمہ کے دورِ ابتلاء میں نازل ہوئی، جس میں رسولِ اکرم ﷺ اور اہلِ ایمان کو صبر و ثبات کی تسلی اور حسنِ انجام کی بشارت دی گئی۔

سورۃ یوسف قرآنِ حکیم کی اُن منتخب سورتوں میں سے ہے جن میں ایک ہی واقعہ کو ابتدا سے انتہا تک مربوط، مسلسل اور دل نشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے، اسی بنا پر اسے خود قرآن نے "اَحسن القصص" قرار دیا، یہ سورت مکی ہے اور اپنے اندر صبر، عفت، توکل اور حسنِ انجام کا ایسا جامع نقشہ پیش کرتی ہے جو انسانی زندگی کے ہر مرحلے پر رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان محض تاریخی واقعہ نہیں بلکہ ایک زندہ پیغام ہے، ایمان کی پختگی، آزمائش میں استقامت اور اقتدار میں عدل و احسان کا پیغام، اس میں ایک معصوم بچے کے خواب سے آغاز ہوتا ہے اور ایک باوقار حکمران کی معافی پر اختتام۔

شانِ نزول: روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفارِ مکہ نے رسولِ اکرم ﷺ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ انہیں ایک مکمل قصہ سنائیں، اس مطالبے کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی اور یوں ایک ایسا واقعہ بیان کیا گیا جو بیک وقت عبرت بھی تھا اور تسلی بھی۔ اس زمانے میں نبی کریم ﷺ اور اہلِ ایمان شدید آزمائشوں سے گزر رہے تھے، سورۃ یوسف نے آپ ﷺ کے قلبِ مبارک کو تقویت دی کہ جس

طرح یوسف علیہ السلام نے کنویں، غلامی، تہمت اور قید کی تاریکیوں سے گزر کر عزت و اقتدار پایا، اسی طرح حق کے علمبرداروں کے لیے بھی انجام کار نصرت اور غلبہ ہے۔

اہم مضامین: ① نبوی نسب اور کردار کی رفعت: حضرت یوسف، حضرت یعقوب، حضرت اسحاق اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کی پاکیزہ نسل سے تھے، ان کا کردار بچپن سے ہی طہارت، صدق اور حلم کا آئینہ دار تھا، خواب کی تعبیر سے لے کر سلطنت کے انتظام تک ہر مرحلہ ان کی دانائی اور تقویٰ کا مظہر ہے۔

② حسد اور اس کے نتائج: بھائیوں کا حسد اس داستان کا نقطۂ آغاز ہے، یہ حسد انہیں اس حد تک لے جاتا ہے کہ وہ اپنے ہی بھائی کو کنویں میں ڈال دیتے ہیں، سورت یہ بتاتی ہے کہ حسد دلوں کو اندھا کر دیتا ہے اور خاندانوں کو توڑ دیتا ہے۔

③ آزمائش اور صبر: کنویں کی تنہائی، بازارِ مصر میں فروخت ہونا، عزیزِ مصر کے گھر کی آزمائش، تہمت اور قید، یہ سب مراحل یوسف علیہ السلام کے لیے کٹھن امتحان تھے، مگر ہر مرحلے پر انہوں نے صبر جمیل اور عفت و پاکیزگی کی مثال قائم کی، یہی صبر بعد میں ان کی عزت و سربلندی کا سبب بنا۔

④ عفت و پاکیزگی: زلیخا کے فتنے کے موقع پر یوسف علیہ السلام کا یہ کہنا کہ "معاذ اللہ" غیرت ایمانی کا اعلان تھا، یہ واقعہ بتاتا ہے کہ وقتی فائدے کے مقابلے میں دائمی رضا کو ترجیح دینا ہی حقیقی کامیابی ہے۔

⑤ حضرت یعقوب علیہ السلام کا صبر: یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں، مگر زبان سے شکوہ نہ نکلا، انہوں نے فرمایا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ یہ صبر امید سے خالی نہ تھا بلکہ اللہ کی رحمت پر کامل یقین کے ساتھ تھا۔

⑥ تدبیرِ الٰہی اور انجامِ خیر: انسان سازشیں کرتا ہے، مگر فیصلہ اللہ کی تدبیر کا نافذ ہوتا ہے، بھائیوں کی چال، قید کی مشقت اور زمانے کی گردش آخر کار یوسف علیہ السلام کو مصر کے خزانے سونپنے کا ذریعہ بنی، سورت کا مرکزی پیغام یہی ہے کہ اللہ کی تقدیر اپنے بندوں کے لیے بہترین راستہ تراشتی ہے۔

⑦ معافی اور اخوت کی بحالی: اقتدار ملنے کے بعد یوسف علیہ السلام نے انتقام نہیں لیا بلکہ فرمایا، لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ آج تم پر کوئی ملامت نہیں، یہ اعلان اس بات کی دلیل ہے کہ حقیقی عظمت معافی

میں ہے، نہ کہ بدلے میں۔

⑧ نبی کریم ﷺ کے لیے تسلی: جس طرح یوسف علیہ السلام نے مصائب کے بعد عزت پائی، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی یہ سورت بشارت تھی کہ مکہ کی مخالفت اور تکذیب کے بعد مدینہ کی نصرت اور فتح مکہ کی سربلندی مقدر ہے۔

خلاصۂ پیغام: سورۃ یوسف ایمان کی عملی تفسیر ہے، یہ سکھاتی ہے کہ: حسد تباہی لاتا ہے۔ صبر عزت کا راستہ ہے۔ عفت ایمان کی حفاظت ہے۔ اللہ کی تدبیر غالب ہے۔

قرآن کریم عربی زبان میں

سوال قرآن کریم کس زبان میں نازل کیا گیا؟ آیت کریمہ کی روشنی میں وضاحت کیجیے۔

الٓرٰ ○ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ{۲} یوسف.

ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں تمہارے سمجھنے کے لیے نازل کیا۔

سورت کا آغاز حروفِ مقطعات الٓرٰ سے ہوتا ہے، ان حروف کے اسرار و رموز پر اہلِ علم نے مختلف پہلوؤں سے گفتگو کی ہے اور اس سے قبل بھی قرآنِ حکیم کی بعض سورتوں کے آغاز میں ایسے حروف آچکے ہیں، ان کا قطعی مفہوم اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، تاہم مفسرین نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ یہ حروف اس حقیقت کی طرف اشارہ ہیں کہ قرآن انہی معروف حروفِ تہجی سے مرکب ہے جنہیں عرب اپنی روزمرہ گفتگو میں استعمال کرتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز رہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ: اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ یہ آیات ایک روشن اور واضح کتاب کی آیات ہیں، ایسی کتاب جو اپنے مضامین، اپنے اسلوب اور اپنے دلائل کے اعتبار سے نہایت جلی اور آشکار ہے، اس کا بیان شکوک و شبہات کی تاریکیوں کو دور کرتا اور حق کو نمایاں کر دیتا ہے۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: پھر فرمایا گیا کہ ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں

نازل کیا ہے، تاکہ اے اہلِ عرب! تم اس کے معانی کو سمجھ سکو، یعنی یہ کلام تمہاری اپنی زبان میں ہے، تمہارے فہم اور تمہاری ثقافت کے مطابق نازل ہوا ہے، تاکہ تم پر حجت پوری ہو جائے اور تم اس کے پیغام کو براہِ راست دل و دماغ سے قبول کر سکو، گویا ابتدا ہی میں یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ قرآن نہ تو اجنبی زبان کا کلام ہے اور نہ مبہم پیغام، بلکہ ایک روشن، بامعنی اور فہم کے قریب الٰہی ہدایت ہے، جو انسان کو سوچنے، سمجھنے اور حق کو اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ عبرانی یا سریانی زبان میں بھی نازل کر سکتے تھے، لیکن یہ عربی زبان کا اعزاز و افتخار ہے کہ عرش بریں کا سب سے آخری پیام عربی میں نازل کیا گیا، عربی زبان اپنی فصاحت، وسعتِ معانی، ضبط و ترتیب اور شانِ بیان کے اعتبار سے دنیا کی ممتاز ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے، اسی لیے نزولِ قرآن کے لیے اسی زبان کا انتخاب فرمایا گیا، یہ محض لسانی ترجیح نہ تھی بلکہ حکمتِ الٰہی کا تقاضا تھا، رسولِ اکرم ﷺ خود عرب تھے، اس لیے طبعاً اولین مخاطب آپ ﷺ کی اپنی قوم قرار پائی، چنانچہ قرآن ان ہی کی زبان میں نازل ہوا تاکہ وہ اس کے اسرار و معارف کو براہِ راست سمجھ سکیں، اس کے اعجاز کو محسوس کریں اور اس کی حقانیت پر دل سے ایمان لائیں۔

آیتِ کریمہ میں لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ کے الفاظ اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ تمہاری زبان میں قرآن اتارنے کا مقصد یہ ہے کہ تم پہلے اس کے علم و حکمت سے بہرہ مند ہو، اس کی روشنی کو اپنے قلوب میں بساؤ، پھر اسے دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچاؤ، تاریخ نے گواہی دی کہ ایسا ہی ہوا، عرب کی سرزمین سے اٹھنے والی یہ نورانی دعوت رفتہ رفتہ اقوامِ عالم تک پہنچی اور انسانی فکر و تہذیب کو ایک نئی سمت عطا کر گئی۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں، عربی زبان چونکہ تمام زبانوں میں فصیح زبان ہے، تمام زبانوں میں واضح اور وسیع تر مفاہیم کی حامل زبان ہے، یہ ایسی زبان ہے جو معانی کو اس انداز میں ادا کرتی ہے جو دلوں کے اندر اترتے چلے جاتے ہیں، فَلِهٰذَا أنزلَ أَشْرَفُ الْكُتُبِ بِأَشْرَفِ اللُّغَاتِ، عَلَى

أَشْرَفِ الرُّسُلِ، بِسِفَارَةِ أَشْرَفِ الْمَلَائِكَةِ، وَكَانَ ذَلِكَ فِي أَشْرَفِ بِقَاعِ الْأَرْضِ، وَابْتَدَءَ إِنْزَالُهُ فِي أَشْرَفِ شُهُورِ السَّنَةِ وَهُوَ رَمَضَانُ، فَكَمُلَ مِنْ كُلِّ الْوُجُوهِ؛ (ابن کثیر)

قرآن کریم ساری کتابوں میں اشرف کتاب ہے، جسے سب سے اشرف زبان میں، رسولوں میں سب سے زیادہ اشرف نبی پر، فرشتوں میں سب سے اشرف جبریل علیہ السلام کے ذریعے، روئے زمین پر سب سے اشرف مقام پر، تمام مہینوں میں اشرف مہینہ رمضان میں اس کے نزول کا آغاز ہوا، چنانچہ یہ کتاب تمام وجوہ سے مکمل کی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا أَنَا عَرَبِيٌّ وَالْقُرْآنُ عَرَبِيٌّ وَكَلَامُ أَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ (تفسیر در منثور) میں عربی ہوں، قرآن کریم عربی زبان میں ہے، جنت والوں کی زبان عربی ہوگی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عربوں سے تین باتوں کی وجہ سے محبت رکھو، لِأَنِّي عَرَبِيٌّ وَالْقُرْآنُ عَرَبِيٌّ وَكَلَامُ أَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ (در منثور) ایک تو اس لیے کہ میں عربی ہوں، دوسرا یہ کہ قرآن کریم عربی میں ہے، تیسرا یہ کہ جنت والوں کی زبان عربی ہوگی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أُلْهِمَ إِسْمَاعِيلُ هٰذَا اللِّسَانَ الْعَرَبِيَّ إِلْهَاماً (در منثور) حضرت اسماعیل علیہ السلام کو عربی زبان الہام کی گئی تھی۔ امام تفسیر حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم قریش کی زبان میں نازل کیا گیا۔

احسن القصص اور نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی دلیل

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْآنَ ۖ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ {۳} یوسف

جواب ترجمہ: ہم نے جو یہ قرآن آپ کے پاس بھیجا ہے اس کے ذریعہ سے ہم آپ سے سب سے

اچھا قصہ بیان کرتے ہیں۔ جبکہ اس سے پہلے آپ واقف نہ تھے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے حبیب مکرم ﷺ! ہم آپ پر یہ قرآن نازل کر کے آپ کو بہترین قصہ سناتے ہیں، یہ قصہ اپنی صداقت کے اعتبار سے بے مثال ہے، اس کے الفاظ ہر قسم کے خلل سے پاک اور اس کا اسلوب نہایت بلیغ اور دل نشیں ہے، اس میں نہ افسانوی مبالغہ ہے اور نہ روایت کی کمزوری، بلکہ حقائق کی ایسی جامع اور مربوط تصویر ہے جو دلوں کو متاثر اور عقلوں کو مسخر کر لیتی ہے۔

''اَحسن القصص'' فرمانے میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ داستان محض ایک واقعہ نہیں بلکہ ہدایت، حکمت اور عبرت کا خزانہ ہے، اس میں آزمائش و صبر، حسد و معافی، فراق و وصال اور عروج و اقتدار، سب پہلو نہایت حسنِ ترتیب کے ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں۔

وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ: یہاں فرمایا کہ اس قرآن کے نزول سے پہلے آپ ان واقعات سے آگاہ نہ تھے، یعنی یہ علم وحیِ الٰہی کے ذریعے عطا کیا گیا، نہ کہ کسی انسانی ذریعے سے حاصل ہوا، اس میں نبوت کی صداقت کی ایک روشن دلیل بھی موجود ہے کہ ایک امّی نبی ﷺ ایسی دقیق اور مربوط تاریخی تفصیلات بیان فرمائیں جو سابقہ آسمانی روایات سے ہم آہنگ ہوں، یہ خود اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ بیان ربِّ علیم کی طرف سے ہے۔

آیت نے واضح کر دیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام عالم الغیب نہیں ہوتے، عالم الغیب اللہ تعالیٰ ہے، وہ جسے چاہتا ہے غیب کی باتوں سے مطلع فرماتا ہے، یوسف علیہ السلام کا واقعہ، احسن القصص نبی کریم ﷺ کے لیے غیب تھا، اسے اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کے ذریعے آپ ﷺ تک پہنچایا، آپ ﷺ کو حقائق سے آگاہ فرمایا۔ گویا اس آیت میں قرآن کے اعجاز، قصۂ یوسف کے حسنِ بیان اور نبوتِ محمدی ﷺ کی حقانیت تینوں حقیقتیں نہایت لطیف انداز میں جمع کر دی گئی ہیں۔

گیارہ ستارے، سورج اور چاند

سوال حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب میں جو ستارے دیکھے تھے ان کی تعداد کتنی تھی؟ وہ ستارے کس حال میں دیکھے گئے تھے؟ آیت کی روشنی میں فرمائیے۔

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَباً وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ {۴} یوسف.

جواب ترجمہ: جب یوسف نے اپنے والد سے کہا کہ ابا میں نے (خواب میں) گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا۔ دیکھتا (کیا) ہوں کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ: اللہ تعالیٰ اپنے رسولِ کریم ﷺ کو اس واقعے کی خبر دیتے ہیں کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدِ گرامی حضرت یعقوب علیہ السلام سے عرض کیا: ”اے ابّا جان! میں نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں“۔

یہ خواب ایک معمولی منظر نہ تھا بلکہ ایک عظیم بشارت کا پیش خیمہ تھا، اللہ تعالیٰ نے نو عمری ہی میں یوسف علیہ السلام کو ایسے اشارات دکھا دیے جو ان کے مستقبل کی رفعت، عزت اور اقتدار کی خبر دے رہے تھے، گیارہ ستاروں سے مراد ان کے گیارہ بھائی اور سورج و چاند سے والدین کی طرف اشارہ تھا، جو وقت آنے پر ان کے سامنے تعظیم و تکریم کے ساتھ جھکیں گے۔

حضرت یوسف کے خواب میں ذکر کیے گئے گیارہ ستارے دراصل ان کے گیارہ بھائی ہیں، جن کے نام مفسرین کرام کے مطابق روبیل، شمعون، لاوی، یہودا، دان، نفتالی، جاد، آشر، یساکر، زبولون اور بنیامین ہیں اور ان میں حضرت بنیامین یوسف کے حقیقی بھائی تھے، اس خواب میں سورج اور چاند والدین کی نمائندگی کرتے ہیں اور یوسف کی والدہ راحیل بنت لابان ہیں، جو حضرت یعقوب کی زوجہ تھیں، بعض مفسرین کرام کے نزدیک چونکہ حضرت راحیل کا انتقال یوسف کی کم سنی میں ہو چکا تھا، اس لیے خواب میں سجدہ کرنے والوں میں ان کی خالہ یا خاندان کے دیگر افراد کی شمولیت کی

طرف اشارہ بھی ممکن ہے، یہ تمام تفصیلات تاریخی اور تفسیری روایتوں پر مبنی ہیں تاکہ خواب کے معنوی مفہوم اور الٰہی بشارت کو واضح کیا جاسکے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے دو شادیاں کی تھیں، ان کی پہلی بیوی راحیک بنت لابان تھیں، جو حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت بنیامین علیہ السلام کی حقیقی والدہ تھیں، دوسری بیوی لیہا بنت لابان تھیں، جو یعقوب کی چچی کی بیٹی تھیں اور باقی دس بھائیوں کی والدہ ہیں، اس طرح حضرت یوسف اور حضرت بنیامین کی پیدائش راحیل سے ہوئی، جب کہ گیارہ بھائیوں کی پیدائش لیہاء سے ہوئی۔

یعقوب کی بیوی لیہاء سے یکے بعد دیگرے متعدد بیٹے پیدا ہوئے، جو یوسف علیہ السلام کے بڑے بھائی بنے، اس دوران راحیل بانجھ تھیں اور ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، اس لیے یوسف اور بنیامین بعد میں پیدا ہوئے، قدیم مصادر جیسے موسوعۃ الملل والأدیان، الکامل فی التاریخ، المرشد إلی فہم أشعار العرب، اور مرآۃ الزمان میں یہ ترتیب صاف بیان کی گئی ہے کہ لیہاء کی اولاد پہلے آئی اور راحیل نے دعا کے بعد اللہ کی رحمت سے یوسف اور پھر بنیامین کو جنم دیا، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یوسف اور بنیامین راحیل کی اولاد ہیں اور وہ اپنے بڑے بھائیوں سے چھوٹے ہیں، کیونکہ پیدائش کے لحاظ سے لیاء کی اولاد نے سبقت حاصل کی اور راحیل کی اولاد بعد میں شامل ہوئی، اس طرح خاندان کی ترتیب اور بھائیوں کی عمر کے فرق میں کوئی تضاد نہیں رہتا، بندہ کو ایک عرصہ تک بہت ہی پریشانی رہی، لیکن اب جدید ذرائع معلومات سے بار بار تحقیق کے بعد یہ بات واضح ہوئی ہے۔ الحمد للہ علی ذالک

یہ خواب دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوری تسلی اور آئندہ عظمت کی خوشخبری تھی، اگرچہ آگے چل کر انہیں حسد، جدائی، غلامی اور قید جیسے سخت مراحل سے گزرنا تھا، مگر اس ابتدائی خواب نے گویا ان کے مقدر کی سمت متعین کر دی تھی۔ اس آیت میں یہ سبق بھی مضمر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو ابتدا ہی میں اپنی عنایت کے آثار دکھا دیتا ہے، تاکہ آزمائشوں کے ہجوم میں بھی امید کی شمع روشن رہے اور یقین کی بنیاد متزلزل نہ ہو۔

نکتہ: یوسف علیہ السلام کے خواب میں گیارہ ستاروں کو ان کے بھائیوں اور سورج و چاند کو والدین کی علامت بنانا محض علامتی تعبیر نہیں، بلکہ مفسرین رحمہم اللہ نے اس کے پیچھے گہرا تفسیری نکتہ بیان کیا ہے۔ خواب میں بھائیوں کی نمائندگی ستاروں سے کی گئی کیونکہ وہ عدد میں زیادہ اور ایک جماعت کی صورت رکھتے تھے اور ستاروں کی طرح ایک ساتھ طلوع ہونے والے تھے، والدین کی نسبت سورج و چاند کی طرف کی گئی تاکہ ان کی عظمت، شرافت اور رہنمائی کا مقام ظاہر ہو، جیسا کہ ابن عطیہ رحمہ اللہ نے لکھا کہ قمر (چاند) باپ کی علامت اور شمس (سورج) ماں کی علامت ہے، کیونکہ یہ دونوں اجسام باقی ستاروں پر فضیلت رکھتے ہیں۔

زبدۃ التفسیر میں بتایا گیا کہ سورج و چاند کو آخر میں ذکر کرنے کا مقصد انہیں خصوصی مقام دینا اور ان کی فضیلت واضح کرنا ہے، والدین اولاد کے لیے ہدایت، روشنی اور تربیت کے سرچشمے ہوتے ہیں، اس لیے انہیں سورج و چاند کی شکل میں دکھانا نہایت موزوں استعارہ ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی ذکر کیا کہ چونکہ یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ راحیل وفات پا چکی تھیں، چاند کی تعبیر خالہ سے کی گئی جنہوں نے ان کی پرورش کی، خلاصہ یہ کہ خواب میں بھائیوں کی کثرت و مشابہت، ستارے، والدین کی عظمت و روشنی، سورج و چاند اور والدین کے مقام کو بلند دکھانے کے لیے ان کا ذکر الگ اور مؤخر کیا گیا، یہ تعبیر نہ صرف خواب کی وضاحت کرتی ہے بلکہ خاندان میں تربیت، راہنمائی اور والدین کے مقام کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

خواب کا تذکرہ بھائیوں سے نہ کرنے کی حکمت

سوال حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹے یوسف علیہ السلام کو یہ حکم کیوں دیا تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کے سامنے اس خواب کا تذکرہ نہ کریں، اس آیت کی روشنی میں بتائیں۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ {۵} یوسف

جواب ترجمہ: انہوں نے کہا کہ بیٹا اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا نہیں تو وہ تمہارے حق میں کوئی فریب کی چال چلیں گے۔ کچھ شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

سمجھدار اور دانا باپ نے بیٹے کو آگاہ کر دیا تھا کہ اگر وہ اپنے بھائیوں سے اس خواب کا تذکرہ کریں گے تو برادران یوسف حسد کی آگ میں جلنے لگیں گے، وہ اس خواب کی تعبیر جان جائیں گے کہ ان گیارہ ستاروں سے مراد وہی برادران یوسف ہیں، سورج سے مراد ان کی والدہ اور چاند سے مراد ان کے والد یعقوب علیہ السلام ہیں اس لیے حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اس خواب کے بارے میں انہیں پتا ہی نہ چلے ورنہ وہ کوئی حیلہ بہانہ کر کے یوسف کی ہلاکت کے درپے ہی نہ ہو جائیں۔

فضیلتِ یوسف علیہ السلام، بھائیوں کا حسد اور والد کی محبت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ {٦} لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ {٧} اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ {٨} اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ {٩} قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ {١٠} قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ {١١} اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ {١٢} یوسف

جواب ترجمہ: اور تمہارا رب اسی طرح تمہیں منتخب فرمالے گا۔ اور تمہیں خوابوں کی تعبیر کا علم دے گا اور وہ تم پر اور یعقوب کی آل پر اپنی نعمت پوری فرما دے گا۔ جیسا کہ اس نے اپنی نعمت اس سے پہلے تمہارے دونوں دادوں ابراہیم اور اسحاق پر پوری فرمادی۔ بیشک آپ کا رب جاننے والا حکمت

والا ہے۔ بلاشبہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں سوال کرنے والوں کیلئے دلائل ہیں۔ جب کہ ان کے بھائیوں نے یوں کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم سب مل کر پوری ایک جماعت ہیں۔ بلاشبہ ہمارے والد کھلی غلطی پر ہیں۔ یوسف کو قتل کر دو یا اسے کسی زمین میں ڈال دو۔ ایسا کرنے سے تمہارے والد کا رخ تمہاری طرف ہو جائے گا اور اس کے بعد تم صلاح والے بن جاؤ۔ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو اور اسے کسی اندھیرے کنویں میں ڈال دو تاکہ اس کو قافلہ والوں میں سے کوئی مسافر اٹھالے۔ اگر تم کو کرنا ہی ہے۔ کہنے لگے کہ اے ہمارے ابا کیا بات ہے آپ یوسف کے بارے میں ہم پر اطمینان نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں۔ آپ اس کو کل ہمارے ساتھ بھیج دیجئے۔ تاکہ وہ ہمارے ساتھ کھائے اور کھیلے اور ہم اس کی پوری حفاظت کرنے والے ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ: یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر میں اللہ تعالیٰ نے انہیں منتخب فرمایا تاکہ وہ خوابوں کی تعبیر سیکھیں اور نبوت کے سلسلے میں کامل نعمت کے حقدار بنیں، جیسا کہ یہ نعمت پہلے ان کے والدین، ابراہیم اور اسحاق علیہما السلام پر پوری ہوئی تھی۔ رب تعالیٰ اپنی مخلوق کے بارے میں عالم اور اپنے تدبیر کے امور میں حکیم ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ: یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی کہانی میں عبرت اور نصیحتیں چھپی ہیں، جو اہل غور و فکر کے لیے سبق آموز ہیں۔

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا: جب بھائیوں نے آپس میں کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کے نزدیک ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں، تو یہ ان کے لیے باعث غصہ اور حیرت تھی کہ اللہ نے انہیں ہم پر کس طرح فضیلت دی، حالانکہ انہیں ایسا کوئی واضح سبب دکھائی نہ دیا۔

اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ: پھر انہوں نے منصوبہ بنایا کہ یا تو یوسف کو قتل کر دیں یا اسے کسی دور دراز زمین میں غائب کر دیں تاکہ والد کا محبت بھرا دل مکمل رہے

اور وہ بعد میں توبہ کر کے نیک قوم بن جائیں۔

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ: تاہم ایک بھائی نے کہا کہ قتل کرنے کے بجائے اسے کسی گہری کھائی میں ڈال دیں تاکہ کوئی مسافر اسے اٹھالے، کیونکہ یہ قتل کے مقابلے میں کم ضرر رسانی کا طریقہ ہے۔

قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَى يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ: جب انہوں نے یوسف کو دور کرنے کا فیصلہ کیا، تو وہ اپنے والد یعقوب علیہ السلام سے عرض کرنے لگے کہ ہمیں کیوں نہ یوسف کی حفاظت کرنے والا بنایا جائے؟ ہم اس کا خیال رکھیں گے اور ہر نقصان سے محفوظ رکھیں گے تاکہ وہ آپ کے پاس سالم واپس آئے۔ أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ: انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہمیں اسے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دیجئے تاکہ وہ کھانے اور کھیل کود سے لطف اندوز ہو اور ہم اس کا محافظ بن کر ہر گزرتے خطرے سے اسے محفوظ رکھیں۔ یہ بات نہ صرف بھائیوں کے حسد اور منصوبہ بندی کو واضح کرتا ہے بلکہ یوسف علیہ السلام کی حفاظت میں ان کے بھائیوں کی ابتدائی نیت، والد کی محبت اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کو بھی بیان کرتا ہے۔

یعقوب علیہ السلام کو کیا پریشانی تھی؟

سوال حضرت یعقوب علیہ السلام کو کیا فکر دامن گیر تھی جب ان کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان سے لے کر گئے؟ اس آیت کی روشنی میں وضاحت فرمایئے۔

قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَنْ تَذْهَبُوا بِهِ وَأَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ {۱۳} قَالُوا لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا إِذًا لَخَاسِرُونَ {۱۴} یوسف

جواب ترجمہ: یعقوب نے کہا کہ بیشک مجھے یہ بات رنجیدہ کرتی ہے کہ تم اسے لے جاؤ اور میں اندیشہ کرتا ہوں کہ تم اس سے غافل ہو جاؤ اور اس کو بھیڑیا کھا جائے۔ کہنے لگے کہ اگر اس کو بھیڑیا کھا جائے اور ہماری پوری جماعت ہے تو ہم بالکل ہی خسارہ میں پڑنے والے ہو جائیں گے۔

قَالَ اِنِّیۡ لَیَحۡزُنُنِیۡۤ : نبی اللہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کی اس طلب کا کہ بھائی یوسف کو ہمارے ساتھ سیر کے لیے بھیجئے جواب دیتے ہیں کہ تمہیں معلوم ہے مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ تم اسے لے جاؤ گے مجھ پر اس کی اتنی دیر کی جدائی بھی شاق گزرے گی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس بڑھی ہوئی محبت کی وجہ یہ تھی کہ آپ حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے پر خیر کے نشان دیکھ رہے تھے۔ نبوت کا نور پیشانی سے ظاہر تھا۔ اخلاق کی پاکیزگی ایک ایک بات سے عیاں تھی۔ صورت کی خوبی، سیرت کی اچھائی کا بیان تھی، اللہ کی طرف سے دونوں باپ بیٹوں پر صلوۃ وسلام ہو۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ممکن ہے تم اپنی بکریوں کے چرانے چگانے اور دوسرے کاموں میں مشغول رہو اور اللہ نہ کرے کوئی بھیڑیا آکر اس کا کام تمام کر جائے اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے۔ آہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اسی بات کو انہوں نے لے لیا اور دماغ میں بسالیا کہ یہی ٹھیک عذر ہے، یوسف کو الگ کر کے ابا کے سامنے یہی من گھڑت گھڑ دیں گے۔ اسی وقت بات بنائی اور جواب دیا کہ ابا آپ نے کیا خوب سوچا۔ ہماری جماعت کی جماعت قوی اور طاقتور موجود ہو اور ہمارے بھائی کو بھیڑیا کھا جائے؟ بالکل ناممکن ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر تو ہم سب بیکار نکمے عاجز نقصان والے ہی ہوئے۔

قَالُوۡا لَئِنۡ اَکَلَہُ الذِّئۡبُ وَ نَحۡنُ عُصۡبَۃٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ: جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جانے میں اندیشہ ظاہر کیا اور بھیڑیے کا خدشہ بیان فرمایا تو بھائیوں نے جواب میں کہا: اگر ہماری موجودگی میں بھیڑیے نے یوسف کو کھالیا، حالانکہ ہم ایک مضبوط جماعت ہیں، تو پھر ہم میں کوئی خیر باقی نہ رہے گی، ہم سراسر خسارے میں ہوں گے کہ اپنے بھائی کی حفاظت نہ کر سکے۔

یہ جواب بظاہر یقین دہانی اور حفاظت کا اعلان تھا، مگر اس کے پس پردہ ان کے دلوں میں ایک اور ہی منصوبہ پل رہا تھا، وہ اپنی اجتماعی قوت اور تعداد کو دلیل بنا کر والد کو مطمئن کرنا چاہتے تھے، حالانکہ اصل خطرہ باہر کے درندے سے نہیں بلکہ اندر کے حسد سے تھا، اس آیت میں انسانی نفس کی ایک باریک کیفیت آشکار ہوتی ہے کہ جب دل میں ارادہ کچھ اور ہو تو زبان پر یقین دہانی کے الفاظ آجاتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ دلوں کے بھیدوں سے خوب آگاہ ہے۔

کنویں کی سازش، جھوٹا خون اور صبر جمیل کا آغاز

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ {۱۵}وَجَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ {۱۶}قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ {۱۷}وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ{۱۸} یوسف

جواب ترجمہ: پھر جب یوسف کو لے گئے اور اس پر متفق ہو گئے کہ اسے اندھیرے کنویں میں ڈال دیں اور ہم نے اس کے پاس وحی بھیج دی کہ تم ضرور انہیں یہ بات جتلاؤ گے اور وہ نہیں جانیں گے۔ اور وہ لوگ شام کے وقت روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس آئے۔ کہنے لگے اے ابا جی بلاشبہ بات یہ ہے کہ ہم سب آپس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کیلئے دوڑ لگانے میں مشغول ہو گئے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا سو اسے بھیڑیا کھا گیا۔ اور آپ ہماری بات کا یقین نہیں کریں گے اگرچہ ہم سچے ہوں۔ اور اس کے کرتہ پر جھوٹا خون لگا کر لے آئے۔ یعقوب نے کہا بلکہ بات یہ ہے کہ تمہارے نفسوں نے تمہیں ایک بات بنا کر دی ہے سو میں صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہو گا۔ اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس کے بارے میں اللہ ہی سے مدد طلب کرتا ہوں۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ : سمجھا بجھا کر بھائیوں نے باپ کو راضی کر ہی لیا۔ اور حضرت یوسف کو لے کر چلے جنگل میں جا کر سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ یوسف کو کسی غیر آباد کنویں کی تہ میں ڈال دیں۔ حالانکہ باپ سے یہ کہہ کر لے گئے تھے کہ اس کا جی بہلے گا، ہم اسے عزت کے ساتھ لے جائیں گے۔ ہر طرح خوش رکھیں گے۔ اس کا جی بہل جائے گا اور یہ راضی خوشی رہے گا۔ یہاں آتے ہی غداری شروع کر دی اور لطف یہ ہے کہ سب نے ایک ساتھ دل سخت کر

لیا۔ باپ نے ان کی باتوں میں آکر اپنے لخت جگر کو ان کے سپرد کر دیا۔ جاتے ہوئے سینے سے لگا کر پیار کیا دعائیں دیں اور رخصت کیا۔

باپ کی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی ان سب نے بھائی کو ایذائیں دینی شروع کر دیں برا بھلا کہنے لگے اور تھپڑ تک مارنے سے بھی باز نہ رہے۔ مارتے پیٹتے برا بھلا کہتے، اس کنویں کے پاس پہنچے اور ہاتھ پاؤں رسی سے جکڑ کر کنویں میں گرانا چاہا۔ آپ ایک ایک کے دامن سے چمٹتے ہیں اور ایک ایک سے رحم کی درخواست کرتے ہیں لیکن ہر ایک جھڑک دیتا ہے اور دھکا دے کر مار پیٹ کر ہٹا دیتا ہے مایوس ہو گئے سب نے مل کر مضبوط باندھا اور کنویں میں لٹکا دیا آپ نے کنویں کا کنارا ہاتھ سے تھام لیا لیکن بھائیوں نے انگلیوں پر مار مار کر اسے بھی ہاتھ سے چھڑا لیا۔ آدھی دور آپ پہنچے ہوں گے کہ انہوں نے رسی کاٹ دی، آپ تہ میں جا گرے، کنویں کے درمیان ایک پتھر تھا جس پر آکر کھڑے ہو گئے۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ: عین اس مصیبت کے وقت عین اس سختی اور تنگی کے وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کی جانب وحی کی کہ آپ کا دل مطمئن ہو جائے آپ صبر و برداشت سے کام لیں اور انجام کا آپ کو علم ہو جائے۔ وحی میں فرمایا گیا کہ غمگین نہ ہو یہ نہ سمجھ کہ یہ مصیبت دور نہ ہو گی۔ سن اللہ تعالیٰ تجھے اس سختی کے بعد آسانی دے گا۔ اس تکلیف کے بعد راحت ملے گی۔ ان بھائیوں پر اللہ تجھے غلبہ دے گا۔ یہ گو تجھے پست کرنا چاہتے ہیں لیکن اللہ کی چاہت ہے کہ وہ تجھے بلند کرے۔ یہ جو کچھ آج تیرے ساتھ کر رہے ہیں وقت آئے گا کہ تو انہیں ان کے اس کرتوت کو یاد دلائے گا اور یہ ندامت سے سر جھکائے ہوئے ہوں گے اپنے قصور سن رہے ہوں گے اور انہیں یہ بھی معلوم نہ ہو گا کہ تو وہ ہے۔

چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب برادران یوسف حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو آپ نے تو انہیں پہچان لیا لیکن یہ نہ پہچان سکے، اس وقت آپ نے ایک پیالہ منگوایا اور اپنے ہاتھ پر رکھ کر اسے انگلی سے ٹھونکا، آواز نکلی ہی تھی اس وقت آپ نے فرمایا لو یہ جام تو کچھ کہہ رہا

ہے اور تمہارے متعلق ہی کچھ خبر دے رہا ہے، یہ کہہ رہا ہے تمہارا ایک یوسف نامی سوتیلا بھائی تھا، تم اسے باپ کے پاس سے لے گئے اور اسے کنویں میں پھینک دیا، پھر اسے انگلی ماری اور ذرا سی دیر کان لگا کر فرمایا لو یہ کہہ رہا ہے کہ پھر تم اس کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر باپ کے پاس گئے اور وہاں جا کر ان سے کہہ دیا کہ تیرے لڑکے کو بھیڑیئے نے کھالیا، اب تو یہ حیران ہو گئے آپس میں کہنے لگے ہائے برا ہوا بھانڈا پھوٹ گیا اس جام نے تو تمام سچی سچی باتیں بادشاہ سے کہہ دیں، پس یہی ہے جو آپ کو کنویں میں وحی ہوئی کہ ان کے اس کرتوت کو تو انہیں ان کے بے شعوری میں جتائے گا۔

وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ : جب بھائی اپنے ناپاک منصوبے کو عملی جامہ پہنا چکے تورات کے وقت اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آئے اور آتے ہی رونے لگے، یہ گریہ صدقِ دل کا نہ تھا بلکہ اپنی چال کو کامیاب بنانے کا ایک ہتھیار تھا، تاکہ آنسوؤں کی نمی حقیقت کے آثار کو دھندلا دے اور باپ کا دل ان کے بیان پر یقین کر لے۔

قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ : انہوں نے کہا: اے ہمارے والد! ہم آپس میں دوڑ لگانے اور تیر اندازی میں مشغول ہو گئے تھے اور یوسف کو اپنے سامان اور کپڑوں کے پاس چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ ان کی نگرانی کرے، اتنے میں بھیڑیا آیا اور اسے کھا گیا، پھر انہوں نے خود ہی یہ جملہ بھی بڑھا دیا کہ آپ تو ہماری بات کا یقین نہیں کریں گے، چاہے ہم سچ ہی کیوں نہ کہہ رہے ہوں۔

یہ الفاظ بظاہر معذرت تھے، مگر در حقیقت ان کے ضمیر کی بے چینی کا اظہار بھی تھے، انہوں نے جھوٹ کو سچ کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی، مگر سچائی کی روشنی جھوٹ کی ملمع کاری سے کبھی مدھم نہیں ہوتی، اس واقعے میں یہ عبرت پوشیدہ ہے کہ آنسو اگر فریب کی بنیاد پر ہوں تو وہ حقیقت کو نہیں چھپا سکتے اور اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید اور نیتوں کی حقیقت سے خوب واقف ہے۔

وَجَاءُوا عَلَى قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا : حضرت یعقوب

علیہ السلام نے جب اپنے بیٹے یوسف علیہ السلام کی خون آلود قمیص دیکھی تو اس سے پتا چلا کہ انہیں بھیڑیے نے نہیں کھایا، کیوں کہ قمیص پھٹی ہوئی نہیں تھی، جب قمیص پھٹی ہوئی نہیں بھیڑیا یوسف کو کیسے کھا سکتا ہے، یعقوب علیہ السلام نے قمیص دیکھتے ہی بیٹوں سے کہا کہ بات اس طرح نہیں ہے جس طرح تم کہتے ہو، یہ وہ کہانی ہے جو تمہیں تمہارے نفسوں نے سجھائی ہے، تمہارے نفس ہائے امارہ جو تمہیں یوسف کے بارے میں برائی سجھاتے ہیں یہ انہی کے تحت تمہاری بنائی ہوئی باتیں ہیں، جنہیں تم اچھا خیال کر رہے ہو، قرآن کریم میں ہے "اور ان کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا لہو بھی لگا لائے۔ یعقوب نے کہا حقیقت الحال یوں نہیں تم اپنے دل سے یہ بات بنا لائے ہو اچھا صبر اور وہی خوب ہے اور جو تم بیان کرتے ہو اس کے بارے میں خدا ہی سے مدد مطلوب ہے"۔

یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائی یوسف علیہ السلام کے کُرتے پر جھوٹا خون لگا کر لائے تھے تاکہ والد کو بھیڑیئے کے کھانے کا یقین دلائیں، مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کا جھوٹ ظاہر کرنے کے لئے ان کو اس سے غافل کر دیا کہ کرتے پر خون لگانے کے ساتھ اس کو پھاڑ بھی دیتے جس سے بھیڑیئے کا کھانا ثابت ہوتا انہوں نے صحیح سالم کرتے پر بکری کے بچے کا خون لگا کر باپ کو دھوکہ میں ڈالنا چاہا یعقوب علیہ السلام نے کرتا صحیح سالم دیکھ کر فرمایا میرے بیٹو! یہ بھیڑیا کیسا حکیم اور عقل مند تھا کہ یوسف کو اس طرح کھایا کہ کرتہ کہیں سے نہیں پھٹا، اس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام پر ان کی جعل سازی کا راز فاش ہو گیا اور فرمایا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ یعنی یوسف کو بھیڑیئے نے نہیں کھایا بلکہ تمہارے ہی نفوس نے ایک بات بنائی ہے اب میرے لئے بہتر یہی ہے کہ صبر کروں اور جو کچھ تم کہتے ہو اس پر اللہ سے مدد مانگوں۔

مسئلہ: یعقوب علیہ السلام نے کُرتہ صحیح سالم ہونے سے برادران یوسف علیہ السلام کے جھوٹ پر استدلال کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قاضی یا حاکم کو فریقین کے دعوے اور دلائل کے ساتھ حالات اور قرائن پر بھی نظر کرنا چاہئے (قرطبی)

ماوردی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پیراہن یوسف بھی عجائب روزگار میں سے ہے تین عظیم الشان وقائع اسی پیراہن یعنی کرُتے سے وابستہ ہیں، ① پہلا واقعہ: خون آلود کر کے والد کو دھوکہ دینے اور کُرتے کی شہادت سے جھوٹ ثابت ہونے کا ہے۔ ② دوسرا واقعہ: زلیخا کا کہ اس میں بھی یوسف علیہ السلام کا کُرتہ ہی شہادت میں پیش ہوا ہے۔ ③ تیسرا واقعہ: یعقوب علیہ السلام کی بینائی واپس آنے کا اس میں بھی ان کا کرُتہ ہی اعجاز کا مظہر ثابت ہوا ہے۔

مسئلہ: بعض علماء نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام نے جو بات اپنے صاحبزادوں سے اُس وقت کہی تھی کہ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ اَمۡرًا یعنی تمہارے نفوس نے ایک بات بنائی ہے یہی بات اس وقت بھی کہی جبکہ مصر میں یوسف علیہ السلام کو اس کی خبر کی تو فرمایا بَلۡ سَوَّلَتۡ لَكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ یہاں غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ دونوں باتیں اپنی رائے سے کہی تھیں ان میں سے پہلی بات صحیح نکلی دوسری صحیح نہیں تھی کیونکہ اس میں بھائیوں کا قصور نہ تھا اس سے معلوم ہوا کہ رائے کی غلطی پیغمبروں سے بھی ابتداءً ہو سکتی ہے اگرچہ بعد میں ان کو بوحی الٰہی غلطی پر قائم رہنے نہیں دیا جاتا۔ نیز قرطبی میں ہے کہ اس سے ثابت ہوا کہ رائے کی غلطی بڑے بڑوں سے ہو سکتی ہے اس لئے ہر صاحب رائے کو چاہئے کہ اپنی رائے کو متہم سمجھے اس پر ایسا جمود نہ کرے کہ دوسروں کی بات سننے ماننے کو تیار نہ ہو۔ (معارف القرآن)

کنویں سے شاہی محل تک، آزمائش، عصمت اور غلبہ تقدیر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَجَآءَتۡ سَيَّارَةٌ فَاَرۡسَلُوۡا وَارِدَهُمۡ فَاَدۡلٰى دَلۡوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشۡرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوۡهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوۡهُ بِثَمَنٍۢ بَخۡسٍ دَرَاهِمَ مَعۡدُوۡدَةٍ ۚ وَكَانُوۡا فِيۡهِ مِنَ الزّٰهِدِيۡنَ ﴿۲۰﴾ وَقَالَ الَّذِى اشۡتَرٰٮهُ مِنۡ مِّصۡرَ لِامۡرَاَتِهٖۤ اَكۡرِمِىۡ مَثۡوٰٮهُ عَسٰٓى اَنۡ يَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوۡسُفَ فِى الۡاَرۡضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنۡ تَاۡوِيۡلِ

الْاَحَادِيْثِ ۚ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ {۲۱} وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ {۲۲} وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۭ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ {۲۳} وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ {۲۴} یوسف.

جواب ترجمہ: اور ایک قافلہ آگیا انہوں نے اپنے آدمی پانی لانے والے کو بھیجا اس نے اپنا ڈول ڈالا وہ کہنے لگا کیا ہی خوشی کی بات ہے کہ یہ ایک لڑکا ہے۔ اور انہوں نے اسے سامان تجارت بنا کر چھپالیا اور اللہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اور انہوں نے اسے معمولی سی قیمت میں بیچ دیا جو گنتی کے چند درہم تھے اور یہ لوگ اس سے بے رغبت تھے۔ اور اہل مصر میں سے جس شخص نے یوسف کو خریدا تھا اس نے اپنی عورت سے کہا اسے عزت کے ساتھ رکھنا۔ ممکن ہے ہمارے کام آجائے یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔ اور اس طرح ہم نے یوسف کو اس سرزمین میں قوت دے دی اور تاکہ اسے خوابوں کی تعبیر دینا بتلا دیں اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے حکمت اور علم عطا کیا اور ہم اسی طرح اچھے کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔ اور وہ جس عورت کے گھر میں تھے اس نے اپنا مطلب حاصل کرنے کیلئے ان کو پھسلایا اور دروازے بند کر دیئے اور کہنے لگی آجاؤ میں تم ہی سے کہہ رہی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں بیشک تیرا شوہر میرا مربی ہے اس نے میرا اچھا ٹھکانا بنایا ہے۔ بیشک بات یہ ہے کہ ظلم کرنے والے کامیاب نہیں ہوتے۔ اور اس عورت نے ان کے ساتھ اپنا کام نکالنے کا مضبوط ارادہ کرلیا تھا اور وہ بھی ارادہ کرلیتے اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے۔ اسی طرح تاکہ ہم ان سے برائی کو اور بے حیائی کو دور رکھیں۔ بیشک وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔

وَجَاۗءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ: ان آیات میں قدرتِ الٰہی کی وہ خاموش تدبیر

جلوہ گر ہوتی ہے جو اندھیری گھاٹیوں سے عزت کے ایوانوں تک راستہ بناتی ہے، ایک قافلہ وہاں سے گزرا، پانی لانے کو اپنا آدمی بھیجا گیا، اس نے کنویں میں ڈول ڈالا تو یوسف علیہ السلام نے رسی تھام لی، جونہی اُس کی نگاہ اس روشن چہرے پر پڑی، خوشی سے پکار اٹھا: کیا خوش خبری ہے، یہ تو ایک خوب صورت لڑکا ہے! مگر اس مسرت کے پیچھے حرص کی چادر بھی تھی، انہوں نے اُسے قافلے والوں سے چھپا کر گویا تجارتی مال بنالیا، حالانکہ اللہ اُن کے ہر برتاؤ سے باخبر تھا۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ: پھر مصر میں اسے نہایت کم قیمت، چند گنے چنے دراہم کے عوض بیچ ڈالا؛ وہ اس سے جلد جان چھڑانا چاہتے تھے، گویا تقدیر کو عجلت تھی کہ یوسف علیہ السلام زیادہ دیر ان کے ہاتھ میں نہ رہیں۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ: مصر کے جس معزز شخص نے خریدا، اس نے اپنی بیوی سے کہا، اسے عزت سے رکھو، شاید ہمارے کام آئے یا ہم اسے بیٹا بنالیں، یوں جسے قتل کے لیے نکالا گیا تھا وہ عزت کے گھر میں جگہ پا گیا، اللہ اپنے امر پر غالب ہے، اگرچہ اکثر لوگ اس راز کو نہیں جانتے۔

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا: جب یوسف علیہ السلام جوانی کی پختگی کو پہنچے تو انہیں فہم و دانش اور علم عطا ہوا اور یہی صلہ ہے نیکی کرنے والوں کا۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ: پھر آزمائش کا ایک اور در کھلا، عزیزِ مصر کی بیوی نے نرمی، فریب اور تنہائی کے اہتمام سے انہیں بہکانا چاہا، دروازے بند کیے اور دعوتِ گناہ دی، مگر یوسف علیہ السلام نے پناہِ خدا طلب کی اور فرمایا کہ میرے مالک نے مجھ پر احسان کیا ہے، میں اس کی امانت میں خیانت نہیں کر سکتا، کیونکہ ظلم کرنے والے کبھی فلاح نہیں پاتے، یوں پاکیزگی نے خواہش پر غلبہ پایا اور کردار نے آزمائش کو شکست دی۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّأَا بُرْهَانَ رَبِّهِ ۚ: شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے

ہیں کہ یعنی عورت نے پھانسنے کی فکر کی اور اس نے فکر کی کہ عورت کا داؤ چلنے نہ پائے اگر اپنے رب کی حجت و قدرت کا معائنہ نہ کرتا تو ثابت قدم رہنا مشکل تھا۔

بعض مفسرین نے وَهَمَّ بِهَا کو وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ سے علیٰحدہ کر کے لَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ سے متعلق کیا ہے۔ جیسے اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَا اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا کی ترکیب ہے۔ اس وقت مقصود یوسف کے حق میں ہم کا ثابت کرنا نہیں، بلکہ نفی کرنا ہے۔ ترجمہ یوں ہو گا کہ عورت نے یوسف کا ارادہ کیا اور یوسف بھی عورت کا ارادہ کرتا اگر اپنے پروردگار کی قدرت و حجت نہ دیکھ لیتا۔ بعض نے وَهَمَّ بِهَا میں لفظ هَمَّ کو بمعنی میلان و رغبت کے لیا ہے۔ یعنی یوسف کے دل میں کچھ رغبت و میلان بے اختیار پیدا ہوا۔ جیسے روزہ دار کو گرمی میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعاً رغبت ہوتی ہے لیکن نہ وہ پینے کا ارادہ کرتا ہے نہ یہ بے اختیاری رغبت کچھ مضر ہے۔ بلکہ باوجود رغبت طبعی کے اس سے قطعاً محترز رہنا مزید اجر و ثواب کا موجب ہے اسی طرح سمجھ لو کہ ایسے اسباب و دواعی قویہ کی موجودگی سے طبع بشری کے موافق بلا اختیار و ارادہ یوسف علیہ السلام کے دل میں کسی قسم کی رغبت و میلان کا پایا جانا نہ عصمت کے منافی ہے نہ ان کے مرتبہ کو گھٹاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے چند اقوال نقل فرمائے ہیں، ایک قول ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اسے مارنے کا قصد کیا تھا۔ ایک قول ہے کہ اسے بیوی بنانے کی تمنا کی تھی۔ ایک قول ہے کہ آپ قصد کرتے اگر دلیل نہ دیکھتے لیکن چونکہ دلیل دیکھ لی قصد نہیں فرمایا۔ لیکن اس قول میں عربی زبان کی حیثیت سے کلام ہے جسے امام ابن جریر وغیرہ نے بیان فرمایا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

علامہ ابن کثیر علیہ السلام مزید لکھتے ہیں کہ وہ دلیل جو آپ نے دیکھی اس کے متعلق بھی اقوال ملاحظہ فرمائیے۔ کہتے ہیں اپنے والد حضرت یعقوب کو دیکھا کہ گویا وہ اپنی انگلی منہ میں ڈالے کھڑے ہیں۔ اور حضرت یوسف کے سینے پر آپ نے ہاتھ مارا۔ کہتے ہیں اپنے سردار کی خیالی تصویر سامنے آگئی۔ کہتے ہیں

آپ کی نظر چھت کی طرف اٹھ گئی دیکھتے ہیں کہ اس پر یہ آیت لکھی ہوئی ہے لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا وَّ سَآءَ سَبِيْلًا، خبردار زنا کے قریب بھی نہ بھٹکنا وہ بڑی بے حیائی کا اور اللہ کے غضب کا کام ہے اور وہ بڑا ہی برا راستہ ہے۔ کہتے ہیں تین آیتیں لکھی ہوئی تھیں ایک تو وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ (الانفطار:۱۰) تم پر نگہبان مقرر ہیں۔ دوسری آیت یہ تھی وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ (یونس:۶۱) تم جس حال میں ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ تیسری آیت یہ تھی اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ (الرعد:۳۳) اللہ ہر شخص کے ہر عمل پر حاضر ناظر ہے۔ کہتے ہیں کہ چار آیتیں لکھی پائی، تین وہی جو اوپر ہیں اور ایک حرمت زنا کی جو اس سے پہلے ہے۔ کہتے ہیں کہ کوئی آیت دیوار پر ممانعت زنا کے بارے میں لکھی ہوئی پائی۔

کہتے ہیں ایک نشان تھا جو آپ کے ارادے سے آپ کو روک رہا تھا۔ ممکن ہے وہ صورت یعقوب ہو۔ اور ممکن ہے اپنے خریدنے والے کی صورت ہو۔ اور ممکن ہے آیت قرآنی ہو کوئی ایسی صاف دلیل نہیں کہ کسی خاص ایک چیز کے فیصلے پر ہم پہنچ سکیں۔ پس بہت ٹھیک راہ ہمارے لیے یہی ہے کہ اسے یونہی مطلق چھوڑ دیا جائے جیسے کہ اللہ کے فرمان میں بھی اطلاق ہے (اسی طرح قصد کو بھی) پھر فرماتا ہے ہم نے جس طرح اس وقت اسے ایک دلیل دکھا کر برائی سے بچالیا، اسی طرح اس کے اور کاموں میں بھی ہم اس کی مدد کرتے رہے اور اسے برائیوں اور بے حیائیوں سے محفوظ رکھتے رہے۔ وہ تھا بھی ہمارا برگزیدہ پسندیدہ بہترین اور مخلص بندہ۔ (تفسیر ابن کثیر)

بعض مفسرین نے فرمایا کہ زلیخا کے مکان میں ایک بُت تھا اس نے اس بت پر پردہ ڈالا تو یوسف علیہ السلام نے وجہ پوچھی اس نے کہا کہ یہ میرا معبود ہے اس کے سامنے گناہ کرنے کی جرأت نہیں یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا معبود اس سے زیادہ حیا کا مستحق ہے اس کی نظر کو کوئی پردہ نہیں روک سکتا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کی نبوت اور معرفت آلہیہ خود ہی برہان رب تھی۔

بچے کی گواہی، قمیص کی دکھلائی، تہمت کا پردہ چاک

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ {۲۵}قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَآ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ {۲۶}وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ {۲۷}فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ {۲۸}یوسف.

جواب ترجمہ: اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف دوڑے اور اس عورت نے پیچھے سے اس کا کرتہ چیر دیا اور دونوں نے اس عورت کے سردار کو دروازہ کے پاس پالیا۔ وہ کہنے لگی جو شخص تیرے گھر والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اسے جیل میں ڈال دیا جائے یا دردناک سزا دی جائے۔ یوسف نے کہا اسی نے مجھے اپنی مطلب براری کیلئے پھسلایا اور اس کے خاندان میں سے ایک گواہی دینے والے نے گواہی دی کہ اگر اس کا کرتہ سامنے سے پھاڑا گیا ہے تو عورت نے سچ کہا اور یہ شخص جھوٹے لوگوں میں سے ہے۔ اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھاڑا گیا تو اس عورت نے جھوٹ کہا اور یہ سچوں میں سے ہے۔ پھر جب اس کے کرتے کو دیکھا گیا کہ پیچھے سے پھاڑا گیا ہے تو کہنے لگا کہ بیشک یہ تم عورتوں کی فریب کاری میں سے ہے۔ بیشک تمہارا فریب بڑا ہے۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ: پھر ایک ہنگامۂ اضطراب برپا ہوا، دونوں دروازے کی جانب لپکے، یوسف علیہ السلام اپنی عفت بچا کر نکل جانے کے لیے اور عزیز مصر کی بیوی انہیں روک لینے کے ارادے سے، اس نے پیچھے سے ان کی قمیص پکڑلی تاکہ قدم ٹھہر جائیں، مگر پاکیزگی کی وہ دوڑ کہاں رکنے والی تھی، قمیص پشت کی جانب سے چاک ہوگئی، عین اسی لمحے دروازے پر اس کا شوہر موجود تھا، صورت حال کو بھانپتے ہی عورت نے عیاری سے پانسہ پلٹا اور بات کو یوں موڑا کہ گویا جرم

کا ارتکاب یوسف نے کیا ہو، اس نے عزیز سے کہا: جو شخص تمہاری بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کرے، اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اسے قید کر دیا جائے یا دردناک عذاب دیا جائے؟ یوں ایک بے گناہ کو موردِ الزام ٹھہرانے کی تدبیر کی گئی، مگر حق کی روشنی جلد ظاہر ہونے والی تھی۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا: حضرت یوسف علیہ السلام کو ورغلانے کے بعد زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کو ہی موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی، ایسے میں یوسف بول پڑے کہ اسی عورت نے اپنی مطلب براری کے لیے مجھے اپنی جانب مائل کرنے اور گناہ کا ارتکاب کرنے کی کوشش کی ہے، رب العالمین نے اپنی قدرت کاملہ سے پنگھوڑے میں آرام کرنے والے بچے کو وکیل صفائی بنا دیا، جس نے یوسف علیہ السلام کی برأت اور پاکیزگی کا اعلان کیا۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پیغمبرانہ شرافت کی بناء پر غالباً اس کا راز فاش نہ فرماتے مگر جب اس نے پیش قدمی کر کے یوسف علیہ السلام پر تہمت رکھنے کا اشارہ کیا تو مجبور ہو کر انہوں نے حقیقت کا اظہار کیا کہ **هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي** یعنی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کے لئے مجھے پھسلا رہی تھی۔

معاملہ بڑا نازک اور عزیز مصر کے لئے اس کا فیصلہ سخت دشوار تھا کہ ان میں سے کسے سچا سمجھے شہادت اور ثبوت کا کوئی موقع نہ تھا مگر اللہ تعالیٰ جس طرح اپنے برگزیدہ بندوں کو گناہ سے بچا لیتے ہیں اور ان کو معصوم و محفوظ رکھتے ہیں اسی طرح دنیا میں بھی ان کو رسوائی سے بچانے کا انتظام معجزانہ انداز سے فرما دیتے ہیں اور عموماً ایسے مواقع پر ایسے چھوٹے بچوں سے کام لیا گیا ہے جو عادۃً بولنے بات کرنے کے قابل نہیں ہوتے مگر بطور معجزہ ان کو گویائی عطا فرما کر اپنے مقبول بندوں کی براءت کا اظہار فرما دیتے ہیں جیسے حضرت مریم پر جب لوگ تہمت باندھنے لگے تو صرف ایک دن (اور راجح قول کے مطابق چالیس) کے بچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما کر ان کی زبان سے والدہ کی پاکی ظاہر فرما دی اور قدرت خداوندی کا ایک خاص مظہر سامنے کر دیا، بنی اسرائیل کے ایک بزرگ

جُرَیج پر اسی طرح کی ایک تہمت ایک بڑی سازش کے ساتھ باندھی گئی تو نوزائیدہ بچہ نے ان کی براءت کے لئے شہادت دی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کو شبہ پیدا ہوا تو فرعون کی بیوی کے بال سنوارنے والی عورت کی چھوٹی بچی کو گویائی عطا ہوئی اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں فرعون کے ہاتھ سے بچایا۔

ٹھیک اسی طرح یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق ایک چھوٹے بچہ کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرمادی اور وہ بھی نہایت عاقلانہ اور حکیمانہ انداز کی یہ چھوٹا بچہ اسی گھر میں گہوارہ کے اندر پڑا تھا یہ کس کو گمان ہو سکتا تھا کہ وہ ان حرکتوں کو دیکھے اور سمجھے گا اور پھر اس کو کسی انداز سے بیان بھی کر دے گا مگر قادر مطلق اپنی اطاعت میں مجاہدہ کرنے والوں کی شان ظاہر کرنے لئے دنیا کو دکھلا دیتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی خفیہ پولیس (سی آئی ڈی) ہے جو مجرم کو خوب پہچانتی اور اس کے جرائم کا ریکارڈ رکھتی ہے اور ضرورت کے وقت اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ (معارف القرآن)

إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ: معصوم بچے نے پنگھوڑے سے گواہی دیتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا: اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ عورت سچی ہے، کیونکہ ایسی صورت میں وہ خود کو بچا رہی ہوتی اور یوسف ہی دست درازی کرنے والے ہوتے، پس تب وہی جھوٹے شمار کیے جاتے، یوں قدرت نے ایک معصوم زبان سے انصاف کا میزان قائم کر دیا۔

وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ: اگر یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہو تو یہ ان کی سچائی کی روشن دلیل ہے، اس لیے کہ یہ صورتحال اسی وقت پیش آتی ہے جب کوئی شخص بھاگ رہا ہو اور دوسرا اسے روکنے کے لیے پیچھے سے پکڑے، پس یہ قرینہ خود گواہی دیتا ہے کہ وہ اس سے دامن بچا کر نکل رہے اور الزام لگانے والی ہی جھوٹ پر تھی۔

فَلَمَّا رَأَى قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ: چنانچہ جب عزیز نے اپنی آنکھوں سے کہ قمیص پشت کی جانب سے

چاک ہے تو حقیقت اس پر عیاں ہو گئی اور اسے یوسف علیہ السلام کی صداقت کا یقین ہو گیا، تب اس نے کہا یہ تہمت جو تم نے لگائی ہے تم عورتوں کی چالوں ہی میں سے ایک چال ہے، بے شک تمہاری تدبیر بڑی گہری اور اثر رکھنے والی ہوتی ہے۔

عزیز مصر کی یوسف و زلیخا کو نصیحت

سوال عزیز مصر کو جب پتا چل گیا کہ زلیخا ہی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ورغلایا اور گناہ پر آمادہ کرنے کی کشش کی تو اس کے بعد اس نے حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کو کیا نصیحت کی تھی؟ آیت کی روشنی میں بتائیے۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ {۲۹} یوسف.

جواب ترجمہ: یوسف اس بات کو جانے دو۔ اور اے عورت تو اپنے گناہ سے استغفار کر۔ بلاشبہ تو ہی گناہ گاروں میں سے ہے۔

عزیز مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے عرض کیا کہ جو کچھ زلیخا کی طرف سے آپ کو ورغلانے کے سلسلہ میں کارروائی کی گئی وہ آپ کسی سے ذکر نہ کریں اور بیوی کو یہ کہا کہ اے عورت! تو اپنے گناہ کی معافی مانگ تو گناہ گاروں میں سے ہے، جس نے یوسف کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی، اسے ورغلانے کی کوشش کی۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ شوہر کے سامنے اپنی بیوی کی ایسی خیانت اور بے حیائی ثابت ہو جانے پر اس کا مشتعل نہ ہونا اور پورے سکون و اطمینان سے باتیں کرنا انسانی فطرت سے بہت قابل تعجب ہے امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ عزیز مصر کوئی بے غیرت آدمی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے جس طرح یوسف علیہ السلام کو گناہ سے پھر رسوائی سے بچانے کے لیے فوق العادت انتظام فرمایا اسی انتظام کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ عزیز مصر کو غصہ سے مشتعل نہیں ہونے دیا ورنہ عام عادت کے مطابق ایسے موقع پر انسان تحقیق و تفتیش کے بغیر ہی ہاتھ چھوڑ بیٹھتا ہے اور زبان

سے گالی گلوچ تو معمولی بات ہے اگر عام انسانی عادت کے مطابق عزیز مصر کو اشتعال ہو جاتا تو ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ سے یا زبان سے یوسف علیہ السلام کی شان کے خلاف کوئی بات سرزد ہو جاتی یہ قدرت حق کے کرشمے ہیں کہ اطاعت حق پر قائم رہنے والے کی قدم قدم پر کس طرح حفاظت کی جاتی ہے۔(معارف القرآن)

جمال یوسفی اور فتنہ نسوانیت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ {۳۰} فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ {۳۱} قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ {۳۲} قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ {۳۳} فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ {۳۴} ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ {۳۵} یوسف

جواب ترجمہ: اور چند عورتوں نے کہا جو شہر میں رہتی تھیں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو مطلب حاصل کرنے کیلئے پھسلاتی ہے۔ اس غلام کے عشق نے اس کے دل میں پوری طرح جگہ پکڑلی ہے۔ بیشک ہم تو اس عورت کو کھلی گمراہی میں دیکھ رہی ہیں۔ پھر جب اس نے ان عورتوں کی مکر کی باتیں سنیں تو انہیں بلوا بھیجا اور ان کیلئے ایک مجلس تیار کی جس میں تکیہ لگا کر بیٹھیں اور ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک چھری دے دی اور یوسف سے کہا کہ ان کے سامنے نکل آ۔ سو جب ان عورتوں نے

انہیں دیکھا تو حیران رہ گئیں۔ اور اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور کہنے لگیں حاشاللہ یہ شخص بشر نہیں ہے یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔ وہ عورت کہنے لگی سو یہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں تم نے مجھے ملامت کی اور واقعی میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی سو وہ بچ گیا اگر اس نے وہ بات نہ مانی جس کا میں اسے حکم دے رہی ہوں تو ضرور اس کو جیل میں بھیج دیا جائے گا اور یہ ضرور بے عزت ہو گا۔ یوسف نے کہا کہ اے میرے رب یہ عورتیں مجھے جس کام کی دعوت دے رہی ہیں اس کے مقابلہ میں مجھے جیل جانا محبوب ہے اور اگر آپ مجھ سے ان کی چال بازی کو دفع نہ کریں گے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ سو ان کے رب نے ان کی دعا قبول کر لی سو عورتوں کی چال بازی کو یوسف سے ہٹا دیا۔ بلاشبہ وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ پھر نشانیاں دیکھنے کے بعد ان لوگوں کی سمجھ میں یہ آیا کہ ایک وقت تک یوسف کو جیل میں رکھیں۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ : یہاں یہ بیان ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی خبر شہر میں پھیل گئی، بعض خواتین نے اس معاملے پر آپس میں بات کرتے ہوئے اعتراض کیا اور کہا کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اپنی طرف راغب کر رہی تھی اور اس کے دل میں اُس کی محبت نے اس کی عقل پر چھالیا تھا، مفسرین کے نزدیک یہ بیان اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ لوگوں کی نظر میں محبت اور فریب کی آمیزش انسان کو بھٹکا سکتی ہے اور یہ کہ وہ ظاہری حالات کو اپنی سمجھ کے مطابق غلط تعبیر کر بیٹھتے ہیں۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً: جب عزیز مصر کی بیوی نے سنا کہ مصری عورتیں اس کی غیبت پر کمربستہ ہیں، اس کے خلاف پروپیگنڈے کر رہی ہیں، اس کی مذمت کر رہی ہیں، تو اس نے مصری عورتوں کی دعوت کی، اس نے ان کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ اسے ملنے کے لیے آئیں، چنانچہ اس نے ان کے لیے گدے، تکیے وغیرہ تیار کیے، ان کے کھانے کا انتظام وانصرام کیا، کھانا کاٹنے کے لیے ان عورتوں میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں چھری تھما دی۔

پھر عزیز مصر کی بیوی نے یوسف علیہ السلام کو آواز دی کہ ان عورتوں کی طرف نکل آؤ، جب وہ تشریف لائے تو ان عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھتے ہی تعجب کیا، اسے بہت بڑا سمجھا، ان کے حسن وجمال کو دیکھ کر ان پر ایسی بے ہوشی چھاگئی کہ انہوں نے فرط دہشت بھول پن کے باعث کھانا کاٹنے کے دوران اپنے ہاتھ زخمی کر ڈالے، تعجب کرتے ہوئے وہ کہنے لگیں کہ معاذاللہ یہ تو انسانی جنس میں سے ہے ہی نہیں، کیونکہ اس کا حسن وجمال انسانوں کے حسن وجمال سے کہیں زیادہ ہے، یہ تو فرشتوں میں سے کوئی شریف فرشتہ ہے۔

عورتوں کی گفتگو کو مکرو (فریب) اس لیے کہا کہ مکاروں کی طرح چھپ چھپ کر یہ باتیں کرتی تھیں اور زلیخا پر طعن کر کے گویا اپنی پارسائی کا اظہار مقصود تھا، حالانکہ یوسف علیہ السلام کے بے مثال حسن وجمال کا شہرہ جس عورت کے کان میں پڑتا تھا، اس کی دید کا اشتیاق دل میں چٹکیاں لینے لگتا تھا، کچھ بعید نہیں کہ زلیخا پر طعن و تشنیع اور نکتہ چینی کرنے والیوں کے دلوں میں یہ ہی غرض پوشیدہ ہو کہ زلیخا کو غصہ دلا کر کسی ایسی حرکت پر آمادہ کر دیں جو یوسف علیہ السلام کے دیدار کا سبب بن جائے، یا زلیخا کے دل میں اس کی نفرت بٹھا کر اپنی طرف مائل کرنے کا موقع نکالیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ زلیخا نے بعض عورتوں کو اس معاملہ میں اپنا راز دار بنایا ہو، اس نے راز داری کی جگہ پردہ داری اور خوردہ گیری شروع کر دی بہر حال ان کی گفتگو کو لفظ "مکر" سے ادا کرنے میں یہ سب احتمالات ہیں۔ (عثمانی)

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ: تب (زلیخا نے) کہا یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیتی تھیں، حالانکہ اسے میں نے ہی ورغلایا اور پھسلانے کی کوشش کی تھی، اسی ابتلائے عظیم سے بچنے کے لیے لب یوسفی پر یہ دعائیہ کلمات رقصاں ہو گئے تھے کہ اے میرے پروردگار! جس سیاہ کاری اور بدکاری کی طرف یہ مجھے دعوت دے رہی ہیں اس سے بہتر تو پابند سلاسل ہونا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ زلیخا کا مایوسانہ غصہ اور مظلومانہ انداز بیان اس کی ہم جنسوں پر اثر کر گیا، یا پہلے ہی سے کچھ ملی بھگت ہو گی، بہر حال لکھا ہے کہ اب عورتوں نے یوسف کو سمجھانا شروع کیا کہ تم کو اپنی

محسنہ اور سیدہ کا کہنا ماننا چاہیے تھا، آخر اس غریب پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو، پھر یہ بھی سوچ لو کہ نافرمانی کا نتیجہ کیا ہو گا، خواہ مخواہ مصیبت سر پر لینے سے کیا فائدہ، کہتے ہیں کہ بظاہر زبان سے وہ زلیخا کی سفارش کر رہی تھیں مگر دل ہر ایک کا یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا، یوسف علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یہ عورت بری طرح پیچھے پڑی ہے اور شیطان ہر طرف اپنا جال بچھانے لگا ہے تو نہایت عزم و استقلال اور پیغمبرانہ استقامت سے بارگاہ احدیت میں درخواست کی کہ مجھے ان کے مکر و فریب سے بچایئے، اگر اس سلسلہ میں قید ہونا پڑے تو میں قید کو ارتکاب معصیت پر ترجیح دیتا ہوں، اگر آپ میری دستگیری نہ فرمائیں گے تو ڈر ہے کہ بے عقل ہو کر ان کی ابلہ فریبیوں کی طرف نہ جھک پڑوں، یہاں یوسف علیہ السلام کی زبانی یہ جتلا دیا کہ انبیاء کی عصمت بھی حق تعالیٰ کی دستگیری سے ہے اور یہ کہ وہ اپنی عصمت پر مغرور نہیں ہوتے بلکہ عصمت کا جو منشاء ہے (حفاظت و صیانت الٰہی) اسی پر نظر رکھتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ: حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے رب! وہ قید جس کا مجھے خطرہ ہے، میرے لیے اس فتنہ اور فحاشی کی دعوت سے زیادہ بہتر ہے اور اگر تو نے میری حفاظت نہ کی تو میں ان کے فریب میں آجاؤں گا اور نادانوں کی طرح ان کے حکم میں آ گیا۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ: اسی عاجزانہ دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر عزیز کی بیوی اور شہر کی خواتین کے مکر و فریب کو دور کر دیا، یہ واقعہ واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعا سنتا ہے، ان کے حالات سے باخبر ہے اور ہر مؤمن کی عاجزی اور تضرع کا جواب دیتا ہے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ لَیَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِیْنٍ: پھر باوجود اس کے کہ وہ لوگ نشان دیکھ چکے تھے ان کی رائے یہی ٹھہری کہ کچھ عرصے کے لئے ان کو قید ہی کر دیں، حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کا راز سب پر کھل گیا، لیکن تاہم ان لوگوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ کچھ مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل خانہ میں رکھیں، بہت ممکن ہے کہ اس میں ان سب نے یہ

مصلحت سوچی ہو کہ لوگوں میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ عزیز کی بیوی اس کی چاہت میں مبتلا ہے، جب ہم یوسف کو قید کر دیں گے وہ لوگ سمجھ لیں گے کہ قصور اسی کا تھا اسی نے کوئی ایسی نگاہ کی ہو گی۔

یہی وجہ تھی کہ جب شاہ مصر نے آپ کو قید خانے سے آزاد کرنے کے لیے اپنے پاس بلوایا تو آپ نے وہیں سے فرمایا کہ میں نہ نکلوں گا جب تک میری برأت اور میری پاکدامنی صاف طور پر ظاہر نہ ہو جائے اور آپ حضرات اس کی پوری تحقیق نہ کر لیں جب تک بادشاہ نے ہر طرح کے گواہ سے بلکہ خود عزیز کی بیوی سے پوری تحقیق نہ کر لی اور آپ کا بے قصور ہونا، ساری دنیا پر کھل نہ گیا آپ جیل خانے سے باہر نہ نکلے، پھر آپ باہر آئے جب کہ ایک دل بھی ایسا نہ تھا جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے ذرا بھی بدگمانی ہو، قید کرنے کی بڑی وجہ یہی تھی کہ عزیز کی بیوی کی رسوائی نہ ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے آباؤ اجداد

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ {۳۶} قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ۭ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ {۳۷} وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَاۗءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ {۳۸} يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ {۳۹} مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَاۗءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ {۴۰} يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۭ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ

رَّاْسِهٖ ؕ قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ{۴۱}وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ{۴۲} یوسف.

جواب ترجمہ: اور یوسف کے ساتھ دو جوان جیل میں داخل ہوئے ان میں سے ایک نے کہا کہ میں خواب میں اپنے کو دیکھ رہا ہوں کہ شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا کہ میں خواب میں اپنے کو اس حال میں دیکھ رہا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے پرندے کھا رہے ہیں آپ ہمیں اس کی تعبیر بتا دیجئے بلاشبہ ہم آپ کو نیک آدمیوں میں سے سمجھ رہے ہیں۔

یوسف نے کہا جو کھانا تمہیں دیا جاتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں خواب کی تعبیر بتا دوں گا یہ اس علم میں ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے۔ بلاشبہ میں نے ان لوگوں کے دین کو چھوڑ رکھا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔ اور میں نے اپنے باپ دادوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے دین کا اتباع کیا ہے۔ یہ ہمارے لیے کسی طرح بھی درست نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں۔ یہ ہم پر اور دوسرے لوگوں پر اللہ کا فضل ہے اور لیکن بہت سے لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! کیا بہت سے معبود جدا جدا بہتر ہیں یا اللہ بہتر ہے جو تنہا ہے زبردست ہے۔

تم لوگ اللہ کے سوا جن لوگوں کی عبادت کرتے ہو وہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے تجویز کر لیے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی سند نازل نہیں فرمائی۔ حکم بس اللہ ہی کا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہ سیدھا راستہ ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور دوسرے کو سولی پر چڑھایا جائے گا اور اس کے سر میں سے پرندے کھائیں گے جس بات کے بارے میں تم معلوم کر رہے تھے اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور جن دو جوانوں نے خواب کی تعبیر دریافت کی تھی ان میں سے جس شخص کے بارے میں یوسف نے گمان کیا کہ وہ رہا ہونے والا ہے اس سے کہا کہ تو اپنے

آقا کے سامنے میرا تذکرہ کر دینا پھر اس شخص کو شیطان نے اپنے آقا سے تذکرہ کرنا بھلا دیا سو یوسف جیل میں چند سال رہے۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ: الخ جس روز یوسف علیہ السلام کو جیل خانہ جانا پڑا اسی دن بادشاہ کا ساقی اور نان بائی بھی کسی جرم میں جیل خانے بھیج دیئے گئے، ساقی کا نام "نبوا" بندار تھا اور باورچی کا نام "مجلث" تھا۔ ان پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے کھانے پینے میں بادشاہ کو زہر دینے کی سازش کی تھی۔

قید خانے میں بھی نبی اللہ یوسف علیہ السلام کی نیکیوں کی کافی شہرت تھی، سچائی، امانت داری، سخاوت، خوش خلقی، کثرت عبادت، خدا ترسی، علم و عمل، تعبیر خواب، احسان و سلوک وغیرہ میں آپ علیہ السلام مشہور ہو گئے تھے، جیل خانے کے قیدیوں کی بھلائی ان کی خیر خواہی ان سے مروّت و سلوک ان کے ساتھ بھلائی اور احسان ان کی دلجوئی اور دلداری ان کے بیماروں کی تیمارداری خدمت اور دوادارو بھی آپ علیہ السلام کا تشخص تھا، یہ دونوں ہی ملازم یوسف علیہ السلام سے بہت ہی محبت کرنے لگے، ایک دن کہنے لگے کہ ہمیں آپ علیہ السلام سے بہت ہی محبت ہو گئی ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا اللہ تمہیں برکت دے، بات یہ ہے کہ مجھے تو جس نے چاہا کوئی نہ کوئی آفت ہی مجھ پر لایا، پھوپھی کی محبت، باپ کا پیار، عزیز کی بیوی کی چاہت، سب مجھے یاد ہے اور اس کا نتیجہ میری ہی نہیں بلکہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اب دونوں نے ایک مرتبہ خواب دیکھا ساقی نے دیکھا کہ وہ انگور کا شیرہ نچوڑ رہا ہے، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں (خَمرًا) کے بدلے لفظ (عِنَباً) ہے، اہل عمان انگور کو خمر کہتے ہیں، اس نے دیکھا تھا کہ گویا اس نے انگور کی بیل بوئی ہے اس میں خوشے لگے ہیں، اس نے توڑے ہیں، پھر ان کا شیرہ نچوڑ رہا ہے کہ بادشاہ کو پلائے۔

یہ خواب بیان کر کے آرزو کی کہ آپ ہمیں اس کی تعبیر بتلایئے، یوسف علیہ السلام نے فرمایا اس کی تعبیر یہ ہے کہ تمہیں تین دن کے بعد جیل خانے سے آزاد کر دیا جائے گا اور تم اپنے کام پر یعنی بادشاہ کی ساقی گری میں لگ جاؤ گے، دوسرے نے کہا جناب میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے آ آ کر اس میں سے کھا رہے ہیں۔

اکثر مفسرین کے نزدیک مشہور بات تو یہی ہے کہ واقعہ ان دونوں نے یہی خواب دیکھے تھے اور ان کی صحیح تعبیر یوسف علیہ السلام سے دریافت کی تھی، لیکن سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ درحقیقت انہوں نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا تھا، لیکن یوسف علیہ السلام کی آزمائش کے لیے جھوٹے خواب بیان کرکے تعبیر طلب کی تھی۔ (تفسیر ابن کثیر)

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا: حضرت یوسف علیہ السلام اپنے دونوں قیدی ساتھیوں کو تسکین دیتے ہیں کہ میں تمہارے دونوں خوابوں کی صحیح تعبیر جانتا ہوں اور اس کے بتانے میں مجھے کوئی بخل نہیں، اس کی تعبیر کے واقع ہونے سے پہلے ہی میں تمہیں وہ بتادوں گا، یوسف علیہ السلام کے اس فرمان اور اس وعدے سے تو بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام، تنہائی کی قید میں تھے کھانے کے وقت کھول دیا جاتا تھا اور ایک دوسرے سے مل سکتے تھے اس لیے آپ علیہ السلام نے ان سے یہ وعدہ کیا اور ممکن ہے کہ اللہ کی طرف سے تھوڑی تھوڑی کرکے دونوں خوابوں کی پوری تعبیر بتلائی گی ہو۔

ذَالِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي: پھر حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں مجھے یہ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا فرما گیا ہے۔

إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ: خوابوں کی تعبیر کا علم جو دیا گیا تو اس کی وجہ خود ہی بیان کر دی، وہ یہ ہے کہ میں نے ان کافروں کا مذہب چھوڑ رکھا ہے جو نہ اللہ کو مانیں نہ آخرت کو برحق جانیں میں نے اللہ کے پیغمبروں کے سچے دین کو مان رکھا ہے اور اسی کی تابعداری کرتا ہوں۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ: خوابوں کی تعبیر کا جو علم دیا گیا اس پر ایک اور وجہ بیان کر دی کہ خود میرے باپ دادا اللہ کے رسول تھے، ابراہیم، اسحاق، یعقوب علیہ الصلواۃ والسلام، فی الواقع جو بھی راہ راست پر استقامت سے چلے ہدایت کا پیرو رہے، اللہ کے رسولوں کی

اتباع کو لازم پکڑ لے، گمراہوں کی راہ سے منہ پھیر لے، اللہ تبارک تعالیٰ اس کے دل کو پر نور اور اس کے سینے کو معمور کر دیتا ہے، اسے علم و عرفان کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے، اسے بھلائی میں لوگوں کا پیشوا کر دیتا ہے کہ اور دنیا کو وہ نیکی کی طرف بلاتا رہتا ہے، ہم جب کہ راہ راست دکھا دیئے گئے توحید کی سمجھ دے دیئے گئے شرک کی برائی بتا دیئے گئے۔

مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ: حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے بہت سے انعامات گنوائے اور فرمایا کہ پھر ہمیں کیسے یہ بات زیب دیتی ہے؟ کہ ہم اللہ کے ساتھ اور کسی کو بھی شریک کر لیں، یہ توحید اور سچا دین اور یہ اللہ کی وحدانیت کی گواہی یہ خاص اللہ کا فضل ہے جس میں ہم تنہا نہیں بلکہ اللہ کی اور مخلوق بھی شامل ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ: حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں ہمیں یہ برتری ہے کہ ہماری جانب یہ براہ راست اللہ کی وحی آئی ہے اور لوگوں کو ہم نے یہ وحی پہنچائی، لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں۔

مولانا محمد اسحاق کاشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس سے واضح فرما دیا گیا کہ باپ دادا کی پیروی مطلوب و محمود ہے جبکہ وہ حق پر ہوں۔ کہ وہ پیروی ان کی نہیں بلکہ اصل میں حق ہی کی پیروی ہوتی ہے۔ پس اپنے باپ دادا اور بڑے بزرگ جب راہ حق وصواب پر ہوں تو ان کی اتباع و پیروی کرنا مذموم نہیں، بلکہ محمود و مطلوب ہے۔ اور یہ اندھی تقلید کے زمرے میں نہیں آئے گا بلکہ اتباع حق وصدق کے ہی قبیل سے ہو گا۔ اور حق وصدق کی اتباع و پیروی دین حق کا تقاضا بلکہ اصل دین ہے۔ اور اسی پر سارا مدار و انحصار ہے سعادت دارین کا۔ (تفسیر مدنی)

يَاصَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ: قید خانے کی تنہائی میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے دونوں ساتھیوں سے نہایت حکیمانہ انداز میں خطاب کیا: کیا جدا جدا معبودوں کی پرستش بہتر ہے یا اُس ایک اللہ کی عبادت جو یکتا ہے، جس کا کوئی شریک نہیں، جو سب پر غالب ہے اور خود کسی کے غلبے میں نہیں آتا؟

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ: پھر انہوں نے باطل عقیدے کی حقیقت کھول کر رکھ دی کہ تم اللہ کے سوا جنہیں پوجتے ہو وہ محض نام ہیں، ایسے نام جن کے پیچھے کوئی حقیقی معبودیت نہیں، یہ نام تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گھڑ لیے ہیں۔

مَا أَنْزَلَ اللهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ: حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے غلط اور باطل عقیدہ کے بخیے ادھیڑتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نازل نہیں کی۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ: حضرت یوسف علیہ السلام نے اصلاح عقائد کے سلسلہ میں پیش قدمی کرتے ہوئے فرمایا کہ اقتدار و اختیار سراسر اللہ ہی کے لیے ہے، ان خود ساختہ ہستیوں کے لیے نہیں، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ عبادت خالص اسی کے لیے ہو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، یہی توحید دینِ مستقیم ہے، سیدھا راستہ جس میں کوئی کجی نہیں۔

وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ: حضرت یوسف علیہ السلام نے زندان کی اوٹ میں توحید کی دعوت دی، مشرکین کو متوجہ کیا، اللہ کی حاکمیت کا ڈنکا بجایا، اللہ کے دین کی راستی سے لوگوں کو آگاہ کیا، پھر واضح کیا کہ یہ سب حق کا پیغام ہے مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو جان نہیں پاتے، اس لیے وہ مخلوقات میں سے بعض کو معبود بنا بیٹھتے ہیں۔

ساقی بری اور نانبائی تختہ دار پر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا وَأَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّأْسِهِ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيٰنِ {۴۱} وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ فَأَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ {۴۲} یوسف.

جواب ترجمہ: اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور دوسرے کو سولی پر چڑھایا جائے گا اور اس کے سر میں سے پرندے کھائیں گے جس بات کے

بارے میں تم معلوم کر رہے تھے اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور جن دو جوانوں نے خواب کی تعبیر دریافت کی تھی ان میں سے جس شخص کے بارے میں یوسف نے گمان کیا کہ وہ رہا ہونے والا ہے اس سے کہا کہ تو اپنے آقا کے سامنے میرا تذکرہ کر دینا پھر اس شخص کو شیطان نے اپنے آقا سے تذکرہ کرنا بھلا دیا سو یوسف جیل میں چند سال رہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے جیل کے ساتھیوں میں سے وہ شخص جو انگور نچوڑ رہا تھا اس کی تعبیر یہ تھی کہ وہ جیل سے نکل جائے گا اور جو اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے تھا اس کی تعبیر یہ تھی کہ اسے صلیب پر کھینچا جائے گا اور اس کی موت واقع ہو گی۔

یوسف علیہ السلام نے ان کے خوابوں کی تعبیر بیان فرمائی، کہ جس نے خواب میں شراب پلاتے دیکھا اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ بیداری میں بادشاہ کو شراب پلائے گا اور جس نے سر پر سے جانوروں کو روٹیاں کھاتے دیکھا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سولی دیا جائے گا، پھر جانور اس کے سر سے نوچ نوچ کر کھائیں گے، قضا و قدر کا فیصلہ یہ ہی ہے جو کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتا، جو بات تم پوچھتے تھے وہ میں نے بتلا دی۔ یہ بالکل طے شدہ امر ہے۔ جس میں تخلف نہیں ہو سکتا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ساقی زہر خورانی کی تہمت سے بری ہو گیا، اور خباز (نانبائی) کو جرم ثابت ہونے کی وجہ سے سزائے موت دی گئی۔ (عثمانی)

وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ: حضرت یوسف علیہ السلام نے دونوں قیدیوں میں سے جس کے بارے میں گمان کیا تھا کہ وہ رہائی پانے والا ہے، اس سے فرمایا کہ اپنے بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا، شاید وہ میری بے گناہی کی خبر سنے اور مجھے اس قید سے نجات ملے۔

فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ: مگر شیطان نے اسے یہ بات یاد رکھنے نہ دی، چنانچہ وہ اپنے آقا کے پاس پہنچ کر یوسف علیہ السلام کا تذکرہ کرنا بھول گیا اور یوں حضرت یوسف علیہ السلام کو کئی برس مزید قید میں ٹھہرنا پڑا۔

مدت قید یوسفی: اس آیت میں بِضْعَ سِنِیْنَ کے بارے میں مفسرین کی توضیح یہ ہے کہ بضع تین سے نو سال کے درمیانی عرصے کو کہتے ہیں، تاہم جمہور اہلِ تفسیر کی رائے یہی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس واقعے کے بعد **سات** سال مزید **قید** میں گزارے، بعض روایات، خصوصاً امام سمعانی رحمہ اللہ کی نقل کے مطابق، وہ اس سے پہلے بھی تقریباً پانچ سال قید میں رہ چکے تھے، اس طرح مجموعی مدتِ قید اکثر اقوال کے مطابق بارہ سال بنتی ہے، گویا سات سال وہ تھے جو ساقی کے بھول جانے کے بعد بڑھے، جبکہ پانچ سال اس سے قبل کے تھے، یوں اللہ کی حکمت کے تحت آزمائش کا یہ دور طویل ضرور تھا، مگر اسی صبر واستقامت نے آگے چل کر عزت واقتدار کی راہیں ہموار کیں۔

نکتہ: اس واقعے میں ایک باریک اشارہ یہ بھی ہے کہ جب بندہ کسی ظاہری سہارے کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو بسا اوقات اللہ تعالیٰ اسے مزید انتظار کے مرحلے سے گزار کر خالص توکل کا درس دیتا ہے، تاکہ دل پوری طرح اسی ایک ذات پر قائم ہو جائے۔

شاہ مصر کا خواب اور حضرت یوسف کی تعبیر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ {۴۳} قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ {۴۴} وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ {۴۵} يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ {۴۶} قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ {۴۷} ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ {۴۸} ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ

النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ{۴۹} یوسف.

جواب ترجمہ: اور بادشاہ نے کہا کہ بیشک میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ سات گائیں موٹی ہیں جنہیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور ان کے علاوہ خشک بالیں ہیں اے دربار والو مجھے میرے خواب کے بارے میں جواب دو اگر تم خواب کی تعبیر دیتے ہو۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ تو یوں ہی خیالی خواب ہیں۔ اور ہم خوابوں کی تعبیر دینا جانتے نہیں ہیں۔ اور وہ شخص بول اٹھا جو دو قیدیوں میں سے رہا ہوا تھا اور اسے ایک مدت کے بعد یاد آگیا کہ میں تمہیں اس کی تعبیر سے باخبر کر دوں گا لہٰذا تم لوگ مجھے بھیج دو۔ اے یوسف اے سچے ہمیں ایسی سات موٹی گایوں کے بارے میں جواب دیجئے جنہیں سات دبلی گائیں کھائے جا رہی ہیں اور سات ہری بالوں اور ان کے علاوہ خشک بالوں کے بارے میں بتایئے تاکہ میں ان لوگوں کی طرف واپس ہو جاؤں امید ہے کہ وہ بھی جان لیں گے۔ یوسف نے کہا کہ سات سال لگاتار متواتر کھیتی تار کرو گے پھر جو جو تم کھیتی کاٹ لو تو اسے اس کی بالوں ہی میں چھوڑے رکھنا مگر تھوڑا سا جس سے تم کھاتے رہو۔ پھر اس کے بعد سخت سات سال آئیں گے جو اس سب کو کھا جائیں گے جو تم نے ان کے لیے پہلے سے بچا کر رکھا ہو گا بجز اس کے جو تم چھوڑو گے۔ پھر اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں کے لیے خوب بارش ہو گی اور اس میں رس نچوڑیں گے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ: قدرت الٰہی نے یہ مقرر رکھا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام قید خانے سے بعزت و اکرام پاکیزگی برأت اور عصمت کے ساتھ نکلیں اس کے لیے قدرت نے یہ سبب بنایا کہ شاہ مصر ریان بن ولید نے ایک خواب دیکھا جس سے بھونچکا سا ہو گیا، دربار منعقد کیا اور تمام امراء، رؤسا، کاہن، منجم اور علماء کو خواب کی تعبیر بیان کرنے والوں کو جمع کیا اور اپنا خواب بیان کر کے ان سب سے تعبیر دریافت کی، لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور سب نے لاچار ہو کر یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ کوئی باقاعدہ لائق تعبیر سچا خواب نہیں جس کی تعبیر ہو سکے، یہ تو

یونہی پریشان خواب مخلوط خیالات اور فضول توہمات کا خاکہ ہے، اس کی تعبیر ہم نہیں جانتے۔

اس وقت شاہی ساقی کو حضرت یوسف علیہ السلام یاد آ گئے کہ وہ تعبیر خواب کے پورے ماہر ہیں، اس علم میں ان کو کافی مہارت ہے، یہ وہی شخص ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل خانہ بھگت رہا تھا یہ بھی اور اس کا ایک اور ساتھی بھی، اسی سے حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا کہ بادشاہ کے پاس میرا ذکر بھی کرنا، لیکن اسے شیطان نے بھلا دیا تھا۔

آج مدت مدید کے بعد اسے یاد آ گیا اور اس نے سب کے سامنے کہا کہ اگر آپ کو اس کی تعبیر سننے کا شوق ہے اور وہ بھی صحیح تعبیر تو مجھے اجازت دو، یوسف صدیق علیہ السلام جو قید خانے میں ہیں ان کے پاس جاؤں اور ان سے دریافت کر آؤں، آپ نے اسے منظور کیا اور اسے اللہ کے محترم نبی کے پاس بھیجا۔

بھول جانے کے بعد اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا فرمان یاد آیا، دربار سے اجازت لے کر یہ چلا، قید خانے پہنچ کر اللہ کے نبی ابن نبی ابن نبی ابن نبی علیہم السلام سے کہا کہ اے سچے یوسف! بادشاہ نے اس طرح کا ایک خواب دیکھا ہے، اسے تعبیر کا اشتیاق ہے، تمام دربار بھرا ہوا ہے، سب کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں، آپ مجھے تعبیر بتلا دیں تو میں جا کر انہیں سناؤں اور سب معلوم کر لیں۔

آپ علیہ السلام نے نہ تو اسے کوئی ملامت کی کہ تو اب تک مجھے بھولے رہا، باوجود میرے کہنے کے تو نے آج تک بادشاہ سے میرا ذکر بھی نہ کیا، نہ اس امر کی درخواست کی کہ مجھے جیل خانے سے آزاد کیا جائے بلکہ کسی تمنا کے اظہار کے بغیر خواب کی پوری تعبیر سنا دی اور ساتھ ہی تدبیر بھی بتا دی۔

قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ: اہل دربار نے بادشاہ کا خواب سن کر بے بسی سے کہا: یہ تو پراگندہ اور بے ربط خوابوں کا مجموعہ ہے اور ایسے خوابوں کی کوئی ٹھوس تعبیر نہیں ہوتی، ہم اس طرح کے منتشر خوابوں کی تعبیر جاننے والے نہیں۔

اضغاث احلام کا معنی: ضِغثٌ کا معنی ہے بے ربط اور خلط ملط باتیں، گھاس پھونس کا مٹھی بھر مجموعہ۔ ابو عبیدہ نے کہا: جس خواب کو بہت لوگ دیکھیں اور ان کو جمع کر کے ایسا مجموعہ یا گٹھا بنا لیا جائے جیسے

سوکھی ہوئی گھاس کا گٹھا ہوتا ہے اس سے مراد وہ خواب ہے جس کی تعبیر نہ بیان کی جاسکے۔ کسائی نے کہا: اَضغَاثُ اَحلَامٍ کا معنی ہے ملے جلے اور خلط ملط خواب۔ ابن قتیبہ نے کہا: اَضغَاثُ اَحلَامٍ کا معنی ہے جس طرح آدمی مختلف گھاسوں کو ملا کر ایک گٹھا بناتا ہے اور اس میں طرح طرح کی گھاس ہوتی ہے اسی طرح جس خواب میں مختلف النوع باتیں دکھائی دیں۔ زجاج نے کہا: اَلضِّغثُ کا معنی ہے کسی چیز کا گٹھا، مثلاً سبزیوں یا ان جیسی چیزوں کا، ان کی مراد یہ تھی کہ تم نے خواب میں چند ملی جلی چیزیں دیکھی ہیں، یہ کوئی واضح خواب نہیں ہے اور ایسے ملے جلے خواب کی تعبیر کا ہمیں علم نہیں ہے۔ (تبیان القرآن) علامہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ان سرداروں کا قول ہے جن سے بادشاہ نے تعبیر دریافت کی کہ تیرا یہ خواب پراگندہ خیالات اور غلط ملط باتیں ہیں یہ جھوٹا خواب ہے جس کی کچھ حقیقت نہیں۔

وَقَالَ الَّذِی نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ: اتنے میں وہ ساقی، جو قید سے نجات پا چکا تھا، ایک مدت بعد یوسف علیہ السلام کو اور ان کے علم تعبیر کو یاد کر بیٹھا، اس نے کہا میں تمہیں اس خواب کی حقیقت بتاتا ہوں، مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس شخص کے پاس جاؤں جو اس فن میں بصیرت رکھتا ہے۔

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ: چنانچہ جب وہ یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا تو نہایت عقیدت سے بولا: اے یوسف، اے راست باز! ہمیں اس خواب کی تعبیر بتایئے، سات موٹی گائیں ہیں جنہیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سبز بالیاں ہیں اور سات سوکھی، میں چاہتا ہوں کہ واپس جا کر بادشاہ اور اہل دربار کو اس کی صحیح تعبیر بتاؤں تاکہ وہ حقیقت سے آگاہ ہوں اور آپ کے علم و فضل اور بلند مقام کو پہچان سکیں۔

قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا: حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے خواب کی تعبیر نہایت حکمت اور بصیرت کے ساتھ بیان کی، فرمایا: تم لگاتار سات برس پوری محنت اور اہتمام سے کاشتکاری کرو گے۔

فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ: حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ پھر جو فصل ہر سال کاٹو اسے اس کی بالیوں میں ہی رہنے دو تاکہ وہ کیڑے اور فساد سے محفوظ رہے، البتہ اپنی ضرورت کے مطابق تھوڑا سا اناج کھاتے رہو۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ: اس کے بعد سات سخت قحط کے سال آئیں گے، جو ان خوش حالی کے برسوں میں جمع کیا ہوا غلہ کھا جائیں گے، سوائے اس تھوڑی مقدار کے جسے تم بیج کے لیے سنبھال کر رکھو گے۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ: پھر ان خشک سالیوں کے بعد ایک سال ایسا آئے گا جس میں خوب بارشیں ہوں گی، زمین سرسبز ہو اٹھے گی اور لوگ اپنی ضرورت کی چیزیں، انگور، زیتون اور دیگر پیداوار، نچوڑیں گے، یوں آزمائش کے بعد فراخی اور تنگی کے بعد وسعت کا دروازہ کھلے گا۔

یوسف علیہ السلام نے قید خانے سے نکلنے سے کیوں انکار کیا؟

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ {۵۰} یوسف.

جواب ترجمہ: (یہ تعبیر سُن کر) بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف کو میرے پاس لے آؤ۔ جب قاصد ان کے پاس گیا۔ تو انہوں نے کہا کہ اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور ان سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔ بیشک میرا پروردگار ان کے مکروں سے خوب واقف ہے۔

جب شاہ مصر کا قاصد حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اسے فرمایا کہ اپنے آقا کی طرف واپس جاؤ اور ان سے یہ مطالبہ کرو کہ وہ مصری عورتوں سے ذرا دریافت کریں جنہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر ڈالے تھے کہ میرے بارے میں اصل حقیقت کیا ہے؟ تاکہ سب

لوگوں کے سامنے معاملہ واضح ہو جائے، میری صفائی علی رؤس الاشہاد ہو جائے، جو کچھ ان مصری عورتوں نے کیا اللہ تعالیٰ اس بات کو خوب جاننے والا ہے، اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

یوسف علیہ السلام کی مکمل برأت کا اعلان

سوال حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت کب ظاہر ہوئی؟ آیت کی روشنی میں وضاحت مطلوب ہے۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ {۵۱} یوسف.

جواب ترجمہ: بادشاہ نے (عورتوں سے) پوچھا کہ بھلا اس وقت کیا ہوا تھا جب تم نے یوسف کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا؟ سب بول اٹھیں کہ حاشا للہ ہم نے اس میں کوئی برائی معلوم نہیں کی۔ عزیز کی عورت نے کہا اب سچی بات تو ظاہر ہو ہی گئی ہے۔ (اصل یہ ہے) کہ میں نے اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا اور وہ بیشک سچا ہے۔

جب شاہ مصر نے ان عورتوں سے پوچھا جنہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر دیے تھے کہ مہمانی کے دن جب تم نے یوسف کا ارادہ کیا تھا اس دن کیا معاملہ تھا؟ کیا تم نے کوئی ایسی بات اس میں دیکھی تھی جو اسے مشکوک بنادے؟ ان سب عورتوں نے جواباً کہا تھا کہ اللہ کی پناہ! ہم نے یوسف میں ادنیٰ سی بات بھی ایسی نہیں دیکھی تھی جو اسے عیب دار کرے، اس وقت شاہ مصر کی بیوی نے کہا: اب حق واضح ہو چکا ہے، پوشیدگی اور خفا اب دور ہو چکا ہے، میں ہی وہ قصور وار ہوں جس نے یوسف کو ورغلانے کی کوشش کی تھی مگر وہ بچ نکلا تھا، وہ ان تمام باتوں میں سچا ہے جو اس نے کہیں۔

قول یوسف علیہ السلام و قول زلیخا کا مطلب

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ {۵۲} وَمَآ اُبَرِّئُ

نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ {۵۳} وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ {۵۴} یوسف

جواب ترجمہ: یہ اس لیے کہ وہ جان لے کہ میں نے اس کے پیچھے اس کی خیانت نہیں کی اور بلاشبہ اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو نہیں چلنے دیتا۔ اور میں اپنے نفس کو بری نہیں بتاتا بلاشبہ نفس برائی کرنے کا خوب زیادہ حکم دیتا ہے۔ بجز اس کے جس پر میرا رب رحم فرمائے بیشک میرا رب غفور ہے رحیم ہے۔ اور بادشاہ نے کہا کہ اس شخص کو میرے پاس لاؤ میں اسے خالص اپنے لیے رکھوں گا پھر جب ان سے بات کی تو کہا بیشک آج تم ہمارے پاس باعزت ہو معتبر آدمی ہو۔

جب جیل میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ساری تفصیل بتلائی گئی تو اسے سن کر یوسف علیہ السلام نے کہا اور بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ کے پاس جا کر انہوں نے یہ کہا اور بعض مفسرین کے نزدیک زلیخا کا قول ہے اور مطلب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کی غیر موجودگی میں بھی اس غلط طور پر خیانت کا ارتکاب نہیں کرتی بلکہ امانت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کرتی ہوں۔ یا یہ مطلب ہے کہ میں نے اپنے خاوند کی خیانت نہیں کی اور کسی بڑے گناہ میں واقع نہیں ہوئی۔ امام ابن کثیر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ (تفسیر مکہ) اگر اس سے قول یوسف مراد لیا جائے تو حضرت یوسف کے قول میں ذٰلِكَ سے مراد برأت طلب کرنا ہے، لِیَعْلَمَ کا فاعل شاہ مصر ہے، میں نے اس کی خیانت نہیں کی یعنی اس کے گھر میں، وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ میں تواضع اور انکساری کا اظہار فرمایا، کہ بھول چوک، پھسلن، مزلت اقدام سے میں اپنی برأت نہیں کرتا، اِنَّ النَّفْسَ سے مراد انسانی نفس ہے جو کثرت سے انسان کو برائی کا حکم کرتا رہتا ہے۔

اگر یہ قول شاہ مصر کی بیوی کا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ میں اس کے بارے میں کہتی ہوں، اس کی صفائی اور برأت میں اور اپنے لیے خیانت کا اقرار کرتی ہوں تاکہ میرے خاوند کو پتا چل

جائے کہ میں نے کوئی خیانت نہیں کی، مجھ سے فحش کا صدور نہیں ہوا، میں نے تو صرف اسے ورغلایا تھا اور اس بات کا میں اعتراف کرتی ہوں تاکہ میری بھی برأت ہو جائے اور اس کی بھی برأت ہو جائے، اور اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ خیانت کاروں کو توفیق نہیں دیتا، نہ ہی ان کی خیانت میں ان کی راہنمائی کرتا ہے، میں اپنے نفس کی پاکی نہیں بیان کر رہی اور نہ ہی اپنے نفس کی برأت کر رہی ہوں، اس لیے کہ نفس تو صاحب نفس کو معاصی اور نافرمانی کی بہت زیادہ ترغیب دیتا رہتا ہے، تاکہ لذتیں حاصل کی جائیں، مگر بچتا وہی ہے جسے اللہ بچائے، اللہ ان لوگوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے جو توبہ کے خواستگار ہوتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام جیل سے تخت شاہی تک

سوال آیت کا ترجمہ کیجیے اور بتائیے کہ آیت میں أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي، اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَآئِنِ الْأَرْضِ کا کیا مطلب ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ {۵۴} قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَآئِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ {۵۵} یوسف.

جواب ترجمہ: بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لاؤ میں اسے اپنا مصاحب خاص بناؤں گا۔ پھر جب ان سے گفتگو کی تو کہا کہ آج سے تم ہمارے ہاں صاحب منزلت اور صاحب اعتبار ہو۔ (یوسف علیہ السلام) نے کہا مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے کیونکہ میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور اس کام سے واقف ہوں۔

جب بادشاہ کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کی بے گناہی کھل گئی تو خوش ہو کر کہا کہ انہیں میرے پاس بلا لاؤ کہ میں انہیں اپنے خاص مشیروں میں کر لوں، چنانچہ آپ تشریف لائے، جب وہ آپ سے ملا، آپ کی صورت دیکھی، آپ کی باتیں سنیں، آپ کے اخلاق دیکھے تو دل سے گرویدہ ہو گیا اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا کہ آج سے آپ ہمارے ہاں معزز اور معتبر ہیں، اس وقت آپ نے

ایک خدمت اپنے لئے پسند فرمائی اور اس کی اہلیت ظاہر کی، انسان کو یہ جائز بھی ہے کہ جب وہ انجان لوگوں میں ہو تو اپنی قابلیت بوقت ضرورت بیان کر دے، اس خواب کی بنا پر جس کی تعبیر آپ نے دی تھی، آپ نے یہی آرزو کی کہ زمین کی پیداوار غلہ وغیرہ جو جمع کیا جاتا ہے اس پر مجھے مقرر کیا جائے تاکہ میں محافظت کروں نیز اپنے علم کے مطابق عمل کر سکوں تاکہ رعایا کو قحط سالی کی مصیبت کے وقت قدرے عافیت مل سکے۔ بادشاہ کے دل پر تو آپ کی امانت داری، سچائی، سلیقہ مندی اور کامل علم کا سکہ بیٹھ چکا تھا اسی وقت اس نے اس درخواست کو منظور کر لیا۔ (تفسیر ابن کثیر)

یوسف علیہ السلام کو اعزاز کے ساتھ جیل خانہ سے دربار میں لایا گیا اور باہمی گفتگو سے یوسف علیہ السلام کی صلاحیتوں کا پورا اندازہ ہو گیا تو بادشاہ نے کہا کہ آپ آج ہمارے نزدیک بڑے معزز اور معتمد ہیں۔ (تفسیر معارف القرآن)

اہل تفسیر لکھتے ہیں کہ شاہ مصر نے معزّزین کی ایک جماعت، بہترین سواریاں اور شاہانہ ساز و سامان اور نفیس لباس دے کر قید خانہ بھیجی تاکہ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ ایوانِ شاہی میں لائیں۔ ان لوگوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر بادشاہ کا پیام عرض کیا آپ نے قبول فرمایا اور قید خانہ سے نکلتے وقت قیدیوں کے لئے دعا فرمائی، جب قید خانہ سے باہر تشریف لائے تو اس کے دروازہ پر لکھا هٰذِهٖ مَنَازِلُ البَلوىٰ وَقُبُورُ الاَحيَاءِ وَشَمَاتَةُ الأَعدَاءِ وَتَجرِبَةُ الأَصدقَاءِ (روح البیان) یہ بلا کا گھر، زندوں کی قبر اور دشمنوں کی بدگوئی اور سچوں کے امتحان کی جگہ ہے۔

امام بغوی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ جب بادشاہ کا قاصد جیل میں یوسف علیہ السلام کے پاس دوبارہ پہنچا اور بادشاہ کی دعوت پہونچائی تو یوسف علیہ السلام نے سب جیل والوں کے لئے دعا کی اور غسل کر کے نئے کپڑے پہنے جب دربار شاہی پر پہنچنے تو یہ دعاء کی حَسبِی رَبِی مِن دُنیَایَ وَحَسبِی رَبِی مِن خَلقِه عَزَّ جَارُہٗ وَجَلَّ ثَنَاءُہٗ وَلَآ الٰہ غَیرُہٗ یعنی میری دنیا کے لئے میرا رب مجھے کافی ہے اور ساری مخلوق

کے بدلے میرا رب میرے لئے کافی ہے جو اس کی پناہ میں آ گیا وہ بالکل محفوظ ہے اور اس کی بڑی تعریف ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

جب دربار میں پہنچے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اسی طرح دعاء کی اور عربی زبان میں سلام کیا اَلسَّلَامُ عَلَیکُم وَرَحمَۃُ اللّٰہِ اور، بادشاہ کیلئے دعاء عبرانی زبان میں کی بادشاہ اگرچہ ستر (۷۰) زبانیں جانتا تھا مگر عربی زبان سے واقف نہ تھا یوسف علیہ السلام نے بتلایا کہ سلام تو عربی زبان میں کیا گیا ہے اور دعا عبرانی زبان میں، حضرت یوسف بہتر زبانیں جانتے تھے، مگر بادشاہ انہیں سمجھ نہیں سکتا تھا، بادشاہ نے پوچھا کہ یہ کیا زبانیں ہیں؟ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میرے آباء حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کی زبانیں ہیں، جب یوسف علیہ السلام نے عربی زبان میں گفتگو کی تو بادشاہ سمجھ نہ سکا، تو اس نے پوچھا یہ کیا زبان ہے؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میرے چچا اسماعیل علیہ السلام کی زبان ہے، بادشاہ نے ستر زبانوں میں یوسف علیہ السلام سے گفتگو کی تو یوسف علیہ السلام نے ستر زبانوں میں اسے جواب دیا، جس پر بادشاہ بہت ہی حیران ہوا۔

اس گفتگو کے بعد بادشاہ نے تقاضا کیا کہ میں آپ کے سامنے اپنے خواب بیان کرتا ہوں اور آپ مجھے ان کی تعبیر بتائیں، چنانچہ بادشاہ نے وہ خواب بیان کیا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، تو یوسف علیہ السلام نے بڑے عمدہ اسلوب میں ان خوابوں کی تعبیر بتائی۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام سے مختلف زبانوں میں باتیں کیں یوسف علیہ السلام نے اس کو اسی زبان میں جواب دیا اور عربی اور عبرانی کی دو زبانیں مزید سنائیں جن سے بادشاہ واقف نہ تھا اس واقعہ نے بادشاہ کے دل میں یوسف علیہ السلام کی غیر معمولی وقعت قائم کر دی۔

پھر شاہ مصر نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں آپ سے اپنے خواب کی تعبیر بلاواسطہ سُن لوں یوسف علیہ السلام نے پہلے اس کے خواب کی ایسی تفصیلات بتلائیں جو اب تک بادشاہ نے بھی کسی سے ذکر نہیں کی تھیں پھر تعبیر بتلائی۔

أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي اس کا مطلب یہ ہے کہ میں انہیں اپنے چنے ہوئے لوگوں اور اپنے مشورہ دینے والوں میں شامل کر دوں۔

اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے مصر کے خزانوں کا ذمہ دار بنا دیجیے۔

یوسف علیہ السلام کی عزت واقتدار، بھائیوں کے ساتھ پہلی ملاقات

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ {۵۶} وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ {۵۷} وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ {۵۸} وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ {۵۹} فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ {۶۰} قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ {۶۱} وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ {۶۲} یوسف

جواب ترجمہ: اور ہم نے اسی طرح یوسف کو زمین میں با اختیار بنا دیا اس میں جہاں چاہے رہے ہم جسے چاہیں اپنی رحمت پہنچا دیں اور ہم اچھے کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ اور البتہ آخرت کا ثواب ان لوگوں کیلئے بہتر ہے جو ایمان لائے اور تقوی اختیار کرتے تھے۔ اور یوسف کے بھائی آئے سو وہ ان کے پاس اندر چلے گئے سو یوسف نے انہیں پہچان لیا اور وہ انہیں نہیں پہچان رہے تھے۔ اور جب یوسف نے انہیں سامان تیار کر دیا تو فرمایا کہ تمہارا جو ایک باپ شریک بھائی ہے اسے میرے پاس لے آنا کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ میں پورا ناپ کر دیتا ہوں اور میں سب سے زیادہ مہمان نوازی کرنے والا ہوں۔ سو اگر تم اس بھائی کو میرے پاس نہ لائے تو تمہارے لیے میرے پاس کوئی غلہ نہیں ہے جو میں تمہیں ناپ کر دوں اور میرے پاس مت آنا۔ بھائیوں نے کہا کہ ہم اس کے باپ سے اس کے بارے

میں درخواست کریں گے اور ہمیں یہ کام ضرور کرنا ہے۔ اور یوسف نے اپنے خدمت گزاروں سے کہا کہ ان کی پونجی ان کے کجاووں میں رکھ دو اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ جائیں تو اسے پہچان لیں شاید وہ پھر واپس آجائیں۔

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ہم نے سرزمین مصر کو یوسف علیہ السلام کا مطیع کر دیا، تنگی و قید کے بعد اب پورے مصر میں ہر جگہ جانے کی کشادگی تھی اور ہم اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت سے نوازتے ہیں، جیسا یوسف کو پہنچائی، غلامی، قید کے بعد ہم نے ان کو زمین میں اقتدار بخشا اور کنوئیں میں ڈالے جانے کے بعد اقتدار سے بہرہ ور کر دیا اور جو شخص بھی اپنے رب کی اطاعت گزاری اور خوب عمل کرتا ہے، اوامر و نواہی کو بجالاتا ہے ہم اس کے بدلے کو ضائع نہیں کرتے جیسا یوسف علیہ السلام نے اچھے عمل کیے تو ان کے اجر کو ضائع نہیں کیا۔ (تفسیر طبری)

تمکین ارضی کی کیفیت: جب یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے زمین کے خزانوں پر مامور کر دیجیے، اس درخواست پر بادشاہ ریان بن ولید نے انہیں اس ذمہ داری پر مامور کر دیا، انہیں اطفیر کی معزولی کے بعد اس کی جگہ مقرر کیا گیا، یہ بھی ذکر کیا گیا کہ اطفیر انہی ایام میں فوت ہو گیا تھا اور ریان بن ولید نے یوسف کی شادی اطفیر کی عورت راعیل سے کر دی، جب راعیل یوسف کے پاس آئی تو اس نے راعیل سے کہا کیا یہ اس سے بہتر نہیں جس کا تو ارادہ کرتی تھی؟ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ راعیل نے کہا اے سچے! تم مجھے اس پر ملامت مت کرو میں حسن و جمال والی عورت تھی اور خوش حالی کی زندگی پائی تھی اور میرا خاوند عورتوں کے پاس نہ جاتا تھا اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے حسن و جمال اور عمدہ ہیئت سے نوازا تھا، پس میرے نفس نے مجھ پر غلبہ پایا، لوگوں کا خیال ہے یوسف نے اسے کنواری پایا، اسی راعیل سے ان کے دو بیٹے افرائیم بن یوسف اور میشا بن یوسف پیدا ہوئے۔

علامہ طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بادشاہ نے ان کو مصر کا گورنر بنا دیا ان کا حکم مصر میں چلنے لگا وہ خرید و فروخت اور تجارت کے ذمہ دار تھے اور تمام تجارتی معاملات کے مسئول تھے۔ (طبری)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں جہاں چاہتے اترتے اور جو چاہتے تصرف کرتے، گویا ریان بن الولید برائے نام بادشاہ تھا، حقیقت میں یوسف بادشاہی کر رہے تھے اور " عزیز " کہہ کر پکارے جاتے تھے، بعض علماء نے لکھا ہے کہ بادشاہ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا، نیز اسی زمانہ میں عزیز مصر کا انتقال ہوا تو اس کی عورت زلیخا نے آپ سے شادی کر لی۔ واللہ اعلم۔ محدثین اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ (عثمانی)

ایک مقام پر اس آیت کے ذیل میں یہ معلومات افزا تفسیر کی گئی ہے، اَمارت طلب کرنے کے ایک سال بعد بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلا کر آپ کی تاج پوشی کی اور تلوار اور مُہر آپ کے سامنے پیش کی اور آپ کو طلائی تخت پر تخت نشین کیا جو جواہرات سے مرصّع تھا اور اپنا ملک آپ کو تفویض کیا اور قطفیر (عزیز مصر) کو معزول کر کے آپ کو اس کی جگہ والی بنایا اور تمام خزائن آپ کو تفویض کئے اور سلطنت کے تمام امور آپ کے ہاتھ میں دے دیئے اور خود مثل تابع کے ہو گیا کہ آپ کی رائے میں دخل نہ دیتا اور آپ کے ہر حکم کو مانتا، اسی زمانہ میں عزیز مصر کا انتقال ہو گیا۔

بادشاہ نے اس کے انتقال کے بعد زلیخا کا نکاح حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کر دیا، جب یوسف علیہ السلام زلیخا کے پاس پہنچے اور اس سے فرمایا کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے جو تو چاہتی تھی؟ زلیخا نے عرض کیا اے صدیق! مجھے ملامت نہ کیجئے میں خوبرو تھی، نوجوان تھی، عیش میں تھی اور عزیز مصر عورتوں سے سروکار ہی نہ رکھتا تھا اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہ حسن و جمال عطا کیا ہے، میرا دل اختیار سے باہر ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو معصوم کیا ہے، آپ محفوظ رہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا کو باکرہ پایا اور اس سے آپ کے دو فرزند ہوئے افراثیم اور میثا اور مصر میں آپ کی حکومت مضبوط ہوئی، آپ نے عدل کی بنیادیں قائم کیں، ہر زن و مرد کے دل میں آپ کی محبت پیدا ہوئی اور آپ نے قحط سالی کے ایّام کے لیے غلّوں کے ذخیرے جمع کرنے کی تدبیر فرمائی، اس کے لیے بہت وسیع اور عالی شان انبار خانے تعمیر فرمائے اور بہت کثیر ذخائر جمع کئے، جب

فراخی کے سال گزر گئے اور قحط کا زمانہ آیا تو آپ نے بادشاہ اور اس کے خدام کے لیے روزانہ صرف ایک وقت کا کھانا مقرر فرمادیا۔

ایک روز دوپہر کے وقت بادشاہ نے حضرت سے بھوک کی شکایت کی، آپ نے فرمایا یہ قحط کی ابتداء کا وقت ہے پہلے سال میں لوگوں کے پاس جو ذخیرے تھے سب ختم ہوگئے، بازار خالی رہ گئے، اہل مصر حضرت یوسف علیہ السلام سے جنس خریدنے لگے اور ان کے تمام درہم دینار آپ کے پاس آگئے۔

دوسرے سال زیور اور جواہرات سے غلّہ خریدا اور وہ تمام آپ کے پاس آگئے، لوگوں کے پاس زیور وجواہر کی قسم سے کوئی چیز نہ رہی۔ تیسرے سال چوپائے اور جانور دے کر غلّے خریدے اور ملک میں کوئی کسی جانور کا مالک نہ رہا۔ چوتھے سال میں غلّے کے لیے تمام غلام اور باندیاں بیچ ڈالیں۔

پانچویں سال تمام اراضی وعملہ وجاگیریں فروخت کر کے حضرت سے غلّہ خریدا اور یہ تمام چیزیں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچ گئیں۔ چھٹے سال جب کچھ نہ رہا تو انہوں نے اپنی اولادیں بیچیں، اس طرح غلّے خرید کر وقت گذارا۔ ساتویں سال وہ لوگ خود بک گئے اور غلام بن گئے اور مصر میں کوئی آزاد مرد وعورت باقی نہ رہا، جو مرد تھا وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا غلام تھا، جو عورت تھی وہ آپ کی کنیز تھی اور لوگوں کی زبان پر تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی سی عظمت وجلالت کبھی کسی بادشاہ کو میسر نہ آئی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے کہا کہ تو نے دیکھا اللہ کا مجھ پر کیسا کرم ہے، اس نے مجھ پر ایسا احسان عظیم فرمایا اب ان کے حق میں تیری کیا رائے ہے؟ بادشاہ نے کہا جو حضرت کی رائے اور ہم آپ کے تابع ہیں، آپ نے فرمایا میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تجھ کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے تمام اہل مصر کو آزاد کیا اور ان کے تمام املاک اور کل جاگیریں واپس کیں۔

اس زمانہ میں حضرت نے کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں تناول فرمایا، آپ سے عرض کیا گیا کہ اتنے عظیم خزانوں کے مالک ہو کر آپ بھوکے رہتے ہیں؟ فرمایا اس اندیشہ سے کہ سیر ہو جاؤں تو کہیں بھوکوں کو نہ بھول جاؤں، سبحان اللہ کیا پاکیزہ اخلاق ہیں۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ مصر کے تمام زن و مرد کو حضرت یوسف علیہ السلام کے خریدے ہوئے غلام اور کنیزیں بنانے میں اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت تھی کہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو کہ حضرت یوسف علیہ السلام غلام کی شان میں آئے تھے اور مصر کے ایک شخص کے خریدے ہوئے ہیں بلکہ سب مصری ان کے خریدے اور آزاد کئے ہوئے غلام ہوں اور حضرت یوسف علیہ السلام نے جو اس حالت میں صبر کیا اس کی یہ جزا دی گئی۔ (خزائن العرفان) یہاں ان دونوں تفاسیر کے مندرجات میں تھوڑا بہت فرق ہے، علامہ محمود نسفی نے تفسیر مدارک التنزیل میں ان واقعات کے مندرجات کو اسرائیلی روایات کہا ہے۔

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ثواب آخرت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو سچا جاننے والوں کے لئے بہت بہتر ہے اس سلطنت مصریہ کے مقابلہ میں جو یوسف علیہ السلام کو دیا گیا تھا بشرطیکہ وہ مومن اللہ تعالیٰ کے تقویٰ پر کاربند اور اس کے حکم کی مخالفت اور محارم کی بے حرمتی میں اس کے عقاب سے ترساں و لرزاں ہوں اور امر و نہی میں اس کی اطاعت گزاری کرنے والے ہوں۔ (طبری)

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی آئے اور ان کے پاس داخل ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا اور وہ یوسف کا انکار کرنے والے تھے وہ اسے پہچانتے نہ تھے۔

بر دران یوسف کی آمد کا سبب: جب یوسف علیہ السلام اپنی مملکت میں تخت شاہی پر براجمان ہو گئے اور ابتلاء سے نکل گئے اور سات شادابی والے سال گزر گئے جن میں آئندہ سات قحط والے سالوں کی تیاری کی خبر دی تھی، قحط والے سال مسلط ہو گئے لوگ ہر جانب سے مشقت میں مبتلا ہو گئے اور مصر کا رخ کیا تاکہ غلہ تلاش کریں۔

جب یوسف علیہ السلام نے لوگوں کی اس مشقت کو دیکھا تو ان سے ہمدردی کا اظہار کیا وہ ایک آدمی کو ایک اونٹ کا بوجھ پھر غلہ دینے لگے، ایک آدمی دو اونٹ غلہ نہ لے جا سکتا تھا، آپ علیہ السلام نے اس طرح

لوگوں میں انصاف و توسیع سے کام لیا، مصر میں غلہ کی خاطر آنے والے لوگوں میں بردران یوسف بھی شامل تھے، آپ نے ان کو پہچان لیا مگر وہ پہچان نہ سکے اس لئے کہ وہ اس بات سے انکاری تھے کہ ارادہ الٰہی کے مطابق یوسف اس جگہ تک پہنچیں جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو پہنچانا تھا۔

شدید ترین قحط سالی شروع ہوگئی، لوگ بھوک میں مبتلا ہوگئے، یہاں تک کہ بھوک کے اثرات اس علاقہ بھی پہنچے جہاں یعقوب علیہ السلام مقیم تھے، یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو مصر بھیجا اور یوسف کے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لیا جب وہ یوسف کے ہاں پہنچے تو آپ نے ان کو پہچان لیا اور وہ ان کو ناواقف قرار دینے والے تھے۔

آپ علیہ السلام نے ان کو دیکھ کر فرمایا تم مجھے اپنے احوال کی اطلاع دو، مجھے تمہاری حالت بہت بگڑی نظر آتی ہے، انہوں نے کہا کہ ہم شام سے آئے ہیں، آپ نے پوچھا تم کیسے آئے ہو؟ انہوں نے بتلایا غلہ کی غرض سے آئے ہیں، آپ علیہ السلام نے فرمایا تم جھوٹ بول رہے ہو، تم تو جاسوس ہو، تمہاری تعداد کتنی ہے؟ انہوں نے کہا ہم دس ہیں۔

آپ علیہ السلام نے فرمایا تم دس ہزار ہو، تم میں سے ہر ایک ایک ہزار کا راہنما ہے، تم مجھے ٹھیک ٹھیک حالات بتلاؤ، انہوں نے کہا ہم ایک سچے آدمی کی اولاد ہیں ہماری تعداد بارہ تھی ہمارا والد ہمارے ایک بھائی کو بہت چاہتا تھا وہ ہمارے ساتھ جنگل میں ہم سے ہلاک ہوگیا، وہ ہمارے والد کا زیادہ چہیتا تھا، آپ نے پوچھا تمہارے باپ کے ہاں کون ٹھہرا ہوا ہے؟ انہوں نے کہا ہمارا سب سے چھوٹا بھائی، آپ نے کہا تم مجھے کیسے اطلاع دیتے ہو کہ تمہارا باپ سچا ہے جبکہ وہ چھوٹے سے محبت کرتا ہے بڑے کو چھوڑ کر، تم میرے پاس اپنے اس بھائی کو لاؤ تاکہ میں اسے دیکھوں اگر فَإِنْ لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ اسے نہ لائے تو تمہیں غلہ نہ ملے گا بلکہ میرے ملک کے قریب بھی مت آنا انہوں نے کہا اس کے والد کو اس کے متعلق بہلائیں گے اور ہم ضرور ایسا کریں گے، آپ نے کہا اپنے لوٹنے کی ضمانت کے طور پر اپنے میں سے ایک شخص کو چھوڑ دو انہوں نے شمعون کو وہیں چھوڑا۔ (طبری)

وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ: جب یوسف علیہ السلام نے ان کے لئے ان کا سامان تیار کر دیا تو کہا کہ (پھر آنا تو) جو باپ کی طرف سے تمہارا ایک اور بھائی ہے اسے بھی میرے پاس لیتے آنا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں ناپ بھی پوری پوری دیتا ہوں اور مہمانداری بھی خوب کرتا ہوں؟

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی خوب مدارات اور مہمان داری کی، ایک ایک اونٹ فی کس غلہ دیا، یہ خاص مہربانی اور اخلاق دیکھ کر کہتے ہیں انہوں نے درخواست کی کہ ہمارے ایک علاتی بھائی (بنیامین) کو بوڑھے غمزدہ باپ نے تسکین خاطر کے لیے اپنے پاس روک لیا ہے کیونکہ اس کا دوسرا عینی بھائی (یوسف) جو باپ کو بے حد محبوب تھا مدت ہوئی کہیں جنگل میں ہلاک ہو چکا ہے، اگر بنیامین کے حصہ کا غلہ بھی ہم کو مرحمت فرمائیں تو بڑی نوازش ہو گی، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اس طرح غائب کا حصہ دینا خلاف قاعدہ ہے تم پھر آؤ تو بنیامین کو ساتھ لاؤ تب اس کا حصہ پا سکو گے، میرے اخلاق اور مہمان نوازی کو تم خود مشاہدہ کر چکے ہو، کیا اس کے بعد تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کے لانے میں کچھ تردد ہو سکتا ہے؟ (تفسیر عثمانی)

فَإِن لَّمْ تَأْتُونِ بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ: اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر تم اپنے باپ جائے بھائی کو نہ لاؤ گے تو تمہیں میرے ہاں سے کوئی غلہ نہ ملے گا اور نہ تم میرے علاقہ کے قریب آنا۔

قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ: برادران یوسف نے کہا ہم بنیامین کو لانے کے لیے باپ کو پھسلانے کی کوشش کریں گے، اس کے متعلق ضرور چال چلیں گے اور کوئی حیلہ کریں گے تاکہ ان کے ہاتھوں سے ہم لا سکیں۔ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ اور ہم نے ضرور یہ کرنا ہے، یہ بہر صورت ہو گا، اس میں کوئی کمی اور سستی نہ کریں گے، یوسف علیہ السلام نے کہا ایک کو بطور رہن چھوڑ دو، انہوں نے شمعون کو ان کے پاس چھوڑ دیا، جو یوسف علیہ السلام کے متعلق سب سے بہتر رائے والا تھا۔

وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ : اور یوسف علیہ السلام نے اپنے خدّام سے کہا کہ ان کے غلے کی قیمت ان کے تھیلوں میں رکھ دو عجب نہیں کہ جب یہ اپنے اہل و عیال میں جائیں تو اسے پہچان لیں (اور) عجب نہیں کہ یہ پھر یہاں آئیں۔ یہاں فتیان سے وہ لوگ مراد ہیں جو غلہ ماپ ماپ کر دے رہے تھے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام نے ان کی اچھی طرح مہمان نوازی کی اور غلہ بھرنے والوں کو یہ اشارہ بھی کر دیا کہ جو رقم غلہ کی قیمت کے طور پر ان سے وصول کی گئی ہے وہ بھی ان کے غلہ میں رکھ دی جائے اور یہ کام انہوں نے اس غرض سے کیا کہ ممکن ہے کہ انہیں دوبارہ آنے کے لیے رقم میسر نہ ہو اور وہ آ ہی نہ سکیں یا بڑی دیر بعد میسر ہو تو اس صورت میں میرے پاس دوبارہ اپنے چھوٹے حقیقی بھائی بنیامین کو ساتھ لے کر آئیں۔

قرآن کے الفاظ سے تو رقم واپس کرنے کی یہی اصل غرض معلوم ہوتی ہے، تاہم بعض مفسرین کہتے ہیں کہ رقم کی واپسی سے ان کا دوسرا مقصد یا تابع مقصد یہ بھی تھا کہ وہ بھائیوں سے غلہ کی قیمت لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

بنیامین شام سے مصر کیسے پہنچے؟

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ آیت مبارکہ میں وَنَمِيرُ أَهْلَنَا کا کیا مطلب ہے؟

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ {٦٣} قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۖ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ {٦٤} وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ۭ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ {٦٥} قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ {٦٦} یوسف

جواب ترجمہ: پھر جب وہ اپنے باپ کے پاس آئے تو کہنے لگے کہ اے ابا جان ہمیں غلہ دینے کی ممانعت کر دی گئی ہے سو آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تا کہ ہم غلہ لا سکیں اور بلاشبہ ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ ان کے والد نے کہا کیا میں اس پر تمہارا اعتبار کروں مگر جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی پر تمہارا اعتبار کر چکا ہوں۔ سو اللہ سب سے بہتر نگہبان ہے اور وہ سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔ اور جب انہوں نے سامان کو کھولا تو انہوں نے اپنی پونجی کو پایا کہ ان کی طرف واپس کر دی گئی ہے کہنے لگے کہ اباجی اور ہمیں کیا چاہیے یہ ہماری پونجی ہے ہماری طرف لوٹا دی گئی ہے اور ہم اپنے گھر والوں کیلئے لائیں گے اور ہم اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ لے آئیں گے۔ یہ غلہ تھوڑا سا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں ہرگز اسے تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا یہاں تک کہ تم مجھے اللہ کی طرف سے مضبوط عہد نہ دیدو کہ تم اسے ضرور لے کر آؤ گے مگر یہ کہ تم کو گھیر لیا جائے سو جب انہوں نے اپنے والد کو اپنا عہد دے دیا تو والد نے کہا کہ ہم جو بات کہہ رہے ہیں اس پر اللہ نگہبان ہے۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ: جب بھائی مصر سے واپس اپنے والدِ گرامی کے پاس پہنچے تو عرض کرنے لگے "اے ہمارے ابّا جان! ہم سے غلّہ ناپ کر دینا روک دیا گیا ہے، اب اگر آئندہ گئے تو ہمیں پورا پیمانہ نہ ملے گا، اس لیے ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیجیے تا کہ ہم پورا غلّہ حاصل کر سکیں اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے"۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ مصری حاکم نے شرط عائد کی ہے کہ اگلی بار حقیقی بھائی کو ساتھ لایا جائے، تبھی ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر مزید غلہ مل سکے گا، بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے بتایا: بادشاہ نے ہمارا بڑا اکرام کیا، مگر شمعون کو بطورِ رہن روک لیا ہے اور صاف کہہ دیا ہے کہ اگر اپنے اس بھائی کو ساتھ نہ لائے تو نہ ہمارے شہر میں داخل ہونا اور نہ ہمارے قریب آنا۔

یہ سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل میں پرانا زخم تازہ ہو گیا، انہوں نے فرمایا "کیا میں اس کے بارے میں بھی تم پر ویسا ہی اعتماد کروں جیسا اس کے بھائی کے بارے میں پہلے کیا تھا؟ اللہ ہی سب سے بہتر نگہبان ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"۔ گویا انسانی وعدوں پر اعتماد سے بڑھ کر انہوں نے اپنے معاملے کو اللہ کی حفاظت کے سپرد کیا، بعض آثار میں ہے کہ انہوں نے بیٹوں سے کہا: جب مصر کے حاکم کے پاس جاؤ تو میرا سلام کہنا اور اس کے احسان پر اس کے لیے دعا کرنا۔

اس آیت میں ایک طرف بھائیوں کی محتاجی اور تدبیر کا پہلو ہے اور دوسری طرف حضرت یعقوب کا دل شکستہ مگر خدا پر کامل بھروسا، جو اس قصے کا روحانی جوہر ہے۔

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب بیٹوں نے بنیامین کو اپنے ساتھ بھیجنے کی درخواست کی تو ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام نے گہرے رنج اور پُر معنی لہجے میں فرمایا: "کیا میں تمہیں اس کے بارے میں اسی طرح امین سمجھوں جیسے اس سے پہلے اس کے بھائی یوسف کے بارے میں سمجھا تھا؟" یعنی کیا پھر وہی اعتماد کروں جس کا نتیجہ میرے دل کے چراغ کے بجھڑ جانے کی صورت میں نکلا؟ اس جملے میں ایک باپ کے زخمی دل کی کسک بھی ہے اور تجربے کی تلخی بھی۔

پھر فوراً اپنے کلام کو توکل کی روشنی میں سمو دیا: "پس اللہ ہی سب سے بہتر نگہبان ہے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"۔ گویا انسانی تدبیروں اور وعدوں سے بلند ہو کر معاملہ اس ذات کے سپرد کر دیا جو حقیقی محافظ ہے، جس کی حفاظت میں نہ کوتاہی ہے نہ غفلت۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ: گھر پہنچ کر جب انہوں نے کجاوے کھولے اور اسباب علیحدہ علیحدہ کیا تو اپنی چیزیں جوں کی توں واپس شدہ پائیں تو اپنے والد سے کہنے لگے لیجئے اب آپ کو اور کیا چاہئے، اصل تک تو عزیز مصر نے ہمیں واپس کر دی ہے اور بدلے کا غلہ پورا پورا دے دیا ہے، اب تو آپ بھائی صاحب کو ضرور ہمارے ساتھ کر دیجئے تو ہم خاندان کے لئے غلہ بھی

لائیں گے اور بھائی کی وجہ سے ایک اونٹ کا بوجھ اور بھی مل جائے گا کیونکہ عزیز مصر ہر شخص کو ایک اونٹ کا بوجھ ہی دیتے ہیں اور آپ کو انہیں ہمارے ساتھ کرنے میں تامل کیوں ہے ؟ ہم اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت پوری طرح کریں گے، یہ ناپ بہت ہی آسان ہے یہ تھا اللہ کے کلام کا تتمہ اور کلام کو اچھا کرنا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام ان تمام باتوں کے جواب میں فرماتے ہیں کہ جب تک تم حلفیہ اقرار نہ کرو کہ اپنے اس بھائی کو اپنے ہمراہ مجھ تک واپس پہنچاؤ گے میں اسے تمہارے ساتھ بھیجنے کا نہیں، ہاں یہ اور بات ہے کہ اللہ نہ کرے تم سب ہی گھر جاؤ اور چھوٹ نہ سکو ، چنانچہ بیٹوں نے اللہ کو بیچ میں رکھ کر مضبوط عہد و پیمان کیا، اب حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ فرما کر کہ ہماری اس گفتگو کا اللہ وکیل ہے، اپنے پیارے بچے کو ان کے ساتھ کر دیا، اس لئے کہ قحط کے مارے غلے کی ضرورت تھی اور بغیر بھیجے چارہ نہ تھا۔ وَنَمِيرُ أَهْلَنَا کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے گھر والوں کے لیے زیادہ مقدار میں غلہ لے کر آئیں۔

قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُونِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهٖٓ إِلَّآ أَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ : حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کی بات سن کر نہایت سنجیدہ اور باوقار لہجے میں فرمایا: میں ہرگز اسے تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک تم اللہ کا پختہ عہد اور مضبوط قسم نہ دو کہ اسے لازماً میرے پاس واپس لاؤ گے، الا یہ کہ تم سب کو ایسی آفت گھیر لے کہ کوئی ایک بھی نہ بچے اور تمہارے لیے نہ بچاؤ کی صورت ہو نہ واپسی کی قدرت۔

چنانچہ جب انہوں نے اللہ کے نام پر مؤکد عہد دے دیا اور اپنے قول کو قسم سے باندھ لیا تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس پر اللہ گواہ ہے اور اس کی گواہی ہمارے لیے کافی ہے۔ یوں ایک باپ نے اپنے زخمی دل کے باوجود معاملہ محض انسانی وعدوں پر نہیں چھوڑا، بلکہ عہد کو اللہ کی شہادت سے وابستہ کر کے اسے ذمہ داری اور جواب دہی کی بلند سطح پر قائم کر دیا۔

نظر بد سے بچنے کی تدبیر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ {٦٧} وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ۭ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ۭ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ {٦٨} وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰي يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ {٦٩} یوسف

جواب ترجمہ: اور یعقوب نے کہا کہ اے میرے بیٹو! تم سب ایک ہی دروازے سے داخل مت ہونا اور مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔ اور میں اللہ کے حکم کو تم سے ذرا بھی ٹال نہیں سکتا۔ حکم صرف اللہ ہی کا ہے میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور چاہیے کہ بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کریں۔ اور جب وہ اسی طرح داخل ہوئے جیسے ان کے والد نے انہیں حکم دیا تھا اللہ کے حکم سے ذرا بھی انہیں کوئی چیز بچانے والی نہ تھی مگر یعقوب کے جی میں ایک حاجت تھی جسے اس نے پورا کر لیا اور بلاشبہ وہ علم والے تھے اس وجہ سے کہ ہم نے انہیں سکھایا اور لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ سو جب وہ یوسف پر داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے بھائی کو اپنے پاس ٹھکانا دیا اس سے کہا کہ میں بیشک تیرا بھائی ہوں لہٰذا تو اس کا رنج مت کر جو کچھ یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ: چونکہ اللہ کے نبی حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بچوں پر نظر لگ جانے کا کھٹکا تھا کیونکہ وہ سب اچھے، خوبصورت، تنومند، طاقتور، مضبوط نوجوان تھے اس لئے بوقت رخصت ان سے فرماتے ہیں کہ پیارے بچو تم سب شہر کے ایک دروازے سے شہر میں نہ جانا بلکہ مختلف دروازوں سے ایک ایک دو دو کر کے جانا، نظر کا لگ جانا

حق ہے، پھر ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ یہ میں جانتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ یہ تدبیر تقدیر میں ہیر پھیر نہیں کر سکتی، اللہ کی قضا کو کوئی شخص کسی تدبیر سے بدل نہیں سکتا، اللہ کا چاہا پورا ہو کر ہی رہتا ہے، حکم اسی کا چلتا ہے، کون ہے جو اس کے ارادے کو بدل سکے؟ اس کے فرمان کو ٹال سکے؟ اس کی قضا کو لوٹا سکے؟ میرا بھروسہ اسی پر ہے اور مجھ پر ہی کیا موقوف ہے، ہر ایک توکل کرنے والے کو اسی پر توکل کرنا چاہئے۔

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ: چنانچہ بیٹوں نے باپ کی فرماں برداری کی اور اسی طرح کئی ایک دروازوں میں بٹ گئے اور شہر میں پہنچے، اس طرح وہ اللہ کی قضا کو لوٹا نہیں سکتے تھے ہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک ظاہری تدبیر پوری کی کہ اس سے وہ نظر بد سے بچ جائیں، وہ ذی علم تھے، الہامی علم ان کے پاس تھا، ہاں اکثر لوگ ان باتوں کو نہیں جانتے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی جس طرح کہا تھا داخل ہوئے تو اگرچہ نظر یا ٹوک نہ لگی، لیکن تقدیر اور طرف سے آئی (بنیامین کو الزام سرقہ کے سلسلہ میں روک لیا گیا) تقدیر دفع نہیں ہوتی، سو جن کو علم ہے ان کو تقدیر کا یقین اور اسباب کا بچاؤ دونوں حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن بے علم سے ایک ہو تو دوسرا نہ ہو، یا ہمہ تن اسباب پر اتکاء کر کے تقدیر کا انکار کر بیٹھتا ہے یا تقدیر پر یقین رکھنے کے یہ معنی سمجھ لیتا ہے کہ اسباب کو معطل کر دیا جائے، البتہ عارف اور باخبر لوگ تقدیر و تدبیر کو جمع کرتے اور ہر ایک کو اس کے درجہ میں رکھتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰى اِلَيْهِ اَخَاهُ: جب برادرانِ یوسف دربار یوسفی میں پہنچے تو ان کا حقیقی برادر بنیامین بھی ان کے ہمراہ تھا، یوسف علیہ السلام نے موقع پا کر اسے اپنے قریب کر لیا، اسے اپنے پہلو سے لگا لیا اور تنہائی میں نہایت رازدارانہ لہجے میں فرمایا: میں ہی تمہارا وہ سچا بھائی ہوں، یوسف۔ پس جو کچھ یہ لوگ ہمارے ساتھ کرتے رہے ہیں ان کی ایذا رسانیاں، دل کی کدورتیں اور مجھے کنویں میں ڈال دینے

کی سنگ دلی ان سب پر غم نہ کرو۔ یہ لمحہ جدائی کے طویل اندھیروں میں امید کی پہلی کرن تھا، بھائی کے دل کو تسلی دی گئی اور ماضی کے زخموں پر صبر و یقین کا مرہم رکھا گیا۔

شاہی پیمانے کی گمشدگی و بازیابی

سوال شاہی پیمانہ گم ہونے کا قصہ کیا ہے؟ قرآنی آیات کی روشنی میں بتائیے۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ {۷۰}قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ{۷۱}قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ {۷۲}قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ{۷۳}قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ {۷۴} قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ{۷۵}فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ {۷۶}قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ{۷۷}یوسف.

جواب ترجمہ: پھر جب انہیں سامان دے کر تیار کر دیا تو ایک پانی پینے کا برتن اپنے بھائی کے کجاوہ میں رکھ دیا پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا کہ اے قافلہ والو بلاشبہ تم چور ہو۔ وہ لوگ کہنے لگے اور ان کی طرف آگے بڑھے کہ تم کس چیز کو گم پا رہے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں بادشاہ کا پیمانہ نہیں مل رہا ہے۔ اور جو شخص اسے لے کر آئے اس کیلئے ایک اونٹ کا بوجھ ہے اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ وہ کہنے لگے کہ اللہ کی قسم آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم لوگ اس لیے نہیں آئے کہ زمین میں فساد کریں اور نہ ہم چور ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ پھر اس کی کیا سزا ہے اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے؟ کہنے لگے کہ

اس کی سزا یہی ہے کہ جس کے کجاوہ میں یہ پیمانہ پایا جائے سو خود اس کی ذات ہی اس کا بدلہ ہے ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر یوسف نے اپنے بھائی کے تھیلے کی تلاشی لینے سے پہلے دوسرے بھائیوں کے تھیلوں کی تلاشی لینے سے ابتداء کی۔

پھر اس پیمانہ کو اپنے بھائی کے تھیلے سے بر آمد کر لیا۔ ہم نے یوسف کو اسی طرح تدبیر بتادی۔ بادشاہ کے قانون میں اپنے بھائی کو لے نہیں سکتے تھے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جسے چاہیں درجات کے اعتبار سے بلند کرتے ہیں اور ہر جاننے والے سے اوپر زیادہ جاننے والا ہے۔ برادران یوسف کہنے لگے کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کا بھائی بھی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے سو یوسف نے اس بات کو اپنے جی میں چھپالیا اور اس کو ظاہر نہ کیا۔ کہا کہ تم زیادہ برے ہو اور اللہ ہی خوب جانتا ہے جو تم بیان کر رہے ہو۔

تفسیر: جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے لیے سامان تیار کر دیا تو اس کے بعد اپنے کارندوں اور عمال سے کہا کہ وہ برتن جس کے ساتھ وہ لوگوں کے لیے ناپ تول کرتے ہیں اسے ان کے بھائی بن یامین کے سامان میں رکھ دیں، رکھیں بھی اس طرح کہ کسی کو پتا بھی نہ چلے، جب وہ لوگ اپنی سواریوں پر چلنے کے لیے سوار ہو گئے تو ایک کہنے والے نے آواز دی اے قافلے والو! جنہوں نے غلہ اٹھایا ہوا ہے تم تو چور ہو، حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے منادی کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا کہ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے؟

منادی نے کہا: ہمارا وہ پیمانہ گم ہو گیا ہے جس کے ساتھ بادشاہ لوگوں کو غلہ ناپ کر دیتا ہے۔ جو شخص شاہی پیمانہ مہیا کرے گا ہم اسے ایک اونٹ لاد کر غلہ دیں گے۔ منادی نے کہا: میں ایک اونٹ غلے کا کفیل اور ضامن ہوں۔ برادران یوسف نے کہا: اللہ کی قسم! تم نے جو کچھ دیکھا ہے اس میں تم نے تحقیق کر لی ہے کہ ہم ارض مصر میں فساد مچانے کے لیے نہیں آئے، ہمارے شایان شان چوری

کرنا نہیں ہے۔ پیمانہ تلاش کرنے کی ذمہ داری جن کے سپرد کی گئی تھی انہوں نے برادران یوسف سے کہا: اگر چور تم میں سے مل جائے تو پھر اس کی کیا سزا ہے؟ تم کہتے ہو کہ ہم چور نہیں ہیں۔

برادران یوسف نے کہا: کہ دین ابراہیمی کے مطابق اس کی سزا یہ ہے کہ وہ اس شخص کے سپرد کر دیا جائے، جس کا مال اس نے چرایا ہے، ہماری شریعت کا یہی فیصلہ ہے۔ اب حضرت یوسف علیہ السلام کا مطلب پورا ہو گیا۔

اس کے بعد شاہی کارندوں نے بنیامین کے سامان کی تلاشی سے پہلے برادران یوسف کے سامانوں کی تلاشی لینا شروع کر دی، حالانکہ انہیں علم تھا کہ ان کے سازوسامان میں شاہی پیالہ نہیں ہے، حضرت بنیامین کو اپنے پاس رکھنے کے لیے یہ ایک مضبوط تدبیر تھی، پھر بنیامین کے سامان تک پہنچ گئے، چنانچہ بنیامین کے سامان سے برتن نکال لیا، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں واضح فرمایا کہ ہم نے یوسف کے لیے اس کے بھائی تک رسائی کے لیے یہ تدبیر آسان بنائی، کیونکہ شاہ مصر کے قانون کے مطابق تو باوجود چور ہونے کے بنیامین کو حضرت یوسف علیہ السلام اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے لیکن چونکہ بھائی خود یہی فیصلہ کر چکے تھے، اس لئے یہی فیصلہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جاری کر دیا۔ آپ کو معلوم تھا کہ شرع ابراہیمی کا فیصلہ چور کی بابت کیا ہے۔ اس لئے بھائیوں سے پہلے ہی منوالیا تھا۔ جس کے درجے اللہ بڑھانا چاہے، بڑھا دیتا ہے۔ جیسے فرمان ہے تم میں سے ایمانداروں کے درجے ہم بلند کریں گے۔ ہر عالم سے بالا کوئی اور عالم بھی ہے یہاں تک کہ اللہ سب سے بڑا عالم ہے۔ اسی سے علم کی ابتدا ہے اور اسی کی طرف علم کی انتہا ہے۔

صواع الملک: صواع کو بعض لوگوں نے صاع سے مشتق سمجھ کر اس کا معنی غلہ ماپنے کا معروف پیمانہ (پنجابی ٹوپہ) کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ صاع سے مشتق یا ماخوذ نہیں ہے، بلکہ اس کا معنی پانی پینے کا ایسا پیالہ ہے، جس میں جواہرات وغیرہ جڑے ہوئے ہوں اور اگر یہ پیالہ شیشہ کا ہو تو اسے قدح، لکڑی کا

ہو تو عُس، چمڑے کا ہو تو علبۃ اور مٹی کا ہو تو مرکن کہتے ہیں۔ (الجمال والکمال ۴۷) یہاں دونوں پیمانے مراد ہو سکتے ہیں، غلہ ماپنے والا بھی اور پانی پینے والا بھی۔

عدل یوسفی اور برادران یوسف کی آزمائش

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ {۷۸} قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ {۷۹} فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمُوْنِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ {۸۰} اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ {۸۱} وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ {۸۲} یوسف

جواب ترجمہ: وہ کہنے لگے کہ اے عزیز اس کے والد ہیں جو زیادہ بوڑھے ہیں سو آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لیجئے بلاشبہ ہم آپ کو اچھا برتاؤ کرنے والوں میں سے دیکھ رہے ہیں۔ یوسف نے کہا کہ اللہ ہمیں اس سے پناہ دے کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہو اس کے سوا کسی دوسرے کو پکڑ لیں۔ اگر ایسا کریں تو بلاشبہ ہم ظلم کرنے والے ہو جائیں گے۔ پھر جب یوسف سے ناامید ہو گئے تو وہاں سے علیحدہ ہو کر آپس میں مشورہ کرنے لگے ان میں جو سب سے بڑا تھا اس نے کہا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ کی قسم لے کر پکا وعدہ لیا تھا اور اس سے پہلے تم یوسف کے بارے میں قصور کر چکے ہو سو اب میں اس سرزمین سے نہیں ٹلوں گا جب تک میرا باپ مجھے اجازت نہ دے یا اللہ میرے لیے فیصلہ نہ فرما دے اور وہ فیصلہ دینے والوں میں سب سے اچھا فیصلہ دینے والا

ہے۔ تم لوگ اپنے والد کے پاس چلے جاؤ اور ان سے کہو کہ اے ابا جان بیشک آپ کے بیٹے نے چوری کرلی اور ہم اسی بات کی گواہی دے رہے ہیں جس کا ہمیں علم ہے اور ہم غیب کی باتوں کے حافظ نہیں تھے۔ اور آپ اس بستی سے پوچھ لیجئے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے پوچھ لیجئے جن میں ہم شامل ہو کر آئے ہیں اور بلاشبہ ہم سچ کہہ رہے ہیں۔

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ: جب معاملہ سنگین ہوا تو یوسف علیہ السلام کے بھائی نہایت عجز وانکسار کے ساتھ عرض گزار ہوئے، اے عزیز مصر! اس نوجوان کا ایک نہایت ضعیف اور عمر رسیدہ باپ ہے جو اسے بے حد چاہتا ہے، آپ ہم میں سے کسی ایک کو اس کے بدلے روک لیجیے، ہم نے آپ کو ہمیشہ احسان و مروّت کا پیکر پایا ہے، ہمارے ساتھ بھی لطف و کرم کا معاملہ فرمایئے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ: مگر یوسف علیہ السلام نے عدل کے دامن کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے فرمایا: خدا کی پناہ! کہ ہم بے گناہ کو مجرم کے بدلے پکڑ لیں، جس کے سامان میں شاہی پیمانہ پایا گیا ہے، گرفتاری اسی کی ہو سکتی ہے، اگر ہم نے اس کے سوا کسی اور کو روکا تو یقیناً ظلم کریں گے اور ہم ظالموں میں سے نہیں ہو سکتے۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا: جب بھائی یوسف علیہ السلام کے اس قطعی انکار سے مایوس ہو گئے تو ایک گوشے میں ہٹ کر باہم مشورہ کرنے لگے، ان کے بڑے بھائی نے انہیں جھنجھوڑتے ہوئے کہا: کیا تمہیں یاد نہیں کہ تمہارے والد نے تم سے خدا کا پختہ عہد لیا تھا کہ تم اسے ضرور واپس لاؤ گے، الا یہ کہ کوئی ایسی آفت آ گھیر اڈالے جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو؟ اور اس سے پہلے تم یوسف علیہ السلام کے معاملے میں بھی کوتاہی کر چکے ہو، اپنے باپ سے کیا ہوا وعدہ نبھا نہ سکے، اب میں مصر کی سرزمین نہیں چھوڑوں گا، جب تک والد اجازت نہ دیں یا اللہ میرے حق میں کوئی فیصلہ نہ فرمادے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے، اس کا ہر حکم حق اور عدل پر مبنی ہوتا ہے۔

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ: پھر اس بڑے بھائی نے مشورہ دیا: تم لوگ والد کے پاس لوٹ جاؤ اور عرض کرو کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے، اسی جرم میں عزیزِ مصر نے اسے روک لیا ہے، ہم نے وہی بات کہی ہے جو اپنی آنکھوں سے دیکھی کہ پیمانہ اسی کے سامان سے نکلا، ہمیں اس کے ارادے کا کوئی علم نہ تھا، اگر پہلے سے خبر ہوتی تو ہم آپ سے اس کی واپسی کا عہد ہی کیوں کرتے؟

وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا: اور اگر آپ کو ہماری بات میں تردد ہو تو اس شہر کے لوگوں سے دریافت کر لیجیے جہاں ہم مقیم تھے اور اس قافلے والوں سے بھی پوچھ لیجیے جن کے ساتھ ہم آئے ہیں، وہ سب ہمارے بیان کی تصدیق کریں گے، ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، سچ کہہ رہے ہیں۔

صبر جمیل کیا ہوتا ہے؟

سوال آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے نیز بتائیے کہ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ کا کیا مطلب ہے؟

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ {۸۳} یوسف

جواب ترجمہ: یعقوب نے کہا کہ بلکہ تمہارے نفسوں نے تمہیں ایک بات سمجھا دی ہے سو میں صبر جمیل کو ہی اختیار کروں گا امید ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے گا بلاشبہ وہ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

تفسیر: حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے فرمایا: ”بات اس طرح نہیں کہ جیسا تم نے اسے بیان کیا، گویا اس نے چوری کی ہو، بلکہ تمہاری اپنی خواہشات نے تمہارے دلوں میں یہ بات سجا دی کہ تم بھی اپنے بھائی کے ساتھ ویسا ہی مکّار رویہ اختیار کرو جیسا پہلے یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا، میرا صبر ایک صبر جمیل ہے، ایسا صبر جس میں جزع و فزع نہیں اور شکایت صرف اللہ کے حضور کی جاتی ہے، امید

ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں سب میرے پاس لوٹا دے گا: یوسف علیہ السلام اس کا بھائی اور ان کا بڑا بھائی، بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے میری حالت کو اور حکمت والا ہے اپنے فیصلوں میں"۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا میں لفظ سَوَّلَتْ کا تحقیقی اور لغوی معنیٰ یہ ہے کہ کسی چیز کو دل میں اچھالنا یا چھوٹی بات کو بڑی کر کے دل میں بھڑکانا، یعنی دل کو بہکانا یا خواہش پیدا کرنا۔ مفسرین کے مطابق یہ لفظ عام طور پر چالاکی یا مکاری کے مترادف نہیں بلکہ ایک داخلی تحریک یا وسوسہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو انسان کی نفسی خواہشات یا نفسِ امارہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کے قول میں قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا کا مفہوم یہ ہے کہ یہ معاملہ ویسے نہیں کہ بنیامین علیہ السلام نے چوری کی، بلکہ تمہارے دلوں نے اپنی خواہشات و نفسانی مرغوبات کے زیر اثر یہ بات اپنی آنکھوں میں بڑی بنالی کہ بھائی نے کچھ غلط کیا، خلاصہ یہ کہ سَوَّلَتْ کا مطلب دل میں خواہش یا وسوسہ پیدا کرنا، بہکانا، یا کسی کام کو اپنے دل میں اچھالنا ہے تاکہ وہ دل میں بڑا اور اہم لگے۔

یہ آیت صبر جمیل کی عملی مثال پیش کرتی ہے، جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے تمام دکھوں اور ناانصافیوں کے باوجود دل کے سکون، اللہ پر توکل اور مخلوق سے شکایت نہ کرنے کی اعلیٰ ترین صفت اختیار کی۔

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ کا مطلب یہ ہے کہ میرا صبر صبر جمیل ہے، صبر جمیل اسے کہتے ہیں جس میں کوئی جزع فزع نہ ہو، کوئی شکوہ و شکایت نہ ہو، امام تفسیر مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صبر جمیل اسے کہتے ہیں کہ انسان کسی سے شکوہ و شکایت نہ کرے۔

گریہ یعقوب علیہ السلام

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے، نیز بتائیے کہ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ کا کیا مطلب ہے؟

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ {۸۴}

جواب ترجمہ: اور ان کی طرف سے رخ پھیر لیا اور کہا کہ یوسف پر افسوس ہے۔ اور غم کی وجہ سے ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں سو وہ گھٹتے رہتے تھے۔ (سورۃ یوسف)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس دوسرے صدمے کے بعد صاحبزادوں سے اس معاملہ میں گفتگو کو چھوڑ کر اپنے رب کے سامنے فریاد شروع کی اور فرمایا کہ مجھے سخت رنج و غم ہے یوسف پر اور اس رنج و غم میں روتے روتے ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں یعنی بینائی جاتی رہی یا بہت ضعیف ہو گئی امام تفسیر مقاتل رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ کیفیت یعقوب علیہ السلام کی چھ سال رہی کہ بینائی تقریباً جاتی رہی تھی **فَهُوَ كَظِيْمٌ** یعنی پھر وہ خاموش ہو گئے کسی سے اپنا دُکھ نہ کہتے تھے **کظیم** **کظم** سے بنا ہے جس کے معنی بند ہو جانے اور بھر جانے کے ہیں مراد یہ ہے کہ غم واندوہ سے ان کا دل بھر گیا اور زبان بند ہو گئی کہ کسی سے اپنا رنج و غم بیان نہ کرتے تھے، اسی لئے **کظم** کے معنی غصہ کو پی جانے کے آتے ہیں کہ غصہ دل میں بھرے ہوئے ہونے کے باوجود زبان یا ہاتھ سے کوئی چیز غصہ کے مقتضیٰ کے مطابق سرزد نہ ہو حدیث میں ہے **وَمَن يَّكظِمُ الغَيظَ يَاجُرُهُ اللهُ** یعنی جو شخص اپنے غصہ کو پی جائے اور اس کے تقاضے پر باوجود قدرت کے عمل نہ کرے اللہ تعالیٰ اس کو بڑا اجر دیں گے، ایک حدیث میں ہے کہ حشر کے دن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو مجمع عام کے سامنے لا کر جنت کی نعمتوں میں اختیار دیں گے کہ جو چاہیں لے لیں۔ (معارف القرآن)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں ہر نبی کو حق تعالیٰ اپنی حکمت اور اس کی استعداد کے موافق جس قسم کے امتحان میں چاہے مبتلا کرتا ہے۔ یعقوب علیہ السلام کے قلب میں یوسف کی فوق العادت محبت ڈال دی پھر ایسے محبوب اور ہونہار بیٹے کو جو خاندانِ ابراہیمی کا چشم و چراغ تھا، ایسے دردناک طریقے سے جدا کیا گیا۔ غمزدہ اور زخم خوردہ یعقوب کے جگر کو اس روح فرسا صدمہ نے کھالیا تھا۔ وہ کسی مخلوق کے سامنے نہ حرف شکایت زبان پر لاتے تھے نہ کسی سے انتقام لیتے، نہ غصہ نکالتے۔ غم کی بات منہ سے نہ نکلتی۔ ہاں جب اپنے کو بہت گھونٹتے تو دل کا بخار آنکھوں کی راہ سے ٹپک پڑتا۔

بیسیویں برس تک چشم گریاں اور سینہ بریاں کے باوجود ادائے فرائض و حقوق میں کوئی خلل نہ پڑنے دیا۔ ان کا دل جتنا یوسف کے فراق میں روتا تھا، اتنا ہی خدا کے حضور میں زیادہ گڑگڑاتا تھا۔ درد و غم کی شدت اور اشکباری کی کثرت جس قدر ان کی بصارت کو ضعیف کرتی اسی قدر نور بصیرت کو بڑھا رہی تھی۔ بے تابی و اضطراب کا کیسا ہی طوفان اٹھتا، دل پکڑ کر اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتے زبان سے اف نہ نکالتے، بنیامین کی جدائی سے جب پرانے زخم میں نیا چرکا لگا تو اس وقت بے اختیار یا اسفی علی یوسف صرف اتنا لفظ زبان سے نکلا۔ بقول حضرت شاہ صاحب ایسا درد اتنی مدت دبا رکھنا پیغمبر کے سوا کس کا کام ہو سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یوسف علیہ السلام کے زندہ ہونے کا والد کو احساس

سوال قرآن کریم کی ان آیات مبارکہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے، نیز بتایئے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی اور فراق کے بعد رہ رہ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ میرا بیٹا یوسف زندہ ہے، یہ احساس آپ کو کیسے ہوتا تھا؟

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ {۸۵} قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ {۸۶} يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ {۸۷} یوسف

جواب ترجمہ: بیٹے کہنے لگے اللہ کی قسم آپ تو برابر یوسف کو یاد کرتے رہیں گے یہاں تک کہ گھل جائیں یا ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائیں۔ یعقوب نے کہا کہ میں اپنے رنج اور غم کی اللہ ہی سے شکایت کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے مجھے وہ علم عطا ہوا ہے جو تم نہیں جانتے۔ اے میرے بیٹو! تم جاؤ اور یوسف کو اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو بلاشبہ اللہ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔

قَالُوا تَاللّٰهِ تَفْتَأُ تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتّٰى تَكُونَ حَرَضًا: حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے فرمایا: "بے شک اللہ کی قسم، اے اباجی! آپ یوسف کا ذکر ہمیشہ کرتے رہتے ہیں اور اس پر غمگین رہتے ہیں یہاں تک کہ آپ بیمار ہو جائیں یا واقعی ہلاک ہو جائیں۔" یہاں لفظ حرض کی تشریح میں مفسرین نے بتایا ہے کہ یہ بیمار یا دُکھ کے معنی رکھتا ہے اور بعض نے اسے "وہ تکلیف یا مرض جس سے دل پریشان ہو" قرار دیا ہے۔

قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللّٰهِ: حضرت یعقوب علیہ السلام نے جواب دیا: "میں جو بھی غم و اندوہ محسوس کرتا ہوں، اس کی شکایت صرف اللہ ہی سے کرتا ہوں اور میں اللہ کی رحمت، احسان اور مستحق بندوں کو بلا تاخیر جواب دینے کی حکمت کو جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔" یہاں بثّی سے مراد غم کی کیفیت اور اس کے پھیلاؤ کی حالت ہے اور أَشْكُو سے شکایت یا بیانِ دکھ مراد لیا گیا ہے۔

يَا بَنِيَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ: پھر آپ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا: "اے میرے بیٹوں! جاؤ اور یوسف و اس کے بھائی کی خبریں معلوم کرو اور اللہ کی رحمت و نجات سے ناامید نہ ہو جاؤ، کیونکہ اس کی مدد اور رحمت سے صرف وہ لوگ ناامید رہتے ہیں جو اللہ کی قدرت و فضل سے غافل ہیں۔" یہاں لفظ تَحَسَّسُوا سے مراد باریک بینی سے تحقیق کرنا، حالت معلوم کرنا ہے اور رَوح اللہ سے مراد اللہ کی رحمت اور نجات کی قوت لی گئی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام جانتے تھے کہ یوسف علیہ السلام زندہ ہیں اور ان سے ملنے کی توقع رکھتے تھے کیونکہ یوسف علیہ السلام کے خواب میں وہ ان کا مستقبل دیکھ چکے تھے اور جانتے تھے کہ کسی نہ کسی دن یہ جدائی ختم ہونے والی ہے تاہم دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ جس کی جدائی ایک گھڑی کے لیے شاق تھی وہ برسوں کے لیے ان سے جدا ہو گیا تھا اس کے فراق کا زخم بھر نہیں سکتا تھا بلکہ اس بات کے تصور نے کہ وہ زندہ موجود ہے مگر مجھ سے دور ہے درد فراق کی چبھن اور زیادہ کر دی تھی۔ (الکتاب)

یہ آیات بنیادی طور پر صبر، یقین اور اللہ کی رحمت پر اعتماد سکھاتی ہیں، یہ بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد و رحمت سے فقط کافر یا غافل لوگ ناامید رہتے ہیں، جبکہ مومن اپنے دل میں صبر اور امید رکھتا ہے۔

برادران یوسف کی عجز و مسکینی سے لبریز لجاجت

سوال آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے نیز بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ کا کیا مطلب ہے؟

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ {۸۸} یوسف.

جواب ترجمہ: جب وہ یوسف کے پاس گئے تو کہنے لگے کہ عزیز ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے اور ہم تھوڑا سا سرمایہ لائے ہیں۔ آپ ہمیں (اس کے عوض) پورا غلہ دیجئے اور خیرات کیجئے کہ خدا خیرات کرنے والوں کو ثواب دیتا ہے۔

اب ان بھائیوں کو یوسف علیہ السلام کے متعلق تو کچھ علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے اور کس سمت کو جا کر اسے تلاش کیا جائے۔ کیونکہ ظن ضرور تھا کہ جس قافلہ نے اسے کنویں سے نکالا تھا وہ مصر کو جا رہا تھا۔ لہذا یہ امکان تھا کہ شاید وہ مصر میں ہی ہو۔ البتہ بن یمین کے متعلق یقین تھا کہ اسے شاہ مصر نے اپنے پاس رکھ لیا ہے اور تیسرا بھائی بھی ادھر ہی تھا۔ لہذا انہوں نے تیسری بار پھر مصر کا رخ کیا کچھ تھوڑی بہت پونجی بھی مہیا کر لی کہ اس قحط سالی کے زمانہ میں کچھ غلہ ہی لے آئیں گے اور اسی دوران اپنے بھائیوں کی بازیافت کے لیے بھی کوشش کریں گے چنانچہ مصر پہنچ کر انہوں نے سب سے پہلے شاہ مصر کا ہی رخ کیا اور اس سے التجا کی کہ ہم لوگوں پر سخت مشکل وقت آن پڑا ہے۔ کھانے کو غلہ نہیں اور غلہ کے لیے رقم بھی نہیں تھوڑی سی رقم ہم لائے ہیں۔ اگر آپ غلہ پورا دے دیں تو آپ کی انتہائی مہربانی ہو گی۔ آپ کے ہم پر پہلے بھی بہت احسانات ہیں جن کا ہم شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ اب بھی ہم پر احسان فرمائیے اور اللہ ہی اس کی آپ کو جزا دے گا۔ اور انشاء اللہ وہ ضرور آپ کو جزا دے گا۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں جب برادران یوسف والد کے حکم کے مطابق مصر میں عزیز مصر سے ملے تو خوشامد کی گفتگو شروع کی اپنی محتاجی اور بیکسی کا اظہار کیا کہ اے عزیز! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط کی وجہ سے سخت تکلیف پہنچ رہی ہے یہاں تک کہ اب ہمارے پاس غلہ خریدنے کے لئے بھی کوئی مناسب قیمت موجود نہیں ہم مجبور ہو کر کچھ نکمی چیزیں غلہ خریدنے کے لئے لے آئے ہیں آپ اپنے کریمانہ اخلاق سے انہی نکمی چیزوں کو قبول کرلیں اور ان کے بدلے میں غلہ پورا اتنا ہی دیدیں جتنا اچھی قیمتی چیزوں کے بالمقابل دیا جاتا ہے یہ ظاہر ہے کہ ہمارا کوئی استحقاق نہیں آپ ہم کو خیرات سمجھ کر دیدیجئے بیشک اللہ تعالیٰ خیرات دینے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے۔

یوسف علیہ السلام نے جب بھائیوں کے یہ مسکنت آمیز الفاظ سنے اور شکستہ حالت دیکھی تو طبعی طور پر اب حقیقت حال ظاہر کر دینے پر مجبور ہو رہے تھے اور واقعات کی رفتار کا انداز یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام پر جو اظہار حال کی پابندی منجانب اللہ تھی اب اس کے خاتمہ کا وقت بھی آچکا تھا اور تفسیر قرطبی و مظہری میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ اس موقع پر یعقوب علیہ السلام نے عزیز مصر کے نام ایک خط لکھ کر دیا تھا جس کا مضمون یہ تھا،

من جانب یعقوب صفی اللہ، ابن اسحاق ذبیح اللہ ابن ابراہیم خلیل اللہ، بخدمت عزیز مصر، امابعد، ہمارا پورا خاندان بلاؤں اور آزمائشوں میں معروف ہے میرے دادا ابراہیم خلیل اللہ کا نمرود کی آگ سے امتحان لیا گیا پھر میرے ایک لڑکے کے ذریعے میرا امتحان لیا گیا جو مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھا یہاں تک کہ اس کی مفارقت میں میری بینائی جاتی رہی اس کے بعد اس کا ایک چھوٹا بھائی مجھ غم زدہ کی تسلی کا سامان تھا جس کو آپ نے چوری کے الزام میں گرفتار کرلیا اور میں بتلاتا ہوں کی ہم اولاد انبیاء ہیں نہ ہم نے کبھی چوری کی ہے نہ ہماری اولاد میں کوئی چور پیدا ہوا۔ والسلام

یوسف علیہ السلام نے جب یہ خط پڑھا تو کانپ گئے اور بے اختیار رونے لگے اور اپنے راز کو ظاہر کر دیا اور تعارف کی تمہید کے طور پر بھائیوں سے یہ سوال کیا کہ تم کو کچھ یہ بھی یاد ہے کہ تم نے یوسف علیہ السلام اور

اس کے بھائی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا جبکہ تمہاری جہالت کا زمانہ تھا کہ بھلے برے کی سوچ اور انجام بینی کی فکر سے غافل تھے، برادران یوسف نے جب یہ سوال سُنا تو چکرا گئے کہ عزیز مصر کو یوسف کے قصہ سے کیا واسطہ؟

بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ کا معنیٰ ہے نکمی چیزیں، جن کی کوئی حیثیت نہ ہو، یہ نکمی چیزیں کیا تھیں؟ قرآن وحدیث میں ان کی کوئی تصریح نہیں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں بعض نے کہا کہ کھوٹے دراہم تھے جو بازار میں نہ چل سکتے تھے بعض نے کہا کہ کچھ گھریلو سامان تھا یہ لفظ مزاجۃ کا ترجمہ ہے اس کے اصل معنی ایسی چیز کے ہیں جو خود نہ چلے بلکہ اس کو زبردستی چلایا جائے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں بضاعۃ مزجاۃ کا مطلب ہے ردی، واہی، ناقص، بیکار، کھوٹی اور قیمت نہ بننے والی کچھ یونہی سی رکھی رکھائی چیزیں۔

بھائیوں کی اصلاح اور رحمت خداوندی کی امید

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ {۸۹} قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ {۹۰} قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ {۹۱} یوسف

جواب ترجمہ: یوسف نے کہا کہ کیا تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا جب کہ تم جاہل تھے۔ کہنے لگے واقعی کیا آپ یوسف ہیں؟ یوسف نے کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر احسان فرمایا بلاشبہ بات یہ ہے کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے تو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتا۔ کہنے لگے اللہ کی قسم اللہ نے تجھے ہم پر فضیلت دے دی اور بلاشبہ ہم خطا کرنے والوں میں سے تھے۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ: یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمایا کہ کیا تم نے سوچا کہ تم نے میرے اور میرے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تم اس وقت جہالت میں تھے، اس لیے تم پر ظلم ہوا، یہاں مفسرین نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یوسف علیہ السلام نے انہیں خبر دار کیا کہ ان کا عمل ناپسندیدہ اور غیر مناسب تھا اور اس پر توبہ اختیار کریں، اس تنبیہ میں محبت اور شفقت کا پہلو غالب ہے نہ کہ سختی یا سرزنش، کیونکہ وہ ان کی معصومیت اور کم علمی کو دیکھ رہے تھے، یہ بھی کہا گیا کہ ان کے بھائی اس وقت نادان اور لاپرواتھے، اسی لیے یہ جرم وقوع پذیر ہوا۔

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ: یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے استفسار کیا: "کیا واقعی تم وہ یوسف ہو؟" جس پر یوسف علیہ السلام نے تصدیق کی کہ "ہاں، میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، جس پر اللہ نے ہم پر مہربانی فرمائی، جو اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے، اللہ اس کی نیکیاں ضائع نہیں کرتا۔" یہاں واضح ہے کہ اللہ کی نعمت اور کرم کا اظہار ان کی حفاظت، عزت اور صحیح راستے پر رہنے کی شکل میں ہوا اور یہ بات مفسرین کے مطابق تقویٰ اور صبر کے ساتھ اعمالِ حسنہ کرنے والے کے لیے اللہ کی جانب سے اجر کی ضمانت ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ: بھائیوں نے اعتراف کیا: "واللہ! اللہ نے واقعی تمہیں ہم پر فضیلت دی اور ہم واقعی گناہگار ہیں۔" یعنی انہوں نے اپنے سابقہ قصور اور ظلم کو تسلیم کیا اور یوسف علیہ السلام کی عظمت اور احسان کو مانا، مفسرین نے یہاں یہ بھی ذکر کیا کہ ان کی توبہ، اعتراف اور اللہ کی قدرت پر ایمان، ان کے ماضی کے جرم کے بعد اصلاح اور اللہ کی رحمت کی امید کا مظہر ہے۔

برادران یوسف کے لیے یوسف کا پروانہ درگزر

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے نیز بتائیے کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ کا کیا معنیٰ ہے؟

قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ {۹۲} یوسف

جواب ترجمہ: یوسف نے کہا آج تم پر کوئی ملامت نہیں اللہ تمہاری مغفرت فرمائے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔

برادران یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا کیا مظالم ڈھائے، انہیں اپنے والد سے بھلا پھسلا کر لائے، انہیں راستے میں اذیتیں دیتے رہے، انہیں اندھے کنویں میں ڈال دیا، مگر یوسف کو جب اللہ نے تاج شاہی سے نوازا، ان کے برادران عجز و مسکینی کے پیکر بن کر فریاد لے کر ان کے پاس پہنچے تو انہیں کوئی ملامت نہیں کی، انہیں طعن و تشنیع کا ہدف نہیں بنایا بلکہ فراخ دلی اور وسعت ظرفی، پیغمبرانہ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے عفو و درگزر کا پروانہ جاری کرتے ہوئے ایک ایسا تاریخی جملہ صادر فرمایا جس کو عرش بریں کے سب سے آخری نمائندے حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس وقت دہرایا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے فاتح بنے تھے۔

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ: سیدنا یوسف نے ان کے اس اندیشہ کو بھانپ لیا اور انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا جو ہو چکا سو ہو چکا۔ آج تم پر کوئی گرفت نہیں، کوئی سرزنش نہیں اور آئندہ میں تمہاری ایسی تقصیر کا ذکر بھی نہ کروں گا۔ میں نے سب کچھ تمہیں معاف کیا اور اللہ سے دست بدعا ہوں کہ وہ بھی تمہیں معاف فرمادے اور مجھے قوی امید ہے کہ وہ ضرور تمہیں معاف فرمادے گا، کیونکہ وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ (تیسیر القرآن)

یوسف علیہ السلام کی متبرک قمیص

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَذَا فَأَلْقُوهُ عَلَى وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيراً وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ {۹۳} وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَن تُفَنِّدُونِ {۹۴} قَالُوا تَاللّٰهِ

إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ {۹۵} فَلَمَّا أَن جَاء الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَى وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيراً قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللهِ مَا لاَ تَعْلَمُونَ {۹۶} یوسف.

جواب ترجمہ: جاؤ، میرا یہ قمیص لے جاؤ اور میرے والد کے منہ پر ڈال دو، ان کی بینائی پلٹ آئے گی، اور اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ۔ جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا میں یوسف (علیہ السلام) کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں۔ گھر کے لوگ بولے خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہوئے ہیں۔ پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسف (علیہ السلام) کا قمیص یعقوب (علیہ السلام) کے منہ پر ڈال دیا اور یکایک اس کی بینائی عود کر آئی۔ تب اس نے کہا میں تم سے کہتا نہ تھا؟ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ تم میری یہ قمیص لے جاؤ اور میرے والد کے چہرے پر ڈال دو تو ان کی بینائی لوٹ آئے گی یہ ظاہر ہے کہ کسی کی قمیص کا چہرہ پر ڈال دینا بینائی کے لوٹنے کا کوئی مادی سبب نہیں ہو سکتا بلکہ یہ ایک معجزہ تھا حضرت یوسف علیہ السلام کا کہ ان کو اللہ کے حکم سے معلوم ہو گیا کہ جب اُن کی قمیص والد کے چہرے پر ڈالی جائے گی تو اللہ تعالیٰ ان کی بینائی بحال فرمادیں گے۔

یہ اس قمیص کی خصوصیت تھی کیونکہ یہ عام کپڑوں کی طرح نہیں تھی بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے جنت سے اُس وقت لائی گئی تھی جب ان کو برہنہ کر کے نمرود نے آگ میں ڈالا تھا پھر یہ جنت کا لباس ہمیشہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس محفوظ رہا اور ان کی وفات کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام کے پاس رہی، ان کی وفات کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کو ملی آپ نے اس کو ایک بڑی متبرک شے کی حیثیت سے ایک نلکی میں بند کر کے یوسف علیہ السلام کے گلے میں بطور تعویذ کے ڈال دیا تھا تاکہ نظر بد سے محفوظ رہیں برادران یوسف نے جب ان کی قمیص والد کو دھوکہ دینے کے لئے اتار لی اور وہ

برہنہ کر کے کنویں میں ڈال دیئے گئے تو جبریل امین تشریف لائے اور گلے میں پڑی ہوئی نلکی کھول کر اس سے یہ قمیص نکالی اور یوسف علیہ السلام کو پہنا دی اور یہ ان کے پاس برابر محفوظ چلی آرہی تھی اس وقت بھی جبریل امین ہی نے یوسف علیہ السلام کو یہ مشورہ دیا کہ یہ جنت کا لباس ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ نابینا کے چہرے پر ڈال دو تو وہ بینا ہو جاتا ہے اور فرمایا کہ اس کو اپنے والد کے پاس بھیج دیجئے تو وہ بینا ہو جائیں گے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال اور ان کا وجود خود جنت ہی کی ایک چیز تھی اس لئے ان کے جسم سے متصل ہونیوالے ہر کرتے میں یہ خاصیت ہو سکتی ہے (مظہری، معارف القرآن)

چنانچہ یوسف علیہ السلام کے بھائی یہوذا یہ قمیص لے کر آئے، اپنے والد کے چہرے پر ڈالی تو ان کی بینائی واپس آگئی، جب یہ قافلہ عریش مصر سے نکلا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے ادھر کہنا شروع کر دیا تھا کہ مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے، اللہ کے امر سے تین، آٹھ یا اس سے زائد ایام کی مسافت سے ہوا نے یوسف علیہ السلام کے قمیص کی خوشبو یعقوب علیہ السلام تک پہنچا دی تھی، یعقوب علیہ السلام نے اپنے ان بچوں سے کہا جو ان کے پاس تھے کہ اگر تم مجھے بے وقوف نہ سمجھو تو میری تصدیق کرو گے، مگر برادران یوسف نے کہا کہ ابا جان! آپ پرانی غلطی پر ہی ہیں، جو یوسف کی محبت میں آپ کو افراط کا شکار رکھے ہوئے ہے، نہ غم و حزن آپ کے دل سے نکلتا ہے اور نہ ہی آپ کو کسی طرح تسلی ہو رہی ہے، یہ کیسے سنگدل لوگ تھے اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو اپنے باپ سے جدا ہوئے اسی سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور برادران یوسف ابھی اسی فرسخ کی مسافت پر تھے۔

یہ یہوذا وہی تھا جس نے یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کے بعد جھوٹا خون لگا کر یوسف علیہ السلام کی قمیص باپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے، اسی نے دکھ میں باپ کو مبتلا کیا تھا، آج اسی نے باپ کو یوسف علیہ السلام کی قمیص دے کر خوش کیا، جونہی قمیص آپ کے چہرے پر

رکھی گئی تو بینائی لوٹ آئی تو یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ میں تمہیں کہتا تھا کہ میں اپنے اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔

اشک ندامت، بخشش کی درخواست

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ {۹۷} قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ {۹۸} یوسف

جواب ترجمہ: ان کے بیٹے کہنے لگے کہ اے ابا جی ہمارے گناہوں کی مغفرت کیلئے دعا کیجئے بلاشبہ ہم خطا کرنے والے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں عنقریب اپنے رب سے تمہارے لیے مغفرت کی دعا کروں گا بلاشبہ وہ غفور ہے اور رحیم ہے۔

ان آیات میں توبہ، ندامت اور پدری شفقت کا نہایت دل نشین منظر سامنے آتا ہے، جب بھائیوں پر اپنے گناہ کی سنگینی پوری طرح منکشف ہو گئی تو انہوں نے عاجزی سے عرض کیا: ”اے ہمارے ابا جان! ہمارے گناہوں کی بخشش کے لیے اللہ سے دعا کیجیے، بے شک ہم خطاکار تھے۔“ یہ احساسِ جرم دراصل توبہ کی پہلی سیڑھی تھا، دلوں میں ندامت جاگی، اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا اور مغفرت کی طلب نے ان کے باطن کو جھکا دیا، انہوں نے اپنے والد کو وسیلہ بنایا، اس لیے کہ جرم انہی کے خلاف بھی تھا اور ان کی رضا و معافی مطلوب تھی، نیز وہ اللہ کے مقرب بندے تھے، اس امید کے ساتھ کہ ان کی دعا قبولیت کا دروازہ کھول دے گی۔ إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ کہہ کر انہوں نے تسلیم کیا کہ ہم گناہگار تھے، انجام کی برائی کو نہ سمجھ سکے اور نفس کی نادانی میں بہہ گئے۔

جواب میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے پدری شفقت کے ساتھ فرمایا: ”میں عنقریب اپنے رب سے تمہارے لیے بخشش مانگوں گا، یقیناً وہی بڑا بخشنے والا، نہایت رحم فرمانے والا ہے۔“ انہوں نے ماضی کی تلخیوں کو نہ دہرایا، نہ ملامت کی تکرار کی، بلکہ آئندہ کے لیے استغفار کا پختہ وعدہ کیا۔ لفظ ”سَوفَ“

میں استمرار اور اہتمام کا پہلو نمایاں ہے، گویا وہ بار بار اور دل کی گہرائی سے دعا کریں گے، پھر اللہ تعالیٰ کی صفت اَلْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ کا ذکر کر کے بیٹوں کے دلوں میں امید کی شمع روشن کی، کہ اس کی مغفرت وسیع ہے اور اس کی رحمت دائمی۔

یہی وہ لمحہ تھا جب بکھرا ہوا گھرانہ دوبارہ جمع ہونے کی تمہید باندھ رہا تھا، یوسف علیہ السلام کی خواہش تھی کہ قمیص کے ذریعے باپ کی بینائی لوٹے اور سب اہلِ خانہ عزت و وقار کے ساتھ اکٹھے ہوں، عزت جب عدل کے ساتھ نصیب ہو اور اپنے بھی اس میں شریک ہوں تو وہ نعمت دوبالا ہو جاتی ہے اور یہی فطرت کا تقاضا ہے۔

بھائیوں کو خطا کا احساس کب ہوا؟ اہلِ تفسیر کے مطابق برادرانِ یوسف کی حقیقی ندامت اس وقت ظاہر ہوئی جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا تعارف کرایا، انہیں معاف فرمایا اور قمیص دے کر واپس بھیجا، چنانچہ جب وہ مصر سے لوٹ کر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان پر اپنے جرم کی سنگینی پوری طرح عیاں ہو چکی تھی، وہ پہلے ہی حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے اعترافِ تقصیر کر چکے تھے، مگر باپ کے روبرو آ کر ان کی شرمندگی اشکِ ندامت میں ڈھل گئی اور انہوں نے عاجزی سے عرض کیا ”یٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ“ اے ہمارے ابا جان! ہمارے گناہوں کی مغفرت کی دعا کیجیے، ہم واقعی خطاکار تھے۔

مفسرین واضح کرتے ہیں کہ یہ محض رسمی معذرت نہ تھی بلکہ کھلا اعتراف، دل کی پشیمانی اور باقاعدہ رجوع الی اللہ تھا، انہوں نے تسلیم کیا کہ ان کی حرکت دانستہ ظلم اور معصیت تھی، اس لیے اب وہ والد کی رضا اور اللہ کی بخشش کے طالب ہیں، گویا توبہ کا یہ منظر قمیصِ یوسف کے ساتھ واپسی کے فوراً بعد پیش آیا، جب حقیقت بے نقاب ہو چکی تھی اور تکبر کی جگہ انکسار نے لے لی تھی۔

تختِ شاہی پر سجدہ ریزیاں

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ {۹۹}وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ {۱۰۰} یوسف.

جواب ترجمہ: پھر جب یہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے والدین کو اپنے پاس ٹھکانا دیا اور کہا کہ مصر میں انشاء اللہ امن وامان کے ساتھ داخل ہو جایئے۔ اور اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب یوسف علیہ السلام کے آگے سجدے میں گر پڑے (اس وقت یوسف نے کہا ابّا جان! یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے (بچپن میں) دیکھا تھا میرے پروردگار نے اسے سچ کر دیا۔ اور اس نے مجھ پر (بہت سے) احسان کئے ہیں کہ مجھ کو جیل خانے سے نکالا اور اس کے بعد کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈال دیا تھا۔ آپ کو گاؤں سے یہاں لایا۔ بیشک میرا پروردگار جو چاہتا ہے تدبیر کرتا ہے۔ وہ دانا (اور) حکمت والا ہے۔

جب حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے کر سرزمینِ کنعان سے مصر کی جانب روانہ ہوئے تو یہ محض ہجرت نہ تھی بلکہ ایک وعدۂ الٰہی کی تکمیل کا سفر تھا، مصر پہنچ کر جب وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی بارگاہ میں داخل ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے نہایت محبت و توقیر کے ساتھ اپنے والدین کو گلے لگایا اور سب کو اطمینان دلایا کہ اب مصر میں داخل ہو جاؤ، اللہ کے حکم سے آپ لوگ یہاں امن و عافیت کے ساتھ رہو گے، کوئی گزند آپ کو نہ پہنچے گی، پھر انہوں نے اپنے والدین کو اپنے تختِ اقتدار پر بٹھایا اور والدین سمیت گیارہ بھائیوں نے تعظیم کے طور پر سجدہ کیا۔

یہ سجدہ عبادت کا نہیں بلکہ تکریم واحترام کا تھا، جیسا کہ اس دور کی شریعت میں جائز تھا، اسی موقع پر یوسف علیہ السلام نے اپنے والد سے عرض کیا کہ اب وہ خواب حقیقت بن کر سامنے آگیا ہے جو میں نے

بچپن میں دیکھا تھا، اللہ نے اسے سچا کر دکھایا، مجھے قید خانے سے عزت کے ساتھ نکالا، آپ سب کو بادیہ نشینی سے یہاں لا بسایا اور شیطان کی ڈالی ہوئی دوریوں کے بعد ہمیں دوبارہ جمع کر دیا، بے شک میرا رب اپنی تدبیر میں نہایت لطیف ہے، وہ اپنے بندوں کے احوال سے خوب باخبر اور ہر کام میں حکمت والا ہے۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں یوسف نے اپنی طرف سے والدین کی تعظیم کی، تخت پر بٹھلایا لیکن خدا کو یوسف کی جو تعظیم کرانی تھی اسے یوسف کب روک سکتے تھے۔ اس وقت کے دستور کے موافق ماں باپ اور سب بھائی یوسف علیہ السلام کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔

یہ سجدہ تعظیمی تھا، جو بقول حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ آدم کے زمانہ سے مسیح علیہ السلام کے عہد تک جائز رہا۔ البتہ شریعت محمدیہ نے ممنوع و حرام قرار دیا۔ جیسا کہ احادیث کثیرہ اس پر شاہد ہیں بلکہ حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ نے وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ الخ سے حرمت کا اشارہ نکالا ہے۔

بعض مفسرین نے اس جگہ سجدہ کے معنی متبادر مراد نہیں لیے۔ محض جھک جانے کے معنی لیے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ سجدہ یوسف کو نہ تھا بلکہ یوسف کی عزت و عظمت دیکھ کر سب نے خدا کے سامنے سجدہ شکر ادا کیا۔ اس تقدیر پر وَخَرُّوْا لَهٗ، میں لام سببیہ ہو گا۔ یعنی یوسف کے عروج و اقتدار کے سبب سے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے (تنبیہ) تعظیم اور عبادت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ غیر اللہ کی تعظیم کلیۃً ممنوع نہیں، البتہ غیر اللہ کی عبادت شرک جلی ہے۔ جس کی اجازت ایک لمحہ کے لیے کبھی نہیں ہوئی، نہ ہو سکتی ہے "سجود عبادت" یعنی غیر اللہ کو کسی درجہ میں نفع و ضرر کا مستقل مالک سمجھ کر سجدہ کرنا شرک جلی ہے جس کی اجازت کبھی کسی ملت سماوی میں نہیں ہوئی۔ ہاں "سجود تعظیم" یعنی عقیدہ مذکورہ بالا سے خالی ہو کر محض تعظیم و تکریم کے طور پر سر بسجود ہونا شرائع سابقہ میں جائز تھا۔ شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم نے اس کی بھی جڑ کاٹ دی۔ (تفسیر عثمانی)

بچھڑے ہوئے اپنوں کی ملاقات، دعائے یوسفی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ {۱۰۱} یوسف

جواب ترجمہ: اے میرے رب آپ نے مجھے سلطنت کا حصہ عطا فرمایا اور مجھے خوابوں کی تعبیر سکھائی۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا فرمانے والے آپ ہی دنیا اور آخرت میں میرے کارساز ہیں مجھے اس حالت میں موت دینا کہ میں فرمان بردار ہوں اور مجھے نیک بندوں میں شامل فرمایئے۔

اس عظیم الشان منظر کے بعد، جب بچھڑے ہوئے دل مل چکے اپنوں کا فراق کے بعد وصال ہوا اور خواب حقیقت کا جامہ پہن چکا، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے رب کے حضور سرِ نیاز جھکا دیا، عرض کیا: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے مصر کی بادشاہت عطا فرمائی اور خوابوں کی تعبیر کا علم بخشا، اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، جو انہیں بے مثال وجود میں لایا، تو ہی دنیا میں میرا کارساز ہے اور آخرت میں بھی تو ہی میرا اولی و مددگار ہوگا، پس جب میرا وقتِ مقررہ آپہنچے تو مجھے حالتِ اسلام میں وفات دینا اور مجھے اپنے نیک بندوں، انبیائے صالحین، کے ساتھ جنتِ فردوس میں جگہ عطا فرمانا، یہ دعا اقتدار کے عروج پر کھڑے ایک نبی کی عاجزی کا اعلان ہے، جہاں حکومت و عظمت کے باوجود دل کی اصل آرزو یہی ہے کہ خاتمہ ایمان پر ہو اور رفاقت صالحین کی نصیب ہو۔

آیات کائنات سے اعراض اور عذاب الٰہی کا اندیشہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ {۱۰۲} وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ {۱۰۳} وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ {۱۰۴} وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا

وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ {۱۰۵} وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ {۱۰۶} اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ {۱۰۷} قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ {۱۰۸} وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ {۱۰۹} یوسف

جواب ترجمہ: یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کی طرف وحی کے ذریعے بھیجتے ہیں۔ اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہیں تھے جب انہوں نے اپنے کام کا پختہ ارادہ کر لیا تھا اور وہ تدبیر کر رہے تھے۔ اور اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اگرچہ آپ حرص کریں۔ اور آپ اس پر ان سے کسی عوض کا سوال نہیں کرتے یہ تو جہاں والوں کے لیے نصیحت ہے۔ اور بہت سی نشانیاں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں جن پر یہ لوگ گذرتے ہیں اور وہ ان سے اعراض کئے ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر اس حال میں کہ شرک کرنے والے ہیں۔ کیا یہ لوگ اس بات سے مطمئن ہیں کہ ان پر اللہ کی طرف سے عذاب کی کوئی ایسی آفت آپڑے جو ان کو گھیر لے یا ان پر اچانک قیامت آجائے اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔ آپ فرما دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں بصیرت پر ہوں اور وہ لوگ بھی جنہوں نے میرا اتباع کیا۔ اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے سب آدمی ہی تھے جو مختلف بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے۔ ہم ان کی طرف وحی بھیجتے تھے کیا یہ لوگ زمین میں نہیں چلے پھرے سو وہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو ان سے پہلے گذرے اور البتہ آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا کیا تم سمجھ نہیں رکھتے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ: حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کا یہ پورا واقعہ

محض ایک تاریخی حکایت نہیں بلکہ وحیِ الٰہی کا بیان ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ اے میرے حبیب ﷺ! یہ سب خبریں ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، آپ اس وقت موجود نہ تھے جب یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انہیں کنویں کی تہہ میں ڈالنے کا منصوبہ بنایا اور خفیہ تدبیریں سوچیں، مگر ہم نے یہ سب آپ ﷺ پر منکشف کر دیا۔

وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ: پھر انسانی فطرت کی ایک تلخ حقیقت واضح کی گئی کہ اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں، خواہ آپ ان کی ہدایت کے لیے کتنی ہی تڑپ اور کوشش کیوں نہ کریں، آپ اپنے آپ کو ان کے انکار پر غم میں ہلاک نہ کیجیے۔

وَكَأَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا: آسمانوں اور زمین میں اللہ کی وحدانیت کی بے شمار نشانیاں بکھری پڑی ہیں، لوگ ان کے پاس سے گزرتے ہیں مگر غور و فکر سے منہ موڑ لیتے ہیں، جیسے آنکھیں دیکھتی ہوں مگر دل بیدار نہ ہوں۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ: مزید یہ کہ اکثر لوگ اللہ کو خالق، رازق اور زندگی و موت کا مالک تو مانتے ہیں، مگر اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بھی ٹھہراتے ہیں، بتوں کو پوجتے ہیں، اس کی ذات کے لیے اولاد کا دعویٰ کرتے ہیں، حالانکہ وہ ان سب باتوں سے پاک ہے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت کے مفہوم میں وہ مسلمان بھی داخل ہیں جو ایمان کے باوجود مختلف قسم کے شرک میں مبتلا ہیں، مشرکین سے جب پوچھا جاتا تھا کہ آسمانوں کو پیدا کرنے والا کون ہے؟ زمینوں کو وجود دینے والا کون ہے؟ پہاڑوں کو زمین میں گاڑنے والا کون ہے؟ تو صاف صاف کہتے تھے کہ ان سب کو پیدا کرنے والا اکیلا اللہ ہی ہے، اس کے باوجود وہ لوگ شرک کرتے تھے۔

مشرکین تو تلبیہ میں بھی شرکیہ کلمات سے اپنے دل کو خوش کرتے تھے اور اللہ کے غصے کو دعوت دیتے تھے، وہ اپنے تلبیہ میں یہ شرکیہ کلمات بار بار استعمال کرتے تھے

لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ، إِلَّا شَرِيكًا هُوَ لَكَ، تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ (مسلم) جب مشرکین اپنے

تلبیہ میں یوں کہتے لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ تو نبی کریم ﷺ فرماتے کہ یہ کافی ہے یہ کافی ہے۔ آپ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ اس سے زیادہ نہ کہو۔

`اللہ تعالیٰ نے سورۃ لقمان کی آیت ۱۳ میں شرک کو ظلم عظیم قرار دیا ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک بار پوچھا کہ یارسول اللہ! گناہوں میں کون سا گناہ بڑا ہے؟ تو آپ ﷺ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا أَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ (بخاری و مسلم) گناہوں میں بڑا گناہ یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کا کسی کو شریک ٹھہرائے حالانکہ اس اللہ نے تجھے پیدا کیا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا کہ یہ شخص منافق ہے جو لوگوں کو دکھلانے کے لیے کام کرتے ہیں، اور مشرک اپنے عمل کے ذریعے شرک کرتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں بھی منافقین کی صفات بیان کی گئی ہیں کہ منافقین اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیتے ہیں، اللہ ان کے دھوکے کا انہیں جواب دیتا ہے، یہ لوگ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں، لوگوں کو دکھلانے کے لیے نمازیں پڑھتے ہیں، اللہ کا ذکر تھوڑا سا ہی کرتے ہیں۔ (النساء ۱۴۲)

اسی طرح بعض شرک ایسے خفیہ ہوتے ہیں کہ اکثر لوگوں کو ان کے بارے میں پتا بھی نہیں ہوتا کہ یہ شرک ہے، جیسے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ایک بیمار کی تیمارداری کے لیے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے بازو کے ساتھ ایک ڈورا بندھا ہوا ہے، آپ نے اسے کھینچ کر نکال دیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی کے بخار کے لیے ایک بڑھیا نے ایک دھاگا ان کے گلے میں لٹکا دیا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جب اس دھاگے کو دیکھا تو اسے کاٹ پھینکا اور فرمایا کہ آل عبداللہ کا گھر شرک سے پاک ہے، میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ نے تعویذ گنڈے کو شرک قرار دیا۔

نسائی کی روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عکیم رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو انہیں کسی نے گلے میں کوئی چیز لٹکانے کے لیے کہا، تو انہوں نے جواباً کہا کہ کیا میں اپنے گلے میں کوئی چیز لٹکاؤں جب کہ آپ ﷺ

نے فرمایا کہ جس نے کوئی چیز لٹکائی وہ اسی کے حوالے کر دیا جائے گا۔

مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص کوئی ڈور اور دھاگا لٹکائے اس نے شرک کیا، جو شخص کوئی چیز لٹکائے اللہ اس کا کام پورا نہ کرے، اور جو شخص کوئی چیز لٹکائے اللہ اسے لٹکا ہوا ہی رکھے۔(مسند احمد، ابن کثیر) ایک حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں تمام شریکوں سے زیادہ بے نیاز اور بے پرواہ ہوں جو شخص اپنے کسی کام میں میرا کوئی شریک ٹھرائے میں اسے اور اس کے شریک کو چھوڑ دیتا ہوں۔(مسلم)

مسند میں ہے قیامت کے دن جب کہ اول آخر سب جمع ہوں گے، اللہ کی طرف سے ایک منادی ندا کرے گا کہ جس نے اپنے عمل میں شرک کیا ہے، وہ اس کا ثواب اپنے شریک سے طلب کر لے، اللہ تعالیٰ تمام شرکاء سے بڑھ کر شرک سے بے نیاز ہے۔ مسند میں ہے آپ فرماتے ہیں مجھے تم پر سب سے زیادہ ڈر چھوٹے شرک کا ہے، لوگوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ فرمایا ریاکاری۔

قیامت کے دن لوگوں کو جزائے اعمال دی جائے گی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے ریا کرو تم جاؤ اور جن کے دکھانے سنانے کے لئے تم نے عمل کئے تھے، انہیں سے اپنا اجر طلب کرو اور دیکھو کہ وہ دیتے ہیں یا نہیں؟

مسند میں ہے آپ فرماتے ہیں جو شخص کوئی بدشگونی لے کر اپنے کام سے لوٹ جائے وہ مشرک ہو گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا یارسول اللہ! پھر اس کا کفارہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہنا دعا اَللّٰھُمَّ لَا خَیرَ اِلَّا خَیرُكَ وَلَا طَیرَ اِلَّا طَیرُكَ وَلَا اِلٰهَ غَیرُكَ یعنی اے اللہ سب بھلائیاں سب نیک شگون تیرے ہی ہاتھ میں ہیں، تیرے سوا کوئی بھلائیوں اور نیک شگونیوں والا نہیں۔ اسی طرح ایک حدیث میں غیر اللہ کی قسم کھانے کو شرک فرمایا ہے(ترمذی)

مسند احمد میں ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ لوگو شرک سے بچو وہ تو چیونٹی کی چال سے زیادہ پوشیدہ چیز ہے، اس پر حضرت عبداللہ بن حزن اور حضرت قیس

بن مضارب کھڑے ہو گئے اور کہا یا تو آپ اس کی دلیل پیش کیجئے یا ہم جائیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آپ کی شکایت کریں۔ آپ نے فرمایا لو دلیل لو۔ ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ سنایا اور فرمایا يَا أَيُّهَا النَّاسُ، اتَّقُوا هٰذَا الشِّرْكَ فَإِنَّهُ أَخْفَى مِنْ دَبِيبِ النَّمْلِ، لوگو! شرک سے بچو وہ تو چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے۔

کسی نے آپ سے پوچھا کہ پھر اس سے بچاؤ کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا یہ دعا پڑھا کرو اَللّٰهُمَّ إِنَّا نُعُوذُبِكَ (مِنْ) أَنْ نُشْرِكَ بِكَ شَيْئًا نَعْلَمُهُ، وَنَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا نَعْلَمُهُ، اے اللہ! ہم تیری پناہ چاہتے ہیں کہ تیرے ساتھ کسی کو جانتے ہوئے شریک ٹھہرائیں، اس چیز کی ہم آپ سے بخشش مانگتے ہیں جسے ہم نہیں جانتے۔

حضرت حافظ ابو یعلیٰ موصلی رحمۃ اللہ علیہ ایک روایت لائے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ جواب دیا تو پھر آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اس شرک سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہ دعا بتائی جس سے چھوٹے بڑے تمام شرکیات سے انسان کو گلو خلاصی مل جائے گی۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے نام کی منت اور نیاز ماننا بھی باتفاق فقہا اس میں داخل ہے۔ اس کے بعد ان کی مخالفت و جہالت پر اظہار افسوس و تعجب ہے کہ یہ لوگ اپنے انکار و سرکشی کے باوجود اس بات سے کیسے بے فکر ہو گئے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حادثہ عذاب آپڑے یا دفعۃ ان پر قیامت آجائے اور وہ اس کے لئے تیار نہ ہوں۔

أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً: کیا یہ لوگ اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ دنیا میں کوئی ہمہ گیر عذاب انہیں آگھیرے، یا قیامت اچانک آپہنچے اور انہیں سنبھلنے کی مہلت بھی نہ ملے؟

قُلْ هٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللّٰهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي: اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! آپ

اعلان کر دیجیے کہ یہی میرا راستہ ہے، میں لوگوں کو ایک روشن دلیل اور واضح بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور میرے پیروکار بھی اسی راہ پر دعوت دیتے ہیں، میں مشرکوں میں سے نہیں بلکہ خالص توحید کا علم بردار ہوں۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى: اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے ہم نے جو رسول بھی بھیجے وہ مرد (انسان) ہی تھے، فرشتے نہیں، بستیوں کے رہنے والے تھے، بدوی نہیں، ہم نے ان پر بھی اسی طرح وحی نازل کی جیسے آپ پر کی، مگر جب ان کی قوموں نے انہیں جھٹلایا تو ہم نے انہیں تباہ کر دیا، کیا یہ منکر لوگ زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھتے کہ پہلے جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟ اور یاد رکھو، آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے کہیں بہتر ہے جو دنیا میں اللہ سے ڈرتے رہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے کہ اس حقیقت کو سمجھو اور ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کرو اور سب سے بڑھ کر شرک سے بچو؟

انبیاء علیہم السلام شہری تھے نہ کہ دیہاتی: یہاں **مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ** کے بارے میں جمہور اہلِ تفسیر نے صراحت کی ہے کہ یہاں **اَلْقُرٰی** سے مراد دیہات یا بدوی بستیاں نہیں بلکہ شہر اور آباد مدائن ہیں؛ چنانچہ تفسیر البسیط میں امام واحدی نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے **يُرِيدُ أَهل المَدَائِن، لِأَنَّ اللهَ تَعَالَى لَم يَبعَث نَبِيًّا مِّن بَادِيَة** یعنی اس سے مراد اہلِ مدائن ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو بادیہ سے مبعوث نہیں فرمایا۔

اسی طرح البرھان في علوم القرآن میں ہے **مِن أَهلِ القُرَى يَعنِي مِن أَهل الأَمصَارِ، دُونَ أَهل البَوَادِي** یعنی القریٰ سے مراد امصار (شہری مراکز) ہیں نہ کہ بادیہ نشین، الجوھر الشفاف میں وضاحت کی گئی کہ انبیاء علیہم السلام اہلِ امصار میں سے ہوتے تھے، کیونکہ شہری معاشروں میں علم و حلم کی فضا زیادہ سازگار ہوتی ہے، جب کہ بدوی ماحول میں سختی اور جفا غالب آتی ہے۔

شرح تفسیر ابن کثیر میں بھی اسی آیت کے تحت یہ نکتہ بیان ہوا کہ تمام رسول بشر تھے اور اہلِ

القریٰ میں سے مبعوث ہوئے، جیسا کہ خود قرآن نے تصریح فرمائی۔ مزید برآں تفسیر الوسیط میں اس پہلو کو اُجاگر کیا گیا کہ انبیاء علیہم السلام اپنی ہی آبادیوں کے باشندے ہوتے تھے، اجنبی یا بیابانی عناصر میں سے نہیں اور تفسیر نسفی میں صاف الفاظ ہیں وَكَانُوا مِن أَهلِ القُرَى لَا مِن سُكَّانِ البَادِيَةِ ان تصریحات کی روشنی میں اہلِ تفسیر کا موقف واضح ہے کہ سورۃ یوسف آیت ۱۰۹ میں القریٰ سے مراد شہری آبادیاں ہیں، دیہات یا بادیہ نہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ہمیشہ منظم معاشروں اور قائم شدہ آبادیوں ہی میں سے مبعوث فرمائے تاکہ دعوت، فہم اور ابلاغ کا دائرہ مؤثر اور وسیع ہو سکے۔

لباب النقول میں شہریوں کی چار صفات بیان کی گئی ہیں کہ وہ بہت زیادہ عقل مند ہوتے ہیں، وہ بہت زیادہ صاحب فضیلت ہوتے ہیں، وہ بہت زیادہ علم رکھتے ہیں اور وہ بہت زیادہ بردبار ہوتے ہیں۔

تاخیر نصرت، عصمت انبیاء علیہم السلام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ {۱۱۰} یوسف

جواب ترجمہ: (پچھلے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ ان کی قوموں پر عذاب آنے میں کچھ دیر لگی) یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہوگئے اور کافر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ انہیں جھوٹی دھمکیاں دی گئی تھیں تو ان پیغمبروں کے پاس ہماری مدد پہنچ گئی (یعنی کافروں پر عذاب آیا) اور جن کو ہم چاہتے تھے، انہیں بچالیا گیا، اور جو لوگ مجرم ہوتے ہیں، ان سے ہمارے عذاب کو ٹالا نہیں جاسکتا۔

سورۂ یوسف کی آیت ۱۱۰ اپنے مفہوم اور اسلوب کے اعتبار سے نہایت دقیق اور معرکۃ الآراء مقام رکھتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا۔ اس آیت میں تاخیرِ عذاب، انتظارِ نصرت، اور انبیائے کرام علیہم السلام کی بشری کیفیات کے بیان کے ساتھ ساتھ ایک اہم نحوی و تفسیری بحث بھی پوشیدہ ہے، جس نے مفسرین کو مختلف

جہات سے غور و فکر پر آمادہ کیا۔

''حتّیٰ'' کی غایت اور تقدیرِ کلام: آیت کا آغاز لفظ ''حتّیٰ'' سے ہوتا ہے، حالاں کہ اس سے پہلے کوئی صریح کلام ایسا مذکور نہیں جو اس کی غایت قرار پائے، اسی بنا پر مفسرین نے ایک مقدر عبارت تسلیم کی ہے، تاکہ ''حتّیٰ'' کا تعلق درست طور پر متعین ہو سکے۔

بعض اہلِ تفسیر نے تقدیر یوں کی کہ: ہم نے آپ سے پہلے بھی مردانِ حق کو بھیجا، مگر ان کی نصرت میں تاخیر ہوئی، یہاں تک کہ یہ کیفیت پیش آئی، بعض نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ سابقہ امتوں کو فوراً عذاب میں مبتلا نہیں کیا گیا بلکہ مہلت دی گئی، حتیٰ کہ رسولوں پر یاس کی کیفیت طاری ہوئی، ایک رائے یہ بھی سامنے آئی کہ رسولوں نے طویل عرصہ دعوت دی، قوموں نے تکذیب کی اور یہ کشمکش دراز ہوتی رہی، یہاں تک کہ معاملہ اس انتہا کو پہنچا، ان اقوال میں جامع تر مفہوم وہ ہے جس میں دعوت، تکذیب اور تاخیرِ نصرت، تینوں پہلو جمع ہو جائیں، کیونکہ سیاقِ آیات سابقہ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت، قوموں کی سرکشی اور انجامِ بد کا تاریخی تسلسل بیان کیا جارہا ہے۔

وَظَنُّوا أَنَّهُم قَد كُذِبُوا: قرآت اور معانی: آیت کا سب سے زیادہ محلِ بحث حصہ یہ جملہ ہے :وظنّوا أنّهم قد كُذِبوا اس میں دو مشہور قراءتیں ہیں: تخفیف کے ساتھ كُذِبوا اور تشدید کے ساتھ كُذِّبوا۔ ہر قراءت اپنے اندر معنی کی ایک جہت رکھتی ہے، اور انہی احتمالات نے تفسیری آراء میں تنوع پیدا کیا۔

① ضمائر کا مرجع: رسول یا مرسل الیہم؟ ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ ظَنُّوا اور اس کے بعد کی ضمائر کا مرجع کون ہے؟ آیا یہ سب رسولوں کی طرف راجع ہیں یا ان کی قوموں کی طرف؟ ایک قول کے مطابق ضمائر کا مرجع مرسل الیہم، یعنی قومیں ہیں، مفہوم یہ ہو گا کہ جب رسول اپنی دعوت میں بظاہر کامیاب نہ ہوئے اور عذاب میں تاخیر ہوئی تو قوموں نے یہ گمان کر لیا کہ رسولوں نے جو وعدے کیے تھے، خواہ نصرت کے ہوں یا عذاب کے، وہ سچے نہ تھے۔ اس تفسیر میں انبیائے کرام علیہم السلام کی

عصمت پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا، اور سیاقِ آیات میں کفار کے انجام کا ذکر بھی اسی مفہوم سے مناسبت رکھتا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ضمائر رسولوں کی طرف لوٹتی ہیں، اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ طویل آزمائش اور مسلسل تکذیب کے باعث رسولوں کو یہ اندیشہ گزرا کہ کہیں ان کی قومیں انہیں جھٹلانے میں حد سے نہ گزر جائیں یا یہ کہ ان کی بشری طبیعت میں وقتی اضطراب پیدا ہوا، تاہم اس مقام پر نہایت احتیاط کی ضرورت ہے، کیونکہ انبیائے کرام علیہم السلام کی شان عصمت مسلم ہے، یہ تصور ہرگز درست نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وعدے میں شک کریں یا اسے خلافِ واقعہ سمجھیں۔

بعض اہلِ علم نے یہاں "ظنّ" کو اس کے لغوی دائرے میں رکھتے ہوئے "خاطرِ قلب" یا بشری وسوسے کے معنی میں لیا ہے، یعنی ایسا خیال جو انسانی طبیعت میں عارضی طور پر پیدا ہو اور فوراً زائل ہو جائے، لیکن اس تعبیر میں بھی لفظ "وسوسہ" سے اجتناب ضروری ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام شیطانی وسوسوں سے محفوظ ہوتے ہیں، صحیح تر تعبیر یہ ہے کہ اگر کوئی کیفیت ہوئی بھی تو وہ محض وقتی بشری اضطراب تھا، نہ کہ وعدۂ الٰہی میں تردد۔

② قراءتِ تشدید اور اس کی توضیح: قراءتِ تشدید کُذِّبوا کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ رسولوں نے گمان کیا کہ ان کی قوموں نے انہیں جھٹلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، یعنی طویل مدت تک انکار اور مخالفت کے بعد یہ امر یقینی ہو گیا کہ قوم نے تکذیب کو اپنا شعار بنا لیا ہے، اس مفہوم کی تائید ایک معروف روایت سے ہوتی ہے جس میں بیان کیا گیا کہ اہلِ ایمان پر آزمائش طویل ہوئی، نصرت میں تاخیر ہوئی، یہاں تک کہ یہ مرحلہ آیا، پھر اچانک اللہ کی مدد آن پہنچی۔

اس توجیہ کے ساتھ دونوں قراءتوں میں معنوی تطابق پیدا ہو جاتا ہے: ایک میں قوموں کا رسولوں کو جھٹلانا نمایاں ہے، اور دوسری میں رسولوں کے لیے قوموں کی تکذیب کا قطعی ہو جانا۔

③ تخفیف کی ایک اور جہت: بعض قراء نے کَذَبوا کو فعلِ معلوم کے طور پر بھی نقل کیا ہے،

اس صورت میں معنی یہ ہو گا کہ قوموں نے یہ سمجھا کہ رسولوں نے ان سے جو وعدے کیے تھے، وہ پورے نہ ہوئے، لہٰذا (ان کے گمان میں) رسول جھوٹے ثابت ہوئے (العیاذ باللہ)۔ یہاں بھی اصل نسبت قوموں کی بدگمانی کی طرف ہے، نہ کہ انبیاء علیہم السلام کے کسی نقص کی طرف۔

عصمتِ انبیاء اور حدودِ تعبیر: اس مقام پر سب سے اہم اصول یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے بارے میں شک یا بدگمانی سے منزہ ہیں، اگر کسی تفسیر سے یہ لازم آتا ہو کہ انہوں نے وعدۂ الٰہی کو خلافِ واقعہ سمجھا یا اس میں تردد کیا، تو وہ تعبیر قابلِ قبول نہیں، زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ نصرت کے ظہور کے وقت کے بارے میں بشری اندازہ مختلف ہو سکتا ہے، جیسا کہ دیگر مقاماتِ قرآن میں آزمائش کی شدت کا ذکر آیا ہے وَزُلْزِلُوا حَتّٰى يَقُولَ الرَّسُولُ یعنی آزمائش اس قدر بڑھی کہ اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی، مگر ایمان متزلزل نہ ہوا۔

نتیجہ: تاخیر کے بعد ظہورِ نصرت: آیت کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنی نصرت کو ایک مقرر حکمت کے تحت ظاہر کرتا ہے، بسا اوقات تاخیر اس قدر طویل ہو جاتی ہے کہ ظاہری اسباب کے اعتبار سے امید کے آثار ماند پڑ جاتے ہیں، مگر عین اسی مرحلے پر غیبی مدد آ پہنچتی ہے، اہلِ ایمان کو نجات ملتی ہے اور مجرمین عذاب سے دوچار ہوتے ہیں، اس تاخیر میں آزمائش بھی ہے، تربیت بھی اور حجت کا اتمام بھی۔

یوں یہ آیت تاریخِ نبوت کا ایک ہمہ گیر اصول بیان کرتی ہے: حق کا قافلہ اگرچہ صبر آزما مراحل سے گزرتا ہے، مگر انجامِ کار نصرت اسی کا مقدر ہے، تاخیر کو انکار نہ سمجھا جائے اور آزمائش کو ترکِ نصرت پر محمول نہ کیا جائے، یہی پیغام اس مقام کو معرکۃ الآراء بناتا ہے اور یہی اس کی دائمی معنویت ہے۔

قصص انبیاء علیہم السلام میں اربابِ دانش کے لیے عبرت کا سامان

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ

الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ{۱۱۱} یوسف

جواب ترجمہ: یقیناً ان کے واقعات میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے بڑا عبرت کا سامان ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو جھوٹ موٹ گھڑ لی گئی ہو، بلکہ اس سے پہلے جو کتابیں آچکی ہیں ان کی تصدیق ہے، اور ہر بات کی وضاحت اور جو لوگ ایمان لائیں ان کے لیے ہدایت اور رحمت کا سامان۔

سورۂ یوسف کی آخری آیت نہ صرف اس سورت کا اختتام ہے بلکہ پورے قرآنی منہجِ قصص کا جامع خلاصہ بھی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے :لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔ یہاں ''قصص'' سے مراد گزرے ہوئے لوگوں کے واقعات و احوال کا بیان ہے، بعض اہلِ تفسیر نے اس لفظ کو خاص طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان تک محدود کیا، جب کہ دوسرے حضرات نے اسے تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے قصص پر محمول کیا ہے، جن کے حالات قرآن میں مذکور ہیں، جیسے حضرت نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، لوط علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام، جمع کے صیغے اور اسلوبِ بیان کو سامنے رکھا جائے تو عموم کا پہلو زیادہ نمایاں محسوس ہوتا ہے، اگرچہ سورت کے سیاق میں حضرت یوسف علیہ السلام کی سرگزشت بطورِ خاص سامنے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان ایک وحدت رکھتی ہے، مگر اس کے اجزاء میں انسانی زندگی کے بے شمار رنگ سمٹے ہوئے ہیں، یہ محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ انسانی نفس کی کشاکش، خواہشات کے طوفان، حسد و رقابت کی آگ، صبر و استقامت کی قوت، اور تدبیر و حکمت کی روشنی، سب کا آئینہ دار ہے، اس میں دکھایا گیا ہے کہ نفس کیسے بہکتا ہے اور کیسے سنبھلتا ہے، کمزور ارادے کیسے خواہشات کے پیچھے بہہ جاتے ہیں اور مضبوط عزم رکھنے والے کیسے آزمائشوں کے بیچ راستہ نکالتے ہیں۔

اس سورت میں گھریلو زندگی کے لیے بھی رہنمائی ہے، حسد گھر کو کیسے جلاتا ہے اور عفو و محبت اسے کیسے آباد کرتے ہیں، اجتماعی اور معاشی نظم کے اصول بھی ملتے ہیں، خوشحالی کے زمانے میں ذخیرہ

اندوزی اور منصوبہ بندی، تاکہ قحط کے ایام میں معاشرہ سنبھل سکے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کچھ کاٹو اسے اس کی بالیوں میں رہنے دو، سوائے تھوڑے سے حصے کے جو کھاؤ، یہ محض معاشی تدبیر نہیں بلکہ مستقبل بینی اور اجتماعی ذمہ داری کا درس ہے۔

حکمرانی کے اوصاف کی ایک روشن تصویر بھی اسی سورت میں ملتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کی ذات میں ایک عادل حاکم کی خصوصیات جلوہ گر ہیں، سب سے نمایاں صفت قوتِ ارادہ ہے، جو خواہشات کے طوفان میں صبر کی صورت ظاہر ہوئی، دوسری صفت حلم و بردباری ہے، غصے پر قابو رکھنا، کیونکہ جو حاکم غضب کے پیچھے چل پڑے وہ انصاف سے دور ہو جاتا ہے، تیسری صفت محتاجوں اور ضرورت مندوں کی خبر گیری ہے، خواہ وہی لوگ کیوں نہ ہوں جنہوں نے پہلے اذیت پہنچائی ہو، چوتھی صفت اعتمادِ نفس ہے، جب حضرت یوسف علیہ السلام نے خزائنِ مصر کی ذمہ داری طلب کی تو یہ خواہشِ اقتدار نہیں بلکہ احساسِ ذمہ داری اور اپنی صلاحیت کا ادراک تھا، پانچویں صفت اخلاص اور توحید ہے، اللہ کے حضور جھکنے والا حاکم ہی بندوں پر عدل کر سکتا ہے، چھٹی صفت رفق و شفقت ہے، جیل میں بھی انہوں نے ساتھیوں کو محبت سے پکارا، اور ساتویں صفت تدبر و تأنی ہے، معاملات کو بغیر اشتعال اور بغیر تحقیر کے سلجھانا، جیسا کہ بھائی کو روکنے کے واقعے میں حکمت سے کام لیا گیا، یوں عفو نے حسد کو شکست دی، محبت نے عداوت کو مٹایا اور ہدایت نے گمراہی کو مغلوب کیا۔

آیت میں عِبْرَةٌ کا لفظ اس نکتے کو واضح کرتا ہے کہ یہ واقعات محض سنانے کے لیے نہیں بلکہ سبق لینے کے لیے ہیں، عبرت دراصل اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان ماضی کے واقعات سے حال کے لیے روشنی حاصل کرے، انسان کی فطرت زمانوں کے بدلنے سے نہیں بدلتی، گناہوں کی نوعیت بھی ملتی جلتی رہتی ہے اور ان کے نتائج بھی، اس لیے سابقہ قوموں کا انجام بعد والوں کے لیے تنبیہ ہے، یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے قصص میں منکرین کے لیے انذار ہے اور اہلِ ایمان کے لیے تسلی کہ نصرتِ الٰہی یقینی ہے، خواہ تاخیر کیوں نہ ہو۔

پھر فرمایا گیا مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ، یہ کوئی گھڑی ہوئی داستان نہیں۔ یہاں حدیثاً کو نکرہ لانے سے عمومِ نفی پیدا ہو گیا، یعنی یہ کسی درجے میں بھی من گھڑت روایت نہیں، مخالفین اسے اساطیر الاولین کہتے تھے، مگر قرآن اس الزام کو قطعی طور پر رد کرتا ہے، یہ سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق ہے؛ جو کچھ حق وہاں تھا، یہ اس کی توثیق کرتا ہے اور جہاں تحریف ہوئی، اسے واضح کرتا ہے۔ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ کا مطلب یہ ہے کہ یہ کلام اپنے سے پہلے نازل شدہ صحیفوں کی سچائی کی گواہی دیتا ہے، کیونکہ سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔

مزید فرمایا وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ یعنی انسان کی ہدایت کے لیے درکار اصولی امور کی وضاحت، پھر اسے هُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ قرار دیا، ہدایت اس لیے کہ یہ راستہ دکھاتا ہے اور رحمت اس لیے کہ صحیح راستہ پالینا خود سب سے بڑی رحمت ہے، البتہ یہ فیض انہی کے لیے ہے جو ایمان لائیں اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں جو ضد اور انکار پر اڑے رہیں، ان کے لیے یہ نور بھی بے اثر رہتا ہے۔

یوں سورۂ یوسف کا اختتام اس اعلان پر ہوتا ہے کہ قرآنی قصص تاریخ نہیں، ہدایت ہیں؛ حکایت نہیں، حقیقت ہیں؛ اور محض بیان نہیں، بلکہ دل و دماغ کو جھنجھوڑ دینے والی زندہ عبرت ہیں۔ جو لوگ عقل کی گہرائی تک پہنچتے ہیں، وہی ان سے روشنی لیتے ہیں، اور انہی کے لیے یہ کتاب سراسر ہدایت اور رحمت بن جاتی ہے۔

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی جامعہ رشیدیہ لاہور

اضافات جدیدہ وترمیمات: ۲۸ فروری ۲۰۲۶ء ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ

سورۃ الرعد (تعارف)

سوال سورۃ الرعد کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۂ رعد قرآنِ مجید کی ان سورتوں میں سے ہے جو دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر کائنات کے پردوں کے پیچھے کارفرما قدرتِ الٰہی کی جھلک دکھاتی ہے، اس کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، بعض حضرات اسے مکی قرار دیتے ہیں، بعض مدنی، اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ سورت مدنی ہے البتہ چند آیات مکہ میں نازل ہوئیں، تاہم مضامین پر غور کیا جائے تو اس میں دعوت، انذار، قدرتِ الٰہی کے دلائل اور رسولِ اکرم ﷺ کی تسلی، یہ سب عناصر اس جامع انداز میں جمع ہیں کہ مکی و مدنی اسلوب کی خوب صورت آمیزش محسوس ہوتی ہے۔

سورۂ رعد قرآنِ مجید کی تیرہویں سورت ہے، جس کی کل ۴۳ آیات ہیں، کلمات اور حروف کی تعداد میں شمار کے طریقِ کار کے باعث معمولی اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم جمہور کے نزدیک اس میں تقریباً ۸۵۴ کلمات اور ۳۵۴۱ حروف ہیں، اگرچہ مصاحف کے رسم اور گنتی کے اختلاف سے یہ تعداد کچھ کم و بیش بھی بیان کی جاتی ہے، ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے یہ تیرہویں نمبر پر ہے، جب کہ ترتیبِ نزولی کے بارے میں اکثر اہلِ علم کی رائے ہے کہ یہ تقریباً ۹۶ ویں نمبر پر نازل ہوئی۔

وجہِ تسمیہ: اس سورت کا نام "الرعد" اس لیے رکھا گیا کہ اس میں ارشاد ہوتا ہے: وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ "رعد" سے مراد وہ گرج ہے جو بادلوں سے سنائی دیتی ہے، لغت میں اسے بادلوں کی آواز کہا گیا ہے اور بعض آثار میں یہ بھی منقول ہے کہ رعد ایک فرشتہ ہے جو اللہ کے حکم سے بادلوں کو ہانکتا ہے، نام ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ سورت کا مرکزی مزاج جلالِ الٰہی، قدرت کی ہیبت اور کائنات کی ہمہ گیر تسبیح کو نمایاں کرنا ہے۔

مرکزی پیغام: سورۂ رعد کا بنیادی موضوع اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی کامل قدرت اور قیامت کے یقینی وقوع کا اثبات ہے، سورت کا آغاز ہی اس اعلان سے ہوتا ہے کہ جو کتاب آپ ﷺ پر نازل کی

گئی ہے وہ سراسر حق ہے، لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، گویا ابتدا میں ہی حق اور انکار کا تقابل قائم کر دیا گیا۔

قدرتِ الٰہی کے دلائل: اس سورت میں آفاقی نشانیاں نہایت بلیغ اسلوب میں پیش کی گئی ہیں: آسمانوں کا بغیر دکھائی دینے والے ستونوں کے قائم ہونا۔ سورج اور چاند کا مقررہ نظام کے تحت گردش کرنا۔ زمین کا پھیلایا جانا، پہاڑوں اور نہروں کا بنانا۔ بارش کا برسنا اور مختلف پھلوں کا اگنا۔ یہ سب محض طبعی مظاہر نہیں بلکہ توحید کی روشن دلیلیں ہیں، سورت انسان کو دعوت دیتی ہے کہ وہ کائنات کو عادت کی نظر سے نہیں، بصیرت کی نظر سے دیکھے۔

رعد کی تسبیح: آیت وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ ایک روح پرور منظر پیش کرتی ہے، بادل گرج رہے ہیں، بجلی چمک رہی ہے، فضا لرز رہی ہے اور یہ سب دراصل اللہ کی حمد و تسبیح میں مصروف ہیں، گویا کائنات کا ہر ذرہ اپنی زبانِ حال سے خالق کی کبریائی بیان کر رہا ہے، اگرچہ انسان اکثر اس ہمہ گیر ذکر سے غافل رہتا ہے۔

قیامت اور جزا و سزا: سورت میں بار بار یہ حقیقت اجاگر کی گئی ہے کہ جس رب نے پہلی بار پیدا کیا، وہ دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے، بارش سے مردہ زمین کا جی اٹھنا، بیج کا پھٹ کر شجر بن جانا، یہ سب بعث بعد الموت کی تمثیلات ہیں، منکرین کے شبہات کا مدلل جواب دیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ حق کا انجام فلاح اور باطل کا انجام خسارہ ہے۔

سنتِ الٰہی اور تبدیلی کا اصول: سورۂ رعد کی ایک نمایاں تعلیم یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے، یہ آیت انسانی ذمہ داری اور اجتماعی اصلاح کا بنیادی اصول بیان کرتی ہے، تقدیر کے نام پر جمود اختیار کرنا اس سورت کے پیغام کے خلاف ہے، یہاں عمل، بیداری اور اخلاقی انقلاب کی دعوت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تسلی: کفار کے اعتراضات، مطالبۂ معجزات اور استہزاء کے مقابلے میں رسول اللہ

ﷺ کو صبر و ثبات کی تلقین کی گئی ہے، سابقہ انبیاء علیہم السلام کے حالات کا حوالہ دے کر بتایا گیا کہ دعوت کی راہ آزمائشوں سے خالی نہیں ہوتی، مگر انجام کار نصرتِ الٰہی اہلِ حق ہی کا مقدر بنتی ہے، اس میں آپ ﷺ کے لیے تسکین بھی ہے اور اہلِ ایمان کے لیے حوصلہ بھی۔

قرآن کی حقانیت: سورت اس بات پر زور دیتی ہے کہ یہ کلام انسانی تصنیف نہیں بلکہ ربّ العالمین کا نازل کردہ حق ہے، جو لوگ ضد کی بنا پر انکار کرتے ہیں وہ دلائل کی کمی کی وجہ سے نہیں بلکہ دل کی سختی کی وجہ سے محروم رہتے ہیں۔

خلاصۂ کلام: سورۂ رعد جلال اور جمال دونوں کا حسین امتزاج ہے، اس میں کائنات کی ہیبت ناک گرج بھی ہے اور رحمت کی بارش بھی، انذار کی سختی بھی ہے اور تسلی کی نرمی بھی، یہ سورت انسان کو جھنجھوڑ کر کہتی ہے کہ آسمانوں کی بلندیوں، زمین کی وسعتوں اور بادلوں کی گرج میں اپنے رب کو پہچانو، حق کو قبول کرو، اپنے باطن کو بدلو اور اس دن کی تیاری کرو جب ہر عمل کا حساب ہونا ہے۔

کتاب اللہ کی حقانیت و صداقت

سوال آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ {۱} الرعد

جواب ترجمہ: المر یہ کتاب کی آیتیں ہیں۔ اور آپ کے رب کی طرف سے جو کچھ آپ کی طرف اتارا گیا حق ہے۔ لیکن بہت سے لوگ ایمان نہیں لاتے۔

{المر} یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں "یعنی یہ آیات اس بات کی شاہد ہیں کہ یہ وحی منجانب اللہ ہے، کیونکہ یہ آیات انہی حروف تہجی سے مرکب ہیں اور جب آج تک ان حروف سے ایسی کتاب کوئی نہیں بنا سکا تو ثابت ہوا کہ یہ وحی الٰہی ہیں۔

وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ: اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے

وہ عین حق ہے، یہی حق ہے، یہ ایسا خالص حق ہے جس میں باطل کی کوئی ملاوٹ نہیں ہے اور جس میں کوئی شک اور تردد نہیں ہے، یہ حروف تہجی بھی اس پر دلیل ہیں کہ یہ حق ہے کیونکہ یہ اس کتاب کے من جانب اللہ ہونے پر دلیل ناطق ہیں، کیونکہ اللہ کی جانب سے جو آتا ہے وہ حق ہی ہوتا ہے اور اس میں شک کی گنجائش نہیں رہتی۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ : مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، وہ اس بات پر ایمان نہیں لاتے کہ یہ قرآن مجید من جانب اللہ ہے اور نہ ان نتائج کو مانتے ہیں جو اس ایمان کے بعد سامنے آتے ہیں مثلاً عقیدہ توحید، صرف اللہ کی مکمل اطاعت، عقیدہ بعث بعد الموت اور عقیدہ توحید کے ساتھ عمل صالح اور پوری زندگی کی اصلاح۔

قدرت کی نیرنگیاں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ {۲}وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ {۳} وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ {۴} الرعد.

جواب ترجمہ: اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے بلند فرمادیا تم ان آسمانوں کو دیکھ رہے ہو پھر وہ عرش پر مستوی ہوا۔ اور اس نے چاند اور سورج کو مسخر فرمادیا ہر ایک مدت مقررہ کے مطابق چلتا ہے وہ کام کی تدبیر فرماتا ہے۔ نشانیوں کو واضح طور پر بیان فرماتا ہے۔ تاکہ تم اپنے رب کی

ملاقات کا یقین کرلو۔ وروہی ہے جس نے زمین کو پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ اور نہریں پیدا فرمادیں اور ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسمیں پیدا فرمائیں اور رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو فکر کرتے ہیں۔ اور زمین میں ٹکڑے ہیں جو آپس میں پڑوسی ہیں اور انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتیاں ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن میں بعض کی جڑ بعض سے ملی ہوئی ہیں اور بعض ملی ہوئی نہیں ہیں انھیں ایک ہی پانی سے سیر اب کیا جاتا ہے اور ہم ایک کو دوسرے پر فضیلت دیتے ہیں بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سمجھ سے کام لیتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا: اللہ وہ ذاتِ برحق ہے جس نے آسمانوں کو ایسے بلند فرمایا کہ تمہیں کوئی ستون دکھائی نہیں دیتا جو انہیں تھامے ہوئے ہو، یہ رفعت محض ظاہری بلندی نہیں بلکہ قدرتِ کاملہ کی نشانی ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ: پھر وہ اپنے شایانِ شان عرش پر مستوی ہوا، ایسا استواء جو نہ کسی کیفیت کا محتاج ہے، نہ کسی مثال کا، اللہ تعالیٰ کے عرش پر بیٹھنے سے مراد مخلوق کی طرح بیٹھنا نہیں، بلکہ یہ پوری کائنات پر حکومت و اقتدار کا ایک تخت ہے، جس پر اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق جلوہ افروز ہوتے ہیں، جیسے ایک عام انسان سورج کی گرمی اور سمندر کے پھیلاؤ کو ناپ نہیں سکتا، اسی طرح کسی مخلوق کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ خالق کی کیفیات کا ادراک کر سکے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ: سورج اور چاند کو اس نے اپنی مخلوق کی منفعت کے لیے مسخر کر دیا، دونوں ایک مقررہ مدت تک، اسی کے علم میں متعین راستوں پر رواں دواں ہیں، کائنات کا پورا نظام اسی کے حکم سے چل رہا ہے، وہی آسمان و زمین کے معاملات کی تدبیر فرماتا ہے، یہ سب نشانیاں اس لیے کھول کھول کر بیان کی جاتی ہیں کہ انسان اپنے رب سے ملاقات کے یقین تک پہنچے اور اس یقین کی روشنی میں اپنی عملی زندگی کو سنوارے۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ: اور وہی ہے جس

نے زمین کو بچھایا، اسے رہنے کے قابل بنایا اور اس میں مضبوط پہاڑ گاڑ دیے تاکہ وہ انسانوں کو لے کر ڈگمگائے نہیں، اسی نے ہر قسم کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے، جس طرح جانداروں میں نر و مادہ کی تقسیم ہے، اسی طرح نباتات میں بھی تنوع اور زوجیت کا نظام کار فرما ہے، وہی رات کو دن پر لپیٹ دیتا ہے، اجالا تاریکی میں ڈھل جاتا ہے اور روشنی کے بعد سایہ چھا جاتا ہے، ان تمام مناظر میں ان لوگوں کے لیے واضح دلائل ہیں جو غور و فکر کی عادت رکھتے ہیں، جو کائنات کو محض دیکھتے نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں جلوہ گر حکمت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ: زمین ہی میں ایک دوسرے سے ملی ہوئی قطعات ہیں، کہیں انگوروں کے باغات ہیں، کہیں کھیتیاں لہلہا رہی ہیں، کہیں کھجوروں کے درخت ہیں، بعض ایک ہی جڑ سے پھوٹے ہوئے اور بعض جداگانہ اصل رکھتے ہوئے، سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے، مگر ذائقے، رنگ، تاثیر اور فائدے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، قربت کے باوجود اختلاف، یکساں آبپاشی کے باوجود تنوع، یہ سب اس قادرِ مطلق کی صناعی کا شاہکار ہے، یقیناً ان نشانیوں میں عقل والوں کے لیے گہری عبرت ہے، وہی ان حقائق سے سبق لیتے ہیں اور وحدانیتِ رب پر ایمان کو مضبوط کرتے ہیں۔

زمین کو طول عرض میں پھیلا کر اللہ ہی نے بچھایا ہے، اس میں مضبوط پہاڑ بھی اسی کے گاڑے ہوئے ہیں، اس میں دریاؤں اور چشموں کو بھی اسی نے جاری کیا ہے، تاکہ مختلف شکل وصورت، مختلف رنگ، مختلف ذائقوں کے پھل پھول کے درخت اس سے سیراب ہوں، جوڑا جوڑا میوے اس نے پیدا کئے، کھٹے میٹھے وغیرہ، رات دن ایک دوسرے کے پے در پے برابر آتے جاتے رہتے ہیں، ایک کا آنا دوسرے کا جانا ہے پس مکان سکان اور زمان سب میں تصرف اسی قادر مطلق کا ہے، اللہ کی ان نشانیوں حکمتوں اور دلائل کو جو غور سے دیکھے وہ ہدایت یافتہ ہو سکتا ہے۔

زمین کے ٹکڑے ملے جلے ہوئے ہیں، پھر قدرت کو دیکھیے کہ ایک ٹکڑے سے تو پیداوار ہو اور

دوسرے سے کچھ نہ ہو، ایک کی مٹی سرخ، دوسرے کی سفید، زرد، وہ سیاہ، یہ پتھریلی، وہ نرم، یہ میٹھی، وہ شور، ایک ریتلی، ایک صاف، غرض یہ بھی خالق کی قدرت کی نشانی ہے اور بتاتی ہے کہ فاعل خود مختار، مالک الملک، لاشریک ایک وہی اللہ خالق کل ہے، نہ اس کے سوا کوئی معبود، نہ پالنے والا۔

صِنوَانٌ صنوٌ کی جمع ہے، صنوان کہتے ہیں ایک درخت جو کئی تنوں اور شاخوں والا ہو جیسے انار اور انجیر اور بعض کھجوریاں، غیر صنوان جو اس طرح نہ ہو ایک ہی تنا ہو جیسے اور درخت ہوتے ہیں، اسی سے انسان کے چچا کو صِنوُ الاَب کہتے ہیں حدیث میں بھی یہ آیا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انسان کا چچا مثل باپ کے ہوتا ہے، حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک جڑ یعنی ایک تنے میں کئی ایک شاخدار درخت کھجور ہوتے ہیں اور ایک تنے پر ایک ہی ہوتا ہے یہی صنوان اور غیر صنوان ہے یہی قول اور بزرگوں کا بھی ہے۔

سب کے لئے پانی ایک ہی ہے یعنی بارش کا لیکن ہر مزے اور پھل میں کمی بیشی میں بے انتہا فرق ہے، کوئی میٹھا ہے، کوئی کھٹا ہے، حدیث میں بھی یہ تفسیر ہے ملاحظہ ہو ترمذی شریف۔ الغرض قسموں اور جنسوں کا اختلاف، شکل صورت کا اختلاف، رنگ کا اختلاف، بو کا اختلاف، مزے کا اختلاف، پتوں کا اختلاف، تروتازگی کا اختلاف، ایک بہت ہی میٹھا، ایک سخت کڑوا، ایک نہایت خوش ذائقہ، ایک بیحد بدمزہ، رنگ کسی کا زرد، کسی کا سرخ، کسی کا سفید، کسی کا سیاہ، اسی طرح تازگی اور پھل میں بھی اختلاف حالانکہ غذا کے اعتبار سے سب یکساں ہیں، یہ قدرت کی نیرنگیاں ایک ہوشیار شخص کے لئے عبرت ہیں اور فاعل مختار اللہ کی قدرت کا بڑا زبردست پتہ دیتی ہیں کہ جو وہ چاہتا ہے ہوتا ہے، عقل مندوں کے لئے یہ آیتیں اور یہ نشانیاں کافی وافی ہیں۔

عذاب کو دعوت

سوال ان آیات مبارکہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

بِرَبِّهِمْ وَأُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَأُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ{۵} وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ {۶} الرعد

جواب ترجمہ: اور اگر آپ کو تعجب ہو تو ان کا یہ قول لائق تعجب ہے کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا نئے سرے سے پیدا ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور یہ لوگ دوزخ والے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ لوگ عافیت سے پہلے آپ سے مصیبت کے جلدی آنے کا تقاضا کرتے ہیں اور حالانکہ ان سے پہلے عذاب کے واقعات گزر چکے ہیں اور بلاشبہ آپ کا رب لوگوں کے ظلم کے باوجود انھیں بخش دینے والا ہے۔ اور یہ بات یقینی ہے کہ آپ کا رب سخت عذاب والا ہے۔

وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ: ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اگر اے میرے حبیب ﷺ! آپ کو ان منکرین کے قول پر تعجب ہو تو درحقیقت تعجب کے لائق ان کا یہی کہنا ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا پھر از سرِ نو پیدا کیے جائیں گے؟ گویا وہ بعث بعد الموت کو عقل سے بعید سمجھ کر اس کا انکار کر رہے ہیں، حالانکہ جس ذاتِ اقدس نے آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود میں لایا اور پہلی بار انسان کو پیدا فرمایا، اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا کیا دشوار ہو سکتا ہے؟ پہلی تخلیق کو مان کر دوسری کو ناممکن کہنا صریح بے عقلی ہے، اسی ایک دلیل سے ان کے استبعادِ بعث کا بھی جواب ہو گیا اور انکارِ نبوت کا بھی، کیونکہ جب قیامت اور حساب ہی نہ ہو تو رسالت کی حکمت کیا باقی رہتی ہے، اس طرح ان کا اصل انکار درحقیقت ربّ کی قدرتِ کاملہ پر عدمِ یقین کا نتیجہ ہے۔

وَأُولٰئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَأُولٰئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ: فرمایا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، بعث کا انکار دراصل قدرتِ الٰہی کے انکار کو مستلزم ہے اور قیامت کے انکار

سے رسالت کی تکذیب لازم آتی ہے، ایسے لوگوں کے لیے سخت وعید بیان کی گئی کہ ان کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے اور وہ دوزخ میں داخل ہوں گے جہاں ہمیشہ رہیں گے، یہ انجام اس ضد اور سرکشی کا طبعی نتیجہ ہے جو انہوں نے حق کے مقابل اختیار کی۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ : منکرین قیامت کہتے ہیں کہ اگر سچے ہو تو ہم پر اللہ کا عذاب جلد ہی کیوں نہیں لاتے ؟ کہتے تھے کہ اے اپنے آپ پر اللہ کی وحی نازل ہونے کا دعویٰ کرنے والے، ہمارے نزدیک تو تو پاگل ہے۔ اگر بالفرض سچا ہے تو عذاب کے فرشتوں کو کیوں نہیں لاتا ؟ اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ فرشتے حق کے فیصلے کے ساتھ ہی آیا کرتے ہیں، جب وہ وقت آئے گا اس وقت ایمان لانے یا توبہ کرنے یا نیک عمل کرنے کی فرصت و مہلت نہیں ملے گی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر واضح فرمایا ہے کہ بے ایمان اس کی جلدی مچا رہے ہیں اور ایماندار اس سے خوف کھا رہے ہیں اور اسے برحق جان رہے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ وہ کہتے تھے کہ اے اللہ! اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی اور المناک عذاب نازل فرما۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے کفر و انکار کی وجہ سے اللہ کے عذاب کا آنا محال جان کر اس قدر نڈر اور بے خوف ہو گئے تھے کہ عذاب کے اترنے کی آرزو اور طلب کیا کرتے تھے۔

یہاں فرمایا کہ ان سے پہلے کے ایسے لوگوں کی مثالیں ان کے سامنے ہیں کہ کس طرح وہ عذاب کی پکڑ میں آ گئے۔ کہہ دو کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حلم و کرم ہے کہ گناہ دیکھتا ہے اور فوراً نہیں پکڑتا ورنہ روئے زمین پر کسی کو چلتا پھرتا نہ چھوڑے، دن رات خطائیں دیکھتا ہے اور درگزر فرماتا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ عذاب پر قدرت نہیں رکھتا۔ اس کے عذاب بھی بڑے خطرناک نہایت سخت اور بہت درد دکھ دینے والے ہیں۔

منکرین کا مطالبۂ معجزہ

سوال آیت کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ {۷} الرعد

جواب ترجمہ: اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں کی گئی۔ آپ صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ہدایت دینے والے ہوتے چلے آئے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ کافر لوگ اپنے عناد اور ہٹ دھرمی میں یہ کہتے ہیں کہ اس (محمد ﷺ) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی (خاص) نشانی کیوں نہیں اتاری گئی، جیسی نشانیاں موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ کو دی گئیں؟ ان کا یہ سوال طلب حق کے جذبہ سے نہیں بلکہ ضد اور تمادی فی العناد کے طور پر تھا، حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ معجزہ دیکھ کر ایمان لانے والے نہ تھے، بلکہ ان کی سرکشی کا اصل سبب انکار اور تکبر تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کا جواب نہایت جامع انداز میں عطا فرمایا کہ اے میرے حبیب ﷺ! آپ کا منصب اصل میں انذار ہے، یعنی لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانا اور انجامِ بد سے خبردار کرنا، آپ کو جو نشانیاں عطا کی گئیں وہ اللہ ہی کی عطا کردہ ہیں اور نبی کو اپنی طرف سے معجزات لانے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا، معجزہ اللہ کی مشیت سے ظاہر ہوتا ہے، نہ کہ منکرین کی فرمائش پر۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہر قوم کے لیے ایک ہادی آیا ہے جو انہیں راہِ حق کی طرف رہنمائی کرتا رہا، انبیائے سابقین علیہم السلام کا طریق بھی یہی تھا کہ وہ اللہ کے حکم سے لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلاتے اور حق کی دلیل پیش کرتے، کسی خاص قسم کے معجزہ کا التزام ہر نبی کے لیے لازم نہ تھا، بلکہ اصل مقصود دعوتِ حق اور اقامتِ حجت ہے۔

کفار کا یہ مطالبہ دراصل محض بہانہ تھا، وہ یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح موسیٰ کو عصا اور ید بیضا دیا گیا اور عیسیٰ کو مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ عطا ہوا، اسی نوع کا کوئی محسوس معجزہ ان کے سامنے

ظاہر ہو، تب ایمان لائیں گے، حالانکہ قرآن مجید بذات خود ایسا معجزہ ہے جو فصاحت، بلاغت اور اعجاز معنوی کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر ہے اور اس کی مثل پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے۔

اس آیت میں یہ حقیقت واضح کی گئی کہ نبوت کا مقصد لوگوں کی خواہشات کی تکمیل نہیں بلکہ ان کی اصلاح اور ہدایت ہے، رسول اللہ ﷺ کا کام انذار و تبشیر اور اقامتِ حجت ہے، جبکہ معجزات کا ظہور اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کے تابع ہے، ہر قوم کے لیے ہادی بھیجا جانا اس سنتِ الٰہی کا حصہ ہے، تاکہ کسی پر حجت باقی نہ رہے، یوں اس آیت میں کفار کے اعتراض کا مدلل رد بھی ہے اور منصبِ رسالت کی حقیقت کا نہایت بلیغ بیان بھی۔

شکم مادر میں قدرت کی کاریگریاں

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ {۸} الرعد

جواب ترجمہ: اللہ کو معلوم ہے کہ جو کچھ ہر مادہ اپنے پیٹ میں لیے ہوئے ہے اور جو کچھ پیٹ میں سکڑتا اور بڑھتا ہے اور اس کے ہاں ہر چیز کا اندازہ ہے۔ (سورۃ الرعد)

اللہ کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں، تمام جاندار مادہ حیوان ہوں یا انسان، ان کے پیٹ کے بچوں کا، ان کے حمل کا، اللہ کو علم ہے کہ پیٹ میں کیا ہے؟ اسے اللہ بخوبی جانتا ہے یعنی مرد ہے یا عورت؟ اچھا ہے یا برا؟ نیک ہے یا بد؟ عمر والا ہے یا بے عمر کا؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے {هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى} (النَّجْمِ: ۳۲) وہ بخوبی جانتا ہے جب کہ تمہیں زمین سے پیدا کرتا ہے اور جب کہ تم ماں کے پیٹ میں چھپے ہوئے ہوتے ہو، اپنی بہت پاکیاں نہ بیان کرو وہ خوب جانتا ہے کہ سب سے زیادہ متقی کون ہے؟

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے {يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ} (الزُّمَرِ: ٦) وہ تمہیں تمہاری ماں کے پیٹ میں پیدا کرتا ہے ایک کے بعد دوسری پیدائش میں تین تین اندھیروں میں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے {وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ} (الْمُؤْمِنُونَ: ١٢، ١٤) اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا ہے۔ پھر اس کو مضبوط (اور محفوظ) جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر نطفے کو لوتھڑا بنایا پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت (پوست) چڑھایا پھر اس کو نئی صورت میں بنا دیا تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا ہے بڑا بابرکت ہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے إِنَّ خَلْقَ أَحَدِكُمْ يُجْمَعُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا، ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ مضغة مثل ذلك، ثم يبعث إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ: يَكْتب رِزْقَهُ، وَعُمُرَهُ، وَعَمَلَهُ، وَشِقِيٌّ أَوْ سَعِيدٌ (بخاری و مسلم) تم میں سے ہر ایک کی پیدائش چالیس دن تک اس کی ماں کے پیٹ میں جمع ہوتی رہتی ہے، پھر اتنے ہی دنوں تک وہ بصورت خون بستہ رہتا ہے پھر اتنے ہی دنوں تک وہ گوشت کا لوتھڑا رہتا ہے، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے، جسے چار باتوں کے لکھ لینے کا حکم ہوتا ہے، اس کا رزق، عمر، عمل اور نیک بد ہونا لکھ لیتا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ فرشتہ پوچھتا ہے أَيْ رَبِّ، أَذَكَرٌ أَمْ أُنْثَى؟ أَيْ رَبِّ، أَشَقِيٌّ أَمْ سَعِيدٌ؟ فَمَا الرِّزْقُ؟ فَمَا الْأَجَلُ؟ فَيَقُولُ اللهُ، وَيَكْتُبُ الْمَلَكُ اے اللہ مرد ہو گا یا عورت؟ بدبخت ہو گا یا نیک بخت؟ روزی کیا ہے؟ عمر کتنی ہے؟ اللہ تعالیٰ بتلاتا ہے اور وہ لکھ لیتا ہے۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں غیب کی کنجیاں پانچ ہیں جنہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا کل کی بات اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، پیٹ میں کیا بڑھتا ہے اور کیا گھٹتا ہے کوئی نہیں جانتا۔ بارش کب برسے گی اس کا علم بھی کسی کو نہیں کون شخص کہاں مرے گا اسے بھی اس کے سوا کوئی نہیں جانتا قیامت کب قائم ہو گی اس کا علم بھی اللہ ہی کو ہے۔

پیٹ میں کیا گھٹتا ہے اس سے مراد حمل کا ساقط ہو جانا ہے اور رحم میں کیا بڑھ رہا ہے کیسے پورا ہو رہا ہے۔ یہ بھی اللہ کو بخوبی علم رہتا ہے۔ دیکھ لو کوئی عورت دس مہینے لیتی ہے کوئی نو۔ کسی کا حمل گھٹتا ہے، کسی کا بڑھتا ہے۔ نو ماہ سے گھٹنا، نو سے بڑھ جانا اللہ کے علم میں ہے۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ وَضَعَتْنِي أُمِّي وَقَدْ حَمَلَتْنِي فِي بَطْنِهَا سَنَتَيْنِ، وَوَلَدَتْنِي وَقَدْ نَبَتَتْ ثَنِيَّتِي، میں دو سال ماں کے پیٹ میں رہا جب پیدا ہوا تو میرے اگلے دو دانت نکل آئے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے کہ لَا يَكُونُ الْحَمْلُ أَكْثَرَ مِنْ سَنَتَيْنِ، حمل کی انتہائی مدت دو سال کی ہوتی ہے۔ کمی سے مراد بعض کے نزدیک ایام حمل میں خون کا آنا اور زیادتی سے مراد نو ماہ سے زیادہ حمل کا ٹھہرا رہنا ہے۔

امام تفسیر حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نو سے پہلے جب عورت خون کو دیکھے تو نو سے زیادہ ہو جاتے ہیں مثل ایام حیض کے۔ خون کے گرنے سے بچہ اچھا ہو جاتا ہے اور نہ گرے تو بچہ پورا پاٹھا اور بڑا ہوتا ہے۔

حضرت مکحول رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں الْجَنِينُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ لَا يَطْلُبُ، وَلَا يَحْزَنُ وَلَا يَغْتَمُّ، وَإِنَّمَا يَأْتِيهِ رِزْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ مِنْ دَمِ حَيْضَتِهَا فَمِنْ ثَمَّ لَا تَحِيضُ الْحَامِلُ. فَإِذَا وَقَعَ إِلَى الْأَرْضِ اسْتَهَلَّ، وَاسْتِهْلَالُهُ اسْتِنْكَارٌ لِمَكَانِهِ، فَإِذَا قُطِعَتْ سُرَّتُهُ حَوَّلَ اللَّهُ رِزْقَهُ إِلَى ثَدْيَيْ أُمِّهِ حَتَّى لَا يَطْلُبَ وَلَا يَحْزَنَ وَلَا يَغْتَمَّ، ثُمَّ يَصِيرُ طِفْلًا يَتَنَاوَلُ الشَّيْءَ بِكَفِّهِ فَيَأْكُلُهُ، فَإِذَا هُوَ بَلَغَ قَالَ: هُوَ الْمَوْتُ أَوِ الْقَتْلُ، أَنَّى لِي بِالرِّزْقِ؟ فَيَقُولُ مَكْحُولٌ: يَا

وَيْلَكَ! غَذَاكَ وَأَنْتَ فِي بَطْنِ أُمِّكَ، وَأَنْتَ طِفْلٌ صَغِيرٌ، حَتَّى إِذَا اشْتَدَدْتَ وَعَقَلْتَ قُلْتَ: هُوَ الْمَوْتُ أَوِ الْقَتْلُ، أَنَّى لِي بِالرِّزْقِ؟

بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں بالکل بے غم، بے کھٹکے اور با آرام ہوتا ہے۔ اس کی ماں کے حیض کا خون اس کی غذا ہوتا ہے، جو بے طلب آرام اسے پہنچتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ ماں کو ان دنوں حیض نہیں آتا۔ پھر جب بچہ پیدا ہوتا ہے زمین پر آتے ہی روتا چلاتا ہے، اس انجان جگہ سے اسے وحشت ہوتی ہے، جب اس کی نال کٹ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی روزی ماں کے سینے میں پہنچا دیتا ہے اور اب بھی بے طلب، بے جستجو، بے رنج و غم، بے فکری کے ساتھ اسے روزی ملتی رہتی ہے۔ پھر ذرا بڑا ہوتا ہے اپنے ہاتھوں کھانے پینے لگتا ہے۔ لیکن بالغ ہوتے ہی روزی کے لئے ہائے ہائے کرنے لگتا ہے۔ موت اور قتل تک سے روزی حاصل ہونے کا امکان ہو تو پس و پیش نہیں کرتا۔ افسوس اے ابن آدم! تجھ پر حیرت ہے جس نے تجھے تیری ماں کے پیٹ میں روزی دی، جس نے تجھے تیری ماں کی گود میں روزی دی جس نے تجھے بچے سے بالغ بنانے تک روزی دی۔ اب تو بالغ اور عقل مند ہو کر یہ کہنے لگا کہ ہائے کہاں سے کھاؤں گا؟ موت ہو یا قتل ہو؟ پھر آپ نے یہی آیت پڑھی۔ ہر چیز اس کے پاس اندازے کے ساتھ موجود ہے رزق اجل سب مقرر شدہ ہے۔

نبی کریم ﷺ کی ایک صاحبزادی صاحبہ نے آپ کے پاس آدمی بھیجا کہ میرا بچہ آخری حالت میں ہے، آپ کا تشریف لانا میرے لئے خوشی کا باعث ہے۔ آپ نے فرمایا إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ، وَلَهُ مَا أَعْطَى، وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُسَمًّى، فَمُرُوهَا فَلْتَصْبِرْ وَلِتَحْتَسِبْ بے شک اللہ ہی کے لیے جو اس نے لے لیا، اسی کا ہے جو اس نے دیا، ہر چیز اس کے ہاں ایک وقت مقررہ تک ہے، اسے کہو کہ صبر کرے اور اللہ سے ثواب کی امید رکھے۔

اللہ تعالیٰ کی شان اور قدرت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ{۹}سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ{۱۰}لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ {۱۱}هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ{۱۲}وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ{۱۳}لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ {۱۴}الرعد.

جواب ترجمہ: پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے سب سے بڑا بلند مرتبہ ہے۔ تم میں سے جو شخص کوئی بات چپکے سے کہے یا پکار کر کہے اور جو شخص رات میں کہیں چھپ جائے یا دن میں چلے پھرے یہ سب برابر ہیں۔ ہر شخص کی حفاظت کے لیے کچھ فرشتے ہیں اس کے آگے اور پیچھے اللہ کے حکم سے اس کی نگہبانی کرتے ہیں بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے اور جب اللہ کسی قوم کی برائی چاہتا ہے پھر اسے کوئی نہیں روک سکتا اور اس کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔ وہی ہے جو تمہیں خوف یا امید دلانے کے لیے بجلی دکھاتا اور بھاری بادلوں کو اٹھاتا ہے۔ اور رعد اس کی پاکی کے ساتھ اس کی تعریف کرتا ہے اور سب فرشتے اس کے ڈر سے اور بجلیاں بھیجتا ہے پھر انھیں جس پر چاہتا ہے گرا دیتا ہے اور یہ تو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں حالانکہ وہ بڑی قوت والا ہے۔ اسی کو پکارنا بجا ہے اور اس کے سوا جن لوگوں کو پکارتے ہیں وہ ان کے کچھ بھی کام نہیں آتے مگر جیسا کوئی پانی کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے کہ اس کے منہ میں آجائے حالانکہ وہ اس کے منہ تک نہیں پہنچتا اور کافروں کی جتنی پکار ہے سب گمراہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جو آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہیں، جو دکھائی دیتی ہیں ان کو بھی جانتا ہے، وہ اپنی ذات واپنی صفات میں بہت ہی بڑا ہے، وہ اپنی تمام مخلوقات پر اپنی ذات، اپنی قدرت اور اپنے غلبے کے لحاظ سے بہت ہی بلند ہے، کوئی اونچا بولے یا آہستہ بولے اس کے لیے برابر ہے، رات کی تاریکی میں کوئی اپنے کارنامے چھپائے، یا دن کے اجالے میں ظاہر کرے اس کے لیے برابر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق فرشتے بھی ہیں، جو انسانوں کی آگے پیچھے سے حفاظت کرتے ہیں، اس سے جو خیر اور شر کی باتیں صادر ہوتی ہیں ان کی حفاظت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو نعمتوں سے سرشار اور مالامال کرتا ہے تو ان میں تغیر و تبدیلی اس وقت تک نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود ہی اس کی نافرمانی کرکے اس میں تبدیلی نہ کرلیں، جب اللہ کسی جماعت کو آزمائش اور امتحان میں ڈالنے کا فیصلہ کرلے تو اس کے لیے کوئی جائے فرار نہیں ہوتی، نہ ہی ان کے لیے اللہ کے علاوہ مددگار اور اس کے کاموں کا ذمہ دار ہوتا ہے، اللہ ہی ان کے لیے ان کی محبوب چیزیں لاتا ہے اور ان کی ناپسندیدہ چیزیں ان سے دور کرتا ہے۔

اللہ ہی ایسی ذات ہے جو انسانوں کو بجلی کی کڑک اور چمک سے اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، وہ بادلوں کے اندر سے روشنی اور نور کو چمکاتا ہے، اس وقت انسان خوف کھاتا ہے کہ کہیں جلادینے والی بجلیاں اس پر اثر نہ پڑیں، اس وقت انسان کو بارش برسنے کا لالچ بھی ہوتا ہے، پھر یہ اسی رب کی قدرت کاملہ ہوتی ہے کہ انسانی منفعت اور فوائد کے لیے بوجھل بادل بہت زیادہ پانی اٹھالاتے ہیں۔

بادلوں پر معمور رعد فرشتہ اللہ کی حمد و تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح پڑھتا ہے، اس کا یہ تسبیح پڑھنا اس بات پر دلیل ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور عاجزی اور مسکینی کا اظہار کرتا ہے۔ پھر قدرت والے کی قدرت ہے کہ وہ ہلاک کرنے والی بجلیاں دوڑاتا ہے، پھر وہ جسے چاہتا ہے ہلاک کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بچاتا ہے۔

کافر لوگ اللہ کی توحید کے بارے میں، اللہ کی مرنے کے بعد اٹھائے جانے کی طاقت پر جھگڑا کرتے ہیں، حالانکہ وہ زبردست قوت اور طاقت والی ذات ہے، وہ اپنے نافرمانوں کو پکڑنے کی سخت طاقت اور قوت رکھتا ہے، اللہ ہی کے لیے ہے توحید کی دعوت، اس کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں ہے، اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کی جاسکتی، اس کے سوا کسی کو پکارا نہیں جاسکتا، اللہ کے سوا جن معبودوں کی پوجا پاٹ کی جاتی ہے وہ اس قدر بے بس، بے کس ہیں کہ جو لوگ انہیں پکارتے ہیں وہ کسی کی دعا کو قبول نہیں کرسکتے، ان کی حالت تو اس پیاسے کی سی ہے جو دور سے اپنا ہاتھ پانی کی طرف پھیلاتا ہے تاکہ پانی اس کے منہ تک پہنچ جائے، مگر دور سے پانی کسی کے منہ میں داخل نہیں ہوجاتا، ایسے ہی یہ مشرک اللہ کے سوا دوسروں کو گو پکاریں لیکن رہیں گے محروم ہی دین دنیا کا کوئی فائدہ انہیں نہ پہنچے گا۔ ان کی پکار بے سود ہے۔

اللہ کی طاقت اور عظمت

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ {۱۵} الرعد

جواب ترجمہ: اور جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی سے یا زبردستی سے خدا کے آگے سجدہ کرتی ہے۔ اور ان کے سامنے بھی صبح وشام (سجدے کرتے) ہیں۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت کا بیان ہے کہ ہر چیز پر اس کا غلبہ ہے اور ہر چیز اس کے ما تحت اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہے، چاہے مومنوں کی طرح خوشی سے کریں یا مشرکوں کی طرح ناخوشی سے۔ اور ان کے سائے بھی صبح وشام سجدہ کرتے ہیں۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ (النحل:۴۸) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے جو چیز بھی پیدا کی ہے ان کے سائے

داہنے اور بائیں سے اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے ڈھلتے ہیں اور وہ عاجزی کرتے ہیں۔

اس سجدے کی کیفیت کیا ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے یا دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ کافر سمیت تمام مخلوق اللہ کے حکم کے تابع ہے کسی میں اس سے سرتابی کی مجال نہیں اللہ تعالیٰ کسی کو صحت دے بیمار کرے غنی کر دے یا فقیر بنا دے زندگی دے یا موت سے ہمکنار کرے ان تکوینی احکام میں کسی کافر کو بھی مجال انکار نہیں۔ (تفسیر مکہ)

توحید ربانی اور تمثیل حق و باطل

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ {۱۶} اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ {۱۷} الرعد

جواب ترجمہ: اے میرے حبیب ﷺ! آپ سوال کیجئے کہ آسمانوں کا اور زمینوں کا رب کون ہے؟ میرے حبیب ﷺ آپ جواب دے دیجئے کہ اللہ ہے۔ آپ سوال کیجئے کیا تم لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے مددگار تجویز کر رکھے ہیں جو اپنی جانوں کے لیے نفع اور ضرر کے مالک نہیں ہیں؟ آپ سوال کیجئے کہ نابینا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا اندھیریاں اور روشنی برابر ہو سکتی ہیں کیا یہ بات ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کے لیے شریک تجویز کئے ہیں جنہوں نے کوئی چیز پیدا کی ہو جیسے کہ اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے ان پر مخلوق میں اشتباہ پیدا ہو گیا ہو۔ آپ فرما دیجئے اللہ ہر چیز کا پیدا فرمانے والا

ہے اور وہ تنہا ہے غالب ہے۔ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا پھر نالے اپنی مقدار کے موافق بہنے لگے پھر بہتے ہوئے پانی نے اپنے اوپر جھاگ کو اٹھایا جو پانی پر بلند ہے اور جن چیزوں کو آگ میں ڈال کر اوپر سے جلاتے ہیں تاکہ زیور یا کوئی دوسری نفع کی چیز حاصل کریں اس میں بھی اسی طرح کی جھاگ ہے اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے۔ سو جو جھاگ ہے وہ تو بے فائدہ ہو کر چلا جاتا ہے اور جو لوگوں کو نفع دیتا ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتا ہے اللہ تعالیٰ ایسے ہی مثالیں بیان فرماتا ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ: ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اے میرے حبیب ﷺ! ان مشرکین سے دریافت کیجیے جو اللہ کے سوا دوسروں کو معبود ٹھہراتے ہیں کہ بتاؤ، آسمانوں اور زمین کا خالق اور ان کے نظام کا مدبر کون ہے؟ جب آپ ان سے یہ سوال کریں گے تو وہ خود بھی اس حقیقت کا انکار نہ کر سکیں گے کہ ان سب کا پیدا کرنے والا اور سنبھالنے والا صرف اللہ ہی ہے، پس آپ صاف کہہ دیجیے کہ اللہ ہی ان کا خالق و مدبر ہے۔

قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا: جب وہ اس امر کا اقرار رکھتے ہیں تو پھر ان سے پوچھیے کہ کیا تم نے اللہ کو چھوڑ کر ایسے کارساز اور حمایتی بنا رکھے ہیں جو اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع کے حصول یا ضرر کے ازالے کی قدرت نہیں رکھتے؟ جو اپنے آپ کو نفع نہ پہنچا سکیں اور اپنی مصیبت کو ٹال نہ سکیں، وہ دوسروں کے لیے کیا تدبیر کر سکتے ہیں؟ یہ سوال دراصل ان کے عقیدے کی کمزوری اور بے بنیاد ہونے کو نمایاں کرتا ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ: پھر ان کے سامنے ایک اور واضح تمثیل رکھی جاتی ہے کہ کیا اندھا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا وہ شخص جو بصیرتِ قلب سے محروم ہے اور راہِ حق کو نہیں پہچانتا، اس کے مساوی ہو سکتا ہے جو ایمان کی روشنی میں ہدایت یافتہ ہے؟ اسی طرح کیا ظلمت اور نور یکساں ہو سکتے ہیں؟ کفر تو تاریکیوں کا مجموعہ ہے اور ایمان سراسر نور ہے، جب نور اور ظلمت میں مساوات ممکن نہیں تو ایمان اور کفر میں برابری کیسی؟

أَمْ جَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ: مزید برآں، اگر یہ لوگ اللہ کے لیے شریک ٹھہراتے ہیں تو کیا ان کے وہ خود ساختہ معبود بھی کسی شے کے خالق ہیں؟ کیا انہوں نے بھی اللہ کی مخلوق جیسی کوئی مخلوق پیدا کی ہے کہ خالقِ حقیقی اور ان کے گھڑے ہوئے معبودوں کی تخلیق میں امتیاز باقی نہ رہا ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں، تخلیق کا شرف اور قدرت صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے لیے ہے۔

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ: پس اعلان کر دیجیے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے، وہ یکتا ہے، اس کی اُلوہیت میں کوئی شریک نہیں، وہی عبادت کے لائق ہے اور وہی سب پر غالب آنے والا، قہار ہے، اس کے سوا جس کو بھی پکارا جائے، وہ محض بے بسی اور بے اختیاری کا پیکر ہے۔

یہ آیت دراصل توحید کے اثبات اور شرک کی تردید میں ایک نہایت بلیغ اور عقلی استدلال پیش کرتی ہے، جس میں سوال در سوال کے ذریعے دلوں کے بند دریچے کھول دیے گئے ہیں اور انسان کو اس کے اپنے اقرار کی بنیاد پر حق کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا: ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا، یہاں "آسمان" سے مراد بلندی ہے، یعنی وہ فضا جہاں سے بادل اٹھتے اور برستے ہیں، بادلوں سے نازل ہونے والا یہ پانی پہاڑوں اور بلندیوں پر گرتا ہے، پھر ڈھلوانوں سے بہتا ہوا نشیبی مقامات میں جمع ہوتا ہے اور یوں ندیاں اور نالے رواں ہو جاتے ہیں، فرمایا: "پس وادیاں اپنے اپنے اندازے کے مطابق بہہ نکلیں" ہر وادی میں اتنا ہی پانی آیا جتنا اس کی وسعت اور گنجائش تھی، یا جتنا اس کے لیے مقدر کیا گیا تھا کہ وہ انسانوں کی معیشت، کھیتی باڑی اور مویشیوں کی ضرورت کے لیے کافی ہو، دونوں معنی باہم متعارض نہیں، بلکہ جمع ہو سکتے ہیں۔

فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا: یہ پانی جب تیزی سے بہتا ہے تو اپنے ساتھ مٹی، تنکے اور میل کچیل بھی اٹھالاتا ہے اور اس کے اوپر جھاگ کی تہہ جم جاتی ہے، اسی کو قرآن نے زَبَدًا رَّابِيًا کہا ہے، یعنی

ابھرا ہوا جھاگ، یہ جھاگ بظاہر نمایاں اور سطحِ آب پر پھیلا ہوا ہوتا ہے، مگر اس کی حقیقت محض عارضی ہے، ہوا کا ایک جھونکا اسے منتشر کر دیتا ہے اور پانی اپنی اصل صفائی کے ساتھ باقی رہتا ہے۔

وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ: اسی طرح زمین کے باطن میں اللہ تعالیٰ نے جو دھاتیں ودیعت فرمائی ہیں، جیسے سونا، چاندی، تانبہ اور لوہا انسان انہیں آگ میں تپاتا ہے تاکہ زیورات بنائے یا برتن، اوزار اور اسلحہ تیار کرے، جب یہ دھاتیں پگھلتی ہیں تو ان میں سے بھی میل اور کچرا اوپر آجاتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے پانی کے بہاؤ سے جھاگ اٹھتا ہے، یہ میل کچیل الگ ہو جاتا ہے اور خالص دھات باقی رہتی ہے، جو انسان کے لیے نافع اور کارآمد ہے۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ: یہ سب تمہید دراصل ایک عظیم حقیقت کی تمثیل ہے، اللہ تعالیٰ اسی طرح حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے، حق اس پانی اور خالص دھات کی مانند ہے جو باقی رہتی ہے، نفع پہنچاتی ہے، زمین کو سیراب کرتی ہے، کھیتیوں کو زندگی بخشتی ہے اور انسان کے لیے زینت و سامانِ حیات بنتی ہے، اس کے برعکس باطل اس جھاگ کی مانند ہے جو وقتی جوش میں ابھرتا تو ہے، مگر نہ اس میں وزن ہے، نہ بقا، آخر کار وہ کناروں پر پھینک دیا جاتا ہے یا خود ہی مٹ جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا **فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ:** ”پس جو جھاگ ہے وہ تو رَدّی ہو کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز لوگوں کو نفع دیتی ہے وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے“۔ یہاں باطل کے انجام کو نمایاں کرنے کے لیے پہلے جھاگ کا ذکر کیا گیا کہ اس کا مٹ جانا یقینی ہے اور پھر حق کی بقا کو واضح کیا گیا کہ انجام کار ٹھہراؤ، استحکام اور نفع اسی کے لیے ہے۔

اس تمثیل میں کئی جہات سے مماثلت پائی جاتی ہے: ① جھاگ اور باطل دونوں بے حقیقت اور عارضی ہیں۔ ② دونوں کا ظہور وقتی اور سطحی ہے۔ ③ دونوں کا باقی رہنا ممکن نہیں، جبکہ پانی اور خالص دھات کی طرح حق نافع، ثابت اور جوہری حقیقت رکھتا ہے۔

یہ تشبیہ محض لفظی نہیں بلکہ تمثیلی ہے، یعنی جس طرح پانی اور خالص دھات اپنی افادیت اور بقا

کے سبب اصل اور مقصود ہیں اور جھاگ محض ایک عارضی عارضہ ہے، اسی طرح حق اپنی فطری قوت اور دائمی نفع کے باعث باقی رہتا ہے اور باطل اگر کچھ دیر کے لیے ابھر بھی آئے تو انجام کار زائل ہو کر رہتا ہے۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ : ”اسی طرح اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے“۔ یعنی یہ اندازِ بیان محض ایک مثال تک محدود نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اسی اسلوب سے معانی کو واضح کرتا، حقائق کو آشکار کرتا اور اپنے بندوں کو ہدایت کی راہ دکھاتا ہے، جو دل سننے اور سمجھنے کے لیے آمادہ ہوں، ان کے لیے یہ مثالیں ایمان کی تازگی اور یقین کی پختگی کا سبب بنتی ہیں۔

اوصاف اہل ایمان اور انجام سعادت

سوال آیات مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۭ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ سُوْۗءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ {۱۸} اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ {۱۹} الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ {۲۰} وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْۗءَ الْحِسَابِ {۲۱} وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ {۲۲} جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ {۲۳} سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ ۭ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ {۲۴} الرعد.

جواب ترجمہ: جن لوگوں نے اپنے رب کی اطاعت کی ان کے لیے جنت ہے اور جن لوگوں نے اللہ کی فرمان برداری نہ کی اگر ان کیلئے وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اس جیسا اور

بھی ہو تو وہ اس سب کو اپنی جان کے بدلہ دے دیں گے یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے برا حساب ہے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ رہنے کی بری جگہ ہے۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے کیا یہ شخص اس شخص کی طرح سے ہو سکتا ہے جو اندھا ہو۔ نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور عہد کو نہیں توڑتے۔ اور جو اس چیز کو جوڑے رکھتے ہیں جس کے جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا۔ اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ اور برے حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ اور جنہوں نے اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کیلئے صبر کیا اور نمازوں کو قائم کیا اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے پوشیدہ طور پر اور ظاہری طریقے پر خرچ کیا اور حسن سلوک کے ذریعے بد سلوکی کو دفع کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے آخرت کا اچھا انجام ہے ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے۔ اور ان کے باپ دادوں اور بیویوں اور اولاد میں جو لائق ہوں گے وہ بھی ان میں داخل ہوں گے۔ اور ان پر ہر دروازہ سے فرشتے داخل ہوں گے۔ جو یوں کہیں گے کہ تم نے جو صبر کیا اس کے بدلہ تم پر سلام ہو۔ سو اس جہاں میں اچھا انجام ہے۔

لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ: ارشاد ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا، اس کی توحید کو مانا اور اس کی اطاعت قبول کی، ان کے لیے بہترین بدلہ ہے، وہ نعمتِ کبریٰ جسے جنت کہا گیا ہے۔

وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ: اس کے برعکس جنہوں نے دعوتِ حق کو ردّ کیا، اگر فرض کر لیا جائے کہ زمین بھر کی دولت اور اس کے برابر مزید سرمایہ بھی ان کے پاس ہو، تو وہ روزِ قیامت اپنے آپ کو عذاب سے چھڑانے کے لیے سب کچھ فدیہ میں دے ڈالیں، مگر اس دن کوئی فدیہ کارگر نہ ہو گا۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ: ایسے لوگوں سے ان کے تمام برے اعمال کا سخت حساب لیا جائے گا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا، وہی ان کا بچھونا اور وہی ان کی قرار گاہ۔

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَى إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ: پھر حق و باطل کے امتیاز کو ایک اور اسلوب سے واضح کیا گیا: کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ آپ پر نازل کردہ وحی سراسر حق ہے، اس کے برابر ہو سکتا ہے جو اندھا ہے؟ یہاں بینا سے مراد وہ مؤمن ہے جو بصیرتِ قلب رکھتا اور حق کو پہچانتا ہے اور اندھے سے مراد وہ منکر ہے جو دل کی آنکھ سے محروم ہے، حقیقت یہ ہے کہ نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقلِ سلیم رکھتے ہیں۔

الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ: اہلِ ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے عہد پورے کرتے ہیں، خواہ وہ عہد اللہ سے کیا ہو یا بندوں سے اور پختہ وعدوں کو نہیں توڑتے۔

وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ: وہ ان رشتوں کو جوڑتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، خصوصاً صلۂ رحمی کا اہتمام کرتے ہیں، ان کے دلوں میں اپنے رب کا ایسا خوف ہوتا ہے جو انہیں اطاعت پر آمادہ اور معصیت سے باز رکھتا ہے، وہ اس اندیشے میں رہتے ہیں کہ کہیں حساب کی باریک بینی انہیں ہلاک نہ کر دے، کیونکہ جس سے کڑی باز پرس ہوئی وہ بچ نہ سکے گا۔

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ: مزید یہ کہ وہ اللہ کی اطاعت پر صبر کرتے ہیں، اس کی تقدیر کے خوشگوار اور ناگوار دونوں پہلوؤں پر ثابت قدم رہتے ہیں، اور گناہ سے بچنے میں بھی صبر و استقامت اختیار کرتے ہیں، محض رضائے الٰہی کی طلب میں۔

وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً: وہ نماز کو پورے اہتمام اور خشوع کے ساتھ قائم کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے فرض حقوق بھی ادا کرتے ہیں اور نفلی صدقات بھی دیتے ہیں، کبھی پوشیدہ طور پر تاکہ ریا سے بچیں اور کبھی اعلانیہ تاکہ دوسرے بھی ترغیب پائیں۔

وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ: وہ برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں، دشمنی کو احسان سے پگھلا دیتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت کا انجامِ خیر مقدر ہے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ: یہ انجامِ خیر دائمی نعمتوں سے بھرپور جنتیں ہیں، جہاں وہ ہمیشہ کے لیے آسودہ رہیں گے، ان کی مسرت کا کمال یہ ہو گا کہ ان کے صالح آباؤ اجداد، ازواج اور اولاد بھی ان کے ساتھ داخل ہوں گے، تاکہ ملاقات کی خوشی مکمل ہو اور انس و محبت کی لذت بڑھ جائے اور فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس حاضر ہو کر مبارک باد پیش کریں گے۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ: فرشتے ہر دروازے سے ان پر داخل ہو کر کہیں گے :سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ، تم پر سلامتی ہو! یہ سلام اس بات کی بشارت ہو گا کہ تم اطاعت پر صبر کرنے، تقدیر کے کٹھن مرحلوں کو برداشت کرنے اور گناہوں سے بچنے کی کوشش کے سبب ہر آفت سے محفوظ ہو گئے، پس کیا ہی عمدہ ہے اس گھر کا انجام جس تک تم پہنچے!

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صحیح حدیث میں جنت کے آٹھ دروازے بیان ہوئے ہیں مطلب یہ ہے کہ ان کاملین کی تعظیم و تکریم کے لیے خدا کے پاک فرشتے ہر طرف سے تحائف و ہدایا لے کر حاضر ہوں گے۔ احادیث میں ہے کہ خلق اللہ میں سے اول وہ فقراء مہاجرین جنت میں داخل ہوں گے جو سختیوں اور لڑائیوں میں سینہ سپر ہوتے اور رخنہ بندی کے وقت کام آتے تھے۔ جو حکم ان کو ملتا ان کی تعمیل کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے۔ دنیا کی حاجتیں اور دل کے ارمان دل ہی میں لے کر یہاں سے رخصت ہو گئے۔ قیامت کے دن حق تعالیٰ فرمائے گا میرے وہ بندے کہاں ہیں (حاضر ہوں) جو میرے راستہ میں لڑے، میرے لیے تکلیفیں اٹھائیں اور جہاد کیا۔ جاؤ جنت میں بے کھٹکے داخل ہو جاؤ۔ پھر ملائکہ کو حکم ہو گا کہ میرے ان بندوں کے پاس حاضر ہو کر سلام کرو۔ وہ عرض کریں گے خداوندا! ہم تیری بہترین مخلوق ہیں کیا ہم بارگاہ قرب کے رہنے والوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان زمینی باشندوں کے پاس حاضر ہو کر سلام کریں۔ ارشاد ہو گا، ہاں یہ میرے وہ بندے ہیں جنہوں نے توحید پر جان دی، دنیا کے سب ارمان اپنے سینوں میں لے کر چلے آئے، میرے راستہ میں

جہاد کیا اور ہر تکلیف کو خوشی سے برداشت کرتے رہے۔ یہ سن کر فرشتے ہر طرف سے ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور کہیں گے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (الرعد:۲۴) حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ ہر سال آغاز میں قبور شہداء پر تشریف لے جاتے اور فرماتے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (الرعد:۲۴) یہ ہی طرز عمل ابو بکر، عمر، اور عثمان رضی اللہ عنہم کا رہا۔

عہد شکنی کا انجام، رزق کی حقیقت اور ہدایت کا راز

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ {۲۵} اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۚ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ {۲۶} وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ {۲۷} الرعد

جواب ترجمہ: اور جو لوگ مضبوط کرنے کے بعد اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں اور اللہ نے جس چیز کو جوڑنے کا حکم دیا اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے لعنت ہے اور آخرت میں بد حالی ہے۔ اور اللہ جس کیلئے چاہتا ہے رزق کشادہ فرما دیتا ہے اور جس کیلئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اور وہ لوگ دنیاوی زندگی پر اترا رہے ہیں حالانکہ دنیا والی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بس ایک ذرا سی کام آنے والی چیز ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے کیوں نازل نہیں کی گئی۔ آپ فرما دیجئے بلاشبہ اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہے اور جو اس کی طرف رجوع ہو اسے اپنی طرف راہ دکھاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ: جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوطی سے باندھ لینے

کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اُن رشتوں کو کاٹ دیتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، خواہ وہ خونی رشتے ہوں یا دینی و انسانی تعلقات، وہی درحقیقت بدبخت اور محروم لوگ ہیں، انہوں نے اپنی بداعمالی سے خود کو رحمتِ الٰہی سے دور کرلیا، ایسے لوگوں کے لیے اللہ کی رحمت سے دوری ہے اور ان کا انجام نہایت برا ہے، یعنی جہنم کی آگ، جو ان کی عہد شکنی اور فساد فی الارض کا منطقی نتیجہ ہے۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ، لیکن رزق کی فراخی نہ تو اللہ کی محبت کی قطعی دلیل ہے اور نہ اس کی تنگی محرومی و شقاوت کی علامت، یہ سب اس کی حکمت کے تابع ہے، افسوس کہ کافر دنیا کی زندگی پر اِتراتے ہیں، اسی پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اسی کو اپنی کامیابی سمجھ بیٹھتے ہیں، حالانکہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی محض ایک عارضی سامان ہے، چند روزہ متاع، جو جلد ختم ہو جانے والی ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ: اور منکرین کہتے ہیں: محمد ﷺ پر ان کے رب کی طرف سے کوئی حسی اور ظاہری معجزہ کیوں نہیں اتارا گیا جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور ایمان لے آئیں؟ اے میرے حبیب ﷺ! آپ ان سے کہہ دیجئے: ہدایت اور گمراہی کا اختیار تمہارے ہاتھ میں نہیں کہ تم اسے اپنی شرطوں سے مشروط کرو، اللہ جسے اپنے عدل کے تقاضے سے چاہتا ہے گمراہ رہنے دیتا ہے اور جو شخص اخلاص کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرے، توبہ کرے اور حق کا طالب بنے، اللہ اپنے فضل سے اسے اپنی طرف ہدایت عطا فرماتا ہے، ہدایت کا سرچشمہ آیات کا نزول نہیں، بلکہ دل کا رجوع اور طلبِ صادق ہے۔

ذکر اللہ سے دلوں کا اطمینان

سوال دلوں کو ذکر اللہ سے اطمینان ملتا ہے، اس آیت کی روشنی میں بیان کریں۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ {۲۸} الرعد.

جواب ترجمہ: وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے تسکین ہوتی ہے خبر دار! اللہ کی یاد ہی سے دل تسکین پاتے ہیں۔

یعنی دلوں میں جب ایمان ویقین ٹھکانہ بنالیتے ہیں تو شک وتردد ختم ہو جاتا ہے، ذکر سے مراد قرآن کریم کی تلاوت بھی لی جاسکتی ہے، اس سے مراد زبان سے اوراد وظائف بھی لیے جاسکتے ہیں، جو پیران طریقت اپنے مریدین کی قلبی صفائی کے لیے انہیں تلقین کرتے ہیں، جو روایات میں مذکور ہیں۔

ایمان باعث اطمینان ہے اور نفاق شک وریب ہے، اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کے دل سے شیطانی وساوس اللہ کے ذکر کی وجہ سے ختم ہو جاتے ہیں۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر آدمی کے دل میں دو گھر ہوتے ہیں، ایک میں فرشتہ رہتا ہے اور دوسرے میں شیطان رہتا ہے، جب وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان چھپ جاتا ہے، جب وہ اللہ کا ذکر نہیں کرتا تو شیطان اپنی چونچ اس کے دل پر رکھ کر اس میں وسوسے ڈالتا ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، بخاری نے تعلیقاً یہ روایت نقل کی ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک مرفوع روایت میں بھی اسی روایت کے مفہوم کی طرح ہے کہ جب ابن آدم ذکر کرتا ہے تو شیطان چھپ جاتا ہے اور جب ابن آدم غافل ہوتا ہے تو شیطان وسوسے ڈالتا ہے۔

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کے دل صاف وشفاف ہوتے ہیں، مگر ان میں طاقت اور قوت اللہ تعالیٰ کے ذکر سے آتی ہے، جب بندے اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے دل اللہ کے ساتھ محبت وانس کی وجہ سے اطمینان پاتے ہیں، جیسے مچھلی کو پانی میں سکون ملتا ہے، خشکی کے جانور کو ہوا میں اطمینان، قرار اور سکون ملتا ہے، وحشی جانور کو صحراء میں سکون ملتا ہے، جب انہیں غافل کر دینے والے غافل کر دیں یا اہل غفلت کی صحبت میں رہیں تو پھر ان کے دلوں میں بے چینی، بے قرار، بے سکونی اور بے اطمینانی کی لہر دوڑ جاتی ہے، جیسے مچھلی کو پانی سے باہر نکالا جائے تو تڑپ اٹھتی ہے، تڑپ کر جان دے جاتی ہے، خشکی کے جانور کو پانی میں پریشانی لاحق ہو جاتی ہے، وحشی جانور کو پنجرے میں

بے چینی لاحق ہو جاتی ہے، اسی طرح بڑے بڑے اصفیاء کے خدام اور مریدین کو ذکر اللہ سے سکون و قرار ملتا ہے، لذت حاصل ہوتی ہے، حلاوت ملتی ہے، ذکر کی مٹھاس وہ محسوس کرتے ہیں، جس طرح صوفیاء کرام ذکر کرتے ہیں، جس طرح انہیں قرار و سکون ملتا ہے تو اسے دیکھ کر محسوس کر کے یوں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آیت ایسے ہی ذاکرین کے لیے نازل ہوئی ہے، جن کے دل یاد الٰہی میں مست و مگن ہو کر مطمئن ہوتے ہیں، بعض اہل تفسیر یہاں تک لکھتے ہیں کہ اس سے مراد وہ دل اطمینان حاصل کرتے ہیں جن کا تزکیہ ہو چکا ہوتا ہے۔

ان اصفیاء کی پھر یہ صورت ہو جاتی ہے کہ وہ ہمہ وقت زبان حال و قال سے کہتے ہیں

اب تو رہے بس تا دم آخر وِردِ زبان اے میرے اِلٰہ
لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ
یاد میں تیری سب کو بھلا دوں کوئی نہ مجھ کو یاد رہے
تجھ پر سب گھر بار لٹا دوں خانۂ دل آباد رہے
سب خوشیوں کو آگ لگا دوں غم سے تیرے دلشاد رہے
سب کو نظر سے اپنی گرا دوں تجھ سے فقط فریاد رہے

جب وہ اپنے آقا اور مولا اللہ جل جلالہ کا نام لیتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں

اللہ اللہ کیسا پیارا نام ہے — عاشقوں کا مینا اور جام ہے
اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام — شیر و شکر می شود جانم تمام
نعرۂ مستانہ خوش می آیدم — تا ابد جاناں چنیں می بائیدم

پھر یہ مستانہ وار کہتا ہے

مٹا دے اپنی ہستی کو چھوڑ دے ساری مستی کو — بستی بستی کہتا جا اللہ، اللہ، اللہ، اللہ، اللہ

یہی وہ مردان نیک اطوار ہیں جن کے بارے میں اللہ نے دوسرے مقام پر فرمایا کہ اہل ایمان تو وہ ہیں جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، یہاں فرمایا کہ ان کے دل اطمینان و قرار حاصل کرتے ہیں، ڈرتے اس وقت ہیں جب سزا اور عذاب کا ذکر کیا جاتا ہے اور اطمینان اس وقت حاصل کرتے ہیں جب اللہ جزا اور ثواب کا ذکر کرتے ہیں۔

بعض روایات کے مطابق اس سے مراد حضرت نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس ہے اور ان کے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر در منثور میں ایسی روایات اس مقام پر ذکر کی ہیں جس میں نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو متوجہ فرما کر ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد تم لوگ ہو۔ (تفسیر در منثور) حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر سے مراد قرآن کریم لیا ہے، جب کہ سکون یقین کرنے سے آتا ہے، بے سکونی اور بے قراری شک وریب سے آتی ہے۔ (بغوی)

شیخ قطب الدین دمشقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ذکر کے لیے چند آداب اور شرائط ہیں جن کی رعایت ضروری ہے، تاکہ اس سے برکات کے ثمرات اور نتائج پیدا ہوں، ان شرائط میں سے یہ ہے کہ بہترین ذکر یعنی نفی واثبات لا الہ الا اللہ پر ہمیشگی کرے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تقویٰ اور قول سدید اختیار کرنے کی تلقین فرمائی، اہل تفسیر نے قول سدید سے مراد کلمہ طیبہ لیا ہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ لا الہ الا اللہ کہو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا کہ تم اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہاری راہنمائی کی ہے، اللہ نے ذاکرین کو ذکر کرنے کی راہنمائی کی تو انہیں اسی طرح ذکر کرنا چاہیے، زبانی بھی ذکر کریں اور حروف وآواز کے ساتھ بھی ذکر کریں، ایسے انداز میں کریں کہ دل غافل نہ ہو، اس کے بعد ذکر نفس ہے یعنی دل میں حروف نفسی کا اس طرح سوچنا کہ نفس سن لے، پھر ذکر قلب ہے یعنی دل کا ملاحظہ ہو جو غفلت ونسیان کی ضد ہے، اس کے بعد ایک طریقہ ذکر سری ہے اور یہ اسرار الٰہی کے مکاشفہ کے لیے مراقبہ ہوتا ہے، اس کے بعد ایک طریقہ ذکر روح کا ہے، صفات پاک کی تجلیات اور انوار کے

مشاہدہ کا نام ہے اس کے بعد ذکر خفی ہے جو کہ جمال ذات کے انوار کا معائنہ ہے۔

علامہ قطب الدین دمشقی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ طالب حق کو رضا و سرور وغیرہ آداب و شرائط پر قائم رہنا اور شیخ کی تلقین کے بغیر پوری مضبوطی کے ساتھ ذکر پر مواظبت رکھنا ضروری ہے، تاکہ ذکر کا اثر باطن میں جاوے اور پٹھوں میں سرایت کرے اور وجود کی ظلمت و کثافت و کدورت ذکر کی آگ سے جل جاوے اور ذکر کے نور سے دل کو قرار حاصل ہو، کیونکہ ذکر میں نور اور نار دونوں ہیں کہ اس کے نور سے دل کو تو ٹھنڈک و سکون پہنچتا ہے اور اس کی نار سے بشری اور وجودی کثافتیں جلتی اور اصلی خشونت و طبعی یبوست دور ہو جاتی ہے۔

یہاں تک کہ آثار بشریت سے نکل کر خاکی بوجھوں سے ہلکا ہو کر اپنے قلوب سے ملکوتی میدان کو بھی عبور کر کے ربوبیت اعلیٰ کے آسمان پر جا پہنچتا ہے اور ذکر کی پوری اور بڑی تاثیر اس وقت ہوتی ہے جب کہ خلوت خانۂ تنگ ہو لوگوں سے اور تمام مشاغل سے خالی ہو، کیونکہ لوگوں کا دیکھنا اور ان کی باتوں کا سننا بھی مشغول کرنے والا ہے اور جگہ تنگ ہو اور ہمت جمع کر کے ذکر میں بہت مبالغہ کرے۔

چنانچہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لا الہ الا اللہ کا اتنی کثرت سے ذکر کرو کہ لوگ دیوانہ کہنے لگیں اور صدق و اخلاص سے اللہ تعالیٰ کے ذکر کی علامت قلب کی رقت اور خوف ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے مومنین وہ ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور یہ اس وجہ سے کہ ان کا ذکر عبودیت اور عبادت کا ذکر اور بیداری و جمعیت و انس کا ذکر ہوتا ہے نہ کہ عادت یا غفلت اور تفرقہ و وحشت کا ذکر اور ذاکر کو یہ اوصاف حسنہ اس وجہ سے حاصل ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ اس ذکر کرنے والے کو اپنی عنایت و مہربانی سے ملائکہ مقربین کی جماعت میں فخر کے ساتھ یاد فرماتے ہیں۔ (رسالہ مکیہ)

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کا ذکر جہاد اور صدقات اور خیرات سب سے افضل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ سے بہتر کوئی عمل نہیں ہے، ذکر الٰہی کے

لیے ایک مغز اور تین پوست ہیں اور مغز تو مقصود بالذات ہے، مگر پوست اس لیے مقصود اور محبوب ہیں کہ وہ مغز تک پہنچنے کے ذرائع اور اسباب ہیں۔

پہلا پوست صرف زبان سے ذکر کرنا ہے۔ دوسرا پوست قلب سے ذکر کرنا اور جبراً بہ تکلف اس کا خوگر ہونا ہے، یاد رکھو کہ قلب کو اپنی حالت پر چھوڑنا نہ چاہیے کیونکہ اس کو تفکرات اور تخیلات میں پڑنے سے پریشانی ہوتی ہے، لہٰذا مناسب ہے کہ اس کی مرغوب شے یعنی ذکر الٰہی اس کے حوالہ کر دی جائے تاکہ اس کو اطمینان حاصل ہو جائے۔

تیسرا پوست یہ ہے کہ ذکر الٰہی قلب میں جگہ کرلے اور ایسا گڑ جائے کہ اس کا چھڑانا دشوار ہو جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے درجہ میں جس طرح قلب کو ذکر کی عادت ڈالنے میں دقت پیش آئی ہوئی ہوتی ہے، اس تیسرے درجے میں قلب سے ذکر اللہ کی عادت چھڑانا اس سے زیادہ دشوار ہو۔ (تبلیغ دین)

اہل ایمان کی سعادت دائمی اور حقانیت رسالت محمدیہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ {۲۹} كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ {۳۰} الرعد

جواب ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کیلئے خوشحالی ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔ اسی طرح ہم نے آپ کو ایسی امت میں بھیجا جس سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں تاکہ آپ انہیں وہ چیز پڑھ کر سنائیں جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے۔ اور وہ رحمٰن کے منکر ہو رہے ہیں۔ آپ فرما دیجئے وہ میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے اس پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میرا رجوع ہونا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوۡبٰی لَهُمۡ وَحُسۡنُ مَاٰبٍ: جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور ایسے نیک اعمال اختیار کیے جو انہیں اپنے رب کے قریب کر دیں، ان کے لیے خوش خبری ہے، ان کے حصے میں آخرت کی پاکیزہ اور خوشگوار زندگی ہے، ایسی زندگی جس میں نہ رنج ہو گا نہ زوال، ان کا انجام نہایت حسین ہے اور وہ ہے جنت، جہاں راحت ہی راحت ہے اور ربِّ کریم کی رضا ان کی سب سے بڑی نعمت ہو گی۔

كَذٰلِكَ اَرۡسَلۡنٰكَ فِیۡۤ اُمَّةٍ قَدۡ خَلَتۡ: اور جس طرح ہم نے آپ سے پہلے رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا، اسی طرح، اے میرے حبیب ﷺ! ہم نے آپ کو آپ کی امت کی طرف مبعوث فرمایا ہے، تاکہ آپ ان پر وہ قرآن پڑھ کر سنائیں جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے، یہی قرآن آپ کی صداقت کی روشن دلیل ہے، اس کی فصاحت، اس کی حکمت اور اس کا پیغام خود گواہی دیتا ہے کہ یہ کلام بشر نہیں، کلامِ ربّانی ہے۔

وَهُمۡ يَكۡفُرُوۡنَ بِالرَّحۡمٰنِ: لیکن آپ کی قوم کا حال یہ ہے کہ وہ اس عظیم نشانی کا انکار کرتی ہے، کیونکہ وہ "الرحمٰن" کے منکر ہیں، اسی ذات کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو سراسر رحمت ہے، آپ ان سے فرما دیجئے: وہی رحمٰن میرا رب ہے، جس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، میں نے اپنے تمام معاملات میں اسی پر بھروسا کیا ہے اور میری بازگشت، میری توبہ اور میرا رجوع بھی اسی کی طرف ہے۔

یہ اعلانِ توحید دراصل ہر دل کے لیے پیغام ہے کہ اصل سہارا، اصل امید اور اصل کامیابی اسی ایک رب سے وابستہ ہے، جو اسی کی طرف جھکتا ہے، وہی سکون پاتا ہے اور جو اسی پر توکل کرتا ہے، وہی سرخرو ہوتا ہے۔

کافروں کے مطالبات اور قرآن کا جواب

سوال اس آیت مبارکہ کا شانِ نزول کیا ہے؟ نیز آیت کی تفسیر کیجیے

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ {۳۱} الرعد.

جواب ترجمہ: اور اگر قرآن ایسا ہوتا جس کی وجہ سے پہاڑ چلا دیئے جاتے یا اس کے ذریعہ زمین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتے یا اس کے ذریعہ مردوں سے بات کرا دی جاتی تب بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ بلکہ تمام امور اللہ ہی کے لیے ہیں۔ کیا اہل ایمان ناامید نہیں ہوئے حالانکہ یہ جانتے ہیں کہ اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال بد کی وجہ سے انہیں برابر کوئی نہ کوئی مصیبت پہنچتی رہے گی یا ان کے مکانوں کے قریب مصیبت نازل ہو جائے گی یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آجائے بلاشبہ اللہ وعدہ خلافی نہیں فرماتا۔

مشرکین مکہ کے سامنے اسلام کی حقانیت کے واضح دلائل اور رسول کریم ﷺ کے سچے رسول ہونے کی کھلی ہوئی نشانیاں آپ کی زندگی کے ہر شعبہ سے پھر حیرت انگیز معجزات سے پوری طرح روشن ہو چکی تھیں اور ان کا سردار ابو جہل یہ کہہ چکا تھا کہ بنو ہاشم سے ہمارا خاندانی مقابلہ ہے ہم ان کی اس برتری کو کیسے قبول کر لیں کہ خدا کا رسول کریم ﷺ ان میں سے آیا اس لئے وہ کچھ بھی کہیں اور کیسی ہی نشانیاں دکھلائیں ہم ان پر کسی حال ایمان نہیں لائیں گے اسی لئے وہ ہر موقع پر اس ضد کا مظاہرہ لغو قسم کے سوالات اور فرمائشوں کے ذریعہ کیا کرتے تھے آیات مذکورہ بھی ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کے ایک سوال کے جواب میں نازل ہوئی ہیں تفسیر بغوی میں ہے کہ مشرکین مکہ جن میں ابو جہل بن ہشام اور عبد اللہ ابن امیہ کو رسول کریم ﷺ کے پاس بھیجا اس نے کہا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی قوم اور ہم سب آپ کو رسول تسلیم کر لیں اور آپ کی پیروی کریں تو ہمارے چند مطالبات ہیں اپنے قرآن کے ذریعہ ان کو پورا کر دیجئے تو ہم سب اسلام قبول کر لیں گے۔

مطالبات میں ایک تو یہ تھا کہ شہر مکہ کی زمین بڑی تنگ ہے سب طرف پہاڑوں سے گھری ایک طولانی زمین ہے جس میں نہ کاشت اور زراعت کی گنجائش ہے نہ باغات اور دوسری ضروریات کی آپ معجزہ کے ذریعہ ان پہاڑوں کو دور ہٹا دیجئے تاکہ مکہ کی زمین فراخ ہو جائے آخر آپ ہی کے کہنے کے مطابق داؤد علیہ السلام کے لئے پہاڑ مسخر کر دیئے گئے تھے جب وہ تسبیح پڑھتے تو پہاڑ بھی ساتھ ساتھ تسبیح کرتے تھے آپ اپنے قول کے مطابق اللہ کے نزدیک داؤد علیہ السلام سے کمتر تو نہیں ہیں۔

دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ جس طرح سلیمان علیہ السلام کے لئے آپ کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہوا کو مسخر کر کے زمین کے بڑے بڑے فاصلوں کو مختصر کر دیا تھا آپ بھی ہمارے لئے ایسا ہی کر دیں کہ ہمیں شام و یمن وغیرہ کے سفر آسان ہو جائیں۔

تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ جس طرح عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کر دیتے تھے آپ ان سے کچھ کم تو نہیں آپ بھی ہمارے لئے ہمارے دادا قصی کو زندہ کر دیجئے تاکہ ہم ان سے یہ دریافت کر سکیں کہ آپ کا دین سچا ہے یا نہیں (مظہری بحوالہ بغوی وابن ابی حاتم وابن مردویہ)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم نبی کے گرد ہی تھے کہ ان پر وحی نازل ہوئی جب آپ پر وحی کی کیفیت جاتی رہی تو آپ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اللہ نے مجھے ان باتوں کا اختیار دیا جن کا تم نے مطالبہ کیا ہے اگر میں چاہوں تو ایسا ہو سکتا ہے لیکن اللہ نے مجھے اختیار دیا ہے کہ تم رحمت کے دروازے میں داخل ہو جاؤ اور تم میں سے ایمان لانے والا ایمان لائے یا تمہیں وہ کچھ دیا جائے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو اور باب رحمت اختیار کیا کہ تم میں سے ایمان لانے والا برضا و رغبت ایمان لائے مجھے اللہ نے مطلع کیا کہ اگر تمہیں تمہاری مطلوبہ باتیں عطا کر دی جائیں پھر تم کفر کرو تو وہ تمہیں ایسا عذاب دے گا کہ دنیا کے کسی شخص کو ایسا عذاب نہ دے اس پر یہ آیت نازل ہوئی، وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّآ اَنْ کَذَّبَ۔ آپ نے تین آیات تک وحی کو پڑھا پھر یہ آیت نازل ہوئی وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ

تمسخرِ رسالت کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ {۳۲} اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ قُلْ سَمُّوْهُمْ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ {۳۳} لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ {۳۴} الرعد

جواب ترجمہ: اور بہت سے پیغمبر جو آپ سے پہلے گزر چکے ہیں بلاشبہ ان کا مذاق بنایا گیا پھر میں نے ان لوگوں کو مہلت دی جنہوں نے کفر کیا۔ پھر میں نے ان کو پکڑ لیا سو میرا عذاب دینا کیسا تھا؟ سو جو ذات ہر شخص کے اعمال پر مطلع ہو کیا اس کے برابر وہ ہو سکتا ہے جس کی یہ صفت نہ ہو۔ لوگوں نے اللہ کیلئے شریک تجویز کر لیے آپ فرما دیجئے کہ تم ان کے نام لو کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ زمین میں نہیں جانتا یا محض ظاہری لفظ کے اعتبار سے۔ بلکہ کافروں کیلئے ان کا مکر مزین کر دیا گیا اور وہ لوگ راستہ سے روک دیئے گئے۔ اور اللہ جسے گمراہ کرے سو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ ان کے لیے دنیا والی زندگی میں عذاب ہے اور البتہ آخرت کا عذاب بہت زیادہ سخت ہے۔ اور انہیں کوئی اللہ سے بچانے والا نہیں۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ: یہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ کسی رسول کو جھٹلایا گیا ہو اور اس کا مذاق اڑایا گیا ہو، اے میرے حبیب ﷺ! آپ سے پہلے بھی کتنی ہی قوموں نے اپنے انبیاء کا استہزا کیا، ان کی دعوت کو ٹھٹھوں میں اڑایا اور حق کو جھٹلانے میں حد سے گزر گئیں، اللہ تعالیٰ نے فوراً گرفت نہ کی، انہیں مہلت دی، ڈھیل دی، یہاں تک کہ وہ اپنے باطل اطمینان میں یہ گمان کرنے لگے کہ شاید اب کوئی عذاب نہیں آئے گا، شاید یہ تنبیہات محض

الفاظ ہیں، مگر جب سرکشی حد سے بڑھ گئی تو اچانک عذاب نے آلیا، وہ پکڑے گئے، ایسی گرفت کہ ان کی قوتیں ریزہ ریزہ ہو گئیں اور ان کا غرور خاک میں مل گیا، پس دیکھیے! اللہ کا عذاب کیسا ہوتا ہے، سخت، فیصلہ کن اور عبرت آفریں۔

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ: پھر عقل سے سوال کیا گیا: کیا وہ ذات جو ہر مخلوق کی روزی کی کفیل ہے، جو ہر جان کے ہر عمل پر نگہبان ہے، جو ذرّہ ذرّہ کا حساب رکھتی اور ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ دیتی ہے، کیا وہ عبادت کی زیادہ مستحق نہیں؟ یا وہ بے جان بت، جن کے پاس نہ اختیار ہے، نہ علم، نہ قدرت؟ کفار نے محض ظلم اور جھوٹ کے سہارے انہیں اللہ کا شریک ٹھہرایا، چیلنج دیا گیا، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ان شریکوں کے نام بتاؤ! کیا تم اللہ کو ایسی ہستیوں کی خبر دے رہے ہو جن کا اسے علم ہی نہیں؟ یا یہ سب محض لفظی شعبدہ بازی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں؟

بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ: حقیقت یہ ہے کہ شیطان نے ان کے باطل منصوبوں کو خوش نما بنا دیا، اس نے کفر کو ان کی نگاہ میں سجا دیا اور انہیں سیدھی راہ سے ہٹا دیا اور جسے اللہ گمراہی پر چھوڑ دے، اسے راہ دکھانے والا کوئی نہیں۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَقُّ: ان کے لیے دنیا میں بھی عذاب ہے، قتل، اسیری اور رسوائی کی صورت میں اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں زیادہ سخت اور دائمی ہے، وہاں نہ مہلت ہو گی، نہ فرار کی کوئی سبیل، قیامت کے دن انہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی محافظ نہ ہو گا۔

یہ آیات ایک واضح پیغام دیتی ہیں: تمسخر اور انکار وقتی نشہ تو دے سکتے ہیں، مگر انجام ہمیشہ حق کے حق میں اور باطل کے خلاف فیصلہ سناتا ہے، جو ربِّ کائنات کا منکر ہے، وہ اپنی ہی تباہی کی بنیاد رکھتا ہے اور جو اس کی توحید کو تھام لیتا ہے، وہی حقیقی امان پاتا ہے۔

جنت کیسی ہو گی؟

سوال جنت کیسی ہو گی؟ اس آیت کریمہ کی روشنی میں بتایئے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ {۳۵} الرعد

جواب ترجمہ: اس جنت کا حال جس کا پرہیز گاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے نیچے نہریں بہتی ہیں جس کے میوے اور سائے ہمیشہ رہیں گے یہ پرہیز گاروں کا انجام ہے اور کافروں کا انجام آگ ہے۔

وہ جنت جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پرہیز گار بندوں سے فرمایا ہے، ان لوگوں سے جو اس کے احکام کی تعمیل کرتے اور اس کی نافرمانیوں سے دامن بچاتے ہیں، اس کی شان یہ ہے کہ اس کے محلات اور سرسبز درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہیں، پانی کی روانی، سبزہ کی تازگی اور فضاؤں کی طراوت وہاں کی فضا کو ہمیشہ زندہ رکھتی ہے۔

اس جنت کے پھل دنیا کے پھلوں کی مانند عارضی نہیں، نہ وہ موسم کے محتاج ہیں، نہ فنا کے شکار، وہاں کی نعمتیں دائمی ہیں، ان کا ذائقہ کم نہیں ہوتا، ان کی بہار ماند نہیں پڑتی، اسی طرح اس کا سایہ بھی ہمیشگی کا سایہ ہے، نہ ڈھلنے والا، نہ سکڑنے والا، ایک ایسا سکون جو کبھی زوال نہ دیکھے۔

یہ ہے انجام اُن لوگوں کا جنھوں نے تقویٰ کی راہ اختیار کی، اوامرِ الٰہی کو حرزِ جاں بنایا اور نواہی سے اپنے قدم روک لیے، اس کے برعکس جنھوں نے کفر کی راہ اپنائی، ان کا ٹھکانا آگ ہے، وہ اس میں داخل ہوں گے اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

یہ آیت گویا دو راستوں کا آخری منظر پیش کرتی ہے، ایک راستہ اطاعت و تقویٰ کا، جس کا اختتام ابدی راحت اور سرمدی نعمتوں پر ہوتا ہے اور دوسرا انکار و سرکشی کا، جس کی منزل دائمی حسرت اور عذاب ہے، اب انسان خود فیصلہ کرے کہ وہ کس انجام کو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

وحی قرآنی کی تصدیق، استقامتِ دعوت اور سنتِ رسالت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ {۳۶} وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَمَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ {۳۷} وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ {۳۸} يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ {۳۹} الرعد

جواب ترجمہ: اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی وجہ سے خوش ہوتے ہیں جو آپ پر نازل کیا گیا۔ اور گروہوں میں بعض ایسے ہیں جو اس کے بعض حصے کا انکار کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے مجھے تو بس یہ حکم ہوا ہے کہ اللہ کی عبادت کروں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤں۔ میں اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔ اور اسی طرح ہم نے اس کو اس طور پر نازل کیا کہ عربی زبان میں خاص حکم ہے۔ اور اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آگیا اگر آپ نے ان کی خواہش کا اتباع کیا تو کوئی ایسا نہیں جو اللہ کے مقابلہ میں آپ کی مدد کرنے والا اور بچانے والا ہو۔ اور یقیناً ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیویاں دیں اور ذریت بھی۔ اور کسی رسول کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ کوئی آیت لے آئے الا یہ کہ اللہ کا حکم ہو۔ ہر زمانہ کیلئے لکھے ہوئے احکام ہیں۔ اللہ مٹاتا ہے جو چاہتا ہے اور ثابت رکھتا ہے جو چاہتا ہے۔ اور اس کے پاس اصل کتاب ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ: اہلِ کتاب میں سے وہ لوگ جنہیں تورات عطا کی گئی اور وہ جنہیں انجیل دی گئی تھی، ان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو اس وحی پر مسرور ہوتی ہے جو آپ پر نازل کی گئی، اس لیے کہ وہ اس میں اپنی کتابوں کی جھلک پاتے ہیں، اسی توحید کی صدا سنتے

ہیں، اسی ہدایت کی روشنی دیکھتے ہیں، لیکن انہی میں کچھ گروہ ایسے بھی ہیں جو اس کلام کے بعض حصوں کا انکار کرتے ہیں، خاص طور پر وہ آیات جو ان کی خواہشات کے خلاف ہوں یا ان کے تحریف و تبدل کو بے نقاب کرتی ہوں۔ انہیں صاف اعلان کر دیجیے: مجھے تو حکم یہی ملا ہے کہ میں ایک اللہ کی عبادت کروں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں۔ میری دعوت بھی اسی کی طرف ہے اور میرا لوٹنا بھی اسی کی جانب۔ یہی پیغام تورات اور انجیل لے کر آئی تھیں؛ اور یہی پیغام قرآن لے کر آیا ہے — توحیدِ خالص اور رجوعِ کامل۔ جس طرح سابقہ کتابیں اپنی اپنی قوموں کے لیے نازل کی گئیں، اسی طرح آپ پر بھی یہ قرآن نازل ہوا۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا: ایک واضح، فیصلہ کن اور حق کو باطل سے جدا کرنے والا کلام اور وہ بھی عربی زبان میں، تاکہ حجت پوری ہو اور معنی روشن ہو جائیں، خبردار! اگر آپ اہلِ کتاب کی خواہشات کے دباؤ میں آکر، علمِ الٰہی کے آجانے کے بعد، ان کی مرضی کے مطابق کسی ترمیم یا مداہنت کی راہ اختیار کریں تو پھر اللہ کے مقابل آپ کا نہ کوئی مددگار ہوگا، نہ کوئی محافظ، یہ منصبِ رسالت خواہشات کا تابع نہیں، بلکہ وحی کا پابند ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً: اور یہ بات بھی یاد رہے کہ آپ سے پہلے بھی جتنے رسول آئے، سب بشر تھے، ان کے گھر تھے، اہل و عیال تھے، اولاد تھی، وہ فرشتے نہ تھے کہ نکاح سے منزہ اور نسل سے خالی ہوتے، آپ بھی انہی رسولوں کی سنت پر ہیں، پھر مشرکین کو اس پر تعجب کیوں ہو کہ رسول انسان ہو؟

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ: رہا یہ مطالبہ کہ کوئی نشانی ان کی خواہش کے مطابق پیش کی جائے، تو کوئی رسول اپنی طرف سے معجزہ نہیں لاتا، ہر نشانی اللہ کے اذن سے ظاہر ہوتی ہے۔

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ: کائنات کا ہر فیصلہ ایک طے شدہ نوشتے کے مطابق ہے، ہر امر کا ایک مقرر وقت ہے، جو نہ آگے بڑھتا ہے نہ پیچھے ہٹتا ہے۔ ان آیات میں گویا تین اصول واضح کر دیے گئے، وحی کا

سرچشمہ ایک ہے، رسالت کی سنت انسانی ہے اور اقتدارِ کائنات صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، جو اس حقیقت کو قبول کرے، وہ سکون پاتا ہے اور جو خواہشات کے پیچھے چلے، وہ خود اپنے لیے محرومی لکھ لیتا ہے۔

يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ: خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جسکو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے ثابت اور باقی رکھتا ہے اور اس محو واثبات کے بعد جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے جس پر نہ کسی کی دسترس ہے نہ اس میں کوئی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ (معارف القرآن)

ائمہ تفسیر میں سے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ اور قتادہ رضی اللہ عنہ وغیرہ نے اس آیت کو بھی احکام و شرائع کے محو واثبات یعنی مسئلہ نسخ کے متعلق قرار دیا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے مختلف رسولوں کے ذریعہ اپنی کتابیں بھیجتے ہیں جن میں احکام شریعت اور فرائض کا بیان ہوتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ سب احکام دائمی ہوں اور ہمیشہ باقی رہیں بلکہ قوموں کے حالات اور زمانے کے تغیرات کے مناسب اپنی حکمت کے ذریعہ جس حکم کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں ثابت اور باقی رکھتے ہیں اور اصل کتاب بہر حال ان کے پاس محفوظ ہے جس میں پہلے ہی سے یہ لکھا ہوا ہے کہ فلاں حکم جو فلاں قوم کے لئے نازل کیا گیا ہے یہ ایک میعاد کے لئے یا خاص حالات کی بنا پر ہے جب وہ میعاد گذر جائیگی یا وہ حالات بدل جائیں گے تو یہ حکم بھی بدل جائے گا اس ام الکتب میں اس کی میعاد اور وقت مقرر بھی پوری تعیین کے ساتھ درج ہے اور یہ بھی کہ اس حکم کو بدل کو کونسا حکم لایا جائے گا اس سے یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ احکام خداوندی کبھی منسوخ نہ ہونے چاہئیں کیونکہ کوئی حکم جاری کرنے کے بعد منسوخ کرنا علامت اس کی ہے کہ حکم جاری کرنے والے کو حالات کا اندازہ نہ تھا اس لئے حالات دیکھنے کے بعد اس کو منسوخ کرنا پڑا اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی شان اس سے بلند و بالا ہے کہ کوئی چیز اس کے علم سے باہر ہو کیونکہ تقریر مذکور سے معلوم

ہو گیا کہ جس حکم کو منسوخ کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف اتنی مدت کے لئے جاری کیا گیا ہے اس کے بعد بدلا جائے گا اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کسی مریض کا حال دیکھ کر کوئی حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا اس وقت کے مناسب حال تجویز کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس دوا کا یہ اثر ہو گا اس کے بعد اس دوا کو بدل کر فلاں دوسری دوا دی جائے گی خلاصہ یہ ہے کہ اس تفسیر کے مطابق آیت میں محو و اثبات سے مراد احکام کا منسوخ ہونا اور باقی رہنا ہے۔

اور ائمہ تفسیر کی ایک جماعت سفیان ثوری رحمہ اللہ و کیع رحمہ اللہ وغیرہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی دوسری تفسیر نقل کی جس میں مضمون آیت کو نوشتہ تقدیر کے متعلق قرار دیا ہے اور معنی آیت کے یہ بیان کئے گئے ہیں کہ قرآن وحدیث کی تصریحات کے مطابق مخلوقات کی تقدیریں اور ہر شخص کی عمر اور زندگی بھر میں ملنے والا رزق اور پیش آنے والی راحت یا مصیبت اور ان سب چیزوں کی مقداریں اللہ تعالیٰ نے ازل میں مخلوقات کی پیدائش سے بھی پہلے لکھی ہوئی ہیں پھر بچہ کی پیدائش کے وقت فرشتوں کو بھی لکھوا دیا جاتا ہے اور ہر سال شب قدر میں اس سال کے اندر پیش آنے والے معاملات کا چٹھا فرشتوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر فرد مخلوق کی عمر رزق حرکات و سکنات سب متعین ہیں اور لکھے ہوئے ہیں مگر اللہ تعالیٰ اس نوشتہ تقدیر میں سے جس کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں باقی رکھتے ہیں وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ یعنی اصل کتاب جس کے مطابق محو و اثبات کے بعد انجام کار عمل ہونا ہے وہ اللہ کے پاس ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ بہت سی احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعمال سے انسان کی عمر اور رزق بڑھ جاتے ہیں بعض سے گھٹ جاتے ہیں صحیح بخاری میں ہے کہ صلہ رحمی عمر میں زیادتی کا سبب بنتی ہے اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ بعض اوقات آدمی کوئی ایسا گناہ کرتا ہے کہ اس کے سبب رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے اور ماں باپ کی خدمت واطاعت سے عمر بڑھ جاتی ہے اور تقدیر

الٰہی کو کوئی چیز بجز دعاء کے ٹال نہیں سکتی

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عمر یا رزق وغیر کسی کی تقدیر میں لکھ دیئے ہیں وہ بعض اعمال کی وجہ سے کم یا زیادہ ہو سکتے ہیں اور دعا کی وجہ سے بھی تقدیر بدلی جا سکتی ہے اس آیت میں اسی مضمون کا بیان اس طرح کیا گیا کہ کتاب تقدیر میں لکھی ہوئی عمر یا رزق یا مصیبت یا راحت وغیرہ میں جو تغیر و تبدل کسی عمل یا دعا کی وجہ سے ہوتا ہے اس سے مراد وہ کتاب ہے تقدیر ہے جو فرشتوں کے ہاتھ یا ان کے علم میں ہے اس میں بعض اوقات کوئی حکم کسی خاص شرط پر معلق ہوتا ہے جب وہ شرط نہ پائی جائے تو یہ حکم بھی نہیں رہتا اور پھر یہ شرط بعض اوقات تو تحریر میں لکھی ہوئی فرشتوں کے علم میں ہوتی ہے بعض اوقات لکھی نہیں ہوتی صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتی ہے جب وہ حکم بدلا جاتا ہے تو سب حیرت میں رہ جاتے ہیں اس طرح کی تقدیر معلق کہلاتی ہے جس میں اس آیت کی تصریح کے مطابق محو واثبات ہوتا رہتا ہے لیکن آیت کے آخری جملہ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ نے بتلادیا کہ اس تقدیر معلق کے اوپر ایک تقدیر مبرم ہے جو ام الکتاب میں لکھی ہوئی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ صرف علم الٰہی کے لئے مخصوص ہے اس میں وہ احکام لکھے جاتے ہیں جو شرائط اعمال یا دعاء کے بعد آخری نتیجہ کے طور پر ہوتے ہیں اسی لئے وہ محو واثبات اور کمی بیشی سے بالکل بری ہے (ابن کثیر، معارف القرآن)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں اپنی حکمت کے موافق جس حکم کو چاہے منسوخ کرے، جسے چاہے باقی رکھے۔ جس قوم کو چاہے مٹائے جسے چاہے اس کی جگہ جما دے۔ جن اسباب کی تاثیر چاہے بدل ڈالے جن کی چاہے نہ بدلے۔ جو وعدہ چاہے شرائط کی موجودگی میں ظاہر کرے جو چاہے شرائط کے نہ پائے جانے کی بنا پر موقوف کر دے۔ غرض ہر قسم کی تبدیل و تغییر، محو واثبات، نسخ واحکام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ قضاو قدر کے تمام دفاتر اسی کے قبضہ میں ہیں اور سب تفصیلات و دفاتر کی جڑ جسے "اُم الکتاب" کہنا چاہیے اسی کے پاس ہے یعنی "علم ازلی محیط" جو ہر قسم کے تبدل و تغیر سے

قطعاً منزّہ و مبرّیٰ اور لوح محفوظ کا ماخذ ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں "کہ دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے بعضے اسباب ظاہر ہیں بعضے چھپے ہیں۔ اسباب کی تاثیر کا ایک طبعی اندازہ ہے، جب اللہ چاہے اس کی تاثیر اندازہ سے کم یا زیادہ کر دے جب چاہے ویسی ہی رکھے۔ آدمی کبھی کنکر سے مرتا ہے اور کبھی گولی سے بچتا ہے اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ کے علم میں ہے جو ہر گز نہیں بدلتا۔ اندازے کو تقدیر کہتے ہیں۔ یہ دو تقدیریں ہوئیں ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی۔ جو تقدیر بدلتی ہے اس کو معلق اور جو نہیں بدلتی اس کو مبرم کہتے ہیں۔

انجام وعدۂ عذاب، غلبہ اسلام اور الٰہی تدبیر کی برتری

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ {۴۰} اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ {۴۱} وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ؕ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ {۴۲} وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ {۴۳} الرعد

جواب ترجمہ: اور اگر ہم آپ کو بعض وہ وعدے دکھا دیں جو وعدے ہم ان سے کر رہے ہیں یا ہم آپ کو اٹھا لیں تو بس آپ کے ذمہ پہنچا دینا ہے اور ہمارے ذمہ حساب لینا ہے۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کو اس کے اطراف سے کم کرتے چلے آرہے ہیں اور اللہ حکم فرماتا ہے اس کے حکم کو کوئی ہٹانے والا نہیں۔ اور وہ جلد حساب لینے والا ہے۔ اور جو لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے مکر کیا سو اللہ ہی کیلئے ہے اصل تدبیر۔ جو بھی کوئی شخص عمل کرتا ہے وہ اسے جانتا ہے۔ اور کافر عنقریب جان لیں گے کہ بعد میں آنے والے گھر کا اچھا انجام کس کیلئے ہے۔ اور جنہوں نے کفر کیا انہوں نے کہا کہ تم پیغمبر نہیں ہو۔ آپ فرما دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہونے کیلئے اللہ کافی ہے اور وہ

لوگ کافی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم ہے۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ: اے میرے حبیب ﷺ! اگر ہم آپ کو آپ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں وہ عذاب دکھا دیں جس کا وعدہ ان منکروں سے کیا گیا ہے، تو یہ ہمارا اختیار ہے اور اگر آپ کو اس سے پہلے وفات دے دیں، تب بھی آپ کے ذمے صرف پیغام پہنچا دینا ہے، نہ ان کی سزا آپ کے ذمہ ہے، نہ ان کا محاسبہ آپ کے سپرد، جزا و سزا کا فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے اور حساب ہم ہی لیں گے، رسول کا منصب تبلیغ ہے، انتقام نہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا: کیا یہ کفار نہیں دیکھتے کہ ہم کفر کی زمین کو اس کے کناروں سے کم کرتے چلے جا رہے ہیں؟ اسلام پھیل رہا ہے، فتوحات دروازے کھول رہی ہیں اور باطل کی حدیں سمٹتی جا رہی ہیں، یہ سب اللہ کے حکم سے ہو رہا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے درمیان جو فیصلہ چاہتا ہے صادر کرتا ہے، اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا، نہ اس میں ترمیم کر سکتا ہے اور وہ حساب لینے میں بھی تیز ہے، ایک ہی دن میں اگلے پچھلے سب کا حساب کر ڈالے گا۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا: ان سے پہلے کی قوموں نے بھی اپنے انبیاء علیہم السلام کے خلاف مکر و فریب کے جال بچھائے تھے، سازشیں کی تھیں، دعوتِ حق کو جھٹلایا تھا، مگر ان کی تدبیریں کیا کر سکیں؟ کچھ بھی نہیں، غالب تدبیر تو اللہ کی تدبیر ہے، وہی کارگر اور فیصلہ کن ہے۔

يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ: اللہ تعالیٰ ہر نفس کی کمائی کو جانتا ہے اور اسی کے مطابق بدلہ دیتا ہے۔

وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ: بالآخر حقیقت آشکار ہو کر رہے گی, انکار کرنے والے جان لیں گے کہ وہ کتنی بڑی غلطی پر تھے اور ایمان والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ وہی درست راہ پر تھے، جنہوں نے صبر کیا، ثابت قدم رہے اور آخرکار جنت اور حسنِ انجام کے وارث ٹھہرے۔ یہ آیات اہلِ حق کے لیے حوصلہ اور اہلِ باطل کے لیے تنبیہ ہیں، نتائج کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے، انسان کا کام حق پر قائم رہنا اور امانتِ پیغام ادا کرنا ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا: شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں تمہارے جھٹلانے سے کچھ نہیں ہوتا جبکہ خداوند قدوس میری صداقت کے بڑے بڑے نشان دکھلا رہا ہے قرآن جو اس کا کلام ہے جیسے اپنے کلام الٰہی ہونے کی شہادت دیتا ہے، اسی طرح میرے پیغمبر برحق ہونے کا گواہ ہے۔ اگر آنکھیں کھول کر دیکھو تو سخت ناموافق حالات میں سچ کا اس شان سے پھیلتے جانا اور دشمنوں تک کے دلوں میں گھر کرنا اور جھوٹ کا مغلوب و مقہور ہو کر سمٹتے رہنا خدا کی طرف سے کھلی ہوئی گواہی میری حقانیت کی ہے۔

جن کو قرآن کا علم اور اس کے حقائق کی خبر ہوگئی ہے وہ بھی دل سے گواہ ہیں کہ میں نے کچھ جھوٹ نہیں بنایا۔ نیز جنہیں پہلی کتب سماویہ اور ان کی پیشین گوئیوں کی اطلاع ہے ان کے دل گواہی دیتے ہیں کہ محمد ﷺ ٹھیک ان پیشین گوئیوں کے مطابق تشریف لائے ہیں جو سینکڑوں برس پیشتر موسیٰ اور مسیح کر چکے تھے۔

خلاصہ یہ کہ مکہ کے کافروں نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ اے محمد! تمہیں اللہ نے نہیں بھیجا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے فرمایا کہ آپ ان کافروں سے کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ میری صدق وسچائی اور تمہاری دروغ گوئی اور کذب بیانی پر گواہ ہے، وہ لوگ بھی بطور گواہ کے کافی ہیں جو تمہارے پاس علم الکتاب کے حامل ہیں، چاہے یہود اہل علم ہوں یا نصاریٰ اہل علم، ان میں سے میری رسالت پر ایمان لائے ہیں، وہ گواہ ہیں، جو کچھ میں اللہ کے پاس سے لایا ہوں اس پر بھی اللہ گواہ ہے اور تمہارے ہاں جو علم والے لوگ ہیں وہ گواہ ہیں، جاننے والے ان گواہیوں کی صراحت کریں گے وہ کسی چیز کو چھپائیں گے نہیں۔

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی، جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

اضافات جدیدہ وترمیمات: یکم مارچ ۲۰۲۶ء بروز اتوار بعد نماز مغرب

سورۃ ابراہیم (تعارف)

سوال سورۃ ابراہیم کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ ابراہیم قرآنِ کریم کی چودھویں سورت ہے، یہ مکی سورت ہے اور اس کی آیات ۵۲ ہیں، اس کا مرکزی موضوع توحید، رسالت اور قیامت کا اثبات ہے، اس میں دعوتِ حق کی روشنی کو "نور" اور کفر و شرک کو "ظلمات" سے تعبیر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ قرآن انسانیت کو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لانے کے لیے نازل ہوا ہے۔

وجہ تسمیہ: اس سورت کا نام آیت ۳۵ سے ماخوذ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ عظیم دعا نقل کی گئی ہے جو انہوں نے مکہ مکرمہ کی امن، اپنی اولاد کی ہدایت اور شرک سے حفاظت کے لیے کی، چونکہ اس سورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان افروز کردار اور ان کی دعائیں خاص نمایاں ہیں، اسی مناسبت سے اسے "سورۃ ابراہیم" کہا جاتا ہے۔

اہم مضامین: ① قرآن کا مقصدِ نزول: آغاز ہی میں واضح کر دیا گیا کہ یہ کتاب اس لیے نازل ہوئی ہے کہ انسانوں کو ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لایا جائے۔ ② سابقہ اقوام کے واقعات: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء کی قوموں کا ذکر کر کے بتایا گیا کہ حق کا انکار کرنے والوں کا انجام ہمیشہ تباہی رہا ہے۔ ③ کفر کی حقیقت اور شیطان کی لاتعلقی: قیامت کے دن شیطان اپنے پیروکاروں سے براءت کا اعلان کرے گا اور کہے گا کہ میں نے صرف دعوت دی تھی، اختیار تمہارا اپنا تھا۔ ④ شجرۂ طیبہ اور شجرۂ خبیثہ کی تمثیل: کلمۂ طیبہ کو مضبوط جڑوں والے درخت سے تشبیہ دی گئی ہے اور کفر کو بے بنیاد جھاڑی سے — جو اکھڑ کر پھینک دی جاتی ہے۔

⑤ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں: امنِ مکہ، توحید کی بقا، اولاد کی نماز سے وابستگی اور قیامت کے دن مغفرت کی دعا، یہ سب ایمان کی معراج کو ظاہر کرتی ہیں۔ ⑥ قیامت کے مناظر: مجرموں کی رسوائی، زنجیریں، آگ اور بے بسی کا نقشہ کھینچا گیا ہے تاکہ انسان غفلت سے بیدار ہو۔

نورِ ہدایت کا منشور اور اہل دنیا کی گمراہی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

الٓرٰ ۟ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۱﴾ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِۨ ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۳﴾ ابراھیم

جواب ترجمہ: الٓرٰ یہ کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی تاکہ آپ لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے اندھیروں سے نور کی طرف نکالیں یعنی اس کی راہ کی طرف جو زبردست ہے خوبیوں والا۔ وہ اللہ ہے جس کے لیے وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ اور کافروں کے لیے ہلاکت یعنی سخت عذاب ہے۔ جو دنیاوی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں پسند کرتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں۔ یہ لوگ دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

حروف مقطعات: الر: ان حروفِ مقطعات کی حقیقت پہلے بھی بیان ہو چکی کہ یہ قرآن کے اعجاز کی طرف اشارہ ہیں، وہی حروف جن سے تم کلام بناتے ہو، انہی سے یہ معجزۂ کلام ترتیب پایا، مگر تم اس جیسا لانے سے عاجز رہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ: یہ وہ عظیم کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر نازل کیا، اے رسولِ گرامی ﷺ، تاکہ آپ انسانوں کو کفر، جہالت اور گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان، علم اور ہدایت کے نور کی طرف لے آئیں، اس دین کی طرف جو دراصل اللہ کا راستہ ہے، وہ اللہ جو غالب ہے، جسے کوئی مغلوب نہیں کر سکتا اور وہی ہر حال میں حمد و ثنا کا مستحق ہے۔

اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: وہی اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے۔

اقتدارِ کامل اسی کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا عبادت بھی اسی کا حق ہے، اس کی اُلوہیت میں کسی مخلوق کو شریک کرنا سراسر ناانصافی ہے اور جو لوگ اس واضح حقیقت کے باوجود کفر اختیار کریں، ان کے لیے سخت عذاب ہے، ایسا عذاب جو ان کے انکار کی سنگینی کے مطابق ہو گا۔

اَلَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ: یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا کی عارضی لذتوں کو آخرت کی دائمی نعمتوں پر ترجیح دیتے ہیں، انہیں فانی آسائشیں زیادہ محبوب ہیں اور باقی رہنے والی سعادت ان کی نگاہ میں بے وقعت، یہی نہیں، وہ خود بھی راہِ خدا سے ہٹتے ہیں اور دوسروں کو بھی ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے سیدھے راستے میں کجی پیدا کر دی جائے، اس کی صورت مسخ کر دی جائے، تاکہ لوگ اس پر چلنے سے بدظن ہو جائیں۔

اُولٰٓئِکَ فِیْ ضَلٰلٍۢ بَعِیْدٍ: ایسے اوصاف رکھنے والے لوگ حقیقت سے بہت دور جا چکے ہیں، ان کی گمراہی معمولی نہیں، بلکہ بعید اور عمیق ہے، ایسی کہ جب تک دل میں اخلاص کی کرن نہ جاگے، واپسی کا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ ابتدائی آیات گویا پوری سورت کا عنوان ہیں، قرآن نور ہے، اللہ واحد معبود ہے اور جو دنیا کے فریب میں آ کر اس نور سے منہ موڑے، وہ اپنے لیے دور دراز کی گمراہی خرید لیتا ہے۔

قومی زبان میں نبی کی بعثت

سوال رسولوں کو ان کی اقوام کی طرف کون سی زبانوں میں بھیجا جاتا تھا؟ آیت کی روشنی میں بتایئے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمْ فَیُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ {۴} ابراھیم.

جواب ترجمہ: اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تاکہ انھیں (احکام خدا) کھول کھول کر بتا دے۔ پھر خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی انتہائی درجے کی مہربانی ہے کہ ہر نبی کو اس کی قومی زبان میں ہی بھیجا تاکہ

سمجھنے سمجھانے کی آسانی رہے۔ مسند میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں لَمْ يَبْعَثِ اللّٰهُ، عَزَّ وَجَلَّ، نَبِيًّا إِلَّا بِلُغَةِ قَوْمِهِ، ہر نبی رسول کو اللہ تعالیٰ نے اس کی امت کی زبان میں ہی بھیجا ہے۔

حق ان پر کھل تو جاتا ہی ہے پھر ہدایت ضلالت اللہ کی طرف سے ہے، اس کے چاہنے کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ وہ غالب ہے، اس کا ہر کام حکمت سے ہے، گمراہ وہی ہوتے ہیں جو اس کے مستحق ہوں اور ہدایت پر وہی آتے ہیں جو اس کے مستحق ہوں۔ چونکہ ہر نبی صرف اپنی اپنی قوم ہی کی طرف بھیجا جاتا رہا اس لئے اسے اس کی قومی زبان میں ہی کتاب اللہ ملتی تھی اور اس کی اپنی زبان بھی وہی ہوتی تھی۔

آنحضرت محمد بن عبداللہ ﷺ کی رسالت عام تھی ساری دنیا کی سب قوموں کی طرف آپ رسول اللہ تھے جیسے خود حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ قَبْلِي: نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِي الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا، وأحلَّت لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تُحَلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي، وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ، وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ، وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً (بخاری، مسلم)

مجھے پانچ چیزیں خصوصیت سے دی گئی ہیں جو کسی نبی کو عطا نہیں ہوئیں مہینے بھر کی راہ کی دوری پر صرف رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے، میرے لئے ساری زمین مسجد اور پاکیزہ قرار دی گئی ہے، مجھ پر مال غنیمت حلال کئے گئے ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پر حلال نہیں تھے، مجھے شفاعت سونپی گئی ہے ہر نبی صرف اپنی قوم ہی کی طرف آتا تھا اور میں تمام عام لوگوں کی طرف رسول اللہ بنایا گیا ہوں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت اور سہولت کا ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بھی کوئی رسول کس قوم کی طرف بھیجا ہے تو اس قوم کا ہم زبان بھیجا ہے تاکہ وہ احکام الٰہیہ انہی کی زبان اور انہی کے محاورات میں بتلائے اور ان کو اس کا سمجھنا آسان ہو اگر رسول کی زبان امت کی زبان سے مختلف ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس کے احکام

سمجھنے میں امت کو ترجمہ کرنے کرانے کی مشقت بھی اٹھانا پڑتی اور پھر بھی احکام کو صحیح سمجھنا مشکوک رہتا اس لئے اگر عبرانی زبان بولنے والوں کی طرف کوئی رسول بھیجا تو رسول کی زبان بھی عبرانی ہی تھی فارسیوں کے رسول کی زبان بھی فارسی، بربریوں کے رسول کی زبان بربری رکھی گئی خواہ اس صورت سے کہ جس شخص کو رسول بنایا گیا وہ خود اسی قوم کا فرد ہو اور مادری زبان اسی قوم کی زبان ہو یا یہ کہ اس کی پیدائشی اور مادری زبان اگرچہ کچھ اور ہو مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ اس نے اس قوم کی زبان سیکھ لی جیسے حضرت لوط علیہ السلام اگرچہ اصل باشندے عراق کے تھے جہاں کی زبان فارسی تھی لیکن ملک شام کی طرف ہجرت کرنے کے بعد انہی لوگوں میں شادی کی اور شامیوں کی زبان ہی ان کی زبان بن گئی تب اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خطہ شام کا نبی بنایا۔

اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت مکان و مقام کے اعتبار سے پوری دنیا کے لئے اور زمانے کے اعتبار سے قیامت تک کے لئے عام ہے دنیا کی کوئی قوم کسی ملک کی رہنے والی کسی زبان کی بولنے والی آپ کے دائرہ رسالت و نبوت سے باہر نہیں اور قیامت تک جتنی قومیں اور زبانیں نئی پیدا ہوں گی وہ سب کی سب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت میں داخل ہوں گی۔

یادِ ایام اللہ، شکر و ناشکری کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَذَكِّرْهُمْ ۙ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝{۵}وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝{۶}وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝{۷}وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝{۸} ابراھیم

جواب ترجمہ: اور اس میں شک نہیں کہ ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ اور انہیں اَیامِ الٰہیہ یاد دلاؤ بیشک اس میں ہر ایسے شخص کیلئے نشانیاں ہیں جو خوب صبر کرنے والا ہے خوب شکر کرنے والا ہے۔ اور جبکہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم پر جو اللہ کی نعمتیں ہیں ان کو یاد کرو جب کہ اس نے تمہیں آل فرعون سے نجات دی وہ تمہیں بری طرح تکلیف پہنچاتے تھے اور تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے لیے بڑا امتحان تھا۔ اور وہ وقت یاد کرو جب تمہارے رب نے تم کو مطلع فرمادیا کہ اگر تم شکر کروگے تو تم کو اور زیادہ دوں گا اور اگر تم ناشکری کروگے تو بلاشبہ میرا عذاب سخت ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر تم اور وہ سب لوگ جو زمین میں ہیں اللہ کی ناشکری کرو تو بلاشبہ اللہ بے نیاز ہے ستودہ صفات ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ: ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور روشن نشانیاں عطا کیں، ایسی نشانیاں (معجزات) جو ان کی صداقت اور رسالت پر واضح دلیل تھیں، انہیں حکم دیا کہ اپنی قوم کو کفر و جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان و آگہی کی روشنی کی طرف لے آئیں۔

وَذَكِّرْهُمْ ۢ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ: موسیٰ علیہ السلام کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ وہ اپنی قوم کو "ایّامُ اللہ" یاد دلائیں، وہ دن جب اللہ کی قدرت جلوہ گر ہوئی، اس کی نعمتیں برسیں اور اس کی نصرت نے اہلِ ایمان کو سرفراز کیا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ: جن ایام کے یاد دلانے کا حکم دیا گیا ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ ان ایام کی یاد کیوں دلائی جائے، اس لیے کہ ان دنوں میں توحید کی کھلی نشانیاں ہیں، قدرتِ الٰہی کی عظمت ہے اور اہلِ صبر و شکر کے لیے بصیرت کا سامان ہے، فائدہ وہی اٹھاتا ہے جو اطاعت میں ثابت قدم اور نعمتوں پر شکر گزار ہو۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: اور یاد کیجیے وہ گھڑی جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی

قوم بنی اسرائیل سے فرمایا: اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو! وہ وقت یاد کرو جب اس نے تمہیں فرعون اور اس کے لشکروں کے ظلم سے نجات دی، وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے کہ کہیں تم میں سے کوئی ان کے اقتدار کو چیلنج نہ کر دے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے تاکہ ذلت وخواری کا نشان بنادیں، یہ آزمائش بڑی سخت تھی، صبر کی کسوٹی، مگر تم نے صبر کیا تو اللہ نے رہائی عطا کی اور ظلم کے پنجے سے تمہیں چھڑا لیا۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ: پھر موسیٰ علیہ السلام نے انہیں وہ الٰہی اعلان سنایا جو ہمیشہ کے لیے قانون بن گیا: اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں اپنی نعمتیں بڑھادوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب سخت ہے، گویا شکر اضافۂ نعمت کی کنجی ہے اور کفرانِ نعمت زوال وعذاب کا پیش خیمہ۔

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا: اور موسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی واضح کر دیا: اگر تم اور تمہارے ساتھ زمین کے سب لوگ کفر اختیار کر لو تو اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، وہ خود بے نیاز ہے، اپنی ذات میں محمود ہے، نہ کسی کا ایمان اس کی سلطنت میں اضافہ کرتا ہے، نہ کسی کا کفر اس کے جلال میں کمی لاتا ہے، نفع وضرر انسان کے اپنے دامن میں لوٹتا ہے۔ یہ آیات ہمیں جھنجھوڑتی ہیں: تاریخ محض قصہ نہیں، آئینہ ہے، جو قوم شکر کو اپناتی ہے وہ سربلند ہوتی ہے اور جو نعمتوں کو بھلا دیتی ہے وہ آزمائشوں کے گرداب میں اتر جاتی ہے، فیصلہ ہر دل کو خود کرنا ہے۔

کفار کی جسارت

سوال آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے نیز بتائیے کہ **فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ** کا کیا معنیٰ ہے؟

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ {۹} ابراھیم

جواب ترجمہ: کیا تمہارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے یعنی نوح کی قوم اور

عاد اور ثمود اور ان لوگوں کی خبر جو ان کے بعد تھے جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے سو ان لوگوں نے اپنے ہاتھ ان کے منہ میں دے دیئے اور کہا کہ بیشک تم جو چیز لے کر بھیجے گئے ہو ہم اسے نہیں مانتے اور بلاشبہ جس چیز کی طرف تم لوگ ہمیں بلاتے ہو ہم اس کی طرف سے شک میں ہیں جو تردد میں ڈالنے والا ہے۔

فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ کا مطلب یہ ہے کہ کفار فرطِ غیظ سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگے جیسے دوسری جگہ ہے۔ عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ یا انبیاء کی باتیں سن کر فرطِ تعجب سے ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔ یا ہاتھ منہ کی طرف لے جا کر اشارہ کیا کہ بس چپ رہیے یا ہماری اس زبان سے اس جواب کے سوا کوئی توقع نہ رکھو جو آگے آرہا ہے۔ یا پیغمبر کی باتیں سن کر ہنستے تھے اور کبھی ہنسی دبانے کو منہ پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اَيْدِيَهُمْ کی ضمیر کفار کی طرف اور اَفْوَاهِهِمْ کی رُسل کی طرف راجع ہو، یعنی ملعونوں نے اپنے ہاتھ پیغمبروں کے منہ میں اڑا دیے کہ وہ بالکل بول نہ سکیں یا دونوں ضمیریں رسل کی طرف ہوں یعنی گستاخانہ طور پر انبیاء کے ہاتھ پکڑ کر انہی کے منہ میں ٹھونس دیے۔

بعض کے نزدیک یہاں ایدی سے مراد نعمتیں ہیں۔ یعنی جو عظیم الشان نعمتیں انبیاء نے پیش کی تھیں، مثلاً شرائع الٰہیہ وغیرہ وہ ناقدری سے ان ہی کی طرف لوٹا دیں کسی کو قبول نہ کیا جیسے ہمارے محاورات میں کہتے ہیں کہ میں نے فلاں شخص کی چیز اس کے منہ پر ماری۔ بہر حال کوئی معنی لیے جائیں سب کا حاصل یہ ہے کہ انہوں نے نعمت خداوندی کی ناقدری کی اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول نہ کی ان کے ساتھ بڑی بے رخی بلکہ گستاخی سے پیش آئے۔ (تفسیر عثمانی)

دعوت توحید، صبر رسالت اور وعدہ نصرت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ

ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ {۱۰} قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ {۱۱} وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ۭ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ {۱۲} وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ {۱۳} وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ {۱۴} ابراھیم

جواب ترجمہ: ان کے رسولوں نے کہا کیا اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں کا اور زمین کا پیدا فرمانے والا ہے وہ تمہیں بلاتا ہے تاکہ تمہارے گناہوں کو معاف فرمادے۔ اور مقررہ مدت تک تمہیں ڈھیل دے دے۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو ہمارے باپ دادا جس کی عبادت کرتے تھے تم ہمیں اس سے روکتے ہو۔ سو تم ہمارے پاس کوئی کھلی ہوئی دلیل لے آؤ۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا کہ ہم تمہارے ہی جیسے آدمی ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان فرماتا ہے اور ہمارے بس کی یہ بات نہیں کہ ہم تمہارے سامنے کوئی معجزہ اللہ کے حکم کے بغیر لاسکیں اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اور ہمیں کیا ہوا کہ ہم اللہ پر بھروسہ نہ کریں حالانکہ اس نے ہمیں ہماری راہیں دکھائی ہیں اور ہم تمہاری ایذاؤں پر ضرور ضرور صبر کریں گے اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے بھروسہ کرنے والوں کو۔ اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ضرور ضرور ہم تمہیں اپنی زمین سے نکال دیں گے یا یہ بات ہو کہ تم ہمارے دین میں واپس ہو جاؤ، سو ان کے رب نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ ہم ضرور بالضرور ظالموں کو ہلاک کر دیں گے۔ اور ان کے بعد تمہیں اس زمین میں آباد رکھیں گے یہ اس شخص کے لیے ہے جو میرے حضور کھڑا ہونے سے خائف ہوا اور میری وعید سے ڈرا۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: جب رسولوں نے اپنی قوموں کو توحید کی دعوت دی تو انہوں نے تعجب اور انکار کے لہجے میں کہا: کیا اللہ کے بارے میں بھی کوئی شک ہو سکتا ہے؟ وہی تو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، جس نے انہیں بغیر کسی سابقہ نمونے کے پیدا فرمایا، وہ تمہیں ایمان کی طرف بلاتا ہے تاکہ تمہارے پچھلے گناہ معاف کر دے اور تمہیں دنیا کی مقررہ مدت تک مہلت دے۔

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا: مگر قوموں نے جواب دیا: تم بھی تو ہمارے جیسے انسان ہو، تمہیں ہم پر کیا فضیلت حاصل ہے؟ تم ہمیں ہمارے باپ دادا کے معبودوں سے ہٹانا چاہتے ہو، اگر واقعی تم اللہ کے رسول ہو تو کوئی واضح دلیل پیش کرو۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ: رسولوں نے نہایت وقار سے فرمایا: بے شک ہم تمہارے جیسے بشر ہیں، ہم اس مماثلت کا انکار نہیں کرتے، مگر ہر مماثلت ہر پہلو میں یکسانیت کو لازم نہیں کرتی، اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اپنے خاص فضل سے نواز کر منصبِ رسالت عطا کرتا ہے اور جہاں تک تمہاری مطلوبہ نشانیوں کا تعلق ہے، وہ ہمارے اختیار میں نہیں، ہم اللہ کی مشیت کے پابند ہیں، ایمان والے اپنے تمام معاملات میں اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا: پھر انہوں نے کہا: آخر کون سی رکاوٹ ہمیں اللہ پر توکل سے باز رکھ سکتی ہے؟ اس نے ہمیں سیدھی اور واضح راہ دکھا دی ہے، تمہاری تکذیب اور تمسخر پر ہم صبر کریں گے، کیونکہ اصل سہارا تو اللہ ہی کا ہے اور اسی پر سچے متوکلین بھروسا کرتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ: جب دلائل کے میدان میں کفار عاجز آ گئے تو طاقت کی زبان بولنے لگے، انہوں نے دھمکی دی، یا تو تم ہمارے شہر سے نکل جاؤ، یا ہمارے دین میں واپس آ جاؤ، اس موقع پر اللہ نے اپنے رسولوں کو وحی کے ذریعے تسلی دی، ہم ان ظالموں کو ضرور ہلاک کریں گے جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں۔

وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ: اور پھر وعدہ فرمایا کہ ان کے بعد تمہیں اور تمہارے پیروکاروں کو اسی سرزمین میں بسائیں گے، یہ انجام اُن لوگوں کے لیے ہے جو اللہ کی عظمت کو دل میں زندہ رکھتے ہیں، اس کی نگرانی کا یقین رکھتے ہیں اور اس کی وعید سے ڈرتے ہیں۔ ان آیات میں دعوتِ حق کی پوری تصویر ہے، پہلے دلیل، پھر صبر، پھر دھمکیوں کا سامنا اور بالآخر اللہ کی نصرت، جو حق پر قائم رہے اور خوفِ خدا کو دل میں بسائے، زمین کا وارث وہی بنتا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے خدائی مدد

سوال اس آیت کی تفسیر کیجیے

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ{۱۵} ابراھیم

جواب ترجمہ: اور پیغمبروں نے (خدا سے اپنی) فتح چاہی تو سرکش ضدی نامراد رہ گیا۔

پیغمبروں نے خدا سے مدد مانگی اور فیصلہ چاہا۔ چنانچہ نوح علیہ السلام نے کہا تھا فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (الشعراء:۱۱۸) لوط علیہ السلام نے کہا رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ، شعیب علیہ السلام نے عرض کیا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ (الاعراف:۸۹) موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (یونس:۸۸)

اور کفار نے بھی جب دیکھا کہ اتنی طویل مدت سے عذاب کی دھمکیاں دی جارہی ہیں لیکن اس کے آثار کچھ نظر نہیں آتے تو استہزاء اور تمسخر سے کہنے لگے (رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ) ص:۱۶) اور اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (الانفال:۳۲) یہ تو قریش کے مقولے ہیں، قوم نوح نے کہا تھا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا قوم شعیب علیہ السلام نے کہا فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا غرض دونوں طرف سے فیصلہ کی

جلدی ہونے لگی۔ (عثمانی)

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے ہر لحاظ سے دعوت و تبلیغ کا کام سرانجام دے کر اتمام حجت کی، جب دیکھا کہ یہ لوگ سرکشی، تمرد اور دین کے ساتھ استہزا میں تمام حدود پھلانگتے اور عبور کرتے چلے جارہے ہیں تو پھر وہ اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوگئے، دست بدعا ہوگئے، اپنے رب کے سامنے دامن پھیلادیے، آنسو بہادیے، لجاجت اور سماجت کی انتہا کردی، دعائیں کرنے لگے کہ اے مولا! ان نافرمانوں، ان سرکشوں کے ساتھ اب آپ خود ہی نمٹ لیجیے، اللہ سے اپنے مخالفین اور دشمنوں کے خلاف مدد چاہی اور اللہ سے فیصلہ کروایا، چنانچہ اللہ نے ان کی دعائیں قبول کیں، جس کے نتیجے میں ہر وہ متکبر ہلاک ہوا جو حق قبول نہیں کرتا تھا، جو اللہ کی توحید کا اقرار نہیں کرتا تھا، اللہ کی عبادت میں اخلاص سے کام نہیں لیتا تھا۔

متکبر کا انجام، پیاس عذاب اور بے موت کی زندگی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ {١٦} يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ {١٧} ابراھیم

جواب ترجمہ: اس کے آگے دوزخ ہے اور اسے ایسا پانی پلایا جائے گا جو پیپ ہوگا وہ اسے گھونٹ گھونٹ پیئے گا۔ گلے سے بہ آسانی نہ اتارے گا اور ہر جگہ سے اس پر موت کی آمد ہوگی اور وہ نہیں مرے گا اور اس کے سامنے سخت عذاب ہوگا۔

مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ: قیامت کے دن اس سرکش اور متکبر انسان کے سامنے جہنم ہوگی، گویا وہ اسی کی تاک میں بیٹھی تھی، وہ آگ جسے اس نے دنیا میں جھٹلایا، آج اس کا ٹھکانا بنے گی، وہاں اسے ایسا پانی پلایا جائے گا جو دراصل اہلِ جہنم کے جسموں سے بہنے والی پیپ ہوگی، نہ وہ اس کی پیاس بجھائے گی، نہ اس کے حلق کو راحت دے گی، یوں پیاس اس کے عذاب کا مستقل

حصہ بن جائے گی اور اس پر عذاب کی ایک کے بعد ایک قسم مسلط ہوتی رہے گی۔

يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ: وہ گھونٹ گھونٹ کر اسے پینے کی کوشش کرے گا، اس کی شدید کڑواہٹ، دہکتی حرارت اور بدبو کے سبب حلق سے نیچے اتارنا دشوار ہو گا، ہر بار اسے یوں لگے گا جیسے جان نکل رہی ہو، موت ہر سمت سے لپکے گی، مگر موت آئے گی نہیں، نہ وہ مر کر چھٹکارا پائے گا، نہ بے ہوشی اسے آرام دے گی، وہ زندہ رہے گا، صرف اس لیے کہ عذاب کا ذائقہ چکھتا رہے۔

وَمِنْ وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ: اور یہیں بات ختم نہیں ہوتی، اس کے آگے ایک اور سخت عذاب اس کا منتظر ہو گا، گویا ہر لمحہ پچھلے لمحے سے زیادہ کڑا، ہر منظر پچھلے منظر سے زیادہ ہولناک۔ یہ آیات متنبہ کرتی ہیں، تکبر انسان کو اس مقام تک لے جاتا ہے جہاں زندگی خود عذاب بن جاتی ہے، جو آج حق کے آگے سر نہیں جھکاتا، کل آگ کے سامنے بے بس کھڑا ہو گا، فیصلہ ابھی ہے، انجام وہاں ظاہر ہو گا۔

کافروں کے نیک اعمال کا صلہ

سوال دنیا میں کفار جو نیک عمل کرتے ہیں جیسے صلہ رحمی، نیکی وغیرہ یہ ان کے لیے قیامت کے دن نفع بخش ہو گی؟ قرآنی آیت کی روشنی میں وضاحت فرمائیے۔

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَى شَيْءٍ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ{۱۸}إبراهيم.

جواب ترجمہ: جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے راکھ ہو اسے تیز آندھی کے دن میں تیز ہوا اڑا کر لے جائے جو کچھ انھوں نے کمایا اس میں سے ذرا سے حصہ پر بھی وہ قادر نہیں ہوں گے یہ ہے دور کی گمراہی،

جو کفار دنیا میں نیکی کے کام کرتے ہیں جیسے صلہ رحمی وغیرہ ان کی مثال راکھ کی سی ہے کی جس پر کسی دن زور دار ہوا چلے تو سب راکھ کو اڑا کر لے جائے، اس کا نشان تک باقی نہیں چھوڑتی، اسی طرح

کافروں کے اعمال کی مثال ہے یہ ان اعمال کے بدلے میں کوئی ایسی چیز نہیں پائیں گے جو اللہ کے ہاں انہیں نفع دے، ان تمام اعمال کو کفر اس طرح برباد کر گیا جس طرح ہوا راکھ کو اڑا کر رکھ دیتی ہے، ان کی سعی اور کوشش بغیر کسی اساس اور بنیاد کے ہے، یہ راہ حق سے بہت دور پڑے ہوئے ہیں۔

بعض کفار کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ آخر ہم نے دنیا میں بہت سے اچھے کام صدقہ خیرات کی مد میں کیے ہماری خوش اخلاقی لوگوں میں مشہور ہوئی، بہتیرے آدمیوں کی مصیبت میں کام آئے اور کسی نہ کسی عنوان سے خدا کی پوجا بھی کی، کیا یہ سب کیا کرایا اور دیا لیا اس وقت کام نہ آئے گا؟ اس کا جواب اس تمثیل میں دیا۔ یعنی جسے خدا کی صحیح معرفت نہیں۔ محض فرضی اور وہمی خدا کو پوجتا ہے اس کے تمام اعمال محض بے روح اور بے وزن ہیں۔ وہ محشر میں اسی طرح اڑ جائیں گے جس طرح آندھی کے وقت جب زور کی ہوا چلے تو راکھ کے ذرات اڑ جاتے ہیں، اس وقت کفار نیک عمل سے بالکل خالی ہاتھ ہوں گے حالانکہ وہ یہی موقع ہو گا جہاں نیک عمل کی سب سے زیادہ ضرورت ہو گی۔ اللہ اکبر! یہ کیسی حسرت کا وقت ہو گا کہ جن اعمال کو ذریعہ قرب و نجات سمجھے تھے وہ راکھ کے ڈھیر کی طرح عین اس موقع پر بے حقیقت ثابت ہوئے جب دوسرے لوگ اپنی نیکیوں کے ثمر شیریں سے لذت اندوز ہو رہے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قدرت مطلقہ اور قیامت کا مکالمہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ {۱۹} وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ {۲۰} وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ {۲۱} ابراهيم

جواب ترجمہ: اے مخاطب کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بلاشبہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے

ساتھ پیدا فرمایا اگر وہ چاہے تو تمہیں ختم کر دے اور نئی مخلوق پیدا فرما دے۔ اور یہ اللہ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔ اور وہ سب اللہ کے حضور میں پیش ہوں گے سو ضعیف لوگ ان لوگوں سے کہیں گے جو بڑے بنے ہوئے تھے کہ بلاشبہ ہم تمہارے تابع تھے سو کیا تم ہم سے اللہ کا عذاب کچھ بھی ہٹا سکتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اگر اللہ ہمیں راہ بتاتا تو ہم تمہیں بھی راہ بتا دیتے، ہم سب کے حق میں برابر ہے کہ ہم بے چینی کا اظہار کریں یا صبر کریں ہمارے لیے چھٹکارہ کی کوئی صورت نہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ: الخ کیا انسان نے کبھی غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے؟ یہ کائنات کھیل تماشا نہیں، نہ بے مقصد بنائی گئی ہے، ہر شے ایک حکمت کے تحت وجود میں آئی ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں مٹا دے اور تمہاری جگہ ایک نئی مخلوق لے آئے، ایسی جو اس کی بندگی کرے، اس کے حکم کی اطاعت کرے، یہ کام اس کے لیے کچھ دشوار نہیں، تمہارا فنا ہو جانا اور کسی اور کا آجانا اس کی قدرت کے سامنے نہایت آسان ہے۔

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ: اور تمہارا ہلاک کر دینا یا تمہارے بدلے دوسروں کو پیدا کر دینا اسے عاجز نہیں کر سکتا، وہ ہر چیز پر قادر ہے، اس کی قدرت کی کوئی حد نہیں اور اس کے ارادے کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا: پھر وہ دن آئے گا جب سب مخلوق قبروں سے نکل کر اپنے رب کے حضور کھڑی ہو گی، اس دن کمزور پیروکار اپنے سرداروں سے کہیں گے، ہم تو تمہارے تابع تھے، تمہارے اِشاروں پر چلتے اور تمہارے حکم سے رکتے تھے، کیا آج تم اللہ کے عذاب سے ہمیں کچھ بچا سکتے ہو؟

قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ: مگر وہ سردار جواب دیں گے، اگر اللہ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم تمہیں بھی ہدایت دکھا دیتے اور یوں سب نجات پا لیتے، مگر ہم خود گمراہ ہوئے اور تمہیں بھی گمراہ کیا، اب ہمارے اور تمہارے لیے برابر ہے کہ ہم بے صبری کریں یا صبر کا ڈھونگ رچائیں، کوئی جائے پناہ

نہیں، کوئی فرار کی راہ نہیں۔

یہ آیات انسان کو چونکا دیتی ہیں، اندھی تقلید نجات کا ذریعہ نہیں، قیادت کی غلطی پیروکار کے لیے عذر نہیں بنے گی، اصل ذمہ داری ہر نفس کی اپنی ہے اور فیصلہ کن اختیار صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، آج کا اختیار کل کی جواب دہی میں ڈھل جائے گا، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے، اپنے قدموں کی سمت خود درست کر لیجیے، لیکن غلط راستوں کو از خود سے چن لینے سے بہت بہتر ہے کہ سلف صالحین کے وضع کردہ اصولوں اور زندگی گزارنے کے طریقوں کو اختیار کیا جائے، جن لوگوں نے ساری زندگیاں قرآن وسنت سے مسائل سمجھتے اور استنباط کرتے گزاریں ان کے مرتب کردہ اُصولوں کی پیروی کرتے ہوئے قرآن وسنت کو سمجھا جائے اور ان پر عمل کیا جائے۔

شیطان اور پیروکاران شیطان کا مکالمہ

سوال آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے، نیز بتائیے کہ اس آیت میں مذکور لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ. إِنَّ اللّٰهَ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ {۲۲}إبراهيم.

جواب ترجمہ: اور جب فیصلے ہو چکیں گے تو شیطان کہے گا کہ بلاشبہ اللہ نے تم سے سچے وعدے کیے اور میں نے تم سے جو وعدے کیے وہ وعدے میں نے تم سے خلاف کیے تھے اور میرا تم پر اس سے زیادہ کچھ زور نہ تھا کہ میں نے تم کو دعوت دی سو تم نے میری بات مانی لہٰذا تم مجھے ملامت نہ کرو اور اپنی جانوں کو ملامت کرو نہ میں تمہارا مددگار ہوں نہ تم میرے مددگار ہو میں تمہارے اس فعل سے بیزار ہوں کہ اس سے پہلے تم نے مجھے شریک بنایا بلاشبہ جو ظالمین ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ: اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ معاملے کا فیصلہ کر دے گا اور اپنی مخلوق کا

حساب لے چکے گا، اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے اور اہل دوزخ دوزخ میں داخل ہو جائیں گے۔

حساب کتاب کے بعد جب جنتیوں کے جنت میں اور دوزخیوں کے دوزخ میں جانے کا فیصلہ ہو چکے گا اس وقت کفار دوزخ میں جا کر یا داخل ہونے سے پہلے ابلیس لعین کو الزام دیں گے کہ مردود تو نے دنیا میں ہماری راہ ماری اور اس مصیبت میں گرفتار کرایا۔ اب کوئی تدبیر مثلاً سفارش وغیرہ کا انتظام کر۔ تاکہ عذاب الٰہی سے رہائی ملے۔ تب ابلیس ان کے سامنے لیکچر دے گا جس کا حاصل یہ ہے کہ بیشک حق تعالیٰ نے صادق القول پیغمبروں کے توسط سے ثواب وعقاب اور دوزخ وجنت کے متعلق سچے وعدے کیے تھے جن کی سچائی دنیا میں دلائل وبراہین سے ثابت تھی اور آج مشاہدے سے ظاہر ہے۔ میں نے اس کے بالمقابل جھوٹی باتیں کہیں اور جھوٹے وعدے کیے۔ جن کا جھوٹ ہونا وہاں بھی ادنیٰ فکر وتامل سے واضح ہو سکتا تھا اور یہاں تو آنکھ کے سامنے ہے۔ میرے پاس نہ حجت وبرہان کی قوت تھی نہ ایسی طاقت رکھتا تھا کہ زبردستی تم کو ایک جھوٹی بات کے ماننے پر مجبور کر دیتا، بلاشبہ میں نے بدی کی تحریک کی اور تم کو اپنے مشن کی طرف بلایا، تم جھپٹ کر خوشی سے آئے اور میں نے جدھر شہ دی ادھر ہی اپنی رضا ورغبت سے چل پڑے۔ اگر میں نے اغوا کیا تھا تو تم ایسے اندھے کیوں بن گئے کہ نہ دلیل سنی نہ دعوے کو پرکھا آنکھیں بند کر کے پیچھے ہو لیے۔ انصاف یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ تم اپنے نفسوں پر ملامت کرو۔ میرا جرم اغوا بجائے خود رہا لیکن مجھے مجرم گردان کر تم کیسے بری ہو سکتے ہو۔ (عثمانی)

إِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمہارے ساتھ جو وعدہ کیا تھا وہ سچ تھا کہ تم مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے اور تمہیں جزا وسزا کا سامنا کرنا ہو گا۔

مَّا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنتُم بِمُصْرِخِيَّ: اس کا مطلب یہ ہے کہ آج نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ ہی اللہ کے عذاب سے تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو۔

ایمان اور عمل کا صلہ، جنت اور سلامتی کی فضا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ {۲۳} ابراھیم

جواب ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہ لوگ ایسے باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ ان میں رہیں گے ان کا تحیہ ملاقات کے وقت سلام ہو گا۔

وَاُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: یہاں اسلوبِ کلام قابلِ غور ہے، اُدْخِلَ بصیغۂ مجہول آیا ہے، داخل کرنے والے کا نام ظاہر نہیں کیا گیا، مفسرین نے فرمایا کہ یہ فاعل فرشتے بھی ہو سکتے ہیں جو اہلِ ایمان کو اعزاز کے ساتھ جنت میں لے جائیں گے اور یہ بھی درست ہے کہ در حقیقت داخل فرمانے والا خود اللہ تعالیٰ ہے، لیکن نامِ جلالت کو صراحتاً ذکر نہ کرنے میں ایک لطیف اشارہ پوشیدہ ہے، گویا جنت میں داخلہ ان کے ایمان و عمل کے نتیجے میں مرتب ہو رہا ہے، یعنی یہ محض عطیہ نہیں، بلکہ ان کے کسبِ صالح کا باوقار صلہ ہے۔

پھر فرمایا: بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اپنے رب کے حکم اور رضا سے، اس کی اجازت ہی اصل کلید ہے اور اسی کے قانون کے مطابق ہر نفس کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا۔

آیت نے جنت میں داخلے کا سبب خود بیان کر دیا" :اَلَّذِیْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ"۔ دو بنیادیں ہیں ①: ایمان: حق کو ماننا، اس کی تصدیق کرنا اور دل و جان سے اس کے آگے جھک جانا۔ ② عملِ صالح: وہ افعال جو شریعت کے مطابق ہوں، فرض کی ادائیگی سے لے کر ہر وہ نیک کام جو ذاتاً نفع بخش ہو اور خلقِ خدا کے لیے خیر کا سبب بنے، قولِ طیب بھی اس میں شامل ہے اور فعلِ طیب بھی۔ یہاں اس بحث میں پڑنا مقصود نہیں کہ عمل ایمان کا جز ہے یا نہیں، البتہ آیت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ اجر و ثواب کے استحقاق میں ایمان کے ساتھ عملِ صالح بھی بنیادی کردار رکھتا ہے۔

پھر جنت کی کیفیت بیان ہوئی، نہریں اس کے نیچے بہتی ہوں گی، درختوں کے سائے تلے پانی کی

لہریں بل کھاتی گزریں گی، سبزہ، سایہ، جاری پانی اور دلکش منظر، روح اور نظر دونوں کے لیے سرور کا سامان، یہ محض مادی راحت نہیں، بلکہ قلبی سکون اور باطنی طمانینت بھی ہے۔

وہاں باہمی تعلق امن و محبت پر قائم ہو گا، اسی لیے فرمایا :تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ان کا باہمی سلام، سلامتی کا پیام ہو گا، نہ کوئی ملامت، نہ الزام، نہ طعن و تشنیع، بر خلاف اس کے جو جہنم میں ہو گا، جہاں تابع و متبوع اور شیطان ایک دوسرے کو کوستے رہیں گے۔ یہ آیت دراصل انسان کو راستہ دکھاتی ہے: ایمان دل میں ہو اور عمل زندگی میں، تو انجام جنت ہے اور جنت میں سلامتی کی ابدی فضا۔

کلمہ طیبہ پاکیزہ درخت کی طرح ہے

سوال اس آیت کا ترجمہ کیجیے، نیز بتائیے کہ كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ کا کیا مطلب ہے؟

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ {۲۴} تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ {۲۵} ابراھیم

جواب ترجمہ: کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسی مثال بیان فرمائی وہ مثال کلمہ طیبہ کی ہے جو شجرہ طیبہ کی طرح سے ہے اس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں بلندی میں ہیں۔ وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت اپنا پھل دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے کلمہ توحید لا الہ الا اللہ کی مثال ایک بڑے درخت کی بیان فرمائی ہے اور یہ درخت کھجور کا ہے، اسی طرح ایمان کا درخت ہے کہ اس کی جڑیں مومن کے دل میں علم واعتقاد کے اعتبار سے پیوست ہیں، اس کی شاخیں اعمال صالحہ اور پسندیدہ اخلاق ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے پاس کھجور کا ایک خوشہ لایا گیا۔ تو آپ ﷺ نے اسی آیت کا پہلا حصہ تلاوت فرمایا اور فرمایا کہ پاک درخت سے مراد کھجور کا درخت ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ہم آنحضور ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جو آپ

نے فرمایا مجھے بتلاؤ وہ کون سا درخت ہے جو مسلمان کے مشابہ ہے۔ جس کے پتے نہیں جھڑتے نہ جاڑوں میں نہ گرمیوں میں جو اپنا پھل ہر موسم میں لاتا رہتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میرے دل میں آیا کہ کہہ دوں وہ درخت کھجور کا ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ مجلس میں حضرت ابو بکر ہیں حضرت عمر ہیں اور وہ خاموش ہیں تو میں بھی چپ ہو رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ درخت کھجور کا ہے۔ جب یہاں سے اٹھ کر چلے تو میں نے اپنے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ ذکر کیا۔ تو آپ نے فرمایا پیارے بچے اگر تم یہ جواب دے دیتے تو مجھے تو تمام چیزوں کے مل جانے سے بھی زیادہ محبوب تھا (بخاری) حضرت مجاہد کا بیان ہے کہ میں مدینہ شریف تک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا لیکن سوائے ایک حدیث کے اور کوئی روایت انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے ہوئے نہیں سنا اس میں ہے کہ یہ سوال آپ نے اس وقت کیا۔ جب آپ کے سامنے کھجور کے درخت کے بیچ کا گودا لایا گیا تھا۔ میں اس لئے خاموش رہا کہ میں اس مجلس میں سب سے کم عمر تھا، روایت میں ہے کہ جواب دینے والوں کا خیال اس وقت جنگلی درختوں کی طرف چلا گیا۔

ابن ابی حاتم میں ہے کہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضور مالدار لوگ درجات میں بہت بڑھ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ یاد رکھو اگر تمام دنیا کی چیزیں لگ کر انبار لگا دو تو بھی وہ آسمان تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ تجھے ایسا عمل بتلاؤں جس کی جڑ مضبوط اور جس کی شاخیں آسمان میں ہیں اس نے پوچھا وہ کیا؟ فرمایا دعا (لا الہ الا اللہ واللہ اکبر و سبحان اللہ والحمد للہ) ہر فرض نماز کے بعد دس بار کہہ لیا کرو جس کی اصل مضبوط اور جس کی فرع آسمان میں ہے۔

تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا: وہ پاکیزہ درخت اپنے رب کے حکم سے ہر وقت اپنا عمدہ اور شیریں پھل دیتا رہتا ہے، اس کی عطا کسی خاص موسم کی پابند نہیں، نہ اس کی بخشش کسی گھڑی کی محتاج، جس طرح اس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں بلند ہیں، اسی طرح اس کا فیض بھی مسلسل اور نفع بخش ہے، دلوں کو تازگی، روحوں کو قوت اور زندگی کو معنویت عطا کرتا ہوا۔

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ: اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے ایسی مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں، غور کریں اور حقیقت کو پہچانیں، مثال دل کے بند دریچوں پر دستک ہے، جو سوچتا ہے وہ سمجھ لیتا ہے اور جو سمجھ لیتا ہے وہ اپنی راہ درست کر لیتا ہے۔

کلمۂ خبیثہ گندے درخت کی طرح ہے

سوال آیت کا ترجمہ، نیز بتائیے کہ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ کا کیا مطلب ہے؟

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ {۲۶} إبراهيم

جواب ترجمہ: اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایسی ہے جیسے خبیث درخت ہو جسے زمین کے اوپر سے اکھاڑ دیا گیا ہو اس کے لیے ثبات نہیں ہے۔

کلمہ خبیثہ سے مراد کلمہ کفر ہے، جیسے خبیث درخت کھانے کے لحاظ سے، وہ حنظل ہے، جسے زمین کے اوپر سے اکھاڑ دیا جاتا ہے، اس لیے کہ اس کی جڑیں سطح زمین کے اوپر ہوتی ہیں، جڑوں میں پائیداری نہیں ہوتی، نہ ہی اس کی شاخیں اوپر کی سمت بڑھتی ہیں، اسی طرح کافر ہے جس میں کوئی مضبوطی اور ثبات نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں کوئی خیر ہوتی ہے، نہ اس کا کوئی اچھا عمل اللہ کی طرف چڑھتا ہے۔

اہل ایمان کی دنیا اور عقبیٰ میں ثابت قدمی

سوال اس آیت کا ترجمہ کیجیے نیز بتائیے کہ اس آیت میں اہل ایمان کے لیے جو کہا گیا کہ اللہ انہیں دنیا اور آخرت میں سچی بات پر ثابت قدم رکھیں گے وہ سچی بات کیا ہے؟

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ {۲۷} إبراهيم.

جواب ترجمہ: اللہ ایمان والوں کو دنیا اور آخرت کی زندگی میں سچی بات پر ثابت قدم رکھتا ہے اور ظالموں کو گمراہ کرتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اس سے مراد لا الہ الا اللہ کی گواہی دینا ہے، محمد ﷺ کے رسول ہونے کی گواہی دینا ہے، جو دین حق آپ ﷺ لے کر آئے ہیں اللہ اس کے ذریعے انہیں دنیا کی زندگی میں ثابت قدم رکھتے ہیں، موت کے وقت عمدہ خاتمہ ہو گا، قبر میں دو فرشتوں منکر اور نکیر کی طرف سے کیے جانے والے سوالا ت کے درست جوابات کی طرف راہنمائی۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مومنین دنیا کی زندگی سے لے کر محشر تک اسی کلمہ طیبہ کی بدولت مضبوط اور ثابت قدم رہیں گے۔ دنیا میں کیسی ہی آفات و حوادث پیش آئیں، کتنا ہی سخت امتحان ہو، قبر میں نکیرین سے سوال و جواب ہو، محشر کا ہولناک منظر ہوش اڑا دینے والا ہو، ہر موقع پر یہ ہی کلمہ توحید ان کی پامردی اور استقامت کا ذریعہ بنے گا۔ (تفسیر عثمانی)

بعض اہل تفسیر لکھتے ہیں کہ قبر میں کہ اول منازلِ آخرت ہے جب منکر نکیر آکر ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہارا رب کون ہے، تمہارا دین کیا ہے اور سید عالم ﷺ کی طرف اشارہ کر کے دریافت کرتے ہیں کہ ان کی نسبت تو کیا کہتا ہے؟ تو مومن اس منزل میں بفضلِ الٰہی ثابت رہتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام اور یہ میرے نبی ہیں محمد مصطفٰے ﷺ، اللہ کے بندے اور اس کے رسول پھر اس کی قبر وسیع کر دی جاتی ہے اور اس میں جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آتی ہیں اور وہ منوّر کر دی جاتی ہے اور آسمان سے ندا ہوتی ہے کہ میرے بندے نے سچ کہا۔

نعمت الٰہی، انسانی ناشکری اور انجامِ ہدایت وضلالت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ كُفۡرًا وَّاَحَلُّوۡا قَوۡمَهُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ {۲۸} جَهَنَّمَ يَصۡلَوۡنَهَا ؕ وَبِئۡسَ الۡقَرَارُ {۲۹} وَجَعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا لِّيُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِهٖ ؕ قُلۡ تَمَتَّعُوۡا فَاِنَّ مَصِيۡرَكُمۡ اِلَى النَّارِ {۳۰} قُلۡ لِّعِبَادِىَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا يُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خِلٰلٌ {۳۱} اَللّٰهُ الَّذِىۡ خَلَقَ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ {۳۲} وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ {۳۳} وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ {۳۴} ابراھیم.

جواب ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر۔ یعنی جہنم میں اتار دیا وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ رہنے کی بری جگہ ہے۔ اور ان لوگوں نے اللہ کے لیے مقابل قرار دیدیئے تاکہ وہ انہیں اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں آپ فرمادیجیے کہ تم مزے کی زندگی گزار لو پھر بلاشبہ تمہیں دوزخ کی طرف لوٹ کر چلا جانا ہے۔ آپ میرے بندوں سے فرمادیجیے جو ایمان لائے کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے پوشیدہ طریقے پر خرچ کریں اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہو گی اور نہ کوئی دوستی ہو گی۔ اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا فرمایا اور آسمان سے پانی اتارا پھر اس کے ذریعہ پھلوں سے تمہارے لیے رزق نکالا اور تمہارے لیے کشتی کو مسخر فرمادیا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور اس نے تمہارے لیے نہروں کو مسخر کر دیا۔ اور تمہارے لیے سورج اور چاند کو مسخر فرمادیا اور برابر حرکت میں ہیں اور اس نے تمہارے لیے رات اور دن کو مسخر فرمادیا۔ اور تم نے اس سے جو کچھ مانگا تم کو اس سب میں سے عطا فرمادیا اور اگر تم اللہ کی نعمت کو شمار کرو تو شمار نہیں کر سکتے بلاشبہ انسان بڑا بے انصاف ہے بڑا ہی ناشکرا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ : کیا تم نے اُن لوگوں کا حال نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا؟ یہ وہی لوگ تھے جنہیں امنِ حرم کی نعمت عطا ہوئی، اور جن کے درمیان رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت جیسی عظیم سعادت اتری، مگر انہوں نے شکر کے بجائے کفر کو اختیار کیا، اللہ کی نعمتوں کے بدلے ناشکری کا سودا کیا اور جو حق ان کے پاس آیا، اسے جھٹلا دیا، یوں وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور اپنی پیروی کرنے والوں کو بھی ہلاکت کے گھر میں اتار

لائے، وہ ہلاکت کا گھر جہنم ہے۔

جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۚ وَبِئْسَ الْقَرَارُ: ان کی تباہی، ہلاکت اور بربادی کا گھر جہنم ہے اور وہی ان کا ٹھکانا ہے، اس کی آگ کی تپش انہیں گھیر لے گی اور کیا ہی برا ٹھہرنے کا مقام ہے وہ!

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ: ان مشرکوں نے اللہ کے لیے ہمسر اور شریک ٹھہرائے تاکہ لوگوں کو اس کی راہ سے بھٹکا دیں، حالانکہ وہ خود پہلے ہی گمراہی میں ڈوب چکے تھے، اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجیے: دنیا کی چند روزہ لذتوں سے فائدہ اٹھالو، خواہشات میں مگن رہو اور شبہات پھیلاتے رہو، مگر یاد رکھو! تمہارا آخری ٹھکانا آگ ہے اور اس کے سوا تمہارے لیے کوئی اور جائے پناہ نہیں۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: اور (اے میرے حبیب ﷺ) اہلِ ایمان سے فرما دیجیے: نماز کو اس کے کامل آداب اور خشوع کے ساتھ قائم کرو اور جو کچھ اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرو، چاہے پوشیدہ طور پر تاکہ ریا سے محفوظ رہو، اور چاہے علانیہ، تاکہ دوسروں کے لیے نمونہ اور ترغیب دینے والے بنو، اس دن کے آنے سے پہلے جب نہ کوئی خرید و فروخت کارگر ہو گی، نہ کوئی فدیہ قبول ہو گا اور نہ ایسی دوستی باقی رہے گی جو عذابِ الٰہی سے بچا سکے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بغیر کسی سابق مثال کے پیدا فرمایا، آسمان سے بارش برسائی اور اس کے ذریعے طرح طرح کے پھل تمہارے رزق کے لیے اگائے، اسی نے تمہارے لیے کشتیوں کو مسخر کیا کہ اس کے حکم سے پانی پر چلتی رہیں اور دریاؤں کو تمہارے قابو میں کیا تاکہ تم ان سے سیراب ہو سکو اور اپنی کھیتیوں اور مویشیوں کو پانی دے سکو۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ: اسی نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے پابندِ نظام بنایا کہ مسلسل گردش کرتے رہیں اور رات و دن کو تمہارے لیے مسخر کیا، رات آرام و سکون کے لیے اور دن محنت و کسبِ معاش کے لیے۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا: اور اس نے تمہیں وہ

سب کچھ عطا کیا جو تم نے مانگا، بلکہ وہ بھی جو تم نے مانگا تک نہیں، اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ہر گز شمار نہ کر سکو گے، وہ اس قدر بے شمار اور رنگا رنگ ہیں، مگر انسان عجب ہے، اپنے نفس پر ظلم کرنے والا اور اپنے رب کی نعمتوں کا بڑا ہی ناشکرا، وہ نعمتوں میں جیتا ہے، مگر منعمِ حقیقی کو بھول جاتا ہے، یہی غفلت اس کی سب سے بڑی محرومی ہے۔

الشَّمْسُ وَالْبَدْرُ مِنْ آيَاتِ قُدْرَتِهِ ۔۔۔ وَالْبَرُّ وَالْبَحْرُ فَيْضٌ مِنْ عَطَايَاهُ
الطَّيْرُ سَبَّحَهُ وَالْوَحْشُ مَجَّدَهُ ۔۔۔ وَالْمَوْجُ كَبَّرَهُ وَالْحُوتُ نَاجَاهُ
وَالنَّمْلُ تَحْتَ الصُّخُورِ الصُّمِّ قَدَّسَهُ ۔۔۔ وَالنَّحْلُ يَهْتِفُ حَمْدًا فِي خَلَايَاهُ
وَالنَّاسُ يَعْصُونَهُ جَهْرًا فَيَسْتُرُهُمْ ۔۔۔ وَالْعَبْدُ يَنْسَى وَرَبِّي لَيْسَ يَنْسَاهُ

ترجمہ: ① سورج اور چاند اُس کی قدرت کی روشن نشانیاں ہیں اور خشکی و سمندر اُس کی عطاؤں کا بے پایاں فیض ہیں۔ ② پرندے اُس کی تسبیح کرتے ہیں، جنگلی جانور اُس کی بزرگی بیان کرتے ہیں، لہریں اُس کی تکبیر کہتی ہیں اور مچھلیاں اُس سے سرگوشیِ راز کرتی ہیں۔ ③ سخت چٹانوں کے نیچے رہنے والی چیونٹی بھی اُس کی پاکی بیان کرتی ہے، اور شہد کی مکھی اپنے چھتّوں میں اُس کی حمد کے نغمے بلند کرتی ہے۔ ④ اور انسان ہے کہ کھلم کھلا اُس کی نافرمانی کرتا ہے، پھر بھی وہ اُس کی پردہ پوشی فرماتا ہے، بندہ بھول جاتا ہے، مگر میرا رب اُسے کبھی نہیں بھولتا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دردانگیز دعائیں

سوال حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کو وادی مکہ میں ٹھہرانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں دعائیں مانگیں، ان کا ترجمہ کیجیے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ {۳۵} رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۳۶} رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ

رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ {۳۷} رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ {۳۸} اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ {۳۹} رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ {۴۰} رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ {۴۱} ابراھیم

جواب ترجمہ: اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب اس شہر کو امن وامان والا بنا دیجیے اور مجھے اور میرے فرزندوں کو اس سے دور رکھیے کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب بلاشبہ ان بتوں نے لوگوں میں سے بہت سوں کو گمراہ کر دیا، سو جو شخص میری پیروی کرے بلاشبہ وہ مجھ سے ہے اور جو شخص میری نافرمانی کرے تو بلاشبہ آپ بخشنے والے ہیں مہربان ہیں۔ اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد کو آپ کے محترم گھر کے نزدیک ایسی وادی میں ٹھہرایا جو کھیتی والی نہیں ہے اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں، سو آپ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دیجیے اور انہیں پھلوں میں سے روزی عطا فرمایئے تاکہ شکر ادا کریں۔ اے ہمارے رب بلاشبہ آپ وہ سب کچھ جانتے ہیں جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور زمین میں اور آسمان میں اللہ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے، بلاشبہ میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔ اے میرے رب مجھے نماز قائم کرنے والا رکھیے اور میری اولاد میں سے بھی، اے ہمارے رب اور میری دعا قبول فرمایئے۔ اے ہمارے رب میری مغفرت فرمایئے اور میرے والدین کی اور مومنین کی جس دن حساب قائم ہو گا۔

بندہ راقم الحروف نے اپنی کتاب ''دعائے انبیاء'' میں قرآن کریم میں موجود تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی اَدعیہ کو جمع کیا ہے، ان کا ترجمہ کیا ہے، ان کی تفسیر بیان کی ہے، ان کا منظر اور پس منظر بیان کیا ہے، جس میں بہت ہی عمدہ مواد پیش کیا گیا ہے، یہاں گنجائش نہیں ہے کہ اس کے اقتباسات پیش کیے جائیں، ناظرین اور شائقین اس کتاب میں دیکھ لیں۔

ہولناکیٔ قیامت کی ادنیٰ سی جھلک

سوال آیات کا ترجمہ کیجیے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۭ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ {۴۲} مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ {۴۳} إبراهيم

جواب ترجمہ: اللہ کو ان کاموں سے بے خبر مت سمجھئے جو ظالم لوگ کرتے ہیں بات یہی ہے کہ وہ انہیں ایسے دن کے لیے مہلت دیتا ہے جس میں آنکھیں اوپر کو اٹھی رہ جائیں گی۔ یہ لوگ دوڑتے ہوں گے سروں کو اوپر کو اٹھائے ہوئے ہوں گے، ان کی نظر ان کی طرف واپس نہ لوٹے گی اور ان کے دل ہوا ہوں گے۔

لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ: یعنی قیامت کے دن ہول اور دہشت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ (تفسیر عثمانی) حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسی ٹکٹکی بندھے گی کہ آنکھ نہ جھپکیں گے) (تفسیر بیان القرآن)

مولانا کیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس دن کی ہولناکی اور دہشت کا یہ حال ہو گا کہ مجرم اپنی پلکیں بھی نہ جھپک سکیں گے اور ان کی آنکھیں مسلسل یہ منظر دیکھ رہی ہوں گی اور بند بھی نہ ہو سکیں گی۔ وہ اسی حالت میں سر اٹھائے اور نظریں سامنے جمائے میدان محشر کی طرف دوڑ رہے ہوں گے وہ نیچے کی طرف بھی نہ دیکھ سکیں گے۔ (تیسیر القرآن)

مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ: یعنی محشر میں سخت پریشانی اور خوف و حیرت سے اوپر کو سر اٹھائے ٹکٹکی باندھے گھبرائے ہوئے چلے آئیں گے۔ (تفسیر عثمانی) **مُهْطِعِيْنَ:** تیزی سے دوڑ رہے ہونگے۔ دوسرے مقام پر فرمایا، **مُهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ۔** (القمر) بلانے والے کی طرف دوڑیں گے اور حیرت سے ان کے سر اٹھے ہوئے ہونگے۔ (مکہ) یعنی خوف و حیرت کے سبب سر اوپر اٹھائے ہوئے بے تحاشا

دوڑ رہے ہوں گے (معارف القرآن) لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ: ہکا بکا ہو کر ایک طرف دیکھتے ہوں گے۔ ذرا پلک بھی نہ جھپکے گی۔ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ: دلوں کا حال یہ ہو گا کہ عقل و فہم اور بہتری کی توقع سے یکسر خالی اور فرط دہشت و خوف سے اڑے جا رہے ہوں گے۔ غرض ظالموں کے لیے وہ سخت حسرت ناک وقت ہو گا۔ (عثمانی)

بیداری کی آخری صدا اور غفلت کا انجام

سوال آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے نیز بتائیے کہ یہ لوگ کن کی اقامت گاہوں میں رہتے تھے؟

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۭ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ {۴۴} وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ {۴۵} ابراھیم.

جواب ترجمہ: اور آپ لوگوں کو اس دن سے ڈرائیے جس دن ان کے پاس عذاب آئے گا، سو جن لوگوں نے ظلم کیا وہ یوں کہیں گے کہ اے ہمارے رب تھوڑی سی مدت کے لیے ہمیں مہلت دیجیے ہم آپ کے بلاوے کو قبول کریں گے اور رسولوں کا اتباع کریں گے کیا تم نے اس سے پہلے قسم نہ کھائی کہ ہمیں کہیں جانا ہی نہیں۔ حالانکہ تم ان لوگوں کے رہنے کی جگہ میں رہتے تھے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور یہ بات تم پر ظاہر ہو گئی کہ ہم نے ان کے ساتھ کیسا معاملہ کیا اور ہم نے تمہارے لیے مثالیں بیان کیں۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ: اور (اے میرے حبیب ﷺ) لوگوں کو اُس دن سے ڈرا دیجیے جب عذاب اُن کے سر پر آ پہنچے گا، پھر وہی لوگ جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، فریاد کریں گے: اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی سی مہلت دے دے، ہم تیری دعوت قبول کر لیں گے اور رسولوں کی پیروی اختیار کر لیں گے۔

یہ فریاد اُس وقت کی ہو گی جب مہلت کا دفتر بند ہو چکا ہو گا اور عمل کی گھڑی بیت چکی ہو گی، دنیا میں جو زبان تکبر سے بند تھی، وہ آخرت میں عاجزی سے کھل جائے گی، جو دل حق سے روگرداں تھا، وہ سزا کو دیکھ کر ایمان کا دعویٰ کرے گا، مگر وہ ایمان اضطرار کا ہو گا، اختیار کا نہیں اور ایسا ایمان نجات کا ذریعہ نہیں بنتا۔

کافر کی سرشت زیادہ تر مادّیت پرستی سے آلودہ ہوتی ہے، وہ اُسی چیز کو مانتا ہے جسے آنکھ دیکھ لے اور ہاتھ چھو لے، جس حقیقت تک حواس کی رسائی نہ ہو، اسے وہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، اس کی بصیرت اتنی گہری نہیں ہوتی کہ پردۂ غیب کے پیچھے جھانک سکے یا انجام کو آغاز میں دیکھ سکے۔

اس کے برعکس اہلِ ایمان کی شان یہ ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور آخرت پر یقینِ کامل، وہ زندگی اور موت کے روزمرہ مناظر کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ حیات بے مقصد نہیں اور موت فنا نہیں بلکہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں انتقال ہے، ان کے نزدیک دنیا کھیتی ہے اور آخرت فصل، یہاں کا ہر عمل وہاں کے انجام سے جڑا ہوا ہے۔ سو، اصل دانش یہ ہے کہ انسان عذاب کو دیکھ کر نہیں، بلکہ اس سے پہلے سن کر اور سمجھ کر سنبھل جائے۔ کیونکہ جو آنکھ قیامت کے منظر سے کھلے، اس کے لیے واپسی کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔

وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ: یعنی تمہارے پچھلے ان ہی بستیوں میں یا ان کے آس پاس آباد ہوئے جہاں اگلے ظالم سکونت رکھتے تھے۔ اور ان ہی کی عادات و اطوار اختیار کیں، حالانکہ یہ تاریخی روایات اور متواتر خبروں سے ان پر روشن ہو چکا تھا کہ ہم اگلے ظالموں کو کیسی کچھ سزا دے چکے ہیں اور ہم نے امم ماضیہ کے یہ قصے کتب سماویہ میں درج کر کے انبیاء علیہم السلام کی زبانی ان کو آگاہ بھی کر دیا تھا، مگر انھیں ذرہ بھر عبرت نہ ہوئی۔ (تفسیر عثمانی)

دشمنانِ اسلام کی سازشیں

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کیجیے۔

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ {۴۶}

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ {۴۷} إبراهيم

جواب ترجمہ: اور ان لوگوں نے اپنا مکر کیا اور اللہ کے سامنے ان کا مکر ہے اور واقعی ان کا مکر ایسا تھا کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں۔ سو اے مخاطب تو اللہ کے بارے میں یہ خیال نہ کر کہ وہ وعدہ خلافی کرنے والا ہے بلاشبہ اللہ غلبہ والا ہے بدلہ لینے والا ہے۔

مشرکین نے نبی کریم ﷺ کے قتل کی تدبیریں کیں، نبی کریم ﷺ کو قید کرنے کی سازشیں کیں، نبی کریم ﷺ کو دیس سے بے دیس کرنے، خانماں سے بے خانماں کرنے، گھر سے بے گھر کرنے کی کوششیں کیں، بلکہ مکہ سے آپ ﷺ کو ہجرت کرنے پر مجبور بھی کر دیا تھا، مشرکین مکہ اسلام اور آفتاب اسلام کو بجھانے کی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے، محافظین اسلام کو ستاتے، تکلیفیں دیتے، مارتے اور آزمائشوں سے دوچار کرتے رہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے خفیہ منصوبے، ان کی کھلی سازشیں سب سامنے ہیں، اللہ ان سب سے واقف ہے، ان کی تدبیریں انہی پر الٹانے پر قادر ہے، ان کی تدبیروں کا، ان کی خفیہ سازشوں کا وبال انہی پر پڑنے والا ہے۔

دین اسلام، الٰہی نظام اور اس کے حاملین کی مثال پہاڑوں جیسی ہے، جس طرح پہاڑ مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں، انہیں کوئی اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکتا، دین اسلام اور اس کے حاملین کو بھی کوئی متزلزل نہیں کر سکتا۔ اللہ دین اسلام، شریعت اور حاملین شریعت کا خود محافظ و نگہبان ہے، یہ لوگ سازشیں اور شرارتیں تو کر سکتے ہیں مگر اللہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ: پس ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ اپنے رسولوں سے کیے گئے وعدے کے خلاف کرے گا، اس کا وعدہ محض الفاظ نہیں، بلکہ اٹل حقیقت ہے، وعدے کو رسولوں پر مقدم ذکر کرنا اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ وعدہ شکنی ذاتِ الٰہی کے شایانِ شان ہی نہیں، خواہ وعدہ کسی رسول سے ہو یا کسی اور سے، اللہ نے اپنے رسولوں سے غلبے کا وعدہ فرمایا ہے، حق کو سربلند اور باطل کو مغلوب ہونا ہے، یہی وہ ازلی قانون ہے جس کی گواہی تاریخ بھی دیتی ہے اور وحی بھی۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ: ارشاد فرمایا کہ یقیناً اللہ غالب ہے، قوت والا ہے اور انتقام لینے والا ہے، اس کا "عزیز" ہونا اس کے کامل اقتدار کی دلیل ہے، وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت اور اس کا "ذو انتقام" ہونا اس امر کی ضمانت ہے کہ باطل کو مہلت تو مل سکتی ہے، مگر چھوٹ نہیں، اس کا انتقام اندھی سختی نہیں، بلکہ عدل پر مبنی جزا ہے، جرم کے مطابق سزا اور زیادتی کے برابر مواخذہ، پس انجام کار حق ہی کا غلبہ ہے اور یہ وعدہ ایسا ہے جس میں نہ تاخیر کا اندیشہ ہے، نہ تخلّف کا۔

زمین و آسمان کی تبدیلی، مجرمین کا انجام

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ {۴۸} وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ {۴۹} سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ {۵۰} لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ {۵۱} هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ {۵۲} ابراهيم.

جواب ترجمہ: جس روز زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی بدل جائیں گے اور سب لوگ اللہ کے لیے ظاہر ہو جائیں گے جو واحد قہار ہے۔ اور اے مخاطب تو اس دن مجرموں کو اس حال میں دیکھے گا کہ وہ باہم آپس میں بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ اور ان کے کرتے قطران کے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ نے ڈھانک رکھا ہو گا۔ تاکہ ہر جان کو اس کے کیے ہوئے اعمال کی سزا دے بلاشبہ اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ یہ پہنچا دینا ہے لوگوں کو اور تاکہ وہ اس کے ذریعے ڈرائے جائیں اور تاکہ وہ جان لیں کہ وہی ایک معبود برحق ہے اور تاکہ عقل والے نصیحت حاصل کریں۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے دشمنوں سے

انتقام لے گا، یہ وہ دن ہو گا جس دن زمین دوسری زمین کی شکل میں سفید، صاف اور اجلی چاندی میں تبدیل کر دی جائے گی، اس دن آسمان دوسرے آسمان کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ: یہ وہ دن ہو گا جس میں مخلوق اپنی اپنی قبروں سے زندہ ہو کر نکلے گی، یہ لوگ ایک اکیلے زبردست اللہ کے سامنے ہوں گے، جو اپنی عظمت، اپنے ناموں، اپنی صفات، اپنے افعال کے لحاظ سے متفرد اور یگانہ ہے، وہ ہر چیز پر غالب ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ قیامت کو یہ زمین و آسمان بہیئت موجودہ باقی نہ رہیں گے، یا تو ان کی ذوات ہی بدل دی جائیں گی یا صرف صفات میں تغیر ہو گا اور بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ شاید متعدد مرتبہ تبدیل و تغیر کی نوبت آئے گی۔ (تفسیر عثمانی)

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت میں دونوں احتمال ہیں کہ یہ تبدیلی صفات کے لحاظ سے ہو یا ذات کے لحاظ سے، یعنی یہ آسمان و زمین اپنی صفات کے اعتبار سے بدل جائیں گے یا ویسے ہی ذاتی طور پر یہ تبدیلی آئے گی، نہ زمین رہے گی اور نہ یہ آسمان، زمین بھی کوئی اور ہو گی اور آسمان بھی کوئی اور حدیث میں آتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، **يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى أَرْضٍ بَيْضَاءَ عَفْرَاءَ، كَقُرْصَةِ النَّقِيِّ، لَيْسَ فِيهَا عَلَمٌ لِأَحَدٍ** (مسلم) قیامت والے دن لوگ سفید بھوری زمین پر اکٹھے کیے جائیں گے جو میدہ کی روٹی کی طرح ہو گی، اس میں کسی کا کوئی جھنڈا (یا علامتی نشان) نہیں ہو گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ جب یہ آسمان و زمین بدل دیئے جائیں گے تو پھر لوگ اس دن کہاں ہونگے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صراط پر یعنی پل صراط پر (مسلم) ایک یہودی کے پوچھنے پر آپ نے فرمایا کہ لوگ اس دن پل کے قریب اندھیرے میں ہونگے (صحیح مسلم)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ زمین و آسمان کے بدل دینے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی صفات اور شکل و صورت بدل دی جائے جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات اور روایات

حدیث میں ہے کہ پوری زمین ایک سطح مستوی بنا دی جائے گی جس میں نہ کسی مکان کی آڑ ہو گی نہ درخت وغیرہ کی نہ کوئی پہاڑ اور ٹیلہ رہے گا نہ غار اور گہرائی قرآن کریم میں اسی حال کا ذکر اس طرح فرمایا ہے، لَا تَرٰی فِیۡهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمۡتًا یعنی تعمیرات اور پہاڑوں کی وجہ سے جو آج کل راستے اور سڑکیں مڑ کر گذرتی ہیں اور کہیں اونچائی ہے کہیں گہرائی یہ صورت نہ رہے گی بلکہ سب صاف میدان ہو جائے گا۔

اور تبدیلی زمین و آسمان کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بالکل ہی اس زمین کے بدلے میں دوسری زمین اور اس آسمان کی جگہ دوسرے آسمان بنا دیئے جائیں روایات حدیث جو اس کے متعلق منقول ہیں ان میں بھی بعض دوسرے آسمان بنا دیئے جائیں روایات حدیث جو اس کے متعلق منقول ہیں ان میں بھی بعض سے صرف صفات کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے بعض سے ذات کی تبدیلی۔ (معارف القرآن)

امام حدیث بیہقی نے بسند صحیح حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر کی زمین بالکل نئی زمین چاندی کی طرح سفید ہو گی اور یہ زمین ایسی ہو گی جس پر کسی نے کوئی گناہ نہیں کیا ہو گا جس پر کسی کا ناحق خون نہیں گرایا گیا اسی طرح مسند احمد اور تفسیر ابن جریر کی حدیث میں یہی مضمون بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ مذکور ہے (مظہری)

صحیحین بخاری و مسلم میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ ایک ایسی زمین پر اٹھائے جائیں گے جو ایسی صاف و سفید ہو گی جیسے میدے کی روٹی اس میں کسی کی کوئی علامت (مکان، باغ، درخت، پہاڑ، ٹیلہ وغیرہ کی) کچھ نہ ہو گی یہی مضمون بیہقی نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

اور حاکم نے سند قوی کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز یہ زمین اس طرح کھینچی جائے گی جیسے چمڑے کو کھینچا جائے جس سے اس کی سلوٹیں اور شکن نکل جائیں (اس کی وجہ سے زمین کے غار اور پہاڑ سب برابر ہو کر ایک سطح مستوی بن جائے

گی اور اس وقت تمام اولاد آدم اس زمین پر جمع ہو گی اس ہجوم کی وجہ سے ایک انسان کے حصہ میں صرف اتنی ہی زمین ہو گی جس پر وہ کھڑا ہو سکے پھر محشر میں سب سے پہلے مجھے بلایا جائے گا میں رب العزت کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا پھر مجھے شفاعت کی اجازت دی جائے گی تو میں تمام مخلوق کے لئے شفاعت کروں گا کہ ان کا حساب کتاب جلد ہو جائے۔

اس آخری روایت سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں تبدیلی صرف صفت کی ہو گی کہ غار اور پہاڑ اور عمارت اور درخت نہ رہیں گے مگر ذات زمین یہی باقی رہے گی اور پہلی سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر کی زمین اس موجودہ زمین کے علاوہ کوئی اور ہو گی اور جس تبدیلی کا ذکر اس آیت میں ہے اس سے ذات کی تبدیلی مراد ہے۔

بیان القرآن میں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا ہے کہ پہلے نفخہ صور کے وقت اسی موجودہ زمین کی صفات تبدیل کی جائیں اور پھر حساب کتاب کے لئے ان کو کسی دوسری زمین کی طرف منتقل کیا جائے۔ تفسیر مظہری میں مسند عبد ابن حمید سے حضرت عکرمہ کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے اس کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ زمین سمٹ جائے گی اور اس کے پہلو میں ایک دوسری زمین ہو گی جس پر لوگوں کو حساب کتاب کے لئے کھڑا کیا جائے گا۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ: اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! آپ قیامت کے دن ان مجرموں کو بیڑیوں میں جکڑا ہوا دیکھیں گے، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں زنجیروں کے ساتھ جکڑے ہوئے ہوں گے، یہ لوگ سخت ذلت اور خواری میں ہوں گے، ان کے کپڑے شعلہ زن سخت تارکول سے ہوں گے، ان کے چہروں کو آگ جھلسا دے گی اور جلا دے گی۔

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ: اس آیتِ کریمہ میں عذابِ آخرت کی ایک نہایت ہولناک اور عبرت انگیز تصویر کھینچی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے **:سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ** ان

کے لباس قطران کے ہوں گے، سَرَابِیل دراصل سِرْبَالٌ کی جمع ہے، یعنی وہ قمیص جو جسم سے چمٹ کر اُسے مکمل طور پر ڈھانپ لے اور کوئی خلا باقی نہ چھوڑے، یہاں یہ لباس کسی آرام یا حفاظت کا ذریعہ نہیں، بلکہ خود عذاب کا سامان ہے، قَطِرَان ایک گاڑھا مادہ ہے جو بعض درختوں سے نکالا جاتا ہے، جسے دنیا میں اونٹوں کے علاج کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، مگر اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آگ کو فوراً بھڑکا دیتا ہے۔ پس جب ان مجرموں کے جسموں سے چمٹی ہوئی قمیصیں اسی قطران کی ہوں گی تو وہ خود آگ کا ایندھن بن جائیں گی، یوں شعلے ان کے جسموں کو ہر طرف سے گھیر لیں گے، آگ باہر سے بھی لپٹے گی اور لباس کے ذریعے اندر تک سرایت کرے گی، یہ ایسا عذاب ہو گا جس میں جسم کا کوئی حصہ محفوظ نہ رہے گا۔

چونکہ قمیصیں عموماً چہرے کو نہیں ڈھانپتیں، اس لیے فرمایا :وَتَغْشَى وُجُوهَهُمُ النَّارُ اور آگ ان کے چہروں کو بھی ڈھانپ لے گی۔ یعنی جیسے ان کے جسم قطران کی جلتی ہوئی پوشاک سے لپٹے ہوں گے، ویسے ہی ان کے چہرے براہِ راست شعلوں کی لپیٹ میں ہوں گے، یوں ظاہری و باطنی ہر پہلو سے عذاب ان پر محیط ہو گا۔ اس ہولناک منظر کے بیان کے بعد قرآن مجید خود اس کی حکمت واضح فرماتا ہے: لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ: تاکہ اللہ ہر جان کو اس کے کیے کا پورا بدلہ دے، بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ پھر فرمایا:

هَٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ: یعنی یہ بیان سراسر انسانوں کے لیے پیغام ہے، تاکہ وہ اپنے اعمال کے انجام سے باخبر ہوں تاکہ بدکار اپنے انجام سے ڈریں. تاکہ سب جان لیں کہ معبودِ برحق صرف ایک اللہ ہے، اسی کی الوہیت اور اسی کی قہاری مطلق ہے اور تاکہ اہلِ عقل و بصیرت نصیحت حاصل کریں، یوں آیت

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ رُسُلَهُ سے لے کر اس عذاب کے بیان تک ایک مسلسل پیغام سامنے آتا ہے: اوّلاً، یہ عدلِ الٰہی کا اعلان ہے کہ کوئی عمل بے حساب نہ رہے گا۔ ثانیاً، یہ اعمال اور ان

کے نتائج کا واضح ابلاغ ہے۔ ثالثاً، یہ اہلِ شر کے لیے تنبیہ ہے کہ ان کا انجام کس قدر ہولناک ہو سکتا ہے۔ رابعًا، یہ توحیدِ خالص کی دلیل ہے کہ حقیقی اقتدار اور فیصلہ صرف اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کے ہاتھ میں ہے۔ خامسًا، یہ اہلِ ایمان اور صاحبانِ عقل کے لیے یاد دہانی اور تذکیر ہے۔ یہی قرآن کا انداز ہے، ایک طرف وعید کی شدت، دوسری طرف حکمتِ عدل کا بیان، ایک طرف خوف کی تصویر، دوسری طرف توحید اور بصیرت کی دعوت، یہی اس کا ابدی پیغام ہے اور یہی اس کا زندہ معجزہ۔

الحمدللہ آج رمضان المبارک کی بابرکت گھڑیوں میں سورۃ ابراہیم کے اضافات وترمیمات کی تکمیل ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ اس عاجزانہ ومتواضع کاوش کو قبول ومنظور فرمائے۔ آمین یارب العالمین

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی، جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

اضافات جدیدہ وترمیمات: ۱۳ر مضان المبارک ۱۴۴۷ھ، بعد قبیل نماز ظہر ۱۳مارچ ۲۰۲۶ء

سورۃ الحجر (تعارف)

سوال سورۃ الحجر کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ الحجر قرآنِ کریم کی چودھویں سورت ہے اور بالاتفاق مکی سورتوں میں شمار ہوتی ہے، اس کی آیات کی تعداد ننانوے (۹۹) ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب مکہ کی فضا میں انکار، استہزا اور ضد کی شدت بڑھ چکی تھی، ایسے ماحول میں یہ سورت نازل ہوئی تاکہ ایک طرف منکرین کو انجامِ بد سے آگاہ کرے اور دوسری طرف رسولِ اکرم ﷺ کے قلبِ مبارک کو تسلی اور ثبات عطا کرے، یہ سورت اپنے اسلوب میں نہایت جلالی ہے، اس میں دلائل بھی ہیں، تاریخی شواہد بھی، وعید بھی ہے اور تسلی بھی، تخویف بھی ہے اور توحید کا جلال بھی، گویا یہ سورت حق و باطل کے معرکے میں ایک مضبوط فکری دیوار کی حیثیت رکھتی ہے۔

وجہ تسمیہ: اس سورت کا نام آیتِ مبارکہ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ سے ماخوذ ہے، "الحجر" دراصل اس قوم کی بستی کا نام ہے جو حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تھی، انہیں "اصحابُ الحجر" اس لیے کہا گیا کہ وہ پہاڑوں کو تراش کر اپنے گھر بناتے تھے، ان کی مضبوط عمارتیں اور سنگی قلعے (پتھروں سے بنے ہوئے قلعے) انہیں غرور میں مبتلا کر چکے تھے، مگر جب انہوں نے حق کو جھٹلایا تو وہی مضبوط بستیاں ان کے لیے عذاب سے بچاؤ کا ذریعہ نہ بن سکیں، یوں سورت کا نام ہی اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ ظاہری طاقت، سنگی عمارتیں اور مادی اسباب اللہ کے عذاب کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

اہم مضامین: ① کفار کو انجامِ بد سے خبردار کرنا: سورت کا آغاز ہی اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب منکرین اپنے کفر پر نادم ہوں گے، انہیں بار بار متنبہ کیا گیا کہ دنیا کی مہلت دھوکے میں نہ ڈالے۔ ② سابقہ قوموں کی ہلاکت کا بیان: قومِ لوط، اصحابُ الأیکہ اور اصحابُ الحجر کے واقعات نہایت بلیغ انداز میں بیان کیے گئے ہیں، ان واقعات کا مقصد قصہ گوئی نہیں، بلکہ یہ دکھانا

ہے کہ تکذیبِ رسالت کا انجام ہمیشہ تباہی رہا ہے۔ ③ تخلیقِ آدم اور ابلیس کا انکار: حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، فرشتوں کو سجدے کا حکم اور ابلیس کا تکبر، یہ سب اس لیے بیان ہوا کہ انسان سمجھے، اصل گمراہی تکبر ہے، ابلیس نے عبادت کی کمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ غرور کی وجہ سے لعنت مول لی۔

④ کائنات میں آیاتِ الٰہی: آسمانوں کی بلندی، زمین کی وسعت، ہواؤں کی گردش، بارش کا نزول، یہ سب اللہ کی قدرت کے مظاہر ہیں، سورت بتاتی ہے کہ جو آنکھ کھول کر دیکھے، اسے ہر سمت ربّ کی نشانیاں دکھائی دیتی ہیں۔

⑤ رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی اور صبر کی تلقین منکرین کی باتوں سے دل تنگ نہ ہو۔ حکم دیا گیا. صبر اختیار کیجیے. درگزر کیجیے (صفحِ جمیل) اور اپنے ربّ کی تسبیح وعبادت میں مشغول رہیے، یہ گویا دعوتِ حق کے ہر داعی کے لیے دائمی منشور ہے۔

عظمت قرآن

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ {۱} الحجر

جواب ترجمہ: الٓرٰ یہ آیات ہیں کتاب کی اور قرآن مبین کی۔

حروف مقطعات: سورت کا آغاز حروفِ مقطعات "الر" سے ہوتا ہے، ان حروف کے بارے میں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ان کا قطعی مفہوم اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، یہ ان متشابہات میں سے ہیں جن کا علم ربِّ کائنات نے اپنی ذات کے ساتھ خاص فرمایا ہے، اہلِ ایمان کا شیوہ یہ ہے کہ وہ ان پر ایمان لاتے ہیں اور بے جا کھوج میں نہیں پڑتے، کیونکہ متشابہات کے پیچھے پڑنا اہلِ زیغ کا طریقہ ہے، مؤمن کی زبان پر تو یہی دعا رہتی ہے رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً، اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کرنا اور ہمیں اپنی طرف سے مہربانی عطا فرما دیجیے۔

البتہ ان حروف کی حکمت پر غور کیا جا سکتا ہے، ان میں ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ قرآن انہی حروف سے مرکب ہے جنہیں عرب جانتے اور بولتے تھے، مگر اسی کے باوجود وہ اس جیسی کتاب لانے سے عاجز رہے، یہ عجز اس بات کی روشن دلیل ہے کہ یہ کلام انسانی نہیں بلکہ ربانی ہے، نیز عربوں نے باہم یہ طے کر رکھا تھا کہ قرآن کو نہ سنیں گے یا شور و غوغا سے اس کی تاثیر کو دبائیں گے، چنانچہ جب سورتوں کا آغاز انہی منفرد صوتی حروف سے ہوتا تو ان کی توجہ بے اختیار کھنچ جاتی اور وہ اپنے طے شدہ عہد کو توڑ کر سننے پر مجبور ہو جاتے۔ ان حروف کے بعد فرمایا گیا :

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُبِينٍ: یہ اشارہ یا تو پوری سورت کی طرف ہے یا ان آیات کی طرف جو ابھی تلاوت کی جا رہی ہیں۔ الْكِتَابِ کے معنی ہیں لکھا ہوا صحیفہ، گویا یہ وہ آیات ہیں جو کتابِ الٰہی کا حصہ ہیں، ایسی کتاب جو بذاتِ خود معجزہ ہے، قرآن کی ہر آیت اپنی جگہ معجزہ ہے، اسی لیے نزول کے دوران ہی اس سے تحدی کی جاتی رہی۔

پھر انہی آیات کو ایک اور وصف سے متصف فرمایا: قُرْآنٍ مُبِينٍ یعنی کھلا ہوا، روشن، واضح پڑھا جانے والا کلام، یہ صرف لکھا ہوا صحیفہ نہیں بلکہ پڑھا اور سنایا جانے والا نور بھی ہے، یہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا، اسی کی حفاظت میں رہا، اور اسی کے حکم سے پڑھایا گیا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کو ارشاد ہوا:

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ○ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ○ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ○ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ

اس طرح قرآن دوہری حفاظت میں محفوظ ہوا، سطور میں بھی لکھا گیا اور صدور میں بھی محفوظ رہا، سینوں کی حفاظت نے صفحوں کی حفاظت کو یقینی بنا دیا، تحریر اور تلاوت دونوں کے تواتر نے اسے ہر قسم کی تحریف سے محفوظ رکھا۔

لوگوں نے اسے سنا، کچھ ایمان لے آئے اور بہت سوں نے انکار کیا، اہلِ ایمان نے اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کو پیشِ نظر رکھا، جبکہ منکرین نے سرکشی اختیار کی، ظلم کیا اور دوسروں کو بھی راہِ حق

سے روکنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ واضح فرما دیتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب یہی منکرین تمنا کریں گے کہ کاش وہ اسلام قبول کر لیتے، یوں سورت کی پہلی آیت ہی اعلان کر دیتی ہے کہ یہ کوئی معمولی کلام نہیں، یہ کتاب بھی ہے اور قرآن بھی، لکھا ہوا بھی اور پڑھا ہوا بھی اور ہر پہلو سے روشن، واضح اور ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

کافروں کی حسرت

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ {۲} الحجر

جواب ترجمہ: جن لوگوں نے کفر کیا وہ بہت سی مرتبہ یہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آج منکرین نے قرآن و اسلام جیسی عظیم الشان نعمت الٰہیہ کی قدر نہیں کی لیکن ایسا وقت آنے والا ہے جب یہ لوگ اپنی محرومی پر ماتم کریں گے اور دست حسرت مل کر کہیں گے کاش ہم مسلمان ہوتے! وہ وقت کب آئے گا؟ اس میں اختلاف ہوا ہے ہم ابن الانباری کے قول کے موافق اس کو عام رکھتے ہیں۔ یعنی دنیا و آخرت میں جو مواقع کافروں کی نامرادی اور مسلمانوں کی کامیابی کے پیش آتے رہیں گے ہر موقع پر کفار کو رو رو کر اپنے مسلمان ہونے کی تمنا اور نعمت اسلام سے محروم رہ جانے کی حسرت ہو گی۔

اس سلسلہ میں پہلا موقع تو جنگ بدر کا تھا جہاں کفار مکہ نے مسلمانوں کی طرف کھلا ہوا غلبہ اور تائید غیبی دیکھ کر اپنے دلوں میں محسوس کیا کہ جس اسلام نے فقراء مہاجرین اور اوس و خزرج کے کاشتکاروں کو اونچی ناک والے قریشی سرداروں پر غالب کیا، افسوس ہم اس دولت سے محروم ہیں۔ اسی طرح اسلامی فتوحات و ترقیات کی ہر ایک منزل پر کفار کو اپنی تہی دستی و حرمان پر پچھتانے اور دل سے اشک حسرت بہانے کا موقع ملتا رہا۔

انتہائی حسرت و افسوس کا مقام وہ ہو گا جب فرشتہ جان نکالنے کے لیے سامنے کھڑا ہے اور عالم

غیب کے حقائق آنکھوں سے نظر آرہے ہیں۔ اس وقت ہاتھ کاٹیں گے اور آرزو کریں گے کہ کاش ہم نے اسلام قبول کر لیا ہوتا کہ آج عذاب بعد الموت سے محفوظ رہ سکتے۔

اس سے بھی بڑھ کر یاس انگیز نظارہ وہ ہو گا جو طبرانی کی حدیث میں ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے بہت سے آدمی اپنے گناہوں کی بدولت جہنم میں جائیں گے اور جب تک خدا چاہے گا وہاں رہیں گے۔ بعدہ (اس کے بعد) مشرکین ان پر طعن کریں گے کہ تمہارے ایمان و توحید نے تم کو کیا فائدہ دیا؟ تم بھی آج تک ہماری طرح دوزخ میں ہو، اس پر حق تعالیٰ کسی مؤحد کو جہنم میں نہ چھوڑے گا۔ یہ فرما کر نبی کریم ﷺ نے یہ آیت پڑھی رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ (الحجر: ۲) گویا یہ آخری موقع ہو گا جب کفار اپنے مسلمان ہونے کی تمنا کریں گے۔ (تفسیر عثمانی)

جب اہل ایمان گناہ گار دوزخ سے نکالے جائیں گے تو کافر حسرت کریں گے کہ اے کاش! وہ بھی مؤحد ہوتے، توحید کو مانتے اور تسلیم کرتے، تاکہ وہ بھی آج اہل ایمان کی طرح دوزخ سے نکالے جاتے۔

کافروں کی لمبی امیدیں

سوال اس آیت مبارکہ میں کسے کن لوگوں کے بارے میں حکم دیا گیا؟

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ {۳} الحجر

جواب ترجمہ: (اے میرے حبیب ﷺ!) آپ انہیں چھوڑیئے وہ کھالیں اور نفع اٹھالیں اور امید انہیں غفلت میں ڈالے رکھے، سو وہ عنقریب جان لیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو فرمایا کہ آپ کا کام وعظ و نصیحت ہے، ہمدردی اور خیر خواہی ہے، ان کو دوزخ سے نکال کر جنت کی طرف لیجانا ہے، مگر ان لوگوں کو اس بات کا احساس نہیں کہ ایک شخص ہمارے ساتھ کس قدر ہمدردی رکھتا ہے، اس لیے آپ انہیں ان کے حال پر ہی چھوڑ دیں، یہ دنیا کی چیزوں کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں، یہاں مزے اڑاتے رہیں، کھاتے پیتے رہیں، لمبی لمبی امیدیں اور آرزوئیں باندھتے رہیں، ان کو ان کی لمبی خواہشات، لمبی آرزوؤں نے آخرت کی سدا بہار

زندگی سے غافل کر رکھا ہے، اس لیے ان کو ان کے حال پر رہنے دیجیے، یہ سمجھنے والے اور غور کرنے والے، اپنے نفع اور نقصان کو سمجھنے والے نہیں ہیں۔

خدائی گرفت و سزا کا وقت طے ہے

سوال آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۵﴾ الحجر.

جواب ترجمہ: اور ہم نے جتنی بستیاں ہلاک کی ہیں ان سب کے لیے ایک مقرر وقت لکھا ہوا تھا۔ کوئی قوم اپنے وقت مقرر سے نہ پہلے ہلاک ہوئی ہے نہ پیچھے رہی ہے۔

کسی قوم کے کفر کرتے ہی، کسی کو نافرمانی کرتے ہی نہیں پکڑا جاتا، بلکہ اس کی نافرمانیاں بسا اوقات بڑھنے دی جاتی ہیں، تاکہ اتمام حجت ہو جائے، جب کوئی قوم اور کسی جگہ کے رہنے والے اپنی شر انگیزیوں کی تمام حدود پھلانگنے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنی گرفت میں لیتے ہیں، اللہ ڈھیل دیتے جاتے ہیں، ڈھیل کے بعد پکڑتے ہیں تو ان کی پکڑ بڑی ہی سخت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے کس قوم کو اس کی بداعمالیوں کے سبب پکڑنا ہے اور سزا دینا ہے اس کے ہاں سب کچھ لکھا ہوا موجود ہے، اس کی پکڑ کا ایک وقت طے شدہ ہے، اس طے شدہ وقت سے تقدیم اور تاخیر نہیں ہو سکتی۔ اس لیے نبی کریم ﷺ کے مخالفین اور اسلام دشمن یہ خیال نہ کریں کہ وہ جو چاہیں کرتے رہیں انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔

قرآن کی حفاظت کا ربانی وعدہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے، جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو تبدیل ہونے، محرف ہونے سے محفوظ کیا ہے، قرآن کریم میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۶﴾ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ

مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۷﴾ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا کَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِیْنَ ﴿۸﴾ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾ الحجر

جواب ترجمہ: اور ان لوگوں نے کہا کہ اے وہ شخص جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے بیشک تو دیوانہ ہے۔ تو فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتا اگر تو سچوں میں سے ہے۔ فرشتوں کو ہم فیصلہ کے ساتھ ہی نازل کیا کرتے ہیں اور اس وقت لوگوں کو مہلت بھی نہیں دی جاتی۔ بلاشبہ ہم نے ذکر کو نازل کیا ہے اور بلاشبہ ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

وَقَالُوْا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّکْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ: مکہ کے کافر، اپنی ہٹ دھرمی اور انکار کی شدت میں، رسولِ اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے طنزیہ انداز میں کہتے تھے، ”اے وہ شخص! جس پر تمہارے بقول ذکر نازل کیا گیا ہے! تم تو یقیناً مجنون ہو “ یہ الفاظ دراصل دلیل کا جواب دلیل سے نہ دے سکنے کی بے بسی تھے، جب حجت پوری ہو جائے اور سچائی دل میں اترنے لگے تو متکبر انسان کا آخری سہارا تمسخر رہ جاتا ہے، انہوں نے وحیِ الٰہی کو ”ذکر“ کہہ کر تسلیم تو کیا، مگر اس اعتراف کے ساتھ استہزا کا زہر بھی گھول دیا، گویا وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر یہ واقعی آسمانی پیغام ہے تو پھر اس کے لانے والا ہماری نظر میں کیوں ایک عام بشر ہے؟ پھر انہوں نے مطالبہ کیا:

لَوْ مَا تَاْتِیْنَا بِالْمَلٰٓئِکَةِ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ: ”اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتے لے آؤ! وہ تمہاری گواہی دیں، یا ہمیں ہمارے کفر کے سبب ہلاک کر دکھاؤ!“ یہ مطالبہ ہدایت کی طلب میں نہ تھا، بلکہ عناد کی انتہا تھی، تاریخ گواہ ہے کہ جب قومیں فرشتوں کے نزول کا مطالبہ کرتی ہیں تو وہ دراصل اپنے انجام کو دعوت دے رہی ہوتی ہیں، کیونکہ فرشتوں کا نزول بطورِ گواہی نہیں بلکہ بطورِ فیصلہ بھی ہوتا ہے۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا کَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِیْنَ: اللہ تعالیٰ نے ان کی اس جسارت کا جواب دیا کہ ہم فرشتوں کو محض تمہاری خواہش پر نازل نہیں کرتے، ان کا نزول حکمت کے تابع ہے، جب

عذاب کا وقت آتا ہے، جب فیصلہ صادر ہو جاتا ہے، تب فرشتے اترتے ہیں اور جب وہ اس شان سے آتے ہیں تو پھر مہلت باقی نہیں رہتی، اس کے بعد نہ توبہ کی گنجائش ہوتی ہے، نہ رجوع کا موقع۔

گویا انہیں متنبہ کر دیا گیا کہ جس چیز کا مطالبہ تم کر رہے ہو، وہ دراصل تمہاری ہلاکت کی گھڑی ہے، اگر فرشتے اس طرح آ گئے اور پھر بھی تم ایمان نہ لائے تو فوراً عذاب میں پکڑ لیے جاؤ گے۔

یہ آیات ہمیں ایک مستقل اصول سکھاتی ہیں، اللہ کی سنت یہ نہیں کہ ہر ضدی مطالبے پر خارقِ عادت نشانیاں دکھائی جائیں، ہدایت کا دروازہ دلیل اور وحی کے ذریعے کھولا جاتا ہے، جب کہ عذاب کا دروازہ ضد، تکبر اور اصرار پر کھلتا ہے۔ یہاں کفار کا استہزا بھی آشکار ہوا، ان کا مطالبۂ معجزہ بھی اور اس کے جواب میں عدلِ الٰہی کا ضابطہ بھی، کہ مہلت حکمت کے تحت ہے اور عذاب بھی حکمت کے تحت، لیکن جب فیصلہ ہو جائے تو پھر واپسی کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ: قرآن کریم سے پہلے جو صحائف اور کتابیں نازل ہوئیں ان کی حفاظت کی ذمہ داری انہی لوگوں کے سپرد کی گئی تھی، جن کے لیے اتاری گئی تھیں، مگر قرآن کریم کو اللہ نے یہ اعزاز اور امتیاز بخشا کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری کسی اور کے سپرد نہیں کی گئی بلکہ اس کا محافظ خود رب العالمین ہے، سورۃ الحجر کی اس آیت میں اللہ نے واضح کر دیا کہ اسے اتارا ہم نے ہے اور ہم ہی اس کے محافظ اور پاسبان ہیں۔ تفسیر تیسیر القرآن میں قرآن کریم کی حفاظت کے بہت سے ذرائع بیان کیے گئے ہیں۔

حفاظت قرآن بذریعہ کتابت: حفاظت قرآن کے کئی پہلو ہیں اور یہ حفاظت بذریعہ کتابت بھی کی گئی اور بذریعہ حفظ بھی اور اس حفاظت کا تمام تر کام اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے لیا، بذریعہ کتابت قرآن کریم کی حفاظت کے سلسلہ میں درج ذیل دو احادیث ملاحظہ فرمائیے۔

① سیدنا زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ (کاتب وحی) کہتے ہیں کہ جب (۱۱ھ میں) یمامہ کی لڑائی میں (جو مسیلمہ کذاب سے ہوئی تھی) بہت سے صحابہ شہید ہو گئے تو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے بلا بھیجا،

اس وقت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی ان کے پاس موجود تھے، میں گیا تو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے پاس عمر آئے اور کہا کہ یمامہ کی لڑائی میں بہت سے مسلمان شہید ہو گئے اور میں ڈرتا ہوں کہ اگر اسی طرح اور لڑائیوں میں بھی مسلمان مارے جائیں تو بہت سا قرآن دنیا سے اٹھ جائے گا۔ اگر قرآن کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو یہ ڈر نہ رہے گا، لہذا آپ قرآن کو جمع کرا دیں اور میں (ابو بکر رضی اللہ عنہ) نے عمر کو یہ جواب دیا کہ میں وہ کام کیسے کروں جسے رسول اللہ نے نہیں کیا عمر کہنے لگے۔ اللہ کی قسم! یہ اچھا کام ہے اور بار بار یہی کہتے رہے تا آنکہ اللہ نے میرا سینہ کھول دیا اور میں عمر کی رائے سے متفق ہو گیا۔

سیدنا زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عمر خاموشی سے یہ بات سنتے رہے پھر سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مجھے کہنے لگے تم جوان اور عاقل ہو اور ہم تمہیں سچا جانتے ہیں اور دورِ نبوی میں کاتب وحی رہے ہو تو اب ایسا کرو کہ قرآن (کی جابجا لکھی ہوئی تحریروں) کو تلاش کرو اور سب کو اکٹھا کر دو۔

زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اگر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مجھے پہاڑ ڈھونے کو کہتے تو مجھے اتنا مشکل معلوم نہ ہوتا جتنا قرآن جمع کرنا معلوم ہوا آخر میں نے کہا تم دونوں ایسا کام کرتے ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہنے لگے اللہ کی قسم! یہ اچھا کام ہے میں نے ان سے بڑا تکرار کیا تا آنکہ اللہ نے میرا سینہ بھی کھول دیا اور میں نے یہ کام شروع کر دیا، قرآن کہیں پرچوں پر، کہیں مونڈھے کی ہڈیوں پر، کہیں کھجور کی لکڑیوں پر لکھا ہوا تھا پھر اکثر لوگوں کو یاد بھی تھا، یہاں تک کہ میں نے سورہ توبہ کی آخری دو آیتیں یعنی

(لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (التوبہ ۱۲۸) تا آخر، خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کے ہاں نہ پائیں، پھر یہ مصحف جس میں قرآن جمع کیا تھا، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زندگی تک ان کے پاس رہا، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی تک ان کے پاس رہا، ان کی وفات کے بعد ام المومنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو ملا۔ (بخاری، کتاب التفسیر، سورہ توبہ۔ باب جمع القرآن)

② سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے جن دنوں وہ شام و عراق کے مسلمانوں کے ساتھ آرمینیا اور آذربائیجان فتح کرنے کی خاطر جہاد کر رہے تھے، وہ قرآن کی قرأت میں مسلمانوں کے اختلاف سے گھبرائے ہوئے تھے، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: امیر المومنین! اس سے پہلے کہ مسلمان یہود اور نصاریٰ کی طرح قرآن میں اختلاف کرنے لگیں، اس امت کی خبر لیجئے، چنانچہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو لکھ بھیجا کہ ہمیں اپنا مصحف بھیج دیں، ہم اس کی نقول تیار کر کے آپ کا مصحف آپ کو واپس کر دیں گے چنانچہ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے بھیج دیا۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، سعید بن عاص رضی اللہ عنہ اور عبد الرحمن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، انہوں نے اس کی نقلیں تیار کیں، آپ نے یہ ہدایت کر دی تھی کہ اگر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (انصاری) قرأت کے بارے میں باقی تینوں (قریشی) لوگوں سے اختلاف کریں تو قریش کے محاورہ کے مطابق لکھنا کیونکہ قرآن انہی کے محاورہ پر اترا ہے، جب نقلیں تیار ہو گئیں تو آپ نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کا مصحف انہیں واپس کر دیا اور اس کی ایک نقل ہر مرکزی مقام میں بھجوا دی، نیز حکم دیا کہ لوگوں کے پاس جو الگ الگ پرچیوں اور اوراق میں لکھا ہوا قرآن موجود ہے اسے جلا دیا جائے۔ (بخاری، کتاب التفسیر۔ باب جمع القرآن)

تحریف لفظی سے بچاؤ کی صورتیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبانی حفاظت قرآن پر نسبتاً بہت زیادہ توجہ دی تھی، سب سے پہلے تو حافظ قرآن آپ خود تھے، جتنا قرآن نازل ہو چکا ہوتا، رمضان میں آپ اس کا جبریل سے دَور بھی فرمایا کرتے اور اپنی زندگی کے آخری سال آپ نے دو دفعہ دَور فرمایا۔ پھر صحابہ کو یاد کرواتے اور ان سے سنتے اور بعض دفعہ سناتے بھی تھے، قرآن کریم کے مصاحف لکھنے والے صحابہ کی نسبت قرآن کریم کے حافظوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور حفظ قرآن کا یہ سلسلہ نسلاً بعد نسل آج تک چلا آرہا ہے اور یہ دونوں طریقے ایک دوسرے کی محافظت کرتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن سے محبت رکھنے والے کچھ ایسے لوگ بھی پیدا کر دیئے جنہوں نے قرآن کریم کی آیات، الفاظ حتیٰ کہ

حروف اور اعراب تک شمار کر ڈالے، نتیجہ یہ کہ نزول قرآن سے لے کر آج تک قرآن کے الفاظ و حروف میں سر مُو فرق نہیں آیا اور ان حالات میں کمی و بیشی ممکن ہی نہ رہی اور تحریف لفظی کے سب امکانات ختم ہو گئے۔

تحریف معنوی سے حفاظت: اس حفاظت ذکر سے متعلق تیسرا پہلو تحریف معنوی کا ہے یعنی اگر الفاظِ قرآن کے ساتھ ساتھ مطالب قرآن کی حفاظت نہ ہو تو محض الفاظ کی حفاظت بے سود ہے اور اس صورت میں یہ قرآن ملحدین کی اور دوسرے گمراہ فرقوں کی طبع آزمائی کا تختہ مشق بن سکتا ہے لہذا ضروری تھا کہ قرآن کے جو معنی خود حامل قرآن یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سمجھے تھے ان کی بھی حفاظت کی جائے تاکہ باطل کسی طریقے سے بھی قرآن میں داخل نہ ہونے پائے اور اگر داخل ہونے کی کوشش کرے تو تحقیق کر کے اسے رد کا جاسکے، اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے محدثین کرام کی جماعت کو پیدا فرمایا، جنہوں نے اپنی زندگیاں اسی مقصد کی خاطر کھپا دیں، رسول اللہ کی ہر طرح کی سنت کو محفوظ کر دیا، جو در حقیقت قرآن کے معانی اور مطالب ہی کی حفاظت ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ہاتھوں قرآن کریم کی حفاظت کا ایسا مضبوط انتظام فرما کر اپنا وعدہ پورا کیا کہ غیر مسلم بھی اس کی مکمل حفاظت کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

یہودی کا اسلام اور حفاظت قرآن: امیر المومنین خلیفہ مامون الرشید رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ کبھی کبھی اس کے دربار میں مسائل پر بحث و مباحثے اور مذاکرے ہوا کرتے تھے جس میں ہر اہل علم کو آنے کی اجازت تھی ایسے ہی ایک مذاکرہ میں ایک یہودی بھی آگیا جو صورت شکل اور لباس وغیرہ کے اعتبار سے بھی ایک ممتاز آدمی معلوم ہوتا تھا پھر گفتگو کی تو اس نے بھی فصیح و بلیغ اور عاقلانہ گفتگو کی تھی جب مجلس ختم ہو گئی تو مامون نے اس کو بلا کر پوچھا کہ تم اسرائیلی ہو؟ اس نے اقرار کیا مامون نے (امتحان لینے کے لئے) کہا کہ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو ہم تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کریں گے، اس نے جواب دیا کہ میں تو اپنے اور اپنے آباءواجداد کے دین کو نہیں چھوڑتا، بات ختم ہو گئی یہ شخص چلا گیا۔

پھر ایک سال کے بعد یہی شخص مسلمان ہو کر آیا اور مجلس مذاکرہ میں فقہ اسلامی کے موضوع پر بہترین تقریر اور عمدہ تحقیقات پیش کیں مجلس ختم ہونے کے بعد مامون نے اس کو بلا کر کہا کہ تم وہی شخص ہو جو سال گذشتہ آئے تھے؟ جواب دیا ہاں وہی ہوں مامون نے پوچھا کہ اس وقت تو تم نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا پھر اب مسلمان ہونے کا سبب کیا ہوا؟

اس نے کہا میں یہاں سے لوٹا تو میں نے موجودہ مذاہب کی تحقیق کرنے کا ارادہ کیا میں ایک خطاط اور خوشنویس آدمی ہوں کتابیں لکھ کر فروخت کرتا ہوں تو اچھی قیمت سے فروخت ہو جاتی ہیں میں نے امتحان کرنے کے لئے تورات کے تین نسخے کتابت کئے جن میں بہت جگہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر دی اور یہ نسخے لے کر میں کنیسا میں پہنچا یہودیوں نے بڑی رغبت سے ان کو خرید لیا پھر اسی طرح انجیل کے تین نسخے کمی بیشی کے ساتھ کتابت کر کے نصاریٰ کے عبادت خانہ میں لے گیا وہاں بھی عیسائیوں نے بڑی قدر و منزلت کے ساتھ یہ نسخے مجھ سے خرید لئے پھر یہی کام میں نے قرآن کے ساتھ کیا اس کے بھی تین نسخے عمدہ کتابت کئے جن میں اپنی طرف سے کمی بیشی کی تھی ان کو لے کر جب میں فروخت کرنے کے لئے نکلا تو جس کے پاس لے گیا اس نے دیکھا کہ صحیح بھی ہے یا نہیں جب کمی بیشی نظر آئی تو اس نے مجھے واپس کر دیا۔

اس واقعہ سے میں نے یہ سبق لیا کہ یہ کتاب محفوظ ہے اور اللہ تعالیٰ ہی نے اس کی حفاظت کی ہوئی ہے اس لئے مسلمان ہو گیا قاضی یحییٰ بن اکثم اس واقعہ کے راوی کہتے ہیں کہ اتفاقاً اسی سال مجھے حج کی توفیق ہوئی وہاں سفیان بن عیینہ سے ملاقات ہوئی تو یہ قصہ ان کو سنایا انہوں نے فرمایا بیشک ایسا ہی ہونا چاہئے کیونکہ اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔

یحیی ابن اکثم نے پوچھا قرآن کی کونسی آیت میں؟ تو فرمایا کہ قرآن عظیم نے جہاں تورات وانجیل کا ذکر کیا ہے اس میں تو فرمایا بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ یعنی یہود و نصاری کو کتاب اللہ تورات وانجیل کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ (تفسیر قرطبی ۱۰/۶)

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں زمانہ کتنا ہی بدل جائے مگر اس کے اصول و احکام کبھی نہ بدلیں گے، زبان کی فصاحت و بلاغت اور علم و حکمت کی موشگافیاں کتنی ہی ترقی کر جائیں، پر قرآن کی صوری و معنوی اعجاز میں اصلاً ضعف و انحطاط محسوس نہ ہو گا اور سلطنتیں قرآن کی آواز کو دبانے یا گم کر دینے میں ساعی ہوں گی، لیکن اس کے ایک نقطہ کو گم نہ کر سکیں گی، حفاظت قرآن کے متعلق یہ عظیم الشان وعدہ الٰہی ایسی صفائی اور حیرت انگیز طریقہ سے پورا ہو کر رہا جسے دیکھ کر بڑے بڑے متعصب و مغرور مخالفوں کے سر نیچے ہو گئے۔

"میور" کہتا ہے "جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو قرآن کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو، ایک اور یورپین محقق لکھتا ہے کہ ہم ایسے ہی یقین سے قرآن کو بعینہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں جیسے مسلمان اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ تمسخر اور مجرموں کی ضد کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ {۱۰} وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ {۱۱} كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ {۱۲} لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ {۱۳} وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ {۱۴} لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ {۱۵} الحجر

جواب ترجمہ: اور بلاشبہ ہم نے آپ سے پہلے گزشتہ لوگوں کے گروہوں میں پیغمبر بھیجے۔ اور ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا جس کے ساتھ انہوں نے استہزاء نہ کیا ہو۔ ہم اس طرح اس استہزاء کو مجرمین کے دلوں میں چلاتے ہیں۔ یہ لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے اور پہلے لوگوں کا طریقہ گزر چکا ہے۔ اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں پھر یہ لوگ دن کے وقت اس میں چڑھ جائیں۔

تب بھی یوں کہیں گے کہ بس بات یہ ہے کہ ہماری آنکھوں کی نظر بندی کر دی گئی ہے، بلکہ ہم ایسے لوگ ہیں جن پر جادو کر دیا گیا ہے۔۔

آسمان وزمین کی تخلیق اور تدبیر الٰہی کے مظاہر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ {۱۶}وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ {۱۷}اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ{۱۸}وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ {۱۹}وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ{۲۰}وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ {۲۱}وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ {۲۲}وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ {۲۳}وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ{۲۴}وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ {۲۵}الحجر

جواب ترجمہ: اور بیشک ہم نے آسمان میں ستارے پیدا کیے اور اسے دیکھنے والوں کے لیے زینت والا بنایا۔ اور ہر شیطان مردود سے ہم نے اسے محفوظ کر دیا۔ سوائے اس کے جو چوری سے سن لے تو اس کے پیچھے ایک روشن شعلہ ہولیتا ہے۔ اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور ہم نے اس میں بھاری بھاری پہاڑ ڈال دیے اور ہم نے اس میں ایک معین مقدار سے ہر قسم کی چیز اگائی۔ اور ہم نے تمہارے لیے اس میں زندگی کے سامان پیدا کر دیئے، اور جنہیں تم رزق دینے والے نہیں ہو انہیں بھی ہم نے رزق دیا۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور ہم اس کو صرف مقدار معلوم ہی کے بقدر نازل کرتے ہیں۔ اور ہم نے ہواؤں کو بھیج دیا جو بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں پھر ہم نے آسمان سے پانی اتارا پھر ہم نے تمہیں وہ پانی پلایا تم اتنا پانی جمع کرنے والے نہیں ہو۔ اور بلاشبہ ہم زندہ کرتے ہیں اور موت دیتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں۔ اور بلاشبہ ہمیں معلوم ہیں جو تم سے پہلے تھے اور

بلاشبہ ہمیں وہ لوگ معلوم ہیں جو تمہارے بعد آنے والے ہیں۔ اور بلاشبہ آپ کا رب ان سب کو جمع فرمائے گا، بیشک وہ حکیم ہے علیم ہے۔

جنوں اور انسانوں کی پیدائش

سوال انسان اور جنات کس چیز سے پیدا کیے گئے؟ قرآنی آیات کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ {۲۶} وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ {۲۷} الحجر

جواب ترجمہ: اور البتہ تحقیق ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے سے تھی پیدا کیا اور جنوں کو اس سے بھی پہلے بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں اور ہم نے انسان کو (یعنی اس نوع کی اصل اول آدم علیہ السلام کو) بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہوئی تھی پیدا کیا (یعنی اول گارے کو خوب خمیر کیا کہ اس میں بو آنے لگی پھر وہ خشک ہو گیا کہ وہ خشک ہونے سے کھن کھن بولنے لگا جیسا مٹی کے برتن چٹکی مارنے سے بجا کرتے ہیں پھر اس خشک گارے سے آدم کا پتلا بنایا جو بڑی قدرت کی علامت ہے) اور جن کو (یعنی اس نوع کی اصل ابو الجان کو) اس کے قبل (یعنی آدم علیہ السلام کے قبل) آگ سے کہ وہ (غایت لطافت کی وجہ سے) ایک گرم ہوا تھی پیدا کر چکے تھے مطلب یہ کہ چونکہ اس آگ میں اجزائے دخانیہ نہ تھے اس لئے وہ مثل ہوا کے نظر نہ آتی تھی کیونکہ آگ کا نظر آنا اجزائے کثیفہ کے اختلاط سے ہوتا ہے اس کو دوسری آیت میں اس طرح فرمایا ہے وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (تفسیر بیان القرآن)

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جس طرح آدمیوں یا انسانوں کے جد امجد کا نام آدم علیہ السلام ہے، اسی طرح جنوں کے جد امجد جانّ ہے اور جن کا لغوی معنی کسی چیز کو ڈھانپ کر چھپا دینا ہے کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے اور جنوں کو بھی جن اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ انسانوں کے لیے غیر مرئی مخلوق ہے جو

انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے، جن اپنی شکل و صورت بدل سکتے ہیں کبھی یہ دیو، بھوت پریوں کی شکل میں انسانوں کے سامنے نمودار ہوتے ہیں اور کبھی سانپ کی شکل میں، چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم گھروں میں سانپ دیکھو تو مارنے سے پہلے اسے کہہ لو کہ اگر وہ جن ہے تو چلا جائے۔ قرآن میں بھی جان کا لفظ سانپ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ (۲۷/۱۰) اور جان صرف ایسے سانپ کو کہتے ہیں جو عصا کی طرح لمبا اور پتلا ہو۔

سانپ کی اقسام: دنیا بھر میں سانپوں کی تین ہزار نو سو (۳۹۰۰) اقسام پائی جاتی ہیں، ان میں سات سو پچیس زہریلی (۷۲۵) اور ۲۵۰ انتہائی خطرناک بتائی جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں سانپ کے تین نام یا تین صفات بیان کی گئی ہیں، جب کہ عرب میں سانپ کے لیے بہت سے نام موجود ہیں، ان میں سے کچھ کے نام بمع صفات ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔ عربی زبان میں سانپ کے نام تین بنیادوں پر رکھے گئے ہیں ① جسامت (ثعبان، طویل، قصیر) ② زہریا خطرہ (أفعی، سامّ، نهشل) ③ رنگ و شکل (أرقم، رقشاء، أسود، ذو الطفیتین) قرآنِ کریم نے جو تین الفاظ منتخب کیے حَيَّةٌ، جَآنٌّ، ثُعبَانٌ: وہ دراصل جنس، حرکت اور ہیبت تینوں پہلوؤں کو سمیٹ لیتے ہیں، یہ بلاغت کا اعلیٰ درجہ ہے۔

سانپ کے نام: (۱) حَيَّة: سانپ کا عمومی اور اصل نام۔ (۲) ثُعبَان: بہت بڑا، ہیبت ناک سانپ (۳) جَانّ: باریک، تیز رفتار سانپ۔ (۴) أَفْعَى: سخت زہریلا سانپ، عموماً مہلک۔ (۵) أَرْقَم: دھاری دار یا نقش و نگار والا سانپ۔ (۶) رَقْشَاء: چتکبری مادہ سانپ۔ (۷) صِلّ: نہایت تیز اور خطرناک قسم کا سانپ۔ (۸) أَصْلَال: لمبا اور پتلا سانپ۔ (۹) طُفَّة: چھوٹا سانپ۔ (۱۰) حَنَش: باریک اور تنگ جگہوں میں رہنے والا سانپ۔ (۱۱) دَسَّاس: رینگ کر چھپ جانے والا سانپ۔ (۱۲) سِلّ: نہایت پھرتیلا سانپ۔ (۱۳) نَهْشَل: کاٹنے میں شدید اور جھپٹنے والا سانپ۔ (۱۴) لُفَاع: لپٹنے اور بل کھانے والا سانپ۔ (۱۵) شُجَاع: دلیر اور سامنے آنے والا سانپ (حدیث میں "شجاع أقرع")۔ (۱۶) أَبْتَر –دُم چھوٹی رکھنے والا سانپ۔ (۱۷) ذُو الطُّفْيَتَيْنِ:

پشت پر دو سفید دھاریوں والا سانپ۔(۱۸)**مُقْرِن:** سینگ نما ابھار رکھنے والا سانپ۔ (۱۹)**أَجْرَد:** بالکل ہموار جلد والا سانپ۔(۲۰)**أَسْوَد:** سیاہ رنگ کا سانپ۔(۲۱)**أَخْضَر:** سبز رنگ کا سانپ۔ (۲۲)**أَحْمَر:** سرخی مائل سانپ۔(۲۳)**أَبْيَض:** سفید رنگ کا سانپ۔ (۲۴) **هَيْدَب:** جس کی جلد کھردری ہو۔(۲۵)**عُرْيَان:** بغیر واضح نقش و نگار کا سانپ۔ (۲۶)**مُتَلَوِّ:** بل کھانے والا سانپ۔(۲۷)**قَصِير:** چھوٹے قد کا سانپ۔(۲۸)**طَوِيل:** غیر معمولی لمبا سانپ۔(۲۹)**مُهْرِج:** رنگ بدلنے والا سانپ۔(۳۰)**سَامّ:** زہر والا سانپ (عام وصفی نام)۔

تخلیق آدم، ملائکہ کا سجدہ، ابلیس کا انکار سجدہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ{۲۸}فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ {۲۹}فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ {۳۰}اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ{۳۱}قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ{۳۲}قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ {۳۳} قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ {۳۴}وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ {۳۵}الحجر

جواب ترجمہ: اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ بلاشبہ میں بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں جو سیاہ رنگ کے سڑے ہوئے گارے سے ہو گی۔ سو جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے لیے سجدہ میں گر پڑنا۔ سو تمام فرشتوں نے اکٹھے ہو کر سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا۔ اس نے اس بات سے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابلیس تجھے اس بات پر کس نے آمادہ کیا کہ تو سجدہ کرنے والے کے ساتھ نہ ہوا۔ ابلیس نے کہا میں ایسے بشر کو سجدہ کرنے والا نہیں ہوں جسے آپ نے بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا جو سیاہ رنگ کے سڑے ہوئے گارے سے بنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا سو تو اس سے نکل جا

کیونکہ تو مردود ہے۔ اور قیامت کے دن تک تجھ پر لعنت رہے گی۔

خلاصہ تفسیر: ان آیات میں تخلیقِ آدم علیہ السلام کا وہ عظیم منظر سامنے آتا ہے جب ربِّ کریم نے فرشتوں کو خبر دی کہ وہ ایک ایسے بشر کو پیدا کرنے والا ہے جو کھنکتے ہوئے خشک گارے، سیاہ اور بدلی ہوئی مٹی سے تشکیل پائے گا، پھر جب اس کی صورت سنوار دی گئی اور اس میں روحِ پھونک دی گئی تو حکم ہوا کہ سب اس کے حضور سجدۂ تعظیم بجالائیں، چنانچہ ملائکہ نے بلا تامل سرِ اطاعت جھکا دیا، مگر ابلیس جو فرشتوں کی جماعت میں شامل تو تھا مگر ان میں سے نہ تھا، تکبر کی آگ میں جل اٹھا اور سجدے سے انکار کر بیٹھا، ربِّ ذوالجلال نے اس سے باز پرس کی کہ کس چیز نے تجھے اس حکمِ الٰہی کی تعمیل سے روکا؟ اس نے غرور بھرے لہجے میں جواب دیا کہ میں اس بشر کو کیوں سجدہ کروں جسے تو نے خشک اور بدبودار مٹی سے پیدا کیا ہے! اس سرکشی پر فرمان ہوا: نکل جا یہاں سے، تو راندۂ درگاہ ہے اور قیامت تک تجھ پر لعنت اور رحمتِ الٰہی سے دوری مسلط رہے گی، یوں اس واقعے میں اطاعت و تکبر، بندگی و سرکشی اور عزت و ذلت کا ابدی معیار واضح کر دیا گیا۔

راندۂ درگاہ ہونے کے بعد شیطان کی گستاخی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِيٓ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ {۳۶} قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ {۳۷} إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ {۳۸} قَالَ رَبِّ بِمَآ أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ {۳۹} إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ {۴۰} قَالَ هَٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ {۴۱} إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ {۴۲} وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ {۴۳} لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِّكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ {۴۴} الحجر

جواب ترجمہ: ابلیس نے کہا کہ اے رب سو آپ اس دن تک مہلت دے دیجیے جس دن تک لوگ اٹھائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا سو بلاشبہ تجھ کو مہلت دی گئی۔ معین وقت کی تاریخ تک۔

شیطان نے کہا کہ اے رب اس سبب سے کہ آپ نے مجھے گمراہ کیا میں ان کے لیے زمین میں ضرور ضرور مزین کروں گا اور ضرور ضرور ان سب کو گمراہ کروں گا۔ سوائے آپ کے ان بندوں کے جو منتخب کر لیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والا ہے۔ بلاشبہ میرے بندوں پر تیرا بس نہ چلے گا سوائے گمراہوں کے جو تیرا اتباع کریں گے۔ اور بلاشبہ سب سے جہنم کا وعدہ ہے۔ اس کے سات دروازے ہیں ہر دروازے کے لیے ان میں سے ایک ایک حصہ تقسیم کر دیا گیا ہے۔

خلاصہ تفسیر: ان آیات میں ابلیس کی سرکشی کے بعد اس کی مکالمہ آرائی کا نقشہ کھنچتا ہے، جب وہ راندۂ درگاہ قرار پایا تو اس نے مہلت کی درخواست کی کہ اے پروردگار! مجھے اُس دن تک ڈھیل دے جب تمام مخلوق دوبارہ اٹھائی جائے گی، ارشاد ہوا کہ تجھے مہلت دی جاتی ہے، مگر اُس مقررہ وقت تک جب پہلے نفخۂ صور کے ساتھ سب جاندار موت کی آغوش میں چلے جائیں گے، اس مہلت کو پا کر ابلیس نے گستاخانہ عزم ظاہر کیا کہ چونکہ تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا، اس لیے میں بھی زمین میں انسانوں کے لیے معصیت کو آراستہ کر دوں گا اور سب کو صراطِ مستقیم سے بھٹکانے کی کوشش کروں گا، سوائے ان بندگانِ برگزیدہ کے جنہیں تو نے اپنی خاص عبادت کے لیے چن لیا ہے، ربِّ کریم نے واضح فرما دیا کہ یہی سیدھا راستہ ہے جو میری طرف پہنچاتا ہے اور میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا، تیرا بس صرف اُنہی پر چلے گا جو خود تیرے پیچھے چل کر گمراہی اختیار کریں گے اور آخر کار اعلان کر دیا گیا کہ جہنم ابلیس اور اس کے تمام پیروکاروں کا ٹھکانا ہے، یوں ان آیات میں اخلاص کی حفاظت، اختیارِ انسان اور انجامِ سرکشی کا فیصلہ کن اصول بیان کر دیا گیا۔

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ : حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جیسے بہشت کے آٹھ دروازے ہیں نیک عمل والوں پر بانٹے ہوئے، ویسے دوزخ کے سات دروازے ہیں بد عمل والوں پر بانٹے ہوئے۔ شاید بہشت کا ایک دروازہ اس لیے زیادہ ہے کہ بعضے موحدین نرے فضل سے جنت میں جائیں گے بغیر عمل کے۔ باقی عمل میں دروازے برابر ہیں۔

حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جہنم کے سات دروازے اوپر نیچے سات طبقات کے اعتبار سے ہیں اور بعض حضرات نے ان کو عام دروازوں کی طرح قرار دیا ہے ہر دروازہ خاص قسم کے مجرمین کے لئے مخصوص ہو گا (قرطبی)

تفسیر تیسیر القرآن میں ہے کہ تقسیم شدہ حصہ سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی گناہ کے مجرم الگ کر دیئے جائیں گے اور وہ سب ایک ہی دروازہ سے داخل ہوں گے۔ جیسے دہریے ایک دروازے سے، مشرک الگ دروازہ سے، منافق الگ دروازے سے وغیرہ وغیرہ۔

بالفاظ دیگر جہنم کے ہر طبقہ کے لیے الگ الگ دروازہ ہو گا اور یہ طبقات بھی سات ہی ہوں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک ان کے نام یہ ہیں۔ جہنم، سعیر، لظیٰ، حطمہ، سقر جحیم اور ہاویہ اور جہنم کا لفظ ان سب طبقات کے لیے عام بھی ہے اور پہلے طبقہ کا نام بھی ہے۔

اور بعض لوگوں نے ان طبقات کے لیے گنہگاروں کی یوں تقسیم کی ہے، پہلے طبقہ جہنم میں گنہگار مسلمان۔ دوسرے طبقہ سعیر میں یہود، تیسرے طبقہ لظیٰ میں نصاریٰ، چوتھے طبقے حطمہ میں صائبین، پانچویں طبقہ سقر میں مجوس، چھٹے طبقہ میں مشرک اور ساتویں طبقہ میں منافق جو سب سے نچلا طبقہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ واضح رہے کہ جہنم کے تو سات دروازے ہیں جبکہ جنت کے دروازے آٹھ ہیں۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

اہل تقویٰ کے لیے جنتیں اور بہتے چشمے

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ{۴۵}اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ{۴۶}وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ{۴۷}لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ{۴۸}الحجر

جواب ترجمہ: بلاشبہ تقویٰ اختیار کرنے والے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔ تم اس میں

داخل ہو جاؤ سلامتی کے ساتھ اس حالت میں کہ امن سے رہنے والے ہو۔ اور ہم وہ کینہ نکال دیں گے جو ان کے سینوں میں تھا، بھائی بھائی بن کر رہیں گے تختوں پر آمنے سامنے ہوں گے۔ انہیں وہاں کوئی تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

خلاصہ تفسیر: ان آیات میں اہلِ تقویٰ کا دلنشیں انجام نہایت دل آویز انداز میں سامنے آتا ہے، جو لوگ اپنے رب کے احکام کی تعمیل اور مناہی سے اجتناب کے ذریعے تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں، اُن کے لیے سرسبز باغات اور بہتے چشمے مہیا ہیں، جب وہ ان جنتوں میں داخل ہوں گے تو اُن سے کہا جائے گا سلامتی اور ہر خوف سے امان کے ساتھ داخل ہو جاؤ، وہاں پہنچ کر اُن کے دلوں سے کینہ، حسد اور عداوت کی ہر گرہ کھول دی جائے گی، وہ باہم شیر و شکر، محبت میں بندھے ہوئے بھائیوں کی طرح آمنے سامنے تختوں پر جلوہ افروز ہوں گے، نہ انہیں کوئی رنج و تعب چھوئے گا اور نہ زوال و اخراج کا اندیشہ ہو گا، بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے اسی نعمتِ جاوداں میں مقیم رہیں گے، یوں تقویٰ کی زندگی ابدی سلامتی، قلبی طہارت اور دائمی راحت میں ڈھل جاتی ہے۔

غفور و رحیم کا عذاب الیم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ {۴۹} وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ {۵۰} الحجر

جواب ترجمہ: آپ میرے بندوں کو خبر دے دیجیے کہ بلاشبہ میں غفور ہوں رحیم ہوں۔ اور بلاشبہ میرا عذاب وہ دردناک عذاب ہے۔

خلاصہ تفسیر: ان آیات میں رحمت و عدل کا حسین توازن جلوہ گر ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ اے میرے حبیب ﷺ! میرے بندوں کو خبر دے دیجئے کہ میں ہی توبہ کرنے والوں کے لیے نہایت بخشنے والا اور سراپا رحمت ہوں، جو میری طرف رجوع کرے، میں اسے آغوشِ مغفرت میں لے لیتا ہوں، مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیجئے کہ میرا عذاب نہایت دردناک اور عبرت انگیز ہے، پس بندے

خوف ورجا کے درمیان رہتے ہوئے میری بارگاہ میں پلٹ آئیں، تاکہ میری رحمت کے مستحق ٹھہریں اور میرے عذاب سے امان پاسکیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے معزز مہمان

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ {۵۱}اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ {۵۲}قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ {۵۳}قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ {۵۴}قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ {۵۵}قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ {۵۶} الحجر

جواب ترجمہ: اور ان کو ابراہیم کے مہمانوں کی بھی اطلاع دے دیجیے۔ جب وہ ان پر داخل ہوئے تو انہوں نے سلام کیا، ابراہیم نے کہا کہ بلاشبہ ہم تو تم سے ڈر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ڈرو مت بیشک ہم تمہیں ایک ایسے لڑکے کی بشارت دے رہے ہیں جو صاحب علم ہو گا۔ ابراہیم نے کہا کیا تم مجھے اس حالت میں بشارت دے رہے ہو جب کہ مجھے بڑھاپا پہنچ گیا ہے سو تم کس چیز کی بشارت دیتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے تمہیں امر واقعی کی بشارت دی ہے سو تم ناامیدوں میں سے مت ہو جاؤ۔ ابراہیم نے کہا اور اپنے رب کی رحمت سے ان لوگوں کے سوا کون ناامید ہو گا جو گمراہ ہیں۔

خلاصہ تفسیر: ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کا واقعہ نہایت لطیف انداز میں بیان ہوا ہے، فرشتے انسانی صورت میں ان کے پاس آئے، سلام عرض کیا اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے حسن ضیافت کے ساتھ ان کا جواب دیا اور بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا، اس گمان سے کہ یہ عام مہمان ہیں، جب انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا تو ابراہیم علیہ السلام کے دل میں اندیشہ پیدا ہوا، اس پر فرشتوں نے تسلی دی کہ خوف نہ کیجیے، ہم آپ کو ایک صاحب علم بیٹے کی بشارت دینے آئے ہیں اور ساتھ ہی قوم لوط کی ہلاکت کا پیغام بھی سنانے آئے ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے اپنی پیرانہ سالی کو دیکھتے

ہوئے تعجب سے پوچھا کہ اس بڑھاپے میں اولاد کی خوشخبری کس طرح ممکن ہے؟ فرشتوں نے یقین دلایا کہ یہ وعدہ حق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں، لہٰذا ناامید نہ ہوں، اس پر ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو وہی ہوتے ہیں جو راہِ مستقیم سے بھٹک جائیں، یوں اس واقعے میں قدرت الٰہی کی شان اور امید و یقین کا درس نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

قوم لوط کی تباہی کے لیے آنے والے فرشتے

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ {۵۷} قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ {۵۸} اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ {۵۹} اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ {۶۰} فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِالْمُرْسَلُوْنَ {۶۱} قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ {۶۲} قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ {۶۳} وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ {۶۴} فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ {۶۵} وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ {۶۶} وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ {۶۷} قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ {۶۸} وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ {۶۹} قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ {۷۰} قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ {۷۱} لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ {۷۲} فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ {۷۳} فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ {۷۴} اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ {۷۵} وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ {۷۶} اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ {۷۷} الحجر

جواب ترجمہ: ابراہیم نے کہا کہ اے بھیجے ہوئے فرشتو! تمہارا آنا کس اہم کام کے لیے ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ بلاشبہ ہم مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ مگر آلِ لوط کا خاندان، بلاشبہ ہم ان سب کو بچا لینے والے ہیں۔ سوائے ان کی بیوی کے ہم نے اس کے بارے میں تجویز کر رکھا ہے کہ

بلاشبہ وہ مجرمین میں رہ جانے والی ہے۔ سو جب وہ بھیجے ہوئے فرشتے خاندان لوط کے پاس آئے۔ تو وہ کہنے لگے بیشک تم تو اجنبی آدمی ہو۔ انہوں نے کہا کہ نہیں! بلکہ ہم آپ کے پاس وہ چیز لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کیا کرتے تھے۔ اور ہم آپ کے پاس یقینی ہونے والی چیز لے کر آئے ہیں اور ہم سچے ہیں۔ سو آپ رات کے کسی حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جایئے اور آپ ان کے پیچھے ہو لیجیے اور تم میں سے کوئی بھی پیچھے پھر کے نہ دیکھے اور تمہیں جس جگہ جانے کا حکم ہوا ہے اسی طرف چلے جانا۔ اور ہم نے لوط کے پاس اپنا حکم بھیج دیا کہ صبح ہوتے ہی ان لوگوں کی جڑ کٹ جائے گی۔ اور شہر کے لوگ خوش ہوتے ہوئے آپہنچے۔ لوط نے کہا بیشک یہ میرے مہمان ہیں سو تم مجھے رسوا نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔ لوگوں نے جواب میں کہا کیا ہم نے آپ کو دنیا جہان کے لوگوں سے منع نہیں کیا؟ لوط نے کہا یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تمہیں کرنا ہی ہے۔ آپ کی جان کی قسم بیشک وہ اپنی مستی میں اندھے بن رہے تھے۔ سو سورج نکلتے وقت انہیں سخت آواز نے پکڑ لیا۔ سو ہم نے اس کے اوپر کے حصہ کو نیچے والا حصہ کر دیا اور ہم نے ان پر کنکر کے پتھر برسا دیئے۔ بلاشبہ اس میں بصیرت رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اور بلاشبہ ان کی یہ بستیاں ایک شاہراہ عام پر پڑتی ہیں۔ بلاشبہ اس میں اہل ایمان کے لیے نشانی ہے۔

خلاصہ تفسیر: ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال پر فرشتے اپنے اصل مقصد کا انکشاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ قوم لوط کی سرکش اور بدکار بستیوں کو عذاب الٰہی سے ہلاک کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں، البتہ لوط علیہ السلام اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں کو بچا لیا جائے گا، سوائے ان کی بیوی کے جو کفر و سرکشی میں قوم کے ساتھ رہی، پھر یہی فرشتے انسانی شکل میں لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انہوں نے اجنبی سمجھ کر اندیشہ ظاہر کیا، مگر فرشتوں نے تسلی دی کہ ہم وہ فیصلہ کن عذاب لے کر آئے ہیں جسے تمہاری قوم جھٹلاتی رہی ہے اور ہمارا پیغام سراسر حق ہے، لوط علیہ السلام کو حکم ہوا کہ رات

کے کسی حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جائیں، پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں، کیونکہ صبح ہوتے ہی اس قوم کی جڑ کاٹ دی جائے گی، ادھر سدوم کے لوگ مہمانوں کی خبر سن کر خوشی سے دوڑتے آئے اور بد فعلی کے ارادے ظاہر کیے، لوط علیہ السلام نے انہیں اللہ سے ڈرنے اور اپنی عزت نہ اچھالنے کی نصیحت کی، یہاں تک کہ نکاح کی جائز راہ کی طرف متوجہ کیا، مگر وہ اپنی شہوانی سرمستی میں اندھے ہو چکے تھے، چنانچہ طلوع فجر کے ساتھ ایک ہولناک چیخ نے انہیں آلیا، ان کی بستیاں الٹ دی گئیں اور ان پر پتھریلی مٹی کی بارش برسائی گئی، اس انجام میں اہل بصیرت کے لیے کھلی نشانیاں ہیں اور ان بستیوں کے کھنڈر آج بھی گزرنے والوں کو عبرت کا سبق دیتے ہیں، بے شک اس واقعے میں اہل ایمان کے لیے عظیم تنبیہ اور دلیل موجود ہے۔

حضرت محمد ﷺ کی زندگی و عمر کی قسم: لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ، (اے میرے حبیب ﷺ) تمہاری جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش (ہو رہے) تھے، لَعَمْرُكَ کے مخاطب جناب رسول کریم ﷺ ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کی زندگی کی قسم کھائی ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات و کائنات میں کسی کو جناب نبی کریم ﷺ سے زیادہ عزت و مرتبہ عطا نہیں فرمایا یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی رسول، نبی یا فرشتے کی زندگی پر کبھی قسم نہیں کھائی اور اس آیت میں جناب نبی کریم ﷺ کی زندگی کی قسم کھائی ہے جو آپ ﷺ کا انتہائی اعزاز و اکرام ہے۔ (تفسیر عثمانی، تفسیر معارف القرآن، تیسیر القرآن، روح المعانی)

غیر اللہ کی قسم کھانا: کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے علاوہ کسی اور چیز کی قسم کھائے کیونکہ قسم اس کی کھائی جاتی ہے جس کو سب سے زیادہ بڑا سمجھا جائے اور ظاہر ہے سب سے زیادہ بڑا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اپنی ماؤں اور باپوں کی اور بتوں کی قسم نہ کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قسم نہ کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی قسم بھی صرف اس وقت کھاؤ جب تم اپنے قول میں سچے ہو (ابو داؤد و نسائی عن ابی ہریرہ)

اور صحیحین میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ اپنے باپ کی قسم کھا رہے ہیں تو رسول کریم ﷺ نے پکار کر فرمایا کہ خبردار رہو اللہ تعالیٰ باپوں کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے جس کو حلف کرنا ہو اللہ کے نام کا حلف کرے ورنہ خاموش رہے (قرطبی) لیکن یہ حکم مخلوقات کے لئے ہے اللہ جل شانہ خود اپنی مخلوقات میں سے مختلف چیزوں کی قسم کھاتے ہیں یہ ان کے لئے مخصوص ہے جس کا مقصد کسی خاص اعتبار سے روکنے کا جو سبب ہے وہ یہاں موجود نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس کا کوئی امکان نہیں کہ وہ اپنی کسی مخلوق کو سب سے بڑا اور افضل سمجھیں کیونکہ علی الاطلاق بڑائی تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہے۔ (معارف القرآن)

صبح کے وقت عذاب آن پہنچا: سورج چمکنے کے وقت قوم لوط پر عذاب آیا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ، آخر سورج نکلنے کے وقت انہیں زبردست دھماکے نے آلیا، سورج نکلنے کے وقت آسمان سے ایک دل دہلانے والی اور جگر پاش پاش کر دینے والی چنگھاڑ کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی ان کی بستیاں اوپر کو اٹھیں اور آسمان کے قریب پہنچ گئیں اور وہاں سے الٹ دی گئیں اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر ہو گیا ساتھ ہی ان پر آسمان سے پتھر برسے ایسے جیسے پکی مٹی کے کنکر آلود پتھر ہوں۔ ابن جریج رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ہر عذاب جس سے کوئی قوم ہلاک کی جائے صَيْحَةٌ اور صَاعِقَةٌ کہلاتا ہے۔

قوم لوط کی بستیاں: وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ، اور وہ شہر اب تک سیدھے راستے پر (موجود) ہے، یعنی حجاز سے شام اور عراق سے مصر جاتے ہوئے یہ تباہ شدہ علاقہ راستہ میں پڑتا ہے اور عموماً قافلوں کے لوگ تباہی کے ان آثار کو دیکھتے ہیں جو اس پورے علاقے میں آج تک نمایاں ہیں۔ یہ علاقہ بحر لوط (بحیرہ مردار) کے مشرق اور جنوب میں واقع ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس کے جنوبی حصے کے متعلق جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ یہاں اس درجہ ویرانی پائی جاتی ہے جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں اور نہیں دیکھی گئی۔

اصحاب الایکہ کون تھے؟

سوال اصحاب الایکہ کون لوگ تھے؟ اور ایکہ کیا ہے؟

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ {۷۸} فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ {۷۹} الحجر

جواب ترجمہ: اور بلاشبہ ایکہ والے ظلم کرنے والوں میں سے تھے۔ سو ہم نے ان سے انتقام لے لیا اور بلاشبہ یہ دونوں بڑی شاہراہ پر پڑتی ہیں۔

اصحاب ایکہ سے مراد قوم شعیب ہے، ایکہ کہتے ہیں درختوں کے جھنڈ کو، یہ لوگ ایک موسم میں تر کھجوریں کھاتے تھے اور ایک موسم میں خشک کھجوریں تناول کرتے تھے، ان کا ظلم علاوہ شرک و کفر کے غارت گری اور ناپ تول کی کمی بھی تھی۔ ان کی بستی لوطیوں کے قریب تھی اور ان کا زمانہ بھی ان سے بہت قریب تھا۔ ان پر بھی ان کی پیہم شرارتوں کی وجہ سے عذاب الٰہی آیا۔ یہ دونوں بستیاں بر سر شارع عام تھیں۔ حضرت شعیب علی علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈراتے ہوئے فرمایا تھا کہ لوط کی قوم تم سے کچھ دور نہیں۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان سے بھی بدلا لیا اور یہ دونوں شہر کھلے راستے پر (موجود) ہیں۔ حجاز سے شام و فلسطین نیز عراق سے مصر کو جو تجارتی راستہ جاتا ہے، قوم لوط کا تباہ شدہ علاقہ اسی راستہ میں پڑتا ہے، وہیں ذرا نیچے اتر کر قوم شعیب کا مسکن تھا، دونوں کے آثار راستہ چلنے والوں کو نظر آتے ہیں۔

اصحاب الحجر اور حجر سے کیا مراد ہے؟

سوال اصحاب الحجر کون تھے؟ اور حجر کیا تھا؟

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ {۸۰} وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ {۸۱} وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ {۸۲} فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ {۸۳} فَمَآ

اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ {۸۴} الحجر

جواب ترجمہ: اور بے شک حجر والوں نے رسولوں کو جھٹلایا تھا۔ اور ہم نے انہیں نشانیاں دیں سو وہ ان سے روگردانی کرنے والے ہو گئے۔ اور وہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر گھر بنا لیتے تھے، امن کے ساتھ رہتے تھے۔ سو ان کو صبح صبح چیخ نے پکڑ لیا۔ سو ان کو اس چیز نے کچھ کام نہ دیا جسے وہ کسب کرتے تھے۔

حجر والوں سے مراد ثمودی ہیں جنہوں نے اپنے نبی حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا اور ظاہر ہے کہ ایک نبی کا جھٹلانے والا گویا سب نبیوں کا انکار کرنے والا ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا کہ انہوں نے نبیوں کو جھٹلایا۔ ان کے پاس ایسے معجزے پہنچے جن سے حضرت صالح علیہ السلام کی سچائی ان پر کھل گئی۔ جیسے کہ ایک سخت پتھر کی چٹان سے اونٹنی کا نکلنا جو ان کے شہروں میں چرتی چگتی تھی اور ایک دن وہ پانی پیتی تھی ایک دن شہروں کے جانور۔ مگر پھر بھی یہ لوگ گردن کش ہی رہے بلکہ اس اونٹنی کو مار ڈالا۔

اس وقت حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا بس اب تین دن کے اندر اندر قہر الٰہی نازل ہو گا۔ یہ بالکل سچا وعدہ ہے اور اٹل عذاب ہے ان لوگوں نے اللہ کی بتلائی ہوئی راہ پر بھی اپنے اندھاپن کو ترجیح دی، یہ لوگ صرف اپنی قوت جتانے اور ریاکاری ظاہر کرنے کے واسطے تکبر و تجبر کے طور پر پہاڑوں میں مکان تراشتے تھے، کسی خوف کے باعث یا ضرورتاً یہ چیز نہ تھی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک جاتے ہوئے ان کے مکانوں سے گزرے تو آپ نے سر پر کپڑا ڈال لیا اور سواری کو تیز چلایا اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ جن پر عذاب الٰہی اترا ہے ان کی بستیوں سے روتے ہوئے گزرو، اگر رونا نہ آئے تو رونے جیسی شکل بنا کر چلو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں عذابوں کا شکار تم بھی بن جاؤ آخر ان پر ٹھیک چوتھے دن کی صبح عذاب الٰہی بصورت چنگھاڑ آیا۔ اس وقت ان کی کمائیاں کچھ کام نہ آئیں۔ جن کھیتوں اور پھولوں کی حفاظت کے لئے اور انہیں بڑھانے کے لئے ان لوگوں نے اونٹنی کا پانی پینا نہ پسند کر کے اسے قتل کر دیا وہ آج بے سود ثابت ہوئے اور امر رب اپنا کام کر گیا۔

حجر مدینہ اور شام کے درمیان ایک وادی کا نام تھا۔ یہ قوم ثمود کا مرکزی شہر تھا۔ اس کے کھنڈر

مدینہ کے شمال مغرب میں موجودہ شہر العلاء سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ مدینہ سے تبوک جاتے ہوئے یہ مقام شاہراہ عام پر ملتا ہے اور قافلے اس وادی میں سے ہو کر گزرتے ہیں، مگر نبی ﷺ کی ہدایت کے مطابق کوئی یہاں قیام نہیں کرتا۔ آٹھویں صدی ہجری میں ابن بطوطہ حج کو جاتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "یہاں سرخ رنگ کے پہاڑوں میں قوم ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انہوں نے چٹانوں کو تراش کر ان کے اندر بنائی تھیں۔ ان کے نقش و نگار اس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بنائے گئے ہوں۔ ان مکانات میں اب بھی سڑی گلی انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملتی ہیں۔

قوم صالح پر کس وقت عذاب آیا؟ أَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ، آخر کار آ پکڑا ان کو ایک ہولناک عذاب نے صبح کے وقت جبکہ یہ لوگ خواب خرگوش میں مست تھے، پس اللہ کی پکڑ اور اس کے عذاب سے کبھی بے فکر نہیں ہونا چاہئے کہ وہ کبھی بھی اور کسی بھی شکل میں آسکتا ہے۔ سو اس سے بے فکری اور بے خوفی بڑے ہی خسارے کا سودا ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ، اور ان لوگوں کو ان کی تکذیب اور تمرد و سرکشی کی بناء پر حضرت صالح علیہ السلام نے خبردار فرمادیا تھا کہ تم لوگ تین دن تک رہ بس لو اور عیش کر لو۔

اس کے بعد تم آخری انجام کو بہر حال پہنچ کر رہو گے۔ اور یہ ایسا وعدہ ہے جس کی تکذیب کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ذَٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ (ھود:۶۵) سو کفر و انکار اور حق کی تکذیب کا آخری انجام یقینا اور بہر حال ہلاکت و تباہی ہے۔ ایسے لوگوں کو حضرت حق۔ جل مجدہ۔ کی طرف سے جو مہلت اور ڈھیل ملتی ہے اس سے کسی کو دھوکے میں نہیں پڑنا چاہئے کہ وہ ڈھیل تو دیتا ہے لیکن اس کے بعد جب وہ پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ بھی بڑی سخت اور نہایت ہی ہولناک ہوتی ہے۔ (تفسیر مدنی)

تخلیق کائنات کا مقصد اور صفح جمیل کی تعلیم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ {۸۵} اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ {۸۶} الحجر

جواب ترجمہ: اور ہم نے آسمان کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے پیدا نہیں کیا مگر حق کے ساتھ، اور بلاشبہ قیامت ضرور آنے والی ہے، سو آپ خوبی کے ساتھ درگزر کیجیے۔ بلاشبہ آپ کا رب بڑا خالق ہے اور بڑا عالم ہے۔

ان آیات میں کائنات کی تخلیق کا مقصد نہایت جلال اور وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے آسمانوں کو، جو اپنے برجوں اور وسعتوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور زمین کو، جو اپنی تہوں اور نظام کے ساتھ قائم ہے اور ان کے درمیان پھیلی ہوئی فضا کو، جس میں حیات کے اسرار اور وجود کے بے شمار عجائب پوشیدہ ہیں، محض کھیل تماشے کے لیے پیدا نہیں کیا، بلکہ سراسر حق اور حکمت کے ساتھ وجود بخشا ہے، یہ عالم اس لیے نہیں بنایا گیا کہ انسان کھائے پیئے اور غفلت میں پڑا رہے، بلکہ اس لیے کہ یہاں خیر کو غلبہ ہو، فضیلت فروغ پائے، رذیلت مٹے اور بالآخر حساب و جزا کا دن برپا ہو، اسی لیے فرمایا کہ قیامت یقیناً آنے والی ہے، وہ فیصلہ کن گھڑی جو دنیا کی عارضی زندگی اور آخرت کے ابدی انجام کے درمیان حدِ فاصل ہو گی۔

جب انجام طے ہے تو داعیِ حق کو حکم دیا گیا کہ وہ "صفحِ جمیل" اختیار کرے: یعنی دل آزاریوں پر درگزر کرے، مگر دعوت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے، کشادہ دلی، حلم اور شفقت کے ساتھ لوگوں کے قریب رہے، کہ وہ حاکمِ جابر نہیں بلکہ طبیبِ دلوں کا مداوا کرنے والا ہے۔

آخر میں تسلی دی گئی کہ تمہارا رب ہی اَلْخَلّاقُ الْعَلِیْمُ ہے، کثرت سے پیدا کرنے والا اور ہر شے کے ماضی و مستقبل کا جاننے والا، وہی اس کائنات اور تمہاری دعوت دونوں کا منتظم ہے، وہ مہلت بھی حکمت سے دیتا ہے اور پکڑ بھی عدل سے کرتا ہے اور انجامِ کار حق ہی کو ثابت و غالب کرتا ہے۔

سبع مثانی سے کیا مراد ہے؟

سوال آیت مبارکہ میں السبع المثانی سے کیا مراد ہے؟

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ {۸۷} الحجر

جواب ترجمہ: اور ہم نے تم کو سات (آیتیں) جو (نماز میں) دوہرا کر پڑھی جاتی ہیں (یعنی سورہ الحمد) اور عظمت والا قرآن عطا فرمایا ہے۔

سبع مثانی کے مصداق میں اختلاف ہے۔ صحیح اور راجح یہ ہی ہے کہ اس سے مراد سورہ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں جو ہر نماز کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہیں اور جن کو بطور وظیفہ کے بار بار پڑھا جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے تورات، انجیل، زبور، قرآن کسی کتاب میں اس کا مثل نازل نہیں فرمایا۔ احادیث صحیحہ میں تصریح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سورہ "فاتحہ" کو فرمایا کہ یہ ہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھ کو دیا گیا۔

اس چھوٹی سی سورت کو قرآن عظیم (بڑا قرآن) فرمانا درجہ کے اعتبار سے ہے۔ اس سورت کو اُم القرآن بھی اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ گویا یہ ایک خلاصہ اور متن ہے جس کی تفصیل و شرح پورے قرآن کو سمجھنا چاہیے۔ قرآن کے تمام علوم و مطالب کا اجمالی نقشہ تنہا اس سورت میں موجود ہے یوں مثانی کا لفظ بعض حیثیات سے پورے قرآن پر بھی اطلاق کیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

کفار کو ملنے والا ساز و سامان

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ {۸۸} الحجر

جواب ترجمہ: آپ اپنی آنکھیں ان چیزوں کی طرف نہ بڑھایئے جو ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو فائدہ حاصل کرنے کے لیے دی ہیں، اور آپ ان پر غم نہ کیجیے اور ایمان والوں کے لیے اپنے بازوؤں کو جھکائے رہیے۔

جب ہم نے آپ کو قرآن عظیم جیسی نعمت عطا فرمادی تو پھر کافروں کو دی ہوئی ناپائیدار اور فانی

نعمتوں کی طرف توجہ نہ کرنا چاہیے۔ جب یہ ہدایت آپ کو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دی گئی اس وقت صورت حال یہ تھی کہ رسالت کی ذمہ داریوں کی بنا پر آپ سے تجارت کا شغل بھی چھوٹ چکا تھا اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا والا سرمایہ بھی ختم ہو رہا تھا۔ اور قریش مکہ کے معاشرتی بائیکاٹ کی وجہ سے جو چند جوان صحابہ کاروبار یا دوسرے کام کاج کرتے تھے وہ بھی چھوٹ چکے تھے۔ ویسے بھی کچھ صحابہ غلام اور کچھ آزاد کردہ غلام تھے۔ غرضیکہ مسلمانوں پر یہ سخت تنگدستی کا دور تھا۔ دوسری طرف قریش مکہ خاصے مالدار تھے۔ تجارت کرتے تھے اور ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔ ایسے ہی حالات میں مسلمانوں کو تسلی کے طور پر ایسی ہدایات دی جارہی تھیں۔ (تیسیر القرآن)

آیت میں خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر فی الحقیقت مومنوں کی وہ ابتدائی جماعت مخاطب ہے جو مکہ میں ایمان لائی تھی اور مظلومی و بے سروسامانی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ فرمایا تم دیکھتے ہو کہ مخالفوں کے پاس ہر طرح کی دنیوی آسائشیں ہیں اور تمہارے پاس ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ لیکن تم بھولتے ہو، تمہارے پاس بھی ایک چیز ہے جس سے تمہارے مخالف یک قلم تہی دست ہیں اور وہ اللہ کا کلام ہے۔ اگر یہ نعمت تمہارے پاس موجود ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم مخالفوں کی موجودہ خوش حالیوں کو حسرت و رشک کی نظر سے دیکھو۔ (تفسیر الکتاب)

اعلان رسالت، انا النذیر المبین

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَقُلْ اِنِّیْٓ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ {۸۹} الحجر

جواب ترجمہ: اور (میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ بلاشبہ میں واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔

اس آیتِ کریمہ میں خطاب براہِ راست نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ آپ صاف اور دو ٹوک الفاظ میں اعلان کر دیں کہ "میں کھلا اور واضح ڈرانے والا ہوں"۔ یہ انذار کسی مصلحت، جانب داری یا کمزوری کا محتاج نہیں، نہ طاقتوروں کی رعایت ہے اور نہ کمزوروں پر سختی، بلکہ عدل و صداقت پر قائم ایک بے

لاگ تنبیہ ہے۔

لفظ اِنَّ کے ذریعے تاکید، پھر ضمیرِ منفصل اَنَا سے مزید توثیق، اور اس کے بعد اَلنَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ کی صراحت، یہ سب اس بات کو اجاگر کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ کی ذمہ داری پوری وضاحت کے ساتھ خبردار کرنا ہے، تاکہ جو شخص عاد و ثمود کی ہولناک پکڑ، قومِ ہود کی سرکشی، زمین کے الٹ دیے جانے اور تند و تیز آندھیوں کی تباہ کاریوں سے عبرت لینا چاہے، اس کے لیے دلیل روشن ہو جائے، یہی مفہوم اس ارشادِ نبوی میں بھی جھلکتا ہے اَنَا النَّذِیْرُ الْعُرْیَان میں وہ خبردار کرنے والا ہوں جو خطرے کو بے پردہ اور بے کم و کاست بیان کر دیتا ہے، یہاں دعوت کی اصل روح نمایاں ہے، صداقت، صراحت اور انجام سے آگاہی۔

دین حق کو ٹکڑیوں میں تقسیم کرنے والے

سوال آیت مبارکہ میں مُقْتَسِمِین سے کیا مراد ہے؟

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ {۹۰} الحجر

جواب ترجمہ: (اے پیغمبر، ہم نے اسی طرح یہ کلام تم پر نازل کیا ہے) جس طرح ان لوگوں پر (اپنا کلام) نازل کیا تھا جنہوں نے (دین حق کے) ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

یہ اشارہ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے جنہوں نے حق کو چھپانے کے لیے اپنے قرآن یعنی تورات کے حصے بخرے کر دیے، اس کے بعض کو چھپاتے اور بعض کو ظاہر کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے اس بارے میں بتایئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ (تفسیر در منثور جلال الدین سیوطی)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں ان لوگوں نے اللہ کی ان کتابوں کو جو ان پر اتری تھیں پارہ پارہ کر دیا جس مسئلے کو جی چاہا مانا جس سے دل گھبرایا چھوڑ دیا۔ بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب ہیں کہ کتاب کے بعض حصے کو مانتے تھے اور بعض کو نہیں مانتے تھے۔

یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ مراد اس سے کفار کا کتاب اللہ کی نسبت یہ کہنا ہے کہ یہ جادو ہے، یہ کہانت ہے، یہ اگلوں کی کہانی ہے، اس کا کہنے والا جادو گر ہے، مجنوں ہے، کاہن ہے وغیرہ۔

سیرت ابن اسحاق میں ہے کہ ولید بن مغیرہ کے پاس سرداران قریش جمع ہوئے حج کا موسم قریب تھا اور یہ شخص ان میں بڑا شریف اور ذی رائے سمجھا جاتا تھا اس نے ان سب سے کہا کہ دیکھو حج کے موقع پر دور دراز سے تمام عرب یہاں جمع ہوں گے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ تمہارے اس ساتھی نے ایک اودھم مچار کھا ہے لہذا اس کی نسبت ان بیرونی لوگوں سے کیا کہا جائے یہ بتاؤ اور کسی ایک بات پر اجماع کر لو کہ سب وہی کہیں۔ ایسا نہ ہو کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے اس سے تو تمہارا اعتبار اٹھ جائے گا اور وہ پردیسی تمہیں جھوٹا خیال کریں گے۔ انہوں نے کہا ابو عبد شمس آپ ہی کوئی ایسی بات تجویز کر دیجئے اس نے کہا پہلے تم اپنی تو کہو تا کہ مجھے بھی غور و خوض کا موقع ملے انہوں نے کہا پھر ہماری رائے میں تو ہر شخص اسے کاہن بتلائے۔ اس نے کہا یہ تو واقعہ کے خلاف ہے لوگوں نے کہا پھر مجنوں بالکل درست ہے۔ اس نے کہا یہ بھی غلط ہے کہا اچھا تو شاعر کہیں؟ اس نے جواب دیا کہ وہ شعر جانتا ہی نہیں کہا اچھا پھر جادو گر کہیں؟ کہا اسے جادو سے مس بھی نہیں اس نے کہا سنو **وَاللّٰهِ إِنَّ لِقَوْلِهِ حَلَاوَةً**، واللہ اس کے قول میں مٹھاس ہے، ان باتوں میں سے تم جو کہو گے دنیا سمجھ لے گی کہ محض غلط اور سفید جھوٹ ہے۔ گو کوئی بات نہیں بنتی لیکن کچھ کہنا ضرور ہے اچھا بھائی سب اسے جادو گر بتلائیں۔ اس امر پر یہ مجمع برخاست ہوا۔ اور اسی کا ذکر ان آیتوں میں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے **مُقْتَسِمِيْنَ** کے معنی قسم کھانے والوں کے لیے ہیں یعنی وہ گزشتہ قومیں جو انبیاء علیہم السلام کی تکذیب و مخالفت کے حلف اٹھا چکی تھیں اور جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتی تھیں اور انہوں نے کتب سماویہ کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔

قرآن کریم کو ٹکڑیوں میں تقسیم کرنے والے

سوال جن لوگوں نے قرآن کریم کے حصے بخرے کیے یہ کون لوگ تھے؟

الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ {۹۱} الحجر

جواب ترجمہ: جنہوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے۔

اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور ان کے علاوہ وہ لوگ جنہوں نے قرآن کریم کو حصوں اور ٹکڑوں میں تقسیم کیا، ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ کہانت ہے، بعض اس کے علاوہ کچھ اور کہتے ہیں، اپنی اپنی خواہشات کے مطابق جو منہ میں آتا ہے وہی کہتے ہیں اور ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگوں کو راہ راست سے ہٹادیں، لوگ اس قرآن کی طرف آ ہی نہ سکیں۔

بعض نے کہا مشرکین مراد ہیں جو بطور استہزاء و تمسخر قرآن کی تقسیم کرتے تھے۔ جب سورتوں کے نام سنتے تو ہنس کر آپس میں کہتے۔ بقرہ یا مائدہ میں لوں گا۔ عنکبوت تجھ کو دوں گا۔ ان لوگوں نے ایک اور طرح بھی قرآن کے متعلق خیالات تقسیم کر رکھے تھے کوئی اسے شاعری بتاتا، کوئی کہانت، کوئی جادو، کوئی مجنون کی بڑ، کوئی اساطیر الاولین، ان کو آگاہ کیا کہ میں سب کو عذاب سے ڈرانے والا ہوں، جیسا عذاب یقیناً نازل ہونے والا ہے ان ٹھٹھا کرنے والوں پر۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بانٹنے والوں سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں چونکہ وہ قرآن کریم کے کچھ حصّہ پر ایمان لائے جو ان کے خیال میں ان کی کتابوں کے موافق تھا اور کچھ کے منکر ہوگئے۔ قتادہ و ابن سائب کا قول ہے کہ بانٹنے والوں سے کفار قریش مراد ہیں جن میں بعض قرآن کو سحر، بعض کہانت، بعض افسانہ کہتے تھے اس طرح انہوں نے قرآن کریم کے حق میں اپنے اقوال تقسیم کر رکھے تھے۔

حتمی باز پرس اور ہمہ گیر محاسبہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ {۹۲} عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ {۹۳} الحجر

جواب ترجمہ:، سو آپ کے رب کی قسم ہے ہم ان سب سے ضرور باز پرس کریں گے۔ کیا کچھ وہ کیا کرتے تھے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں ایک نہایت پُر جلال قسم کے ذریعے منکرین کو ان کے انجام سے آگاہ کیا گیا ہے، فَوَرَبِّكَ میں حرفِ فاء اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے قرار دینے، اسے اپنی خواہش کے مطابق بانٹنے اور شرک و فساد میں حد سے گزر جانے کے نتیجے میں یہ فیصلہ صادر ہوا ہے، ربوبیت کی قسم کھا کر فرمایا گیا کہ ہم ان سب سے ضرور باز پرس کریں گے کہ وہ کیا کرتے رہے، اس سوال کی تاکید لامِ قسم، نونِ تاکید اور لفظ اَجْمَعِيْنَ سے کی گئی ہے، تاکہ واضح ہو جائے کہ کوئی فرد اس محاسبے سے بچ نہ سکے گا۔

یہاں سوال محض استفسار نہیں، بلکہ حساب و جزا کا پیش خیمہ ہے، کیونکہ اصل عذاب سوال کے بعد کا انجام ہے، اسلوبِ کلام میں سوال کو اپنی ذاتِ اقدس کی طرف منسوب کر کے اللہ تعالیٰ نے معاملے کی عظمت اور جرم کی سنگینی کو نمایاں کیا ہے، وہ چاہے کھیل تماشے میں مبتلا رہیں، مگر ربِّ علیم و خبیر ان کے اعمال سے بے خبر نہیں، ہر قول و فعل اس کے علم میں محفوظ ہے اور ہر ایک کو اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

اعلانیہ دعوت و تبلیغ کرنے کا حکم

سوال اس آیت مبارکہ میں فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کا کیا معنیٰ ہے؟

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ {۹۴} الحجر

جواب ترجمہ: جس چیز کا آپ کو حکم دیا جاتا ہے اسے خوب صاف طریقے پر بیان کر دیجیے، اور مشرکین سے اعراض کیجیے۔

شروع شروع میں دعوت اسلام کا آغاز خفیہ طور پر ہوتا رہا اور یہ دور تین سال سے زائد عرصہ پر محیط ہے۔ پھر وہ دور آیا جب مسلمان دار ارقم سے باہر اپنے اپنے گھروں کی بعض کھلی جگہوں پر نمازیں

ادا کرتے اور قرآن پڑھتے تھے۔ اس دور میں قریش نے پابندی لگا رکھی تھی کہ مسلمان بلند آواز سے قرآن نہ پڑھا کریں کیونکہ اس سے ان کے بچے اور عورتیں متاثر ہوتی ہیں نیز ان پر کعبہ میں نماز ادا کرنے یا قرآن پڑھنے پر بھی پابندی تھی اور قریش کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر چند سال بعد یہ دور آیا جب اللہ تعالیٰ نے علی الاعلان تبلیغ کا حکم دے دیا اور فرمایا کہ اس سلسلہ میں شرک کرنے والوں کے استہزاء کی مطلق پروانہ کریں ہم ایسے لوگوں سے خود نمٹ لیں گے۔

عبداللہ بن عبیدہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ **كَانَ مُسْتَخْفِيًا حَتّٰى نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ فَخَرَجَ هُوَ وَأَصْحَابُهُ**، اس آیت کے نزول کے وقت تک دعوتِ اسلام اعلان کے ساتھ نہیں کی جاتی تھی، اس آیت کے نزول کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دعوت و تبلیغ کے لیے نکلے۔ (تفسیر زادالمسیر بحوالہ تفسیر بغوی)

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ: کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آپ کو جو پیغام دیا جارہا ہے اسے کھل کر علی الاعلان بیان کریں، دلائل کے ساتھ، اس طرح اعلانیہ بیان کریں کہ حق و باطل کے درمیان فرق واضح دکھائی دے۔ (تفسیر بیضاوی) یہ لفظ صدعٌ سے ہے جس کا معنٰی ہے ابانۃٌ یعنی واضح کرنا۔ (تفسیر نسفی) حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ اس سے مراد نماز میں قرآن کریم کو اونچی آواز میں پڑھنا ہے۔ (تفسیر زادالمسیر)

مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے پیغام کو تمام مخلوق تک پہنچادیں، تاکہ اتمام حجت قائم ہو جائے۔ (تفسیر قرطبی) علامہ فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ **فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ** کا مطلب یہ ہے کہ اپنے دین کو ظاہر کیجیے۔ (قرطبی)

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صبح کو عربی میں **صَدِيعٌ** اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ روشن ہوتی ہے تو ہر چیز واضح دکھائی دیتی ہے۔ (تفسیر مفاتیح الغیب) اخفش رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کا معنٰی یہ ہے کہ قرآن

کریم کے ذریعے حق و باطل کے درمیان فرق کیجیے۔(تفسیر بغوی)حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے معاملے کو مکہ میں واضح کیجیے۔(تفسیر ابن عباس)

ابو نعیم رحمہ اللہ اپنی کتاب الدلائل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت لائے ہیں، جس سے پتا چلتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں کئی سال تک خفیہ طور پر دعوت کا کام کرتے رہے، اس کے بعد یہ آیت نازل فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ اب آپ مکہ میں کھل کر دعوت و تبلیغ کا کام کریں۔(در منثور)

اسماعیل استنبولی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صَدعٌ کا معنیٰ ہے پھاڑنا، مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اجتماعیت کو توحید کے ذریعے توڑ ڈالیے۔(تفسیر روح البیان)

دشمنان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عبرتناک انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ{۹۵}الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ{۹۶} وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ{۹۷}فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ{۹۸}وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ{۹۹}الحجر

جواب ترجمہ:(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) یقین رکھیے کہ ہم آپ کی طرف سے ان لوگوں سے نمٹنے کے لیے کافی ہیں جو (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا) مذاق اڑاتے ہیں۔ جنہوں نے اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود گھڑ رکھا ہے۔ چنانچہ عنقریب انہیں سب پتہ چل جائے گا۔ یقیناہم جانتے ہیں کہ جو باتیں یہ بناتے ہیں، ان سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے۔ تو (اس کا علاج یہ ہے کہ) آپ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہیں، اور سجدہ بجالانے والوں میں شامل رہیں۔ اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہیں، یہاں تک کہ آپ پر وہ چیز آجائے جس کا آنا یقینی ہے۔

کُفّارِ قریش کے پانچ سردار حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کا مزاح اڑاتے تھے، عاص بن وائل سہمی، اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، حارث بن قیس اور ولید بن مغیرہ مخزومی ان سب

کا افسر تھا، اسود بن مطلب کے لئے سید عالم ﷺ نے بد دعا کی تھی کہ یاربّ اس کو اندھا کر دے اور بے اولاد کر دے، ایک روز سید عالم ﷺ مسجد حرام میں تشریف فرما تھے، یہ پانچوں آئے اور انہوں نے حسبِ دستور طعن و تمسخر کے کلمات کہے اور طواف میں مشغول ہو گئے۔ اسی حال میں حضرت جبریلِ امین حضرت کی خدمت میں پہنچے اور انہوں نے ولید بن مغیرہ کی پنڈلی کی طرف اور عاص کے تلوے کی طرف اور اسود بن مطلب کی آنکھوں کی طرف اور اسود بن عبد یغوث کے پیٹ کی طرف اور حارث بن قیس کے سر کی طرف اشارہ کیا اور کہا میں ان کا شر دور کروں گا چنانچہ تھوڑے عرصہ میں یہ ہلاک ہو گئے۔ ولید بن مغیرہ تیر فروش کی دوکان کے پاس سے گزرا اس کے تہہ بند میں ایک نیزے کی نوک چبھی مگر اس نے تکبّر سے اس کو نکالنے کے لئے سر نیچا نہ کیا اس سے اس کی پنڈلی میں زخم آیا اور اسی میں مر گیا۔

عاص ابن وائل کے پاؤں میں کانٹا لگا اور نظر نہ آیا اس سے پاؤں سوجھ گیا اور یہ شخص بھی مر گیا۔

اسود بن مطلب کی آنکھوں میں ایسا درد ہوا کہ دیوار میں سر مارتا تھا اسی میں مر گیا اور یہ کہتا مرا کہ مجھ کو محمد نے قتل کیا (ﷺ)۔ اور اسود بن عبد یغوث کو استسقاء ہوا (ایک بیماری جس سے پیٹ بڑھ جاتا ہے اور پیاس بہت زیادہ لگتی ہے)

اور کلبی کی روایت میں ہے کہ یہ گھر سے نکلا تو اس کو لُو لگی اور اس کا منہ اس قدر کالا ہو گیا کہ وہ حبشی لگتا تھا، گھر والوں نے نہ پہچانا اور نکال دیا اسی حال میں یہ کہتا مر گیا کہ مجھ کو محمد (ﷺ) کے رب نے قتل کیا۔ اور حارث بن قیس کی ناک سے خون اور پیپ جاری ہوا، اسی میں ہلاک ہو گیا۔ انھیں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (خازن)

ایک دن حضور ﷺ راستے سے جا رہے تھے کہ بعض مشرکوں نے آپ کو چھیڑا اسی وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور انہیں نشتر مارا جس سے ان کے جسموں میں ایسا ہو گیا جیسے نیزے کے زخم ہوں اسی میں وہ مر گئے اور یہ لوگ مشرکین کے بڑے بڑے رؤسا تھے۔ بڑی عمر کے تھے اور نہایت شریف گنے جاتے تھے۔ (ابن کثیر)

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ بخاری شریف کی شرح میں لکھتے ہیں نبی کریم ﷺ کے ساتھ استہزا کرنے والے سات لوگ تھے، جنہوں نے نبی کریم ﷺ کو نماز کی حالت میں تکلیف دی تھی، ان میں عمرو بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط اور عمارہ بن ولید شامل تھے۔ (روح المعانی)

علامہ سہیلی رحمۃ اللہ علیہ کی اعلام میں ان کے بارے میں لکھا ہوا ہے کہ یہ قلیب بدر میں پھینکے گئے، اللہ تعالیٰ نے ان سب استہزا کرنے والوں کو ہلاک کیا، یوں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کی کافروں کے شر واستہزا سے کفایت کی۔

الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ: یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی تاریک اندیشی اور گم گشتہ عقل کے زیرِ اثر، اللہ ربُّ السماوات والارض کے ساتھ، جو ذات وصفات میں یکتا اور ہر عیب سے منزّہ ہے، از خود ایک اور معبود گھڑ لیتے ہیں، نہ کوئی دلیل، نہ کوئی برہان، محض وہم وہویٰ کی بنیاد پر شریک ٹھہرا دینا اور پھر اسی پر اترانا، درحقیقت ان کا یہ طرزِ عمل خود ان کے لیے موجبِ تمسخر ہے، مگر وہ دوسروں کا مذاق اڑانے میں پیش پیش رہتے ہیں، اس پر تنبیہ کی گئی **فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ** عنقریب وہ جان لیں گے؛ ''سوف'' مستقبل کی قطعیّت کو نمایاں کرتی ہے، یعنی اپنے شرک اور استہزا کا انجام اور اس کے پیچھے آنے والا عذاب انہیں دیکھنا پڑے گا۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ: پھر رسولِ اکرم ﷺ کی دلجوئی فرمائی گئی کہ ہمیں معلوم ہے، آپ کا سینہ ان کی باتوں سے تنگ ہوتا ہے، آپ بشر تھے، طعن وتمسخر سنتے، جادوگر اور مجنون کہلاتے، قرآن کو شعر اور افسانۂ پارینہ کہا جاتا دیکھتے اور اذیت ناک حرکات کا سامنا کرتے، یہ سب دل پر گراں گزرتا تھا، مگر کمالِ رسالت یہ تھا کہ دل میں کسک کے باوجود چہرہ روشن رہتا، دعوت کا اسلوب نہ بدلتا اور حق کی صدا مدھم نہ ہوتی۔ ''ضیقِ صدر'' سے اس باطنی اذیت کو تعبیر کیا گیا ہے، گویا سینہ ان ناروا باتوں کا بوجھ سمیٹنے میں تنگ پڑ جائے، تاہم داعیِ حق کی استقامت یہی ہے کہ دل زخمی ہو تو ہو، زبان اور عمل راہِ حق سے نہ ہٹیں۔

آخر دم تک عبادت کرنے کا حکم: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السَّاجِدِينَ: جب مخالفین کی حرکات وسکنات سے دل تنگ ہو تو گرانیٔ طبع کے وقت اپنے رب کی طرف توجہ کیجیے، اپنے رب کی تسبیح کیجیے، اس کی شکر گزاری کے لیے، اس کی ثناء کیجیے، جو لوگ اللہ کے عبادت گزار ہیں ان میں شامل ہو جایئے، ایسا کرنے سے غم وفکر کا خاتمہ ہو جائے گا۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ: عزرائیل علیہ السلام کی آمد سے پہلے تک عبادت کرتے رہیے، ان احکامات کو نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی کا جزو لاینفک بنایا، اپنے رب کے احکامات کی آخر دم تک پاسداری کی، اللہ کی عبادت تادم واپسیں کرتے رہے، یہاں تک کہ فرشتہ اجل آن پہنچا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تسبیح کرنے کا حکم فرمایا ہے، نماز تسبیح کا انتہائی درجہ ہے، تقدیس کا انتہائی مقام ہے، سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جاؤ، اس میں اللہ اپنے حبیب کو مزید اپنے قریب لانا چاہتے ہیں، اس لیے کہ اس میں کوئی خفا نہیں ہے کہ سجدہ ایسا مقام ہے جہاں بندہ اپنے رب کے بہت زیادہ قریب ہوتا ہے۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ فَأَخْلِصُوا الدُّعَاءَ (جامع الصغیر) سب سے زیادہ بندہ جو اپنے رب کے قریب ہوتا ہے وہ سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے، اس لیے دعا میں اخلاص اختیار کرو۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو اس مقام پر یہ فرمایا کہ موت تک عبادت کرتے رہو، یہاں یقین کا لفظ استعمال فرما کر استمرار کی طرف اشارہ کیا گیا، کہ آخر دم تک عبادت کرتے رہو۔

الحمدللہ: ۲۰۱۶ء میں سورۃ الحجر کی تفسیر لکھی تھی، اب دوبارہ اضافات وترمیمات کے ساتھ مزید کام کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کی ان مبارک ساعات میں ہماری دعائیں قبول فرماتے ہوئے اس متواضع کاوش کو اپنی عالی بارگاہ میں قبول ومنظور فرمائے۔ آمین یارب العالمین

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی (جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور)

۵ مارچ ۲۰۲۶ء بروز جمعرات وقت تہجد